بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَہَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ

ترجمہ: اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے تو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟

معالم العرفان فی دروس القرآن

افادات

حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی رحمۃ اللہ علیہ

خطیب جامع مسجد نور

بانی مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

مرتب

الحاج لعل دین ایم اے [علوم اسلامیہ]

ناشر

مکتبہ دروس القرآن

فاروق گنج ○ گوجرانوالہ

روزانہ درسِ قرآن

تفسیر

سورۃ محمد (مکمل)

سورۃ الفتح (مکمل)

سورۃ الحجرات (مکمل)

سورۃ ق (مکمل)

سورۃ الذٰریٰت (مکمل)

سورۃ الطور (مکمل)

سورۃ النجم (مکمل)

سورۃ القمر (مکمل)

سورۃ الرحمٰن (مکمل)

جلد ۱۷

افادات :- حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی دام مجدہم
خطیب جامع مسجد نور، گوجرانوالہ، پاکستان

بیسواں ایڈیشن

نام کتاب .... معالم العرفان فی دروس القرآن (سورۃ محمد تا سورۃ الرحمٰن مکمل) جلد ۱۷

افادات .... حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ

مرتب .... الحاج لعل دین ۔ ایم اے (علوم اسلامیہ) شاد مان ٹاؤن لاہور

تعداد طباعت .... پانچ سو (۵۰۰)

سرورق .... سید الخطاطین حضرت شاہ نفیس الحسینی رحمہ اللہ

کتابت .... محمد امان اللہ قادری، گوجرانوالہ

ناشر .... مکتبہ دروس القرآن فاروق گنج گوجرانوالہ

قیمت ۲۳۰ (دو سو تیس روپے)

طبع بیسواں ایڈیشن دسمبر 2013ء

(۱) مکتبہ دروس القرآن محلہ فاروق گنج گوجرانوالہ

(۲) مکتبہ رحمانیہ اقراء سنٹر اردو بازار لاہور

(۳) مکتبہ قاسمیہ الفضل مارکیٹ لاہور

(۴) مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور

(۵) کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی

(۶) کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

(۷) مکتبہ حلیمیہ نزد جامعہ بنوریہ سائٹ نمبر ۶ کراچی

(۸) اسلامیہ کتب خانہ اڈا گاگی ایبٹ آباد

(۹) مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ

(۱۰) مکتبۃ العلم ۱۸ اردو بازار لاہور

(۱۱) کتب خانہ صفدریہ حق سٹریٹ اردو بازار لاہور

فہرست مضامین معالم العرفان فی دروس القرآن جلد ۱۷

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ
فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ ۔ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ

؎ گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن (اقبالؒ)

اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی ہدایت و راہنمائی کے لیے کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و رسل اس دنیا میں مبعوث فرمائے ہیں جنہوں نے اپنے اپنے ادوار میں اقوامِ عالم کو دعوتِ توحید دی اور ان کو ابدی و سرمدی فوز و فلاح اور کامیابی و کامرانی کی راہِ حق دکھائی۔ خدا کا کلام اور پیغام ان تک پہنچایا جو مستقل کتب یا صحائف کی شکل میں تھا۔ تورات حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام، زبور حضرت داؤد علیہ السلام، انجیل حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام پہ اتری اور سب کے آخر میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ السلام پہ اللہ رب العزت کی جانب سے اس کا آخری کلام قرآن کریم کی صورت میں نازل ہوا جس میں رہتی دنیا تک کے لیے تمام انسانوں کی بہتری اور بھلائی کا پروگرام ہے اس پر عمل پیرا ہو کر ہی انسانیت صراطِ مستقیم پا سکتی ہے۔ اور اس سے روگردانی، بے اعتنائی اور لاپرواہی اختیار کرنے سے انسان خائب و خاسر اور نامراد ہو کر ابدالآباد کی خوشیوں، لذتوں اور مسرتوں سے بے بہرہ اور محروم ہو کر جہنم کا کندۂ ناتراش بن جاتا ہے آج انسان قرآنِ کریم کے لازوال اور انقلابی پروگرام کو پس پشت ڈال کر ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ اس کے الفاظ و معانی میں تدبر اور غور و فکر کو ترک کر کے اقوامِ عالم کے ہاتھوں

میں کھلونا بنے ہوئے ہیں، جو انہیں خدا اور رسول کے احکام و فرامین سے دُور ہٹا کر غیروں کا
دستِ نگر بننے پہ مجبور کر کے ان کی مسندِ عظمت و سطوت کے تخت کو سرنگوں کر کے پامال کرنا چاہتے
ہیں۔ ان کی قوتِ ایمانی کو اپنے مکروہ ہتھکنڈوں سے سلب کر کے قعرِ مذلت کی اتھاہ گہرائیوں
میں اتار دینا چاہتے ہیں لیکن مسلمان ان تمام واقعات و حوادثات کو بنظرِ غائر مشاہدہ کرنے
کے باوجود غفلت کی دبیز چادر تانے خوابِ غفلت میں سرشار محوِ خواب ہیں۔ دنیائے اسلام
تباہی و بربادی کے دہانے پہ کھڑی زعمِ خویش سرمست ہے، توحید و سنت سے دور،
اخلاقی گراوٹ، امریکی اور یورپی تہذیب و تمدن کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہے ان کے کلچر کو
ہی اپنے لیے کامیابی کا زینہ سمجھ رہے ہیں۔ قرآن و سنت سے ہٹے ہوئے طور طریقوں
کو نظر انداز کر کے غیر مسلموں سے برابری کر کے اُن کی مشابہت کو اختیار کرنے میں فخر محسوس
کرتے ہیں حالانکہ آقائے نامدار حضرت خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح فرمان موجود ہے
مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ (ابوداؤد شریف صفحہ ۲۰۳ جلد ۱) جس نے کسی قوم سے مشابہت
اختیار کی وہ انہیں میں سے ہے۔ آج بھی اگر مسلمان غیروں کی مشابہت کو ترک کر دیں
قرآن کریم کے انقلابی پروگرام کو اپنی زندگیوں کا نصب العین اور نظریۂ حیات منتخب
کر لیں۔ اس پر عمل پیرا ہونے کو ہی اپنے لیے باعثِ فخر اور فوز و فلاح کا دار و مدار خیال
کر لیں۔ تو آج بھی اُن کی کھوئی ہوئی عزت و وقار، تعظیم و تکریم لوٹ سکتی ہے، یہ دنیا کے رہبر
راہنما بن سکتے ہیں ان کی سیاست و سیادت عروج پا سکتی ہے۔ ان کی اقتصادیات، معیشت
اور معاشرت بہتر ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے لیے نہایت صبر و تحمل کا دامن پکڑنا پڑے گا۔
شرک و بدعت، رسومات اور خرافات کو ترک کرنا ہو گا۔ لہو و لعب اور نشہ بازی سے کنارہ کشی
اختیار کرنی پڑے گی، ریڈیو، ٹیلیویژن وی سی آر اور ڈش انٹینا کے رنگا رنگ اور فحاشی سے
پُر پروگراموں سے گریز کرنا ہو گا۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ تمام اطراف سے
اپنی توجہ کو ہٹا کر صرف اور صرف اللہ کے نازل کردہ کلام کی طرف توجہ کو مکمل طور پہ
مبذول کیا جائے۔ اس کے احکام و فرامین کو اپنی گھریلو اور کاروباری زندگی کا امام بنایا جائے
اپنی معیشت و سیاست کے خطوط اسی کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق کھینچے جائیں

اور ہر آدمی اپنی زندگی کے تمام گوشوں میں اسی سے فیض حاصل کر کے اس پر دل کی گہرائیوں سے عمل کرے۔ قرآن کریم کے اسی انقلابی پروگرام کو بنی نوع انسان کی تفہیم اور تقریب اذہان کے لیے جاری و ساری کرنے کے پیہ سلسلہ "دروس القرآن" کی سترھویں جلد اپنی تمام تر خوبیوں اور اچھائیوں کے ساتھ ناظرین کرام کے سامنے ہے۔ اس جلد میں سورۃ محمدؐ سے سورۃ رحمٰن تک کل ۹ سورتوں کی تشریح درج ہے۔

سورۃ محمدؐ | سورۃ محمد کو سورۃ قتال بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سورۃ میں اسلام کے قانونِ صلح و جنگ کی تفصیلات کا ذکر ہے۔ اسی مناسبت سے اس کو سورۃ قتال بھی کہا جاتا ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ کتاب پر ایمان لانے کو مدار ایمان و کامیابی ٹھہرانے کی وجہ سے اس کا نام سورۃ محمدؐ بھی ہے۔ اہلِ جنت کی کامیابی اور انعامات اور دوزخیوں کی سزا اور ان کے برے انجام کا تذکرہ بھی ہے۔ قرآن کریم میں تدبر، مجاہدین اور صابرین کا ذکر، اللہ اور رسول کی اطاعت، دُنیا کی بے ثباتی اور دلی مرض نفاق کا ذکر بطور خاص ہے ان تمام مباحث کو قرآن و سنت کے احکام، خلفاء راشدینؓ کے تعامل صحابہ کرامؓ کے اسوہ تابعین، مفسرین، محدثین، مؤرخین، فقہاء، اہل اللہ، سلف صالحین، بزرگانِ دین، صوفیاء خصوصاً علماء حق، علماء دیوبند اور امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے افکار اور تعبیرات کی روشنی میں قرآن کریم کی تفسیر کو بیان کیا گیا ہے۔ اس جلد میں فلسفہ ولی اللّٰہی کی چھاپ غالب ہے۔ اور اس کی غامض، پیچیدہ اور علمی تحقیقی اصطلاحات کو بڑے احسن اور سہل انداز میں، شیریں اور آسان زبان میں قارئین کرام کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔

سورۃ الفتح | اس سورۃ میں مسلمانوں کی کفار کے مقابلے میں عظیم الشان فتح کا ذکر ہے اسی وجہ سے اس کا نام سورۃ الفتح ہے اور ۶ھ میں پیش آمدہ واقعہ حدیبیہ کی تفصیلات ہیں اور فتح قریب، مال غنیمت اور منافقین کے طرزِ عمل کا ذکر ہے۔ بیعت رضوان، مسجد حرام میں داخلہ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثار صحابہ کرامؓ کی منقبت و فضیلت اور اس کے ضمن میں بے شمار مسائل اور معلومات کی کثرت قارئین کی خوشی و انبساط میں اضافے کا باعث ہوگی۔

سورۃ الحجرات | حجرات حُجرۃ کی جمع ہے جو کمرہ کو کہا جاتا ہے اس سورۃ میں حضور نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات، امہات المؤمنین کے حجرات کا تذکرہ ہے اسی لیے سورۃ کا نام
سورۃ الحجرات ہے۔ حضور علیہ السلام کی عزت و تکریم اور آپ کی آواز سے اپنی آوازوں کو
پست رکھنے کا حکم، کسی بھی معاملہ میں فاسق کی خبر کی تحقیق کر لینا، اور اگر مسلمانوں کے دو گروہوں
میں لڑائی ہو جائے تو ان کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ صلح کرانے کا حکم، ایمان
والوں کا آپس میں بھائی بھائی ہونا، ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرنے سے
گریز کرنا، جاسوسی کی ممانعت، تخلیق انسانی، غیبت سے اجتناب اور خاندان و قبائل
کا بطور تعارف ذکر اور تقویٰ معیار بزرگی وغیرہ ابحاث اس سورۃ میں بطور خاص مذکور ہیں۔

سورۃ ق | حروف مقطعات میں سے حرف ق بھی ہے امام جلال الدین سیوطی رح
المتوفی ۹۱۱ھ فرماتے ہیں اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمُرَادِہٖ بِذٰلِکَ اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا (جلالین)
اس کی مراد اللہ تعالیٰ ہی زیادہ جانتا ہے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی تصدیق
کرتے ہیں۔ اسی حرف مقطعہ پر سورۃ کا نام ق ہے، اس سورۃ میں قرآن کریم کے نزول پر قوم
کا تعجب کرنا کہ ہم میں سے ہی ہم جیسے ایک آدمی پر یہ کیسے نازل ہو گیا۔ بعث بعد الموت
پر تعجب کرنا، ارض و سماء کی تخلیق کو بطور دلیل پیش کرنا، سابقہ اقوام کی تکذیب کا ذکر، نفخ صور
جنت و دوزخ کا داخلہ، اور جہنم کی پکار ھَلْ مِنْ مَّزِیْد وغیرہ چیزوں کے متعلق سیر حاصل
معلومات درج ہیں۔

سورۃ الذّٰریٰت | اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے چند چیزوں کی قسم اٹھا کر وقوع قیامت
کا تذکرہ کیا ہے۔ اہل جنت و جہنم کا ذکر اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا واقعہ، ان کے
پاس فرشتوں کا بطور مہمان آنا اور لڑکے کی بشارت دینا اور قوم لوط پر عذاب کی وعید اور
نزول، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تذکرہ اور قوم ثمود پر عذاب کا اترنا اور
زمین و آسمان کی تخلیق، جنوں اور انسانوں کا مقصد تخلیق عبادت الٰہی کا ہونا اور اللہ رب العزت
کا قادر مطلق اور قوت کا سرچشمہ ہونے کا ذکر ہے۔

سورۃ الطّور | اس سورۃ میں طور پہاڑ، کتاب اللہ، فرشتوں کی عبادت گاہ بیت المعمور

اہل بہشت کے انعامات اور اہلِ دوزخ کے عذاب، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کفار و مشرکین کا العیاذ باللہ کاہن اور مجنون ہونے کا اتہام، صداقتِ قرآن اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار و مشرکین کی ایذا رسانیوں اور تکالیف پہنچانے پر صبر کی تلقین کا ذکر ہے۔

سورۃ النجم | اس سورۃ میں حضور علیہ السلام کے ساتھ پیش آمدہ حیرت انگیز واقعہ معراج کی مکمل تفصیلات نہایت دلکش انداز سے بیان کی گئی ہیں۔ واقعہ کے آغاز سے اختتام تک افراط و تفریط سے پاک اور احادیث کی روشنی میں بڑی جاذب قلب انداز سے درج کیا گیا ہے۔ جبرائیل علیہ السلام کی زیارت اور رؤیت الٰہی کا مسئلہ۔ اللہ تعالیٰ کا مالک الملک ہونا خدا کے احکام سے روگردانی کرنے والوں کو تنبیہ اور علم غیب خاصۂ خداوندی ہے۔ زندگی اور موت اور اقوام سابقہ عاد اور ثمود کی ہلاکت کا تذکرہ بھی اس میں مذکور ہے۔

سورۃ القمر | اس سورۃ میں روز قیامت اور چاند کے پھٹنے کا ذکر ہے اور قیامت کو پیش آنے والے واقعات کا تذکرہ ہے۔ قرآن کریم بطور نصیحت ہے، اس نصیحت کو حاصل کرنے والوں اور رد کرنے والوں کا تذکرہ، سابقہ اقوام کی تباہ کاریاں اور ان پر خدا تعالیٰ کی طرف سے مسلط کردہ عذاب کا ذکر ہے۔ نیز اہل جنت کے ٹھکانے اور ان کے آسائش و آرام اور راحت و اطمینان کا ذکر بھی ہے۔

سورۃ الرحمٰن | اس سورۃ کو عروس القرآن بھی کہا جاتا ہے اس سورۃ میں دو مکلف گروہوں انسانوں اور جنوں کو اکتیس ۳۱ مرتبہ تنبیہ کی گئی ہے کہ تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے اور ساتھ ساتھ انعامات ربانی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ رب العزت کا ہمیشہ قائم رہنا اور باقی تمام مخلوقات کے فنا ہو جانے کا تذکرہ۔ اہل جنت کے فضائل و انعامات کو بڑی بسط اور تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

غالب امکان یہ تھا کہ اس ستر ہویں جلد پر دروس القرآن کا یہ مقبول عام اور مفید ترین سلسلہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ لیکن صفحات کی ضخامت بڑھ جانے کی وجہ سے اب مزید ایک جلد میں یہ سلسلہ جو کہ سنہ ۱۹۸۰ء میں شروع ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم سے انشاء اللہ العزیز بیس ۲۰ جلدوں میں اختتام پذیر ہوگا۔[1]

---

[1] جو کہ بحمد اللہ رمضان ۱۴۱۳ھ میں مکمل ہوگیا ہے۔ (دفی عنہ)

قارئین کرام کی خدمت میں درخواست ہے کہ وہ اس کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور دست بدعا ہوں اور صاحب دروس حضرت والد محترم صوفی عبدالحمید صاحب سواتی مدظلہ کی صحت و عافیت کے لیے اور جملہ اراکین و معاونین انجمن محبان اشاعت قرآن کے لیے خصوصاً فاضل مرتب الحاج لعل دین ایم اے، الحاج شیخ محمد یعقوب صاحب صدر، الحاج بابو غلام حیدر صاحب سیکرٹری، الحاج محمود الوربٹ صاحب خزانچی، جناب بلال احمد ناگی صاحب، جناب انجم لطیف صاحب، مستری محمد منیر صاحب ناظم مکتبہ دروس القرآن، حاجی محمد اکرم صاحب وغیرہ حضرات جو کہ نہایت محبت اور لگن سے اس نیک سلسلہ میں دامے درمے قدمے سخنے حصہ لے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کے لیے آخرت کا ذخیرہ بنائے اور دین دنیا اور آخرت میں بھلائی عطا فرمائے۔ اس جلد کی پروف ریڈنگ میں احقر کے ساتھ حافظ محمد اشرف گجراتی نے حصہ لیا ہے اللہ تعالیٰ ان کو مزید اخلاص کی توفیق مرحمت فرمائے اور کامیابی سے ہمکنار فرمائے۔ آمین۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ
مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

سُورۃ محمد
(مکمل)

حٰمٓ ۲۶ — محمد ۴۷

درس اوّل ۱ — آیت ۱ تا ۳

سُوْرَةُ مُحَمَّدٍ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ ثَمَانٍ وَثَلٰثُوْنَ اٰيَةً وَاَرْبَعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۃ محمد مدنی ہے۔ یہ اڑتیس آیات ہیں اور اسکے چار رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان اور نہایت رحم والا ہے

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ① وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ② ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ③

ترجمہ:- وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور روکا اللہ کے راستے سے، اللہ نے ضائع کر دیے ان کے اعمال ① اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کیے، اور ایمان لائے اس چیز پر جس کو نازل کیا گیا ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر، اور وہ حق ہے اُن کے رب کی طرف سے، اللہ نے دُور کر دی ہیں اُن سے اُن کی برائیاں اور درست کر دیا ہے اُن کا حال ② یہ اس وجہ سے کہ بیشک وہ لوگ

جنہوں نے کفر کیا، انہوں نے پیروی کی ہے باطل کی - اور
جو ایمان لائے ہیں، انہوں نے پیروی کی ہے حق کی اپنے
رب کی طرف سے ۔ اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تعالےٰ
لوگوں کے لیے اُن کے حالات (۳)

نام اور کوائف

اس سورۃ کا نام سورۃ محمدؐ ہے۔ سورۃ کی دوسری آیت میں لفظ محمدؐ مذکور ہے اور اسی سے سورۃ کا نام اخذ کیا گیا ہے ۔ اس سورۃ کا دوسرا نام قتال بھی آتا ہے، کیونکہ اس میں جنگ کا ذکر بھی ہے۔ قرآن کی بعض دوسری سورتیں بھی مختلف انبیائے کرامؑ کے اسمائے گرامی کے ساتھ منسوب ہیں جیسے سورۃ ہودؑ، یونسؑ، ابراہیمؑ، یوسفؑ اسی طرح یہ سورۃ حضور خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی سے منسوب ہے۔

یہ سورۃ مدنی دور میں نازل ہوئی اور اگلی مزید دو سورتیں یعنی سورۃ الفتح اور سورۃ الحجرات بھی مدنی سورتیں ہیں، آگے پھر سورۃ قٓ سے لے کر سورۃ الواقعہ تک مکی سورتیں ہیں اور اس کے بعد سورۃ حدید پھر مدنی سورۃ ہے، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ سورۃ سورۃ حدید کے بعد نازل ہوئی مگر ترتیب تلاوت کے لحاظ سے یہ پہلے آئی ہے ۔ اس سورۃ مبارکہ کی اڑتیس ۳۸ آیات اور چار رکوع ہیں، اور یہ سورۃ ۵۵۸ کلمات اور ۲۴۷۵ حروف پر مشتمل ہے۔

سابقہ سورۃ کے ساتھ ربط

گزشتہ سورۃ کی آخری آیت میں لفظ بَلٰغٌ آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ توحید، رسالت، معاد اور قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح پیغام ہے۔ یہ بنیادی عقائد بھی ہیں جو اللہ نے قرآن کی مختلف سورتوں اور خاص طور پر حوامیم سبعہ میں اچھی طرح واضح کر دیے ہیں۔ اگر اب بھی کوئی شخص ان بنیادی عقائد پر ایمان نہیں لاتا تو وہ فاسق شمار ہوگا ۔ اور فاسقوں کے متعلق اللہ نے سابقہ سورۃ میں واضح کر دیا ہے ۔ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ (آیت - ۳۵) کہ اللہ تعالیٰ انہیں ضرور ہلاک کریگا ۔ اب اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے فاسق کی علامات

بیان کرکے اس کا ربط اس سورۃ کے ساتھ قائم کر دیا ہے۔ چنانچہ اس سورۃ کی ابتدا ہی اس طرح ہوتی ہے کہ فاسق وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا یعنی دین کے بنیادی عقائد توحید، رسالت، معاد اور قرآن کی حقانیت کو تسلیم نہ کیا، اور انہوں نے دوسرے لوگوں کو بھی خدا تعالیٰ کے راستے سے روکنے کی کوشش کی۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا کہ یہ تباہ و برباد کیے جائیں گے۔

فاسق لوگوں کی ہلاکت دو صورتوں میں واقع ہوتی ہے۔ یا تو ان پر براہِ راست کوئی عذاب نازل کر دیا جاتا ہے۔ جیسے قوم عاد، قوم لوط، قوم ثمود اور قوم فرعون ہلاک ہوئیں۔ یا پھر جنگ کی صورت میں اہل ایمان کے ہاتھوں مجرموں کو شکست دی جاتی ہے جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں طالوت کے ہاتھوں قوم عمالقہ تباہ ہوئی اور جیسے حضور علیہ السلام کے ہاتھوں کفار و مشرکین کو اولین سزا بدر کے مقام پر دی گئی اور پھر آہستہ آہستہ پورے عرب سے ان کا خاتمہ کر دیا گیا۔

جہاد کا حکم

مدنی سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے دین کے مختلف احکام نازل فرمائے ہیں جن میں سورۃ البقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں پھر سورۃ الانعام میں اللہ نے توحید کے درس کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے شرک کا رد فرمایا ہے اور نظام اعتقاد کو پورے طریقے پر سمجھایا ہے۔ سورۃ الاعراف میں انبیاء کی تاریخ بیان کی گئی ہے کہ اللہ کے ہر نبی نے توحید کا درس دیا اور شرک اور کفر سے منع فرمایا۔ اب ان واضح احکام و فرامین کو جو لوگ تسلیم نہیں کرتے بلکہ الٹا اللہ کے راستے سے دوسرے لوگوں کو بھی روکنے کی کوشش کرتے ہیں ان کے ساتھ اللہ نے جہاد کرنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ جہاد کے تفصیلی احکام، سورۃ البقرہ، آل عمران، مائدہ، انفال، توبہ اور احزاب میں بیان کیے گئے ہیں، تاہم اس سورۃ مبارکہ میں اختصار کے ساتھ جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ فاسق لوگوں کے خلاف گویا اعلانِ جنگ ہے اور پھر اگلی سورۃ فتح میں اللہ تعالیٰ نے اس جنگ کے نتیجے میں فتح کی خوشخبری بھی سنا دی ہے۔

جہاد کوئی آسان کام نہیں ہے بلکہ اس میں جان اور مال دونوں چیزیں کھپانی

پڑتی ہیں۔ جہاد شروع کرنے سے پہلے اس کے لیے مکمل تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس تیاری کے سلسلے میں جماعت کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر جماعت کا امیر ہونا چاہیئے جس کی سرکردگی میں جہاد کا فریضہ انجام دیا جائے۔ پھر ایک مکمل تنظیم ہونی چاہیئے جس کے مطابق سامانِ ضرب و حرب فراہم کیا جائے اور دورانِ جنگ کمک کی تحصیل کو باقاعدہ بنایا جائے۔ اگلی سورۃ الفتح میں اللہ تعالیٰ نے ایسی ہی ایک منظم جماعت کا نمونہ بھی پیش کیا ہے۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ ... الآیۃ یہ صحابہ کرامؓ کی جماعت ہے جس کے امیر خود سرورِ کائنات ہیں۔ اللہ نے ان کے اوصاف و خصائل تفصیل کے ساتھ بیان فرمادیئے ہیں تاکہ آنے والی نسلیں بھی انہی کے نقشِ قدم پہ چل کر اسی کے نمونے کے مطابق جماعت تیار کریں تو اللہ تعالیٰ کی نصرت ہر قدم پہ ساتھ ہوگی۔

جہاد کی صورت میں مسلمانوں کی قربانیوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جب خاقانیوں نے خراسان پہ حملہ کیا تو دشمن کے تین لاکھ کے مقابلہ میں مسلمانوں کی کل پونجی دس ہزار مجاہدین تھے۔ اس کے باوجود اہلِ ایمان نے حوصلہ نہ ہارا بلکہ دشمن کے سامنے ڈٹ گئے حتیٰ کہ دس ہزار میں سے ایک فرد بھی زندہ نہ بچا، سب کے سب شہید ہوگئے۔ مگر ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ اس وقت تو مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا، مگر مسلمانوں نے جہاد کو جاری رکھا اور بالآخر فتح انہی کو حاصل ہوئی اور یہ تمام علاقے مسلمانوں کے قبضہ میں آگئے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جہاد کوئی معمولی کام نہیں ہے بلکہ اس میں بڑے کٹھن مرحلے بھی آتے ہیں جن سے گزرنا پڑتا ہے، تب جاکر کہیں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

راہِ حق میں رکاوٹ

الغرض! فرمایا کہ ہلاک ہونے والے وہ فاسق لوگ ہیں اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا جنہوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا۔ وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اور اللہ کے راستے سے روکا۔ کفر سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے توحید، رسالت، معاد، جزائے عمل اور قرآن کی حقانیت کو تسلیم نہ کیا بلکہ اللہ کے نبیوں کو تکالیف پہنچاتے تھے جہاں

تک اسلام کے راستے سے روکنے کا تعلق ہے، اس کا میدان بڑا وسیع ہے۔ ایک رکاوٹ تو ظاہری ہے کہ جہاں پر کفر کا غلبہ ہو وہاں اہلِ ایمان کو شعائرِ دین پر عمل کرنے سے روک دیا جائے۔ جیسے پوری تاریخ انبیاء میں اس قسم کے واقعات ملتے ہیں کہ انبیاء اور ان کے پیروکاروں کو خدا کی عبادت کرنے اور دین کی تبلیغ کرنے سے جبراً روک دیا گیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا ذکر سورۃ الشعراء میں موجود ہے۔ قَالُوا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ (آیت - ۱۱۶) اے نوح! اگر تم نے ہمارے معبودوں کو بُرا بھلا کہنا نہ چھوڑا تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی آپ کے باپ نے یہی کہا کہ اے ابراہیم! تو ہمیں ہمارے معبودوں سے دور کرنا چاہتا ہے۔ اگر تو ان حرکات سے باز نہ آیا لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا (مریم - ۴۶) تو میں تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دوں گا۔ لہٰذا میری نظروں سے دور ہو جا۔ جب حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو ہم جنسی سے منع کیا تو وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے اَخْرِجُوهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُونَ (الاعراف - ۸۲) کہ لوط علیہ السلام اور اس کے چند پیروکار بڑے پاکباز بنتے پھرتے ہیں، ان کو اپنی بستیوں سے نکال باہر کرو۔ شعیب علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو ناپ تول میں کمی بیشی کرنے سے منع فرمایا۔ نیز انہیں راستوں میں بیٹھ کر لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنے سے منع کیا تو قوم کے سرکردہ لوگ کہنے لگے کہ اے شعیبؑ! ہم تمہیں اور تمہارے پیروکاروں کو اپنی بستیوں سے نکال دیں گے۔ اَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا (الاعراف - ۸۸) اگر یہاں رہنا ہے تو اپنا دین چھوڑ کر ہمارے دین میں واپس آجاؤ۔ خود حضور علیہ السلام کی تبلیغ کے راستے میں ہر قسم کے روڑے اٹکائے گئے۔ آپ اور آپ کے ساتھیوں کو طرح طرح کی تکالیف پہنچائی گئیں۔ آپ کو لالچ دیا گیا کہ ہم آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیتے ہیں۔ مال و دولت آپ کے قدموں میں ڈھیر کر دیتے ہیں۔ خوبصورت ترین عورت نکاح میں دے دیتے ہیں۔ آپ ہمارے

بتوں کو بُرا بھلا کہنا چھوڑ دیں۔ مگر اللہ کے مقرب انبیاء دشمنان کے کسی رعب اور لالچ میں نہ آئے اور اپنا مشن جاری رکھا۔

راہِ حق سے روکنے کا دوسرا طریقہ سازشوں کا جال ہے جس کے ذریعے اہل ایمان کو اس دینِ حق سے بدظن کیا جاتا ہے اور سننے والوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کر کے اسلام قبول کرنے سے روک دیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ماضی قریب میں روسیوں کا کردار ہے جنہوں نے کسی بھی مذہبی تبلیغ پر سخت پابندی عائد کر رکھی تھی۔ اُن کے آئین کے مطابق مذہب کے خلاف تو پراپیگنڈا کیا جا سکتا ہے مگر مذہب کے حق میں کوئی زبانی یا عملی تحریک جائز نہیں اس آڑ میں کتنے ہی بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتارا جا چکا ہے۔

یہودی اور عیسائی مشنریاں دینِ حق سے روکنے کے سلسلے میں زیادہ پیش پیش ہیں۔ وہ کبھی سکولوں اور ہسپتالوں کی تعمیر کر کے اور ایڈ دے کر لوگوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ افریقہ اور جنوبی ایشیا کے پس ماندہ ممالک میں یہی حربہ استعمال کر کے لاکھوں لوگوں کو عیسائی بنایا جا چکا ہے کبھی زمانہ تھا کہ خود مسلمان دوسروں کے ساتھ ہمدردی کا صحیح سلوک کیا کرتے تھے مگر آج دیگر اقوام ہیں جو نام نہاد ہمدردی کے جال میں پھنسا کر لوگوں کو بے دین بنا رہی ہیں۔ ساتویں صدی میں مسلمانوں پر زوال آنا شروع ہوا اور پھر اُن کے قدم نہیں سنبھل سکے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ پچاس سے زیادہ مسلمان حکومتوں کے باوجود دنیا میں مسلمانوں کو کوئی حیثیت حاصل نہیں بلکہ یہ دوسروں کے دستِ نگر بنے ہوئے ہیں۔ مغربی ممالک سازش کے ذریعے مسلمانوں کو آپس میں ٹکراتے رہتے ہیں اور پھر اُن کی مدد کی آڑ میں بندر بانٹ شروع کر دیتے ہیں۔ آج مسلمانوں کی نہ کوئی اپنی سوچ ہے اور نہ کوئی نظریہ جس پر چل کر وہ ترقی کی منازل طے کر سکیں۔

ایک امریکی مصنف نے پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے پر مسلمانوں کے حالات پر مبنی ایک کتاب THE new WORLD OF ISLAM. (جدید دنیائے اسلام)

لکھی۔ یہ کتاب امیر شکیب ارسلانؒ (المتوفی ۱۹۴۶ء) کے پاس بھیجی گئی۔ اس کا عربی ترجمہ "الحاضر العالم الاسلامی" کے نام سے پروفیسر عجاج نویہض نے کیا۔ اس پر تین ضخیم جلدوں میں مقدمہ اور تقریظ امیر شکیبؒ نے لکھی جس میں مسلمانوں کے زوال کی وجوہات درج کیں آپ شام کے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، ترکی میں ہسپتالوں کے انچارج رہے خود بالفعل انگریزوں اور اٹلی والوں کے خلاف جنگ میں شریک رہے اور آخر میں بے کسی کے عالم میں شام میں وفات پائی۔ انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ عیسائی اور یہودی طاقتیں اسلام اور مسلمانوں کی اس قدر دشمن ہیں کہ وہ دین اسلام، پیغمبر اسلام اور قرآن پاک کے خلاف بے شمار کتابیں اور پمفلٹ شائع کر چکے ہیں۔ اُن کا مقصد یہ ہے کہ کسی طرح مسلمان دین حق سے بیزار ہو جائیں، قرآن کا دامن چھوڑ دیں اور پھر سے کفر و الحاد کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے پھریں۔

خود مسلمان بھی اپنے کردار سے دین حق کی تبلیغ میں رکاوٹ کا سبب بن رہے ہیں۔ ابھی وزیر آباد کا شرمناک واقعہ پیش آیا ہے کہ بدبختوں نے لڑکی کی لاش کو قبر سے نکال کر اس کے ساتھ بدفعلی کی۔ یہی واقعات غیر مسلموں کیلئے اسلام کیخلاف پراپیگنڈا کا جزو بن جاتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست ٹریننگ کے لیے سویڈن گئے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے وہاں پر بعض لوگوں کو اسلام کی دعوت دی تو ان کا جواب تھا کہ کیا اسلام قبول کر کے ہم چور اور ڈاکو بن جائیں کیونکہ ہم نے تو مسلمانوں کا یہی کردار دیکھا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر مسلمان خود غلط کام کرنے لگیں تو وہ بھی دین کے راستے میں رکاوٹ کا سبب بنتے ہیں۔

اعمال کا ضیاع

بہر حال فرمایا کہ جن لوگوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا اور اللہ کے رستے سے روکا اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ اللہ نے اُن کے اعمال کو ضائع کر دیا۔ اعمال کی قبولیت کا مدار ایمان پر ہے۔ اگر ایمان ہی نہیں ہے تو رفاہ عامہ کا اچھے سے اچھا کام بھی نامقبول ہے اور اللہ کے ہاں اس کا کوئی اجر نہیں ملے گا۔ سورۃ کہف کے آخری رکوع میں ہے کہ اے پیغمبر! آپ ان سے کہہ دیں

کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اعمال کے لحاظ سے نقصان زدہ لوگ کون ہیں۔ فرمایا اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا یہ وہ لوگ ہیں جن کی سعی دُنیا میں ہی برباد ہو گئی اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم اچھے کام کر رہے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ کافر بھی تو رفاہ عامہ کے کام کرتے رہتے ہیں سکول اور ہسپتال بنواتے ہیں، مالی امداد دیتے ہیں تو کیا ان کو بھی کچھ اجر نہیں ملے گا؟ بالکل نہیں۔ اللہ نے ان کو ان کی نیکی کا اجر دنیا ہی میں نیک نامی اور شہرت کی صورت میں دے دیا، اب آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں کیونکہ ایمان سے خالی ہے۔ تو فرمایا کہ جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا، اللہ نے اُن کے اعمال ضائع کر دیے۔

اہل ایمان کے لیے بشارت

اِس کے برخلاف وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جو لوگ ایمان کی دولت سے مالا مال ہوئے اور پھر انہوں نے اچھے اعمال انجام دیے اور بالخصوص وَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ اس چیز پر ایمان لائے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی ہے اور وہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے یعنی جو لوگ قرآن کریم پر بھی ایمان لائے اُسے برحق جانا اور اس پر عمل پیرا ہو گئے كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ اللہ تعالیٰ اُن کے ایمان اور نیکی کی بدولت اُن کی چھوٹی موٹی تقصیریں از خود معاف فرما دے گا۔ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ اور اُن کے حالات کو درست فرما دے گا۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ یہ اس وجہ سے کہ کافروں نے باطل کی پیروی کی۔ کفر اور شرک کی تمام اقسام باطل ہیں، لہٰذا ان کے اعمال ضائع ہو گئے وَاَنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ اور اہل ایمان نے اپنے پروردگار کی طرف سے آمدہ حق کا اتباع کیا تو اللہ نے اُن کی خطائیں معاف کر دیں اور اُن کے احوال کو بھی درست فرما دیا۔ یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کی وحدانیت، رسالت اور قیامت پر ایمان لائے۔ بعث بعد الموت اور جزائے عمل کو برحق جانا۔ اللہ کے فرشتوں اور اس کی کتابوں

پھر ایمان لائے تو اللہ نے اُن کو اچھے انجام کی خوشخبری دے دی۔ فرمایا کَذٰلِکَ یَضْرِبُ اللّٰہُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَھُمْ اسی طرح اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے اُن کے احوال بیان کرتا ہے تاکہ لوگ سمجھ جائیں۔ کفر، شرک اور معاصی کو ترک کر کے ایمان اور نیکی کو اختیار کر لیں اور ہمیشہ کے لیے کامیاب ہو جائیں۔

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰىٓ إِذَآ
أَثْخَنْتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا
فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ۚ ذٰلِكَ ؕ وَلَوْ يَشَآءُ
اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ
وَالَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ أَعْمَالَهُمْ ﴿۴﴾
سَيَهْدِيهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ﴿۵﴾ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ
عَرَّفَهَا لَهُمْ ﴿۶﴾

ترجمہ: اور جب تمہارا مقابلہ ہو اُن لوگوں سے جنہوں
نے کفر کیا تو پھر مارو گردنیں، یہاں تک کہ جب تم خوب
خونریزی کر چکو تو پھر مضبوط باندھ لو پھر یا تو احسان ہوگا
اس کے بعد اور یا فدیہ ہوگا۔ یہاں تک کہ لڑائی رکھ دے
اپنے ہتھیار۔ یہ بات (تم نے سن لی) اور اگر اللہ چاہے
تو بدلہ لے لے اُن سے (دوسرے طریقے سے) لیکن وہ
آزماتا ہے تم میں سے بعض کو بعض کے ساتھ۔ اور وہ
لوگ جو مارے گئے اللہ کے راستے میں۔ پس ہرگز نہیں
ضائع کرے گا اُن کے اعمال کو (۴) راہنمائی فرمائیگا اُن
کی اور درست کر دے گا اُن کے حال کو (۵) اور داخل
کریگا۔ اُن کو جنت میں جس کی اس نے اُن کو پہچان کرا دی ہے (۶)

ربط آیات

گذشتہ درس میں تمہید کے طور پر فرمایا کہ فاسق لوگ وہ ہیں جو کفر کا شیوہ اختیار کرتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور جو لوگ ایمان لانے کے بعد نیک اعمال انجام دیتے ہیں اور خاص طور پر قرآنِ حکیم کی حقانیت کو تسلیم کرتے ہیں جو کہ اُن کے رب کی طرف سے برحق ہے ۔ اللہ تعالیٰ اُن کی کوتاہیوں کو معاف فرمائے گا اور ان کے حالات کو درست کر دے گا ۔ فرمایا حقیقت یہ ہے کہ کافر لوگ باطل کی پیروی کرتے ہیں ۔ جب کہ اہل ایمان حق کے متبع ہیں ۔ حق و باطل کی کشمکش ہمیشہ سے چلی آرہی ہے ۔ اور قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا ۔

قانون جنگ اور اس کی حکمت

اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے جنگ کے قانون اور اس کی حکمت کا تذکرہ فرمایا ہے فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا جب کافروں کے ساتھ تمہاری مڈبھیڑ ہو جائے یعنی جنگ کی نوبت آجائے ۔ گذشتہ درس میں گذر چکا ہے کہ فاسق لوگ وہ ہیں جو کفر کرتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ اہل ایمان یہ صورت حال زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے لہٰذا انہیں لامحالہ کفار کے ساتھ جنگ کرنی پڑے گی ۔ جنگ اور خونریزی کوئی پسندیدہ چیز نہیں ہے ۔ اسی لیے حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے سَلِ اللّٰهَ الْعَافِيَةَ اللہ تعالیٰ سے عافیت اور سلامتی کا سوال کیا کرو ۔ اللہ تعالیٰ تمہارے جسم ، جان ، روح اور دین غرضیکہ ہر چیز کو اپنی سلامتی میں رکھے ۔ تاہم اگر حالات کے مطابق جنگ ناگزیر ہو جائے تو پھر فرمایا بزدلی نہ دکھاؤ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ تو پھر جان لو کہ جنت تمہاری تلواروں کے سائے میں ہے ۔ اگر جنت کی خواہش ہے تو پھر کفار پر ٹوٹ پڑو ، کفر کو ملیامیٹ کر دو اور اللہ کے راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کر دو ۔ سورۃ انفال میں حکم ہے وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (آیت - ۳۹) پھر اُن سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ و فساد باقی نہ رہے اور پوری کی پوری اطاعت خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جائے ۔ اسی سورۃ مبارکہ میں اللہ نے جنگ کا یہ قانون بھی بتلا دیا ہے کہ اسلام کے

ابتدائی دور میں ایک فرد اہلِ ایمان دس کافروں پر بھاری تھا۔ پھر جب اہلِ ایمان
کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ
(الانفال ۶۶) کہ اللہ نے تم سے تخفیف کر دی ہے اور وہ جانتا ہے کہ تم میں ضعف
آگیا ہے، لہٰذا اب ایک کے مقابلے میں دو کفار کے ساتھ لڑ جانے کا حکم دیا جاتا
ہے۔ مطلب یہ کہ اگر دشمن کی تعداد دوگنی بھی ہو تو اُن سے ٹکرا جاؤ۔ اور جو کوئی بزدلی
کا اظہار کرے گا تو اللہ نے اُس کے لیے جہنم کی وعید بھی سنا دی۔

بہر حال فرمایا کہ جب کافروں سے تمہاری ٹکر ہو جائے یعنی میدانِ جنگ میں
آمنا سامنا ہو جائے فَضَرْبَ الرِّقَابِ تو پھر اُن کی گردنوں کو مارو یعنی پوری
قوت کے ساتھ مقابلہ کرو۔ مدنی زندگی میں حضور علیہ السلام نے تقریباً پچاس جنگیں
لڑیں۔ ان میں سے انیس جنگوں میں آپ نے بنفسِ نفیس لشکر کی قیادت فرمائی۔
جب کہ باقی جنگوں میں بالفعل شریک نہیں ہوئے بلکہ لشکر روانہ کر دیے۔ ان انیس
غزوات میں سے آٹھ یا نو غزوات میں جنگ کی نوبت آئی جبکہ باقی مواقع پہ لشکر
میدانِ جنگ میں پہنچے مگر لڑائی نہیں ہوئی۔ حضور علیہ السلام جنگ کے موقع پر یہ دعا پڑھا
کرتے تھے اَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتٰبِ سَرِيْعَ الْحِسَابِ مُجْرِيَ السَّحَابِ
اَهْزِمْهُمْ وَزَلْزِلْهُمْ اے کتاب کے اتارنے والے، جلدی حساب لینے والے
اور بادلوں کو چلانے والے اللہ! ان کفار کو شکست دے اور انہیں درہم برہم کر دے
اس دعا میں نزولِ کتاب کا ذکر کر کے حضور علیہ السلام نے یہ بات سمجھائی ہے۔ کہ
اہلِ ایمان کسی دنیوی لالچ، ملک گیری، قتل و غارت گری یا مال و دولت کے حصول
کے لیے جنگ نہیں کرتے بلکہ اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں اللہ کی نازل کردہ
کتاب کا نظام قائم ہو جائے، فتنہ و فساد ختم ہو جائے اور اللہ کی زمین امن کا گہوارہ
بن جائے۔ جب مقصد یہ ہو تو پھر دشمن کا مقابلہ خوب ڈٹ کر کرنا چاہیے اور اُن
کی گردنوں کو مارنا چاہیے۔ سورۃ التوبۃ میں فرمایا فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ
اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ (آیت ۱۲) کفر کے ان بڑے بڑے سرداروں

سے خوب لڑو۔ کیونکہ اُن کی قسموں کا کچھ اعتبار نہیں۔ وہ نہ تو اپنے عہد کی پابندی
کرتے ہیں اور نہ قرابت داری کا خیال کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کو تہس نہس کر کے رکھ
دو۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ جارحانہ (OFFENSIVE) اور مدافعانہ
(DEFENSIVE) دونوں قسم کی جنگ روا ہے۔ حالات کے مطابق جس طرح
کی لڑائی ضروری ہو۔ اس سے گریز نہ کیا جائے کبھی حملہ آور دشمن سے اپنا دفاع کرنا پڑتا
ہے اور کبھی آگے بڑھ کر کفر اور دشمنانِ دین کی بیخ کنی کرنا ہوتی ہے۔ تاکہ ظلم و فتنے
کا خاتمہ ہو۔

جنگی قیدیوں کا قانون

فرمایا دشمن کے ساتھ خوب مقابلہ کرو حَتّٰی اِذَا اَثْخَنْتُمُوْهُمْ یہاں تک
کہ جب خوب خونریزی کر چکو فَشُدُّوا الْوَثَاقَ تو پھر دشمن کے بازوؤں کو مضبوطی
سے باندھ لو یعنی اُن کو جنگی قیدی بنا لو۔ پھر ان قیدیوں کے ساتھ سلوک کا قانون یہ
ہے فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ پھر یا تو ان پر احسان کر کے ان کو چھوڑ دو وَاِمَّا فِدَآءً
یا فدیہ لے کر رہا کر دو۔ اس مقام پر قیدیوں کے ساتھ سلوک کی یہ دو صورتیں بیان
کی گئی ہیں۔ اگر مسلمان سمجھتے ہیں کہ جنگی قیدی رہا ہونے کے بعد اسلام کی تعلیمات پر
غور و فکر کریں گے اور اُن کے اسلام قبول کر لینے کی اُمید پیدا ہوتی ہو تو پھر انہیں بغیر معاوضہ
کے چھوڑ دینے کی بھی اجازت ہے۔ یا اگر دشمنوں سے مال مقصود ہے جس سے مسلمانوں
کی مالی حالت بہتر ہو سکتی ہو۔ تو پھر قیدیوں سے فدیہ لے کر چھوڑنا بھی جائز ہے جیسا کہ
غزوہ بدر کے بعد ہوا حضور علیہ السلام نے کافر قیدیوں کو مال کے عوض رہا کیا تھا۔ آپ
نے یہ حکم بھی دیا کہ جو قیدی فدیہ دینے کی حیثیت نہیں رکھتے یعنی مالی لحاظ سے کمزور ہیں
اگر وہ پڑھنا لکھنا جانتے ہیں تو چار چار مسلمانوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں۔ اُن کی رہائی
کے لیے یہی معاوضہ کافی ہو گا

اس کے علاوہ چوتھی صورت یہ ہے کہ اگر دشمن سے شر و فساد کا خطرہ ہے
تو پھر ان قیدیوں کو قتل کر کے دشمن کی طاقت کو توڑنا بھی درست ہے۔ چنانچہ مشرکین
مکہ میں سے نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کو قتل کر دیا گیا تھا کیونکہ یہ بڑے ضدی

آدمی تھے اور ان کی طرف سے دوبارہ خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ پانچویں صورت یہ ہے کہ دونوں طرف کے قیدیوں کا آپس میں تبادلہ کر لیا جائے۔ حضور کے زمانہ میں ایسا بھی ہوا ہے۔ چھٹی صورت یہ بھی ہے کہ جن کفار کے ساتھ جنگ ہوئی ہے۔ وہ ذمی بن کر جزیہ دینا قبول کر لیں تو ایسی حالت میں بھی جنگی قیدیوں کو بلا معاوضہ رہا کیا جا سکتا ہے۔ ساتویں صورت یہ ہے کہ عورتوں اور بچوں قیدیوں کو لونڈی غلام بنا لیا جائے اور بالغ مردوں کو قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ غزوہ بنی قریظہ کے موقع پر ایسا ہی ہوا تھا۔ ان کے تمام بالغ مرد قتل کر دیے گئے تھے اور عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنا لیا گیا تھا۔ بہرحال حالات اور مصلحت کے مطابق کوئی بھی صورت اختیار کی جا سکتی ہے۔

فرمایا یا تو قیدیوں پر احسان کر کے انہیں بلا معاوضہ رہا کر دیا جائے یا پھر فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا یہاں تک کہ لڑائی اپنے اوزار رکھ دے یعنی جنگ بند ہو جائے۔ اس سے وہ خاص جنگ بھی مراد ہو سکتی ہے جو کہ واقعہ ہو رہی تھی اور پھر فتح و شکست یا کسی معاہدے کے تحت ختم ہو گئی۔ اور اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کفر کے خلاف جنگ کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔ یہاں تک کہ دنیا میں مکمل امن و امان ہو جائے اور کہیں بھی جنگ کی ضرورت باقی نہ رہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان مبارک ہے کہ تم میں سے ایک ایسی جماعت ضرور باقی رہے گی جو دشمن کا مقابلہ کرتی رہے گی حتیٰ کہ قرب قیامت میں وہ دجال کے ساتھ جنگ کریں گے۔ اس کے بعد دنیا سے جنگ مکمل طور پر ختم ہو جائے گی کیونکہ مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں صرف اہل ایمان ہی باقی رہ جائیں گے جب کہ دیگر سب ادیان ختم ہو جائیں گے۔ یہ امن و امان اور صلح کا زمانہ ہو گا حتیٰ کہ کسی دو آدمیوں کے درمیان بھی کوئی اختلاف، جھگڑا یا دشمنی نہیں ہو گی۔ غرضیکہ اللہ نے جنگ کی حکمت اور اس سے پیدا ہونے والے بعض معاملات کی تشریح فرما دی ہے۔

جنگ کے ذریعہ آزمائش

فرمایا ذٰلِكَ یہ احکام تو تم نے سن لیے۔ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کفار سے کسی دوسرے طریقے سے بھی انتقام لے لے۔

انتقام کی ایک صورت تو جنگ ہے جس کے ذریعے کفار کو نقصان پہنچایا جائے اُن کے آدمی قتل ہوں کچھ لونڈی غلام بنا لیے جائیں اور اُن سے مالِ غنیمت بھی حاصل ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر جنگ کے کسی قدرتی آفت کے ذریعے اُن کو ہلاک کر دے۔ قرآن پاک میں قومِ عاد اور ثمود کے واقعات موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں آسمانی اور زمینی آفت از قسم تند ہوا اور زلزلے کے ذریعے ہلاک کیا۔ قومِ لوط کی بستیاں الٹ دی گئیں اور اُن پر پتھروں کی بارش ہوئی اور فرعونیوں اور نوح علیہ السلام کی قوم کو پانی میں غرق کیا گیا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کسی بھی طریقے سے اپنے دشمنوں سے انتقام لینے پر قادر ہے۔

فرمایا جنگ کی ایک حکمت یہ بھی ہے وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ کہ اللہ تعالیٰ تم میں سے بعض کو بعض کے ذریعے آزماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آزمانا چاہتا ہے کہ تم دین کے لیے کتنی قربانی دے سکتے ہو۔ اللہ نے اسی آزمائش کے لیے جہاد کا قانون نافذ کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ (التوبۃ - ۱۱۱) کہ کبھی مسلمان کافروں کو تہ تیغ کرتے ہیں اور کبھی خود شہید ہو جاتے ہیں۔

شہداء کے فضائل

آگے اللہ نے اُس کی راہ میں شہید ہونے والوں کو خوشخبری سنائی ہے۔ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ جو اللہ کی راہ میں شہید ہو گئے فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ اللہ تعالیٰ اُن کے نیک اعمال کو ضائع نہیں کرے گا، اُن کو نہ صرف پورا پورا بدلہ ملے گا۔ بلکہ اُن کو بلند مراتب نصیب ہوں گے۔ فرمایا سَيَهْدِيْهِمْ اللہ تعالیٰ دنیا میں اُن کی راہنمائی فرمائے گا۔ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ اور اُن کے حال کو درست فرمائے گا۔ اور پھر آخرت میں اُن کے لیے یہ انعام ہو گا۔ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں داخل کرے گا عَرَّفَهَا لَهُمْ جس کی اُن کو پہچان کرا دی گئی ہے۔ پہچان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نبیوں نے انہیں جنت سے متعارف کرا دیا تھا۔ کہ یہ نیک اور ایمان والوں کو نصیب ہو گی اور اُس

ہیں سے یہ سہولتیں میسر ہوں گی۔ چنانچہ اہلِ جنت جب جنت میں پہنچیں گے تو وہ اسے آسانی سے پہچان لیں گے۔ پہچان کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنتی لوگ جنت میں اپنے ٹھکانے کو پہچان لیں گے اور وہاں پہ اپنا ٹھکانا تلاش کرنے کے لیے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی، بلکہ خود بخود وہاں پہنچ جائیں گے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان مبارک ہے کہ جب شہید کے خون کا پہلا قطرہ زمین پہ گرتا ہے تو اس کو معافی مل جاتی ہے اور اسے جنت میں اس کا ٹھکانا دکھا دیا جاتا ہے۔ شہید عذابِ قبر سے بھی مامون ہوتا ہے اور بعض روایات کے مطابق اس کی سفارش اس کے خاندان یا جماعت کے ستر آدمیوں کے حق میں مقبول ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا نکاح بہت سی حوروں کے ساتھ کرا دیتا ہے اور اُس کے سر پہ سونے کا تاج رکھنے کا ذکر بھی آتا ہے۔ یہ اس قدر قیمتی تاج ہوگا کہ اس کا ایک موتی دنیا اور مافیہا کی تمام چیزوں سے قیمتی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ شہداء کو اتنے بلند مراتب عطا کرے گا۔ اسی لیے کہا گیا ہے سَنَامُ الْاِسْلَامِ اَلْجِھَادُ یعنی اسلام کے کوہان کی بلندی جہاد ہے۔ جہاد کے ذریعے دنیا سے شر و فساد مٹتا ہے، امن و امان اور نظم قائم ہوتا ہے اور جہاد میں حصہ لینے والوں کو دنیا و آخرت میں عزت نصیب ہوتی ہے۔ اگر مجاہد زندہ رہے تو غازی بن جاتا ہے اور اُسے مالِ غنیمت اور دیگر فوائد حاصل ہوتے ہیں اور اگر شہید ہو جائے تو آخرت میں بلند درجات حاصل ہوتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ
اَقْدَامَكُمْ ۝٧ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ
اَعْمَالَهُمْ ۝٨ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ
اَعْمَالَهُمْ ۝٩ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ
كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۡ
وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ۝١٠ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝١١

ترجمہ :- اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے
تو وہ تمہاری مدد کرے گا، اور ثابت رکھے گا تمہارے
قدموں کو (٧) اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، پس
ہلاکت ہے ان کے لیے، اور ضائع کر دیا اُس نے
اُن کے اعمال کو (٨) یہ اس وجہ سے کہ بیشک انہوں
نے ناپسند کیا ہے اُس چیز کو جس کو اللہ نے اتارا ہے
پس ضائع کر دیے ہیں ان کے اعمال (٩) کیا یہ لوگ نہیں
چلے پھرے زمین میں، پس دیکھتے کہ کیسا ہوا انجام ان لوگوں
کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ نے ان پر ہلاکت
ڈالی، اور کافروں کے لیے ایسی ہی چیزیں ہیں (١٠) یہ اس
وجہ سے کہ بیشک اللہ تعالیٰ کارساز ہے اُن لوگوں

کا جو ایمان لائے اور بیشک کافروں کا کوئی آقا نہیں ہے (۱۱)

ربط آیات

ابتدائے سورۃ میں تمہید بیان کی گئی۔ اس کے بعد اللہ نے جنگ کے بعض قوانین بیان فرمائے کہ اگر دشمن سے مقابلہ ہو جائے تو پھر بزدلی کا مظاہرہ نہیں کرنا بلکہ جرأت اور بہادری سے لڑنا۔ پھر جب اچھی طرح خونریزی ہو جائے تو دشمن کے بچے کھچے سپاہیوں کو قیدی بنا لو حتیٰ کہ جنگ موقوف ہو جائے۔ جنگی قیدیوں کے متعلق فرمایا کہ یا تو ان پر احسان کر کے انہیں رہا کر دو یا ان سے فدیہ وصول کر کے چھوڑ دو۔ یہ جنگ کافروں کو سزا دینے کا ایک طریقہ ہے۔ تاہم اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو کسی دوسرے طریقے سے بھی کفار کا قلع قمع کرنے پر قادر ہے۔ مگر اس کا قانون یہ ہے۔ کہ وہ لوگوں کی جنگ کے ذریعے آزمائش کرنا چاہتا ہے۔

اسی لیے اس نے جہاد کا حکم دیا ہے جس میں تن، من، دھن ہر چیز لگانی پڑتی ہے۔ پھر جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو آخرت میں بلند مراتب عطا کرے گا اور ان جنت میں پہنچائے گا جس کی پہچان اللہ کے نبیوں نے ان کو دنیا میں ہی کرا دی تھی۔

دین اسلام کی مدد

آج کے درس کی پہلی آیت بھی جہاد ہی کے سلسلہ کی کڑی ہے اور اس کو ایک دوسرے پیرائے میں سمجھایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اے ایمان والو! اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ اگر تم اللہ تعالیٰ کی مدد کرو گے یعنی اس کے دین کی مدد کرو گے اور اس کی تقویت کا باعث بنو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرمائے گا۔ یہاں پر اللہ کی مدد کو مجازی معنوں میں لیا گیا ہے کیونکہ اللہ تو غنی اور صمد ہے اسے کسی کی مدد کی کیا ضرورت ہے؟ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے دین اور اس کے رسول کی مدد کرو گے، اس کو دوسروں تک پہنچاؤ گے، اس کے راستے کی رکاوٹوں کو دور کرو گے، اس پر خود عمل پیرا ہو گے اور دوسروں کو بھی ترغیب دو گے تو یہ اللہ تعالیٰ کی مدد کے مترادف ہوگا۔ فرمایا ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کی مدد تمہارے ساتھ شامل حال ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو تسلی دی ہے اور ان کی مدد کا وعدہ فرمایا ہے۔

دینِ اسلام عوام کا مذہب ہے۔ اہلِ ایمان کی جماعت اُسے دوسروں تک پہنچانے کی پابند ہے۔ یہ دین ایک طرف انسانوں کا تعلق اللہ تعالیٰ سے درست کرتا ہے اور دوسری طرف اس پر عمل پیرا ہونے میں خود لوگوں کا بھی فائدہ ہے۔ اسلام انسانیت کے طبعی تقاضوں اور اُس کی ضروریات کو پورا کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اللہ کے نبیوں نے اس دین کو ہمیشہ عوام و خواص کے سامنے پیش کیا۔ چنانچہ عوام یعنی کمزور اور نادار لوگ تو ابتداء میں ہی ایمان لے آئے مگر خواص یعنی امراء، دولت مند اور ملوک اُس کی مخالفت کرتے رہے۔ پھر آخر میں جاکر جب کوئی چارہ کار باقی نہ رہا تو پھر جاکر اسلام کو قبول کیا۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ اسلام غرباء سے شروع ہوا اور پھر آخر میں غرباء ہی میں باقی رہ جائے گا۔ بہرحال اللہ نے اسلام کی عوامی جماعت کو تسلی دی ہے۔

اسلام کی بنیاد علم اور عدل پر ہے، اس لیے یہ جہالت اور ظلم کو مٹاتا ہے امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ انبیاء کی بعثت کا ایک مقصد "رَفْعُ التَّظَالُمِ مِنْ بَيْنِ النَّاسِ" بھی ہے یعنی یہ لوگوں کے درمیان سے ظلم و زیادتی کو مٹاتا ہے۔ علاوہ ازیں دینِ اسلام لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا طریقہ سکھاتا ہے ایمان کی حقیقت سے روشناس کراتا ہے اور جزائے عمل کی منزل سے آگاہ کرتا ہے۔ اسلام ایک طرف اپنے پیروکاروں کو نیک انجام کی بشارت سناتا ہے اور دوسری طرف منکرین اور بدکرداروں کو اُن کے بُرے انجام سے ڈراتا ہے۔ اسلام کی اشاعت کے ضمن میں بڑی مشکلات پیش آتی ہیں، جان و مال کی قربانی دینا پڑتی ہے عام انسانیت کی بھلائی کی خاطر جب کوئی جماعت دین کا صحیح معنوں میں حق ادا کرتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ بھی اُس کی اعانت فرماتا ہے اور اُس کو غالب بناتا ہے۔

ثابت قدمی

فرمایا اللہ تعالیٰ کا ایک وعدہ تو یہ ہے کہ وہ اپنے دین کی مدد کرنے والوں کی خود مدد کرے گا اور دوسری بات یہ کہ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ کہ وہ تمہارے قدم مضبوط کرے گا۔ قدموں کی مضبوطی کا اطلاق دنیا اور آخرت دونوں مقامات پر ہوتا ہے

جب تک یہ لوگ زندہ رہیں گے ان کے قدم صراطِ مستقیم پر قائم رہیں گے، وہ دین کے تمام تقاضے پورے کریں گے اور کسی مشکل سے مشکل وقت پر بھی ان کے قدم ڈگمگائیں گے نہیں۔ پھر جب آخرت کی منزل آئے گی تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے قدم پل صراط پر مضبوط رکھے گا۔ بے دین لوگوں کے قدم پل صراط پر چلتے ہوئے پھسل جائیں گے، اور وہ جہنم میں جا گریں گے۔ جب کہ اہلِ ایمان اس مرحلے کو کامیابی کے ساتھ طے کر جائیں گے۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے مَنْ اَبْلَغَ حَاجَتَہٗ مَنْ لَّا یَسْتَطِیْعُ اِبْلَاغَہٗ جو شخص کسی غریب آدمی کی حاجت حاکم تک پہنچائے گا۔ جب کہ وہ غریب آدمی خود اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو، تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو قیامت والے دن ثابت قدم رکھے گا۔

مولانا عبید اللہ سندھی بڑے خدا پرست اور انقلابی انسان تھے وہ انگریزوں کے سخت دشمن تھے اور اسی جرم کی پاداش میں انہوں نے عمر عزیز کے پچیس سال جلاوطنی میں گزار دیے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین کی بڑی سمجھ عطا فرمائی تھی؟ بڑے ذہین اور قوتِ قدسیہ کے مالک تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ جب کوئی چیز خاص لوگوں کے پاس ہوتی ہے تو اس کا چنداں اثر نہیں ہوتا۔ اور جب وہی چیز عوام میں آجاتی ہے یعنی عام لوگ اس کی پیروی کرنے لگتے ہیں تو وہ چیز مؤثر اور پختہ ہوجاتی ہے۔ دنیا کے جس جس خطے میں اسلام کی شمع عوام الناس کے سینوں میں روشن ہوئی، وہاں اسلام کو پختگی حاصل ہوئی اور وہ صدیوں تک راسخ رہا اور اس کے کسی اصول اور حکم میں کمزوری نہ آئی۔ اس کے برخلاف آج ہم دیکھتے ہیں کہ عوام میں صحیح دین کی بجائے کفر، شرک، بدعات، رسومات اور لہو و لعب راسخ ہو چکے ہیں۔ اصل دین تو ایک فیصدی لوگوں کے پاس بھی نہیں ہے۔ اسی لیے آج دین راسخ نہیں ہے اور اس کے پیروکار تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔ دین کو پختگی اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب ہر فرد اس کے اصولوں کو تسلیم کر کے عملی طور پر ان پر کاربند ہو جائے۔ پھر اللہ کی مدد بھی آئے گی اور اہلِ ایمان دنیا پر بھی غالب آجائیں گے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے دین کے سچے پیروکاروں کو بشارت سنا دی کہ اگر تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ اور تمہیں ثابت قدمی حاصل ہو گی۔

کفار کے لیے ہلاکت

اہل ایمان کے تذکرہ کے بعد کفار کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اور جن لوگوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا یعنی اللہ کی توحید کو تسلیم نہ کیا، رسالت کا انکار کیا، قیامت اور جزائے عمل کو پہلے لوگوں کی قصے کہانیاں بتلایا، فرمایا فَتَعْسًا لَّهُمْ اُن کے لیے ہلاکت ہے وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ اور اللہ نے اُن کے اعمال کو برباد کر دیا ہے۔ ایسے لوگوں کے قدم نہ دنیا میں مضبوط ہو سکتے ہیں اور نہ آخرت میں۔ یہ سنبھل سکیں گے۔ اُن کا فلسفہ جہالت پر مبنی ہے اور وہ باطل پروگرام کو جاری کرتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ انہیں مغلوب کرے گا اور اُن کے قدم نہیں جم سکیں گے اگر انہوں نے کوئی نیک اعمال بھی انجام دیے ہیں۔ تو ایمان کی عدم موجودگی میں وہ بھی رائیگاں جائیں گے۔ فرمایا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ یہ اس وجہ سے کہ بیشک انہوں نے ناپسند کیا اس چیز کو جس کو اللہ نے نازل فرمایا ہے۔ اللہ نے تو انسانیت کی بہتری کے لیے قرآن کا پروگرام نازل کیا ہے جس سے انسان میں توحید اور ایمان راسخ ہوتا ہے اور اُس کا تعلق باللہ درست ہوتا ہے اسی پروگرام کے ذریعے کفر اور شرک کی بیخ کنی ہوتی ہے مگر انہوں نے اس پروگرام کو پسند نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ کہ اللہ نے اُن کے اعمال کو برباد کر دیا۔ اُن کا اچھے سے اچھا عمل بھی ایمان نہ ہونے کی وجہ سے ضائع ہو گیا۔

ہلاکت کے نشانات

ایسے لوگوں کو اللہ نے عقلی دلیل کے ذریعے سمجھایا ہے اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِی الْاَرْضِ کیا یہ لوگ زمین میں نہیں چلے پھرے فَيَنْظُرُوْا تاکہ یہ دیکھتے كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ کہ کیا ہوا انجام اُن لوگوں کا جو اِن سے پہلے گزرے ہیں۔ عرب اور مکہ کے مشرکین شام کے تجارتی سفر پر جاتے تھے تو قوم ثمود کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات پر سے گزرتے تھے، وہ قوم لوط کی بستیوں کو بھی دیکھتے تھے اور قوم نوح کا واقعہ بھی اُن کو یاد تھا۔ جب کہ ساری قوم فرعون

بحر احمر کی موجوں کی نذر ہو گئی تھی ۔ اللہ نے ان کو یاد دلایا ہے کہ مذکورہ قوموں نے بھی اپنے نبیوں کی رسالت کا انکار کیا، ان کے لائے ہوئے پروگرام کو ٹھکرا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا اور عبرت کے لیے ان کے مکانوں کے کھنڈرات ہی باقی رہ گئے ۔ اسی لیے فرمایا کہ کیا انہوں نے سابقہ اقوام کے انجام کو نہیں دیکھا؟ یہ لوگ خدا کے دین کو مٹانا چاہتے تھے اور دنیا میں شر و فساد برپا کرتے تھے لہٰذا اللہ نے انہیں ہلاک کر دیا۔ مطلب یہ کہ دَمَّرَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ اللہ تعالیٰ نے ان پر ہلاکت ڈال دی ۔ تدمیر کا لغوی معنی مٹا دینا، ملیامیٹ کر دینا ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نافرمان قوموں کے نہ صرف افراد کو ہلاکت میں ڈالا بلکہ ان کی عمارات اور ان کے تمدن کو بھی تباہ و برباد کر دیا فرمایا وَلِلْکٰفِرِیْنَ اَمْثَالُھَا یہ تو پرانی قوموں کا حال تھا آج کے کافروں کے لیے بھی ایسی ہی چیزیں ہیں یعنی اگر انہوں نے کفر و شرک اور ظلم و زیادتی کو ترک نہ کیا تو ان کا انجام بھی سابقہ نافرمان قوموں سے مختلف نہیں ہو گا ۔ آج کے کافر اور آئندہ زمانوں والے کافروں کو اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی آفت میں مبتلا کر دے گا ۔

مومنوں کا کارساز

فرمایا ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ مَوْلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا کارساز ہے ۔ جو لوگ صحیح پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور مفاد عامہ کی بات کرتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ ان کی کارسازی فرماتا ہے ۔ اس مقام پر مولیٰ کا معنی ہم نے کارساز کیا ہے ۔ یہ لفظ آقا، سرور، مالک، رفیق اور ساتھی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ فرمایا اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے کام بناتا ہے وَاَنَّ الْکٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰی لَھُمْ مگر کافروں کا کوئی کارساز یا آقا نہیں ہے ، وہ خدا تعالیٰ کی نصرت سے محروم رہتے ہیں ۔ غزوہ احد کے موقع پر حضرت ابو سفیانؓ نے فخریہ انداز میں کہا تھا ۔ لَنَا الْعُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ ہمارا عزیٰ ہے اور تمہارا کوئی عزیٰ نہیں ہے اس کے جواب میں حضور علیہ السلام نے کہلوایا اَللّٰہُ مَوْلٰنَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ ہمارا کارساز اور مالک تو اللہ ہے مگر تمہارا کوئی کارساز نہیں ہے یہ مومنوں کے لیے تسلی کا مضمون بھی ہو گیا کہ اگر تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور دشمن مغلوب ہو جائے گا ۔

درس چہارم ۴ — آیت ۱۲ تا ۱۵

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ
تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ
وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَهُمْ ﴿١٢﴾
وَكَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ هِيَ أَشَدُّ قُوَّةً مِنْ قَرْيَتِكَ الَّتِي
أَخْرَجَتْكَ أَهْلَكْنَاهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ﴿١٣﴾ أَفَمَنْ كَانَ
عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّهِ كَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ وَ
اتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ ﴿١٤﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۖ
فِيهَا أَنْهَارٌ مِنْ مَاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِنْ لَبَنٍ لَمْ
يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ وَأَنْهَارٌ مِنْ خَمْرٍ لَذَّةٍ لِلشَّارِبِينَ وَ
أَنْهَارٌ مِنْ عَسَلٍ مُصَفًّى ۖ وَلَهُمْ فِيهَا مِنْ كُلِّ
الثَّمَرَاتِ وَمَغْفِرَةٌ مِنْ رَبِّهِمْ ۖ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي
النَّارِ وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُمْ ﴿١٥﴾

ترجمہ :- بے شک اللہ تعالیٰ داخل کریگا اُن لوگوں کو جو
ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کیے بہشتوں میں کہ
بہتی ہیں جن کے نیچے نہریں ۔ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر
کیا ، وہ فائدہ اٹھاتے ہیں اور کھاتے ہیں جیساکہ مویشی کھاتے
ہیں ، اور دوزخ کی آگ اُن کا ٹھکانا ہے ﴿۱۲﴾ اور بہت سی

بستیوں کے رہنے والے جو زیادہ طاقتور تھے آپ کی بستی سے جس سے آپ کو نکالا ہے، ہم نے اُن کو ہلاک کر دیا، پس کوئی اُن کے لیے مددگار نہیں (۱۳) بھلا وہ شخص جو کھُلی دلیل پر ہے اپنے رب کی طرف سے، کیا برابر ہوگا اُس کے برابر ہوگا جس کے لیے مزین کیا گیا ہے اُس کا بُرا عمل، اور پیروی کی ایسے لوگوں نے اپنی خواہشات کی (۱۴) مثال جنت کی جس کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے، اُس میں نہریں ہیں پانی کی جو بدبودار نہیں ہوگا، اور نہریں ہیں دودھ کی جن کا مزا تبدیل نہیں ہوگا، اور نہریں ہیں شراب کی جو لطف آفریں ہوں گی پینے والوں کے لیے، اور نہریں ہیں شہد کی جو صاف کیا ہوا ہے۔ اور اُن کے لیے اُن بہشتوں میں ہر قسم کے پھل ہیں، اور معافی ہے اُن کے رب کی طرف سے۔ تو کیا یہ برابر ہوں گے اُس کے جو ہمیشہ رہنے والا ہوگا (دوزخ کی) آگ میں۔ اور پلایا جائے گا اُن کو کھولتا ہوا پانی، پس کاٹ ڈالے گا اُن کی آنتوں کو (۱۵)

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اُس کے دین کی مدد کرنے والوں کی مدد اور انہیں ثابت قدم رکھنے کا وعدہ فرمایا، نیز کافروں اور نافرمانوں کی برائی اور اُن کی ہلاکت کا تذکرہ فرمایا۔ اللہ نے اُن کے اعمال کو اس وجہ سے برباد کر دیا کروہ اللہ کی نازل کردہ واضح ہدایت کو ناپسند کرتے تھے، پھر اللہ نے اُن کی عبرت کیلئے فرمایا کہ کیا یہ لوگ اپنے اطراف میں پھیلے ہوئے نشانات کو نہیں دیکھتے کہ جن لوگوں نے اللہ کی نافرمانی کی اور اُس کے نبیوں کا مقابلہ کیا۔ وہ کس طرح ہلاک ہوئے۔ فرمایا یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کا کارساز ہے۔ جب کہ کافروں کا کوئی مولیٰ اور رفیق نہیں۔

مومنوں کے لیے جنت

اب اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان اور کفار کے انجام کا تقابل فرمایا

ہے جو لوگ قرآن کی ہدایت کو لے کر اٹھیں گے، اُس پر خود بھی عمل پیرا ہوں گے اور دوسروں تک بھی اس کو پہنچائیں گے۔ انہیں کون سے انعامات ملیں گے اور کفر کرنے والوں کا کیا انجام ہوگا۔ ارشاد ہوتا ہے اِنَّ اللّٰهَ يُدۡخِلُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ؕ بیشک اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ایسی بہشتوں میں داخل کرے گا۔ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں جان و مال کو کھپاتے ہیں اور قرآن پاک کے پروگرام کی سربلندی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں وہ اللہ کے محبوب بن جاتے ہیں۔ اُن میں سے جو لوگ زندہ بچ جاتے ہیں اللہ نے اُن کی مدد اور ثابت قدمی کا وعدہ فرمایا اور جو شہید ہو جاتے ہیں اُن کو آخرت میں ملنے والے انعامات کی ایک جھلک بھی پیش کر دی ہے۔ اِن انعامات کی کچھ تفصیل اگلی آیت میں بھی آ رہی ہے۔

کفار کا دنیا سے استفادہ

آیت کے اگلے حصے میں اللہ نے کفار کی ایک خصلت بیان کر کے اُن کے آخرت کے انجام کی بھی نشاندہی کر دی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا جن لوگوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا یعنی نبیوں کی بات کو تسلیم نہ کیا اور کفر اور شرک پر اڑے رہے، ظاہر ہے کہ انہوں نے اس دُنیا کو آخرت پر ترجیح دی اور اسی دُنیا کے لوازمات میں پھنسے رہے۔ فرمایا يَتَمَتَّعُوۡنَ وہ اسی دُنیا کے ساز و سامان سے مستفید ہوتے رہتے ہیں اور اپنی ابدی زندگی کی طرف کچھ خیال نہیں کرتے۔ اس دُنیا میں رہنے کا ایک مقصد اُن کے نزدیک کھانا پینا ہے۔ اہلِ ایمان تو اس قدر کھاتے پیتے ہیں جس کے ذریعے وہ اپنے جسم اور رُوح کے تعلق کو قائم رکھ سکیں اور اپنے پروردگار کے احکام بجا لا سکیں۔ برخلاف اس کے کفار زندہ ہی اس لیے ہیں۔ تاکہ وہ دُنیا کی نعمتیں کھا پی سکیں۔ چنانچہ اس مقام پر اللہ نے اسی بات کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ کافر لوگ دنیا کی نعمتوں سے مستفید ہوتے ہیں۔ وَيَاۡكُلُوۡنَ كَمَا تَاۡكُلُ الۡاَنۡعَامُ اور وہ دنیا میں رہ کر اسطرح کھاتے ہیں۔

جس طرح جانور اور مویشی کھاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جانوروں کے سامنے کوئی نظریہ حیات نہیں ہوتا، وہ پیدا ہوتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، جنسی خواہش پوری کرتے ہیں اور پھر ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف انسانوں کا ایک خاص نظریہ حیات ہے اُن کے لیے یہ دنیا دار العمل ہے جہاں رہ کر وہ اپنی ابدی زندگی کا سامان پیدا کرتے ہیں اور اس مقصد کے لیے احکام الٰہی پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی ہدایت کے لیے انبیاء کو مبعوث کرتا اور کتابیں نازل کرتا ہے۔ پھر جو لوگ اس ہدایت الٰہی سے مستفید ہو جاتے ہیں وہ ابدی حیات کو پا لیتے ہیں، ورنہ ناکام ہو جاتے ہیں۔

جانور کھاتے پیتے وقت کسی حلال و حرام کے پابند نہیں ہوتے، انہیں جو کچھ گھاس چارہ وغیرہ مل جاتا ہے، کھا لیتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ جس کھیت میں منہ مار رہے ہیں وہ اُن کے مالک کا ہے یا کسی دوسرے کا، اور وہ اُن کے لیے جائز ہے یا ناجائز اور وہ پاک ہے یا نجس۔ اسی طرح وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ ان کا مالک جو کچھ انہیں کھلا رہا ہے، اُس نے اُسے جائز طریقے سے حاصل کیا ہے یا چوری اور غصب کا ہے۔ انہیں تو کھانے سے غرض ہے اور وہ کھاتے چلے جاتے ہیں۔

اللہ نے کافروں کی بھی ایسی ہی مثال بیان فرمائی ہے کہ وہ کھاتے وقت نہ تو حلال و حرام کی تمیز کرتے ہیں، نہ پاک اور ناپاک کا خیال کرتے ہیں بلکہ حرص اور لالچ کے ساتھ کھاتے چلے جاتے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے۔ اَلْمُؤْمِنُ يَأْكُلُ فِي مِعًى وَاحِدٍ وَالْكَافِرُ يَأْكُلُ فِي سَبْعَةِ أَمْعَاءٍ

یعنی مومن صرف ایک آنت میں کھاتا ہے تاکہ وہ زندگی کے ضروری امور انجام دے سکے جب کہ کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے اس کا مقصد محض لذت اٹھانا اور پیٹ بھرنا ہوتا ہے۔ ترمذی شریف میں حضور علیہ السلام کا یہ فرمان بھی موجود ہے کہ آدم کے بیٹے کو چند لقمے ہی کافی ہیں۔ جن کے ذریعے اُس کی پشت قائم رہ سکے اور وہ خدا تعالیٰ کی عبادت و ریاضت اور دیگر ضروری کام کر سکے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایماندار آدمی جس پروگرام کو لے کر آگے بڑھتے ہیں وہ

انسانیت کی بہتری اور خدمت کا پروگرام ہے۔ یہ پروگرام حرص و لالچ اور غرور و تکبر
سے پاک ایک اعلیٰ و ارفع پروگرام ہے۔ اس کے برخلاف کافر لوگ حیوانی زندگی
کے پروگرام پر عمل پیرا ہیں۔ وہ دنیا میں رہ کر بہیمیت سے آگے نہیں بڑھتے۔ اُن
کا مقصدِ حیات صرف اکل و شرب، اچھا مکان، اچھا لباس، اچھی خوراک، اچھی
سواری، کھیل تماشہ اور شہوت رانی ہوتا ہے جسے یَتَمَتَّعُوْنَ کے لفظ سے
تعبیر کیا گیا ہے۔ اللہ نے ایسے لوگوں کا انجام بھی بیان فرما دیا وَالنَّارُ مَثْوًى
لَّهُمْ آخرت میں اُن کا ٹھکانا دوزخ کی آگ ہوگا جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے
لیے رہیں گے۔

اس وقت دنیا کی نام نہاد ترقی یافتہ اقوام صرف حیوانی زندگی کا پروگرام رکھتی
ہیں وہ لوگ زیادہ سے زیادہ اس دنیا کی زندگی کے آرام و آسائش کے لیے تمام پروگرام
مرتب کر رہے ہیں اور ساتھ ساتھ بڑے زور و شور سے یہ پراپیگنڈا بھی کر رہے ہیں کہ
ہم عوام کی خدمت پر کمربستہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے نزدیک عوام کی بھلائی
کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ نہ تو یہ جمہوریت کی کوئی خدمت کر رہے ہیں اور نہ مساوات
قائم کرنا چاہتے ہیں بلکہ یہ تو محض اپنا اُلّو سیدھا رکھنے کا ایک بہانہ ہے۔ علامہ
اقبال مرحوم نے ان کے کردار کی صحیح عکاسی کی تھی۔

پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

انسانیت کی خدمت

اس کے برخلاف انسانیت کی خدمت وہ ہے جو اہلِ ایمان کے حصے میں
آئی ہے۔ انسانیت کی صحیح خدمت وہی کر سکتا ہے جو قرآن کے پروگرام پر عمل پیرا ہے
ایسا شخص کسی چیز سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھائے گا، اس کا تعلق باللہ درست ہوگا،
اور وہ مخلوق کے حقوق ٹھیک ٹھیک ادا کرے گا۔ اسلام کے ابتدائی دور کے
مسلمان خدمتِ انسانی کی عملی تعبیر تھے۔ وہ کسی کے ساتھ ناجائز نہیں کرتے تھے کسی
کا حق غصب نہیں کرتے تھے بلکہ انسانی ہمدردی اور خیر خواہی ان کا مشن تھا۔ کیا آج
کے نام نہاد مساوات کے علمبردار بتا سکتے ہیں کہ ان کی زندگی میں وہ مساوات موجود ہے

جو حضرت ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ کے ادوار میں پائی جاتی تھی؟ ہرگز نہیں۔ یہ تو مساوات اور انسانی خدمت کے نام پہ اپنا پیٹ بھر رہے ہیں۔
ہمارے ملک کے حکمرانوں کا حال بھی ایسا ہی سا ہے۔ جو ملک اسلام کے نام پہ معرض وجود میں آیا تھا۔ وہاں اسلام ہی کے نام پہ دھوکہ دیا جا رہا ہے۔ یہ محض پراپیگنڈا ہے کہ اسلام کا نظام رائج کریں گے، ورنہ حقیقت میں کچھ بھی نہیں۔ ساری مسلکی حیوانی زندگی کی ترقی کے لیے ہو رہی ہیں۔ تمام پروگرام خوراک، سواری، آرام و آسائش کے لیے بنائے جا رہے ہیں۔ مگر خدا کے دین کی سربلندی کے لیے کچھ نہیں کیا جا رہا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو بھی جانوروں کی طرح کھانے پینے، آرام و آسائش اور شہوت رانی سے غرض ہے اور اس سے آگے انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔

کھانے پینے کے آداب

اس مقام پہ کھانے پینے کے اسلامی آداب کا بیان بے محل نہیں ہوگا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے کبھی میز پہ رکھ کر کھانا نہیں کھایا۔ اُس زمانے کے آداب خورد و نوش کے سلسلہ میں "خوان" کا ذکر آتا ہے۔ جو ایک چھوٹی ٹیبل ہوتی تھی۔ لوگ قالین پہ بیٹھ کر آگے خوان رکھ لیتے جس پہ کھانا چن دیا جاتا مگر حضور علیہ السلام نے کبھی خوان بھی استعمال نہیں کیا۔ پوچھنے والے نے پوچھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کیسے کھانا تناول فرماتے تھے تو حضرت انسؓ نے بیان کیا کہ آپ کے لیے چمڑے، اون یا کھجور کے پتوں کا دسترخوان ہوتا جس پہ کھانا رکھ دیا جاتا اور آپ بیٹھ کر تناول فرماتے۔ تاہم فقہائے کرام اور محدثین عظام فرماتے ہیں کہ اگر فرش پہ کھانے کا انتظام نہ ہو سکے تو عندالضرورت کرسی میز پہ بھی کھانا کھانا جائز ہے۔ مطلب یہ کہ کھانا ہمیشہ بیٹھ کر کھانا چاہیئے۔ خواہ زمین پہ بیٹھے یا کرسی یا پلنگ وغیرہ پہ۔ اس زمانے میں کھڑے ہو کر کھانے کی جو وبا پیدا ہو گئی ہے یہ تو بہرحال ناشائستہ بات ہے۔ نہ صرف کھڑے کھڑے بلکہ جانوروں کی طرف چل پھر کر کھانا تو مزید معیوب ہے۔ اگر جانور کسی کھونٹی پہ بندھا ہوا ہو تو بھی کم از کم ایک جگہ کھڑا ہو کر تو کھانے لگا۔ اور اگر وہ آزاد ہے تو مختلف کھیتوں میں منہ مارتا پھرے گا۔

آج کل کا فیشن اسی حد تک پہنچ گیا ہے کہ چل پھر کر مختلف پیالوں سے کھانا لیا۔ اور پھر چلتے پھرتے کھاتے ہیں۔ اس آیت میں مذکور جانوروں کی طرح کھانا آج کے طریقہ اکل و شرب پر بھی صادق آتا ہے۔

سابقہ اقوام کی ہلاکت

آگے اللہ نے عبرت کے طور پر فرمایا، دیکھو! وَكَأَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ أَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِي أَخْرَجَتْكَ اور بہت سی بستیوں والے تمہاری اس بستی سے زیادہ طاقتور تھے جہاں سے آپ کو نکالا گیا۔ أَهْلَكْنَاهُمْ ہم نے ان کو بھی ہلاک کر دیا فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ پس ان کا کوئی مددگار مدد کے لیے نہ آیا۔ نکالے جانے والی بستی سے مراد شہر مکہ ہے جہاں سے حضور علیہ السلام کو ہجرت کے لیے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا۔ آپ کو اپنے آبائی شہر سے حد درجہ محبت تھی اور اس کی ایک وجہ اللہ کا وہ گھر تھا جسے پوری دنیا میں سب سے زیادہ شرف حاصل ہے۔ آپ نے ہجرت پر روانہ ہوتے وقت شہر مکہ پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور فرمایا، اے مکہ! اگر میری یہ قوم مجھے نکلنے پر مجبور نہ کرتی تو میں تمہارا شہر چھوڑ کر کبھی نہ جاتا۔ مگر اللہ کے نبی نے قرآن کے پروگرام کی ترویج اور دین کی حفاظت کی خاطر اپنا وطن، جان، مال، عزیز و اقارب، مکان، زمین، اور باغات سب کچھ چھوڑ دیا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے یاد دلایا کہ ہم نے مشرکین مکہ سے کہیں زیادہ طاقتور اور صاحب جاہ و مال لوگوں کو ہلاک کر دیا، بھلا تم ان کے نقش قدم پر چل کر ہماری گرفت سے کیسے بچ سکتے ہو!

فرمایا، ذرا غور کرو! أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ بھلا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے کھلی ہدایت پر ہے، کیا وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے كَمَن زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ جس کا برا عمل اسے مزین کر کے دکھایا گیا ہو؟ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُم اور انہوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی ہو۔ اس مقام پر ایک ہدایت یافتہ شخص کا موازنہ ایسے شخص کے ساتھ کیا گیا ہے جو اپنے برے اعمال کو بھی اچھا سمجھتا ہے اور خواہشات نفسانی کا پیروکار ہے۔ ظاہر ہے کہ کافر، مشرک، اور بدعتی لوگ اپنے اعمال بد کو اچھا سمجھ کر ہی انجام دیتے ہیں اور بزعم شیطان

اُن کے ذہن میں ڈالتا ہے کہ تم بڑا اچھا کام کر رہے ہو، یہ بڑا کارِ ثواب ہے۔ اس کو ترک نہ کرنا۔ سورۃ الانعام میں ہے کہ جب ہم نے نافرمان قوموں پر عذاب بھیجا تو انہوں نے گریہ زاری نہ کی بلکہ اُن کے دل سخت ہو گئے وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (آیت ۴۳) اور شیطان نے اُن کے بُرے اعمال اُن کو خوشنما کر کے دکھائے کہ تم بالکل صحیح راستے پر جا رہے ہو۔ اور دوسری بات یہ کہ انہوں نے خواہشات کا اتباع کیا، تو خواہشات کی پیروی بھی در اصل شیطان کا اتباع ہے۔ اس بات کا تذکرہ اللہ نے مختلف مقامات پر کیا ہے۔ سورۃ البقرہ میں ہے کہ حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (آیت ۔ ۱۶۸) اور شیطان کے نقوشِ قدم کی پیروی نہ کرنا کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اللہ نے ہدایت اور گمراہی کا فرق بھی واضح کر دیا۔

جنت کی نعمتیں

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے جنت کی کچھ نعمتوں کا تذکرہ کر کے لوگوں کو اُن کے حصول کی ترغیب دلائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ اُس جنت کی مثال جس کا وعدہ متقیوں سے کیا جاتا ہے، ایسی ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ متقی وہ ہے جو حدودِ شرع کا احترام کرتا ہے، کفر، شرک اور معاصی سے بچتا ہے، اپنے آپ کو کمتر سمجھ کر دوسروں کی عزت کرتا ہے اور عدل و انصاف پر قائم ہے۔ ایسا شخص جنت کی نعمتوں کا مستحق ہو گا جس کے متعلق فرمایا فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ اُس جنت میں ایسے پانی کی نہریں ہوں گی جو کبھی خراب نہیں ہو گا۔ آسن در اصل ایسے پانی کو کہتے ہیں جو کسی جوہڑ یا تالاب میں دیر تک رکا رہے اور اُس میں تعفن پیدا ہو جائے۔ فرمایا جنت کا پانی ہر قسم کی بدبو، تعفن یا تغیر سے پاک ہو گا، بلکہ ہمیشہ تر و تازہ رہے گا۔ اور جنتی لوگ اسے استعمال میں لائیں گے پانی بلاشبہ نعمتِ ربِ جلیل ہے۔ یہ مدارِ حیات ہے اور انسان کے بنیادی حقوق میں داخل ہے، لہٰذا اس کی قدر کرنی چاہیے اور اسے کسی صورت میں ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

فرمایا جنت کی دوسری نعمت وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ایسے دودھ کی نہریں ہیں جس کا مزا کبھی تبدیل نہیں ہوگا۔ دنیا کا دودھ بھی نہایت لذیذ، خوش کن اور طاقتور ہے تو جنت کا دودھ تو اس سے ہزار گنا بہتر ہوگا۔ نیز دنیا کا دودھ کچھ عرصہ پڑا رہنے سے خراب ہو کر بدمزا ہو جاتا ہے مگر جنت کا دودھ کبھی خراب نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کا ذائقہ تبدیل ہوگا۔

اس کے علاوہ فرمایا وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ وہاں شراب کی نہریں ہوں گی جو پینے والوں کے لیے نہایت لذت آفریں ہوں گی۔ دنیا کی شراب تو بدذائقہ اور مدہوش کن ہوتی ہے مگر جنت کی شراب طہور ہر نقص سے پاک اور نہایت ہی دل خوش کن اور ذائقہ دار ہوگی جس کا دنیا میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ نہ اس سے نشہ آئے گا اور نہ ہی کوئی خرابی پیدا ہوگی۔ پھر فرمایا وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى بالکل صاف وشفاف شہد کی نہریں ہوں گی اور اس میں موم یا کوئی دوسری ثقیل چیز قطعاً نہیں ہوگی جو طبیعت پر ناگوار گزرے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ یہ تمام نہریں آبادی سے دور کہیں جنگلات میں نہیں ہوں گی جیسے دنیا میں ہوتی ہیں، بلکہ ہر نہر ہر جنتی کے دروازے کے سامنے سے گزر رہی ہوگی جس سے وہ ہمہ وقت مستفید ہو سکے گا۔ ان نہروں کے علاوہ فرمایا وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ اور جنت میں جنتیوں کے لیے ہر قسم کے پھل بھی مہیا ہوں گے۔ جب کسی جنتی کا کوئی پھل کھانے کو جی چاہے گا متعلقہ درخت کی ٹہنی خود بخود جھک کر جنتی کے پاس آجائے گی وہ پھل توڑ کر کھا سکے گا۔ اور پھر یہ بھی کہ یہ پھل اتنے بافراط ہوں گے کہ جونہی کوئی پھل توڑا جائے گا اس کی جگہ فوراً دوسرا پھل آجائے گا۔

فرمایا یہ تو اہل جنت کے خورد و نوش کی چیزوں کا ذکر تھا۔ ان سے بڑی نعمت وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ اللہ تعالیٰ کی جانب سے بخشش اور معافی ہوگی جو اہل جنت کو حاصل ہو جائے گی۔ دنیا میں رہ کر اچھے کام کرنے والے لوگوں سے بھی بعض اوقات کوتاہیاں ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو معاف کر دے گا اور کوئی مؤاخذہ

نہیں کرے گا۔

دوزخ کی تعذیبات

اہلِ جنت کے انعامات کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اہلِ دوزخ کی بعض تعذیبات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ کیا مذکورہ نعمتوں کا حقدار اہلِ جنت اس شخص کی طرح ہوگا کَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ جو ہمیشہ دوزخ کی آگ میں رہنے والا ہوگا۔ کفر، شرک اور معاصی کے مرتکبین، دنیا میں غلط پروگرام کو غلط پراپیگنڈا کے ذریعے چلانے والے ہمیشہ کے لیے دوزخ کا ایندھن بن جائیں گے اور جب اس آگ میں انہیں پیاس ستائے گی اور وہ پانی طلب کریں گے۔ وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا تو انہیں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا۔ جونہی کوئی دوزخی ایک گھونٹ پانی حلق سے نیچے اتارے گا۔ فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُمْ تو ان کی آنتیں کٹ کر نیچے گر پڑیں گی۔ اس کے بعد آنتیں پھر اپنی اصلی حالت پر آجائیں گی۔ پیاس کی شدت سے وہ پھر پانی پئیں گے، تو آنتیں دوبارہ کٹ جائیں گی، اور یہ عمل اسی طرح جاری رہے گا۔ اس قسم کے عذاب کا ذکر انسانی کھالوں کے متعلق بھی آتا ہے۔ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ (النساء - ۵۶) جونہی کسی دوزخی کے جسم کی کھال آگ سے جل جائے گی۔ اس کی جگہ دوسری کھال پہنا دی جائے گی تاکہ وہ اس مسلسل عذاب کا مزا چکھتا رہے

بہرحال اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کا یہ تقابل بھی کر دیا ہے تاکہ لوگ اس میں غور و فکر کر کے اپنے لیے صحیح مقام تلاش کر سکیں۔

حٰمٓ ۲۶ — محمد ۴۷

درس پنجم ۵ — آیت ۱۶ تا ۱۹

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ حَتّٰٓى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ
قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۫ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۶﴾ وَالَّذِيْنَ
اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ﴿۱۷﴾ فَهَلْ
يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَآءَ
اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ﴿۱۸﴾ فَاعْلَمْ
اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ
وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ ﴿۱۹﴾ ع ۲ ۸

ترجمہ:- اور ان میں سے بعض لوگ وہ ہیں جو
کان لگاتے ہیں آپ کی طرف یہاں تک کہ جب وہ
آپ کے پاس سے نکل کر باہر جاتے ہیں تو اہل علم
سے کہتے ہیں کہ اس شخص نے ابھی کیا کہا ؟ یہی
لوگ ہیں کہ اللہ نے مُہر کر دی ہے اُن کے دلوں پر
اور انہوں نے پیروی کی ہے اپنی خواہشات کی (۱۶) اور
وہ لوگ جنہوں نے ہدایت پائی ہے ، زیادہ کی ہے اُس
نے اُن کے لیے ہدایت اور دیا ہے اُن کو ان کا
تقویٰ (۱۷) پس یہ لوگ نہیں انتظار کرتے مگر
قیامت کا کہ آجائے اُن کے پاس اچانک ۔ پس بیشک

اُس کی نشانیاں تو آچکی ہیں ، پس کہاں ہو گا اُن کے لیے جب وہ آجائے گی اِن کے پاس ، اِن کا نصیحت پکڑنا (۱۸) پس آپ خوب جان لیں کہ بیشک اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے اور بخشش طلب کریں اپنی کوتاہیوں کے لیے ، اور ایمان دار مردوں اور ایماندار عورتوں کے لیے ، اللہ تعالیٰ جانتا ہے تمہارے پھرنے کی جگہ کو اور تمہارے ٹھکانے کو (۱۹)

ربطِ آیات

اللہ تعالیٰ نے پہلے جنگ کا قانون بیان فرمایا اور ساتھ ساتھ دین کی مدد کرنے والوں کی مدد اور اُن کو ثابت قدم رکھنے کا وعدہ کیا ، برخلاف اس کے جو لوگ دینِ حق کی مخالفت کرتے ہیں اور قرآنی پروگرام کے راستے میں روڑے اٹکاتے ہیں اُن کو تنبیہ فرمائی اور ساتھ ساتھ اُن کو ان کے بُرے انجام سے آگاہ کیا پھر اہلِ ایمان کو ملنے والی جنت کی نعمتوں کا تذکرہ فرمایا اور کافروں ، مشرکوں اور اہلِ کتاب کی تعذیبات کو بیان فرمایا ۔

منافقین کا گروہ

اب آج کے درس میں اللہ نے منافقین کے گروہ کا تذکرہ کیا ہے اور اُن کی مذمت بیان کی ہے ۔ یہ لوگ بھی اسلام ، دینِ حق اور قرآن حکیم کی مخالفت کرنے والے ہیں ۔ اللہ نے ان کے بُرے انجام سے بھی آگاہ فرمایا ہے ، نیز انہیں اللہ کی وحدانیت اور دینِ حق کو اختیار کرنے کی نصیحت کی ہے ارشاد ہوتا ہے وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّسۡتَمِعُ اِلَيۡكَ ان مخالفین میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کے سامنے کان رکھتے ہیں جب آپ کی مجلس میں آتے ہیں تو ایسا تاثر دیتے ہیں گویا کہ وہ آپ کی بات کو کان لگا کر سن رہے ہیں حَتّٰۤى اِذَا خَرَجُوۡا مِنۡ عِنۡدِكَ یہاں تک کہ جب وہ آپ کے ہاں سے اٹھ کر باہر جاتے ہیں قَالُوۡا لِلَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا تو علم والے لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ اس شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے ابھی کیا کہا ہے ؟ مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کی بات کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے

کیونکہ اُن کے نزدیک دینِ حق کی کوئی حیثیت نہیں، لہٰذا وہ استہزاء کے طور پر پوچھتے
ہیں کہ بھلا بتلاؤ تو اُس شخص نے کیا بات کی ہے؟ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے
واقعی کچھ نہ سمجھا ہو کیونکہ وہ آپ کی بات کو سُنی ان سُنی کر رہے تھے۔ مجلس میں بیٹھ کر
بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تو وہ اس کا مطلب کیا سمجھتے؟ اس قسم کے لوگ
منافقین کے گروہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اللہ نے اہلِ ایمان کو ان کے اندرونی رذائل
سے آگاہ کیا ہے۔

منافقین کا حال قرآنِ پاک کی بہت سی سورتوں میں بیان ہوا ہے، بلکہ منافقوں کے
نام سے ایک مستقل سورۃ بھی موجود ہے۔ اللہ نے جگہ جگہ ان کی مذمت بیان کی ہے
اور ان کے بُرے انجام کا تذکرہ کیا ہے۔ جو شخص نبی یا کسی دوسرے شخص کی مجلس میں
بیٹھتا ہے، جہاں وعظ و نصیحت کی بات ہو رہی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ بات
کو غور سے سنے۔ جو شخص کسی بات کو توجہ کے ساتھ سنتا ہی نہیں، اس سے اگلے مرحلے
کی کیا اُمید ہو سکتی ہے۔ امام سفیان ابن عیینہؒ جو امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد اور امام بخاریؒ
کے استاد ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ہر شخص پر اولین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ بات کو
سُنے۔ سب سے پہلے سُننا ضروری ہے جب سُن چکے تو اب دوسرے نمبر پر اُس پر غور و فکر
کرے اور اس کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اس کے بعد تیسرا درجہ یہ ہے کہ نصیحت
کی اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لے تاکہ بھول نہ پائے۔ اُس شخص کی چوتھی
ذمہ داری یہ ہے کہ جس بات کو سُن کر سمجھا ہے اور اُسے ذہن نشین کر لیا ہے
اُس پر عمل بھی کرے۔ اور پھر اُس کی پانچویں ذمہ داری یہ ہے کہ نیکی کی اُس بات
کو دوسروں تک پہنچائے۔

فرمایا جو لوگ یہ پانچ ذمہ داریاں پوری نہیں کرتے بلکہ پہلے درجے میں
کسی اچھی بات کو توجہ سے سنتے ہی نہیں اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى
قُلُوْبِهِمْ یہی وہ لوگ ہیں کہ جن کے دلوں پر اللہ نے مُہر کر دی ہے۔ اُن کے دل میں
کوئی اچھی بات داخل ہی نہیں ہوتی، لہٰذا نہ وہ اس میں غور کرتے ہیں، نہ ذہن نشین

کرتے ہیں اور نہ ہی اس پر عمل کرنے کی نوبت آتی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ ان سے نیکی کرنے کی توفیق ہی سلب کر لیتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ کہ وہ اپنی خواہشات کے پیچھے ہی چلتے رہتے ہیں۔ پھر وہ اصل دین کی بجائے کفر، شرک، بدعات اور رسم و رواج ہی کا اتباع کرتے رہتے ہیں۔

ہدایت یافتہ لوگ

اس کے برخلاف وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى جن لوگوں نے گمراہی کو چھوڑ کر ہدایت کا راستہ اختیار کیا ہے اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیتا ہے اور انہیں اس ہدایت پر چلتے ہوئے نیکی کی مزید توفیق نصیب ہوتی ہے اور اس طرح ان کے درجات بلند سے بلند تر ہو جاتے ہیں اور دوسری بات یہ وَاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کا تقویٰ عطا فرماتا ہے۔ وہ نہ صرف بڑے بڑے گناہوں سے بچتے ہیں بلکہ اس تقویٰ کی وجہ سے معمولی معمولی لغزشوں کے بھی قریب نہیں جاتے اور اس طرح وہ اس دنیا کی آلائشوں سے بچ کر نکل جاتے ہیں۔ انہیں کفر، شرک، بدعات، معاصی اور رسم و رواج سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی کے احکام پر پوری طرح عمل پیرا رہتے ہیں۔ یہ ہدایت یافتہ لوگ ہیں۔

قیامت کا انتظار

اب دین حق کو پوری طرح واضح ہو جانے کے بعد جو لوگ اس قرآنی پروگرام کا انکار کرتے ہیں ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً پس یہ لوگ نہیں انتظار کرتے مگر قیامت کا کہ آ جائے وہ ان کے پاس اچانک۔ مطلب یہ کہ حقیقت حال واضح ہو جانے کے بعد اس کو قبول نہ کرنا گویا قیامت کا انتظار کرنا ہے تاکہ ان کے درمیان حق و باطل کا حتمی فیصلہ ہو جائے۔

ساعت کے کئی معنے آتے ہیں مثلاً اس سے مراد انقلاب کی گھڑی بھی ہو سکتی ہے اور مکے والوں پر یہ گھڑی فتح مکہ کے دن آئی تھی، جب اللہ نے ان کو شکست دی اور وہ ذلیل و خوار ہو کر اللہ کے نبی کے سامنے حاضر ہوئے۔ ساعت سے

مغلوب ہونے کی گھڑی بھی ہو سکتی ہے اور یہ ذلت کا زمانہ ہوتا ہے جس سے مسلمان بھی دوچار ہو چکے ہیں۔ سن ۱۹۷۱ء میں مسلمانوں پر بھی مغلوبیت کی گھڑی آئی تھی جب پاکستان دولخت ہو گیا۔ اور مسلمانوں کے نوے ہزار افراد ہندوستان کی قید میں چلے گئے۔ ساعت سے موت کی گھڑی بھی مراد ہو سکتی ہے جب کسی انسان کی زندگی کا ہی خاتمہ ہو جاتا ہے اور الساعۃ سے قیامت کی گھڑی بھی مراد ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے ترجمہ میں لکھا ہے تو مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ہدایت کو نہ خود قبول کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو اس کے قریب آنے دیتے ہیں، اُن کا راستہ روکتے ہیں تو کیا وہ قیامت کے منتظر ہیں کہ وہ برپا ہو کر ان کے متعلق صحیح صحیح فیصلہ کر دے اور یہ دائمی سزا میں مبتلا ہو جائیں؟

علامات قیامت

اللہ نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ قیامت ہی کے منتظر ہیں فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا تو اُس کی نشانیاں تو آچکی ہیں۔ خود نزولِ قرآن کے زمانہ میں بعض نشاناتِ قیامت ظاہر ہو چکے تھے۔ شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں کہ قیامت کی سب سے بڑی نشانی حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد ہے۔ تمام سابقہ انبیاء آپ ہی کی راہ دیکھتے رہے۔ جب آپ تشریف لے آئے اور تخلیقِ کائنات کا مقصد حاصل ہو چکا تو اب قیامت ہی باقی ہے، اب نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ کوئی دوسری اُمت ہوگی۔ چونکہ اللہ کا آخری نبی آچکا لہٰذا اب قیامت کا آنا ہی باقی ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کا نزول بھی قیامت کی نشانی ہے۔ معجزہ شق القمر نشانی ہے جس کو اہلِ مکہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اللہ نے فرمایا اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (القمر۔۱) قیامت قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی اکٹھا کر کے فرمایا کَهَاتَيْنِ یعنی مجھے اور قیامت کو اس طرح بھیجا گیا ہے جس طرح یہ دو انگلیاں اکٹھی ہیں۔ ہاں درمیان والی انگلی انگشتِ شہادت سے ذرا آگے نکلی ہوئی ہے، اسی طرح میں قیامت سے ذرا آگے آگیا ہوں۔ میرے پیچھے

اب قیامت ہی آنے والی ہے، کوئی دوسرا پروگرام نہیں آئے گا۔

قیامت کی بعض نشانیاں تو آچکی ہیں اور بعض بڑی بڑی نشانیاں ظاہر ہونا باقی ہیں۔ مثلاً صحیح حدیث میں آتا ہے کہ قربِ قیامت میں دین کا علم اٹھا لیا جائے گا۔ اور دین کے علاوہ دوسری چیزوں کی تعلیم و تعلم عام ہوگی۔ جہالت زیادہ ہو جائے گی، شراب نوشی عام ہوگی اور حوادثات اور جنگوں کی وجہ سے مرد کم اور عورتیں زیادہ ہو جائیں گی حضور علیہ السلام کا یہ فرمان بھی اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰی غَیْرِ اَھْلِہٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَۃَ جب معاملات نااہلوں کے سپرد کر دیئے جائیں گے تو پھر قیامت ہی کا انتظار کرنا۔ باقی بڑی بڑی نشانیوں میں دجال اور یاجوج ماجوج کا خروج، مسیح علیہ السلام کا نزول اور سورج کا مغرب سے طلوع وغیرہ شامل ہیں۔

الغرض! فرمایا کہ تم قیامت کا انتظار کرتے ہو۔ اس کی بعض نشانیاں تو ظاہر ہو چکی ہیں فَاَنّٰی لَھُمْ اِذَا جَآءَتْھُمْ ذِکْرٰھُمْ پھر جب قیامت برپا ہی ہو گئی تو ان کو نصیحت پکڑنے کا کہاں موقع ملے گا؟ اس وقت تو توبہ کا دروازہ بھی بند ہو جائے گا اور پھر کوئی عمل بھی کام نہیں آئے گا۔

درسِ توحید

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ قرآنی پروگرام خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا پروگرام ہے۔ اس سے کسی کی ذات، خاندان یا گروہ کا مفاد وابستہ نہیں بلکہ یہ پروگرام تو انسانوں کا تعلق اللہ سے استوار کرنا چاہتا ہے، اسی لیے فرمایا فَاعْلَمْ خوب اچھی طرح جان لو اور اس حقیقت کو ذہن نشین کر لو اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے، معبودِ برحق صرف وہی ذات ہے اللہ کے علاوہ کوئی ہستی ایسی نہیں جو خالق، مالک، علیم کل، قادرِ مطلق، مشکل کشا اور حاجت روا ہو۔ فتح و شکست اور اقبال و ادبار سب اللہ کے اختیار میں ہے۔ جب یہ تمام صفات صرف اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں تو پھر اس کے سوا عبادت کے لائق بھی کوئی ذات نہیں ہو سکتی۔ یہی وحدانیت کا پروگرام ہے جس کی مخالفت بڑی بدقسمتی کی بات ہے۔ یہاں پر یہ امر وضاحت طلب

ہے کہ اگر فَاعْلَمْ کا خطاب پیغمبر علیہ السلام کی ذات کو ہے تو وحدانیت پر قائم رہنے کا حکم ہے۔ اور اگر یہ خطاب عام لوگوں کو ہے تو ان کو اس طرف متوجہ کرنا اور اس پروگرام کو اختیار کرنے کی تلقین مقصود ہے۔

استغفار کی تلقین

آگے ارشاد ہوتا ہے وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ اے پیغمبر! آپ اپنی کوتاہیوں کی بخشش طلب کریں وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ اور آپ مومن مردوں اور مومن عورتوں کیلئے بھی بخشش کا سوال کریں۔ اس مقام پر ذنب یعنی گناہ کو پیغمبر علیہ السلام کی ذات کی طرف منسوب کیا گیا ہے حالانکہ اللہ کے سارے نبی صغائر اور کبائر سے پاک ہوتے ہیں۔ مفسرین کرام اس اشکال کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہاں پر پیغمبر کی معمولی سی لغزش کو گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حالانکہ درحقیقت وہ گناہ نہیں ہوتا۔ چونکہ انبیائے کرام اللہ کی بارگاہ کے حاضر باش لوگ ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی معمولی سی کوتاہی پر بھی گرفت ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال سورۃ عبس والا واقعہ ہے۔ حضور علیہ السلام بعض سرداران قریش سے دین کے متعلق مخاطب تھے کہ اتنے میں ایک نابینا صحابی حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم رضی آگئے اور انہوں نے آپ کے خطاب میں مداخلت کر کے حضور علیہ السلام کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ حضور علیہ السلام نے اس کا بُرا منایا، کیونکہ آپ تبلیغ کا ایک اہم فریضہ انجام دے رہے تھے۔ اس معمولی سی لغزش پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ آگئی۔ عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ (آیت-١) آپ چیں بجبیں ہوئے اور نابینا صحابی کی طرف التفات نہ کیا۔ الغرض! یہاں پر گناہ کی معافی کا مطلب یہ ہے کہ آپ چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں پر بھی اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتے رہیں اور ساتھ ساتھ اپنی امت کے لوگوں کے لیے بھی بخشش کی دعا کریں۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ میں دن میں سو سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ میرے دل پر ایک تاریکی سی چھا جاتی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ تاریکی حضور علیہ السلام کے قلب اطہر کی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ ماحول کے اثرات کا نتیجہ ہوتا تھا۔ جس طرح آگ کے دھوئیں

کا انتشار دوسرے کے ماحول پر ہو جاتا ہے اسی طرح دوسرے لوگوں کی کوتاہیوں کا اثر نبی کی ذات پر بھی ہوتا ہے۔ جس کو تاریکی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا اسی لیے میں اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کرتا رہتا ہوں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں۔ ذنبک سے مراد حضور علیہ السلام کے ذاتی گناہ نہیں بلکہ امت کے گناہ مراد ہیں جس کے لیے بخشش طلب کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

بعض یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہاں پر مذکور ذنب سے گناہ مراد نہیں بلکہ امکانی ظلمات مراد ہیں۔ خدا تعالیٰ کے سوا ساری کائنات ممکن ہے۔ یہ عدم میں مخفی اور جب وجود میں آئی تو اس کی ظلمت محسوس ہونے لگی، لہذا اللہ کا نبی اس امکانی ظلمت سے بھی استغفار کرتا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ بایزید بسطامیؒ نے ساری رات لا الٰہ الا اللہ کا ورد کرنے کا ارادہ کیا مگر جب یہ ورد شروع کیا تو بچپن کی ایک کوتاہی یاد آ گئی۔ چنانچہ وہ کوتاہی یاد کر کے شرم محسوس کرنے لگے اور ذکر کرنے کی جرأت نہ کر سکے کہ اس کوتاہی کی موجودگی میں میں اللہ کو کیا منہ دکھاؤں اور کیسے اس کا ذکر کروں؛ بہرحال ان امکانی تاریکیوں یا بشری تقاضوں کی جو خامیاں ہوتی ہیں، اللہ کے نبی ان سے بھی استغفار کرتے رہتے ہیں۔ غرضیکہ ذنب اگر نبی علیہ السلام کی طرف منسوب کیا جائے تو اس سے مراد گناہ نہیں ہوگا۔

حضورؐ بحیثیت امیر جماعت

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ نبی معصوم ہوتا ہے۔ وہ ایک حیثیت سے تو خدا کا پیغمبر ہوتا ہے کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچاتا ہے اور دوسری حیثیت سے امیر جماعت بھی ہوتا ہے۔ یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ جماعت کی غلطیوں میں امیر بھی شامل ہوتا ہے اگرچہ وہ ذاتی طور پر ان میں شامل نہ ہو۔ اسی لیے بہت سے مواقع پر حضور علیہ السلام نے صحابہ کرامؓ کی غلطیوں پر ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے۔ مثلاً حضرت اسامہؓ نے ایک کلمہ گو کو قتل کر دیا تو آپ نے اس پر خفگی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ جب یہ شخص قیامت والے دن لا الٰہ الا اللہ لے کر اللہ کے حضور پیش ہوگا تو تم کیا جواب دو گے؟ اسی طرح حضرت خالد بن

ولیدؓ نے ایک شخص کو غلطی سے قتل کر دیا۔ جنگ ہو رہی تھی اور وہ شخص قتل کا مستحق نہیں تھا، مگر کسی طرح ہو گیا۔ اس پر حضور علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں التجا کی کہ پروردگار! میں اس غلطی سے بری ہوں جو خالدؓ سے سرزد ہوئی ہے۔ مطلب یہ کہ چونکہ جماعت کی غلطیوں میں کسی حد تک امیر جماعت بھی شریک ہوتا ہے اس وجہ سے بھی نبی کا استغفار کرنا ضروری ہے۔

استغفار سے شیطان کی ہلاکت

حدیث میں آتا ہے کہ شیطان نے کہا کہ لوگوں نے مجھے دو چیزوں سے ہلاک کر دیا ہے۔ پہلی چیز یہ ہے اَهْلَكُوْنِيْ بِلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ جب لوگ خلوص نیت کے ساتھ کلمہ طیبہ پڑھتے ہیں تو ابلیس تباہ و برباد ہوتا ہے کیونکہ اس پر عقیدۂ وحدانیت سخت ناگوار گزرتا ہے۔ شیطان کی ہلاکت کی دوسری وجہ استغفار ہے جب لوگ استغفار کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی کوتاہیاں معاف کر دیتا ہے اور یہی چیز شیطان کے لیے ہلاکت کا باعث بنتی ہے کہ وہ انسانوں کو ورغلانے میں ناکام رہا۔ الغرض! شیطان نے کہا کہ جب میں نے دیکھا کہ لوگ مجھے کلمہ طیبہ اور استغفار کی وجہ سے ہلاک کرتے ہیں تو میں نے انہیں خواہشات میں ڈال دیا اور کبھی بدعات کے راستے پر ڈال دیا۔ بدعت ایسی خطرناک بیماری ہے جس کو انسان نیکی سمجھ کر کرتے ہیں اور پھر عمر بھر انہیں اس سے توبہ کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔ موت کی تمام رسومات، قل، چالیسواں عرس وغیرہ سب بدعات میں شمار ہوتی ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے مَنْ مَاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ جو آدمی اس حالت میں مر گیا کہ وہ جانتا ہے یعنی دل میں یقین رکھتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، تو وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ کیونکہ یہ نجات کا کلمہ ہے۔ بہرحال فرمایا کہ آپ بخشش طلب کریں اپنی کوتاہیوں کی اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے بھی وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ اللہ تعالیٰ جانتا ہے تمہارے پلٹ کر جانے کی جگہ کو اور تمہارے ٹھکانے کو بھی۔ پلٹنے کی جگہ دنیا بھی ہو سکتی ہے اور برزخ بھی۔

اور ٹھکانے سے مراد آخری ٹھکانا جنت یا دوزخ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کسی شخص کا ٹھکانا کہاں ہوگا؟

وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ ۖ فَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ ۙ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۖ فَأَوْلَىٰ لَهُمْ ﴿٢٠﴾ طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ ۚ فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴿٢١﴾ فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِن تَوَلَّيْتُمْ أَن تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ﴿٢٢﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ ﴿٢٣﴾

ترجمہ :- اور کہتے ہیں ایمان والے کہ کیوں نہیں اُتاری گئی کوئی سورۃ ۔ پس جب اتاری جاتی ہے کوئی سورۃ محکم اور ذکر کیا جاتا ہے اُس میں جنگ کا ، دیکھے گا تو اُن لوگوں کو جن کے دلوں میں بیماری ہے کہ وہ دیکھتے ہیں آپ کی طرف ایسے شخص کی طرح جس پر غشی طاری ہو موت کی وجہ سے ، پس ہلاکت ہے اُن کے لیے ﴿٢٠﴾ حکم ماننا اور بات کرنا دستور کے مطابق (مناسب ہے) پس جب پختہ ہو جائے بات ، پس اگر یہ سچ کر دکھاتے اللہ تعالیٰ کے سامنے تو البتہ ان کے لیے بہتر ہوتا ﴿٢١﴾ پس شاید کہ اگر تم روگردانی کرو گے تو فساد

کرد گئے زمین میں اور قطع کرو گے اپنی قرابتوں کو (۲۲)
یہی لوگ ہیں کہ اللہ نے اُن پہ لعنت بھیجی ہے ، پس
اِن کو بہرہ کر دیا ہے اور اندھا بنا دیا ہے انکی آنکھوں
کو (۲۳)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے منافق لوگوں کی مذمت بیان فرمائی اور ساتھ تاکید فرمائی کہ اللہ کی وحدانیت پہ ثابت قدم رہو کہ دین کا مقصود یہی ہے اور جہاد اسی کے لیے فرض کیا گیا ہے عقیدے اور فکر کی حفاظت بہت بڑی چیز ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اللہ نے اس پروگرام کی مخالفت کرنے والوں کی ناکامی اور نامرادی کا ذکر بھی کیا۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ اپنی لغزشوں اور کوتاہیوں کی رب تعالیٰ سے بخشش طلب کرتے رہو، اللہ تعالیٰ ہر شخص کے پلٹنے کی جگہ اور اس کے ٹھکانے کو جانتا ہے۔

حکم جہاد پر منافقوں کی حالت

اب آج کے درس سے لے کر سورۃ کے آخر تک منافقین کی مذمت بیان کی گئی ہے اور اہل ایمان کے طریقے کو اللہ نے پسند فرمایا ہے۔ اللہ نے اُن کی تعریف کی ہے اور اُن کو بہتری کی خوشخبری سنائی ہے ارشاد ہوتا ہے وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا اور کہتے ہیں وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ کوئی ایسی سورۃ کیوں نہیں نازل کی جاتی جس میں جہاد کا حکم ہو۔ اہل ایمان کفار و مشرکین کی ایذا رسانیوں سے سخت پریشان تھے۔ اُن کی طرف سے ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا لہٰذا مسلمان چاہتے تھے کہ اُن کے ۔ اقتدار دو دو ہاتھ ہو جا ئیں تاکہ اُن کے اور ہمارے درمیان فیصلہ ہو جائے اور آئے دن کی پریشانی سے نجات مل جائے یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مکی دور میں مسلمانوں کے لیے حکم یہ تھا کُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ (النساء - ۷۷) اپنے ہاتھوں کو جنگ سے روکے رکھو۔ اور نماز ادا کرتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ اپنی تنظیم کو درست کرو اور اعمال کی اصلاح کرتے رہو۔ پھر جب مدنی دور آیا تو اہل ایمان کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسی سورۃ نازل فرمائے

جس میں جہاد کرنے کا حکم ہو۔ اس مقام پر اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایمان والوں کی خواہش تھی کہ اللہ تعالیٰ جہاد کا حکم دیں مگر ہوا کیا ؟ فَإِذَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ مُّحْكَمَةٌ جب کوئی مضبوط سورۃ نازل ہوئی وَذُكِرَ فِيهَا ٱلْقِتَالُ جس میں جہاد کرنے کا حکم آگیا جہاد کا حکم قرآن کی سورۃ بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ، انفال، توبہ، احزاب، محمد، فتح اور جمعہ وغیرہ میں موجود ہے۔ تو فرمایا جب جہاد کا حکم نازل ہوا ۔ رَأَيْتَ ٱلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ تو آپ دیکھتے ہیں اُن لوگوں کو جن کے دلوں میں بیماری یعنی منافقت ہے۔ اُن لوگوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ ٱلْمَغْشِىِّ عَلَيْهِ مِنَ ٱلْمَوْتِ وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھتے ہیں جیسے کسی شخص پر موت کی وجہ سے غشی طاری ہو جائے۔ اس پر گھبراہٹ طاری ہو جس کی وجہ سے اس کی شکل ہی تبدیل ہو جائے مطلب یہ کہ جنگ کا نام سن کر اُن پر غشی کے دورے پڑنے لگتے ہیں کہ یہ کیا مصیبت آگئی۔

ایسے لوگوں یعنی منافقین کے متعلق فرمایا فَأَوْلَىٰ لَهُمْ کہ اُن کے لیے ہلاکت ہے۔ دراصل اولیٰ کا لفظ ولی سے مشتق ہے جس کا معنی قریب ہوتا ہے اور مفہوم یہ بنتا ہے کہ خدا کرے کہ اُن کی ہلاکت کا چیز ان کے قریب ہو یہ لوگ اپنے آپ کو جنگ سے بچانا چاہتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں برابر کے شریک ہونا چاہتے ہیں لہٰذا ان کے لیے ہلاکت ہی موزوں ہے۔

فرمایا حیلے بہانے سے جنگ سے گریز کرنے کی بجائے تمہارے حق میں طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور دستور کے مطابق اچھی بات کرنا ہی بہتر ہے نہ تو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرنی چاہیئے اور نہ ہی زبان سے کوئی غیر معیاری بات نکالنی چاہیئے۔ زبان سے بلند بانگ دعویٰ کرنا اور وقت آنے پر بزدلی کا مظاہرہ کرنا ہرگز پسندیدہ فعل نہیں جو کوئی ایسا کرے گا، وہ لازماً ہلاکت کے گڑھے میں گرے گا نیز فرمایا فَإِذَا عَزَمَ ٱلْأَمْرُ جب کسی معاملہ میں پختہ فیصلہ ہو جائے۔ اللہ کا حکم آجائے اور باہمی مشورہ سے جنگ کے لیے نکلنا

اطاعت اور معروف بات

طے پا جائے تو پھر اس سے پیچھے ہٹنا اللہ اور اس کے رسول کو دھوکہ دینے والی بات ہے جسے کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ جب کسی معاملہ میں واضح طور پر وحی نہیں آتی تھی تو حضور علیہ السلام ایسے معاملہ میں صحابہؓ سے مشورہ طلب کرتے تھے پھر باہمی مشاورت میں جو بھی طے پاتا اس کے مطابق عمل کر گزرتے۔ اس کی مثال غزوہ احد کا واقعہ ہے۔ جب کفار نے مدینہ پر چڑھائی کی تو حضور علیہ السلام نے صحابہؓ کو جمع کر کے مشورہ کیا کہ شہر میں رہ کر دشمن سے دفاع کرنا چاہیئے یا شہر سے باہر کھلے میدان میں مقابلہ ہو۔ چنانچہ طے پایا کہ باہر نکل کر مقابلہ کرنا ہو گا۔ اہلِ ایمان تو اس فیصلے پر عملدرآمد کے لیے جبل احد کی طرف چل دیئے مگر منافقوں نے یہاں بھی بزدلی دکھائی اور راستے سے واپس آ گئے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور سچی بات ہونی چاہیئے۔ حیلے بہانے سے اللہ کے رسول کے فیصلے سے انحراف ہلاکت کی علامت ہے۔ فرمایا فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ اگر یہ لوگ اللہ کے سامنے اپنی اطاعت گزاری کو سچی ثابت کریں اور جہاد سے منہ نہ موڑیں تو اسی میں ان کی بہتری ہے۔ اللہ کے نبی کے حکم کے مطابق صلح و جنگ کے ہر معاملہ میں بخوشی شریک ہوں اور دل میں کسی قسم کی کدورت نہ آنے دیں جہاں جانی اور مالی قربانی کی ضرورت ہو، بلا توقف پیش کر دیں اور اپنی بات کو سچ کر دکھائیں تو بالآخر یہی چیز ان کے لیے بہتر ہے۔

جہاد سے گریز

آگے اللہ تعالیٰ نے ایک اور بات ارشاد فرمائی ہے فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ پس شاید اگر تم روگردانی کرو گے یعنی جہاد سے گریز کرو گے اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ تو گویا تم زمین میں فساد برپا کرنے کے مرتکب ہو گے وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ اور قطع رحمی بھی کرو گے۔ اگر بوقت ضرورت میدان جنگ میں نہ نکلے تو اس کا یہی مطلب لیا جائے گا کہ یہ زمین میں اصلاح کی بجائے فساد چاہتے ہیں جہاد تو ہوتا ہی اس لیے ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اور زمین امن و امان کا گہوارہ بن جائے اور اس کے برخلاف اگر تم اس نیک مقصد میں شریک نہیں ہوتے تو ظاہر ہے کہ تم

فساد برپا کرنا چاہتے ہو۔ جہاد میں شریک ہونے کی بجائے پیچھے رہ جانے والے عام طور پر ریشہ دوانیاں کرتے ہیں، غلط پراپیگنڈا کے ذریعے مسلمانوں میں بزدلی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ طرح طرح کی افواہیں اڑاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قوانین کی مخالفت کرتے ہیں، لہذا فرمایا کہ تم زمین میں فساد برپا کرنا چاہتے ہو۔ اور قطع رحمی کرنا چاہتے ہو۔ جو شخص قانونِ الٰہی کی پابندی کرتا ہے اُس سے مخلوقِ خدا کی بہتری کی بھی توقع کی جا سکتی ہے اور جو شخص قانونِ خداوندی کو توڑ ڈالتا ہے اس سے مخلوق کی بہتری کی کیا اُمید ہو سکتی ہے، وہ تو فساد فی الارض کا مرتکب ہوتا ہے

حکمران کی ذمہ داری

تولّی کا ایک معنیٰ تو ہم نے روگردانی کرنا کیا ہے اور اس کا دوسرا معنیٰ والی بننا بھی آتا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا شیخ الہندؒ اس جملے کا معنیٰ یہ کرتے ہیں کہ شاید تم والی بن جاؤ یعنی تمہیں اقتدار اور حکومت مل جائے معاملات تمہارے ہاتھ میں آجائیں تو شاید تم زمین میں فساد اور قطع رحمی کرنے لگو۔ مقصد یہ ہے کہ جو لوگ خدا تعالیٰ کے قانون کی پابندی نہیں کرتے اگر ان کے ہاتھ میں عنانِ حکومت آجائے تو وہ عدل و انصاف کی بجائے ظلم و زیادتی ہی کریں گے، حقوق العباد کو تلف کریں گے کفر، شرک اور بدعات کو رائج کریں گے اور اس طرح فساد فی الارض کے مرتکب ہوں گے۔ ایسے لوگوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ چند روزہ اقتدار سے غلط فائدہ نہ اٹھانا بلکہ ان عارضی اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ادا کرنا، غریب پروری کرنا، مظلوم کی دادرسی اور ظالم کو سخت سزا دینا۔ اور یہی وہ پروگرام ہے جو قرآن پیش کرتا ہے۔ یہ انبیاء کی تعلیم کا پروگرام ہے اور اسی پروگرام پر عمل درآمد کے لیے جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ جہاد کسی شخص کی ذاتی، قومی یا گروہی مفاد کے لیے نہیں بلکہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے دین کی سربلندی کے لیے کیا جاتا ہے۔ اسی لیے حضور علیہ السلام جنگ کے موقع پر یہ دعا کیا کرتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ مُنْزِلَ الْکِتٰبِ سَرِیْعَ الْحِسَابِ مُجْرِیَ السَّحَابِ ھَازِمَ الْاَحْزَابِ اھْزِمْھُمْ وَزَلْزِلْھُمْ اے کتاب کو نازل کرنے والے، جلد حساب لینے والے، اور بادلوں کو

چلانے والے اللہ! دشمنوں کو شکست دے اور ان کو درہم برہم کر دے۔ مطلب یہ ہے کہ اس جہاد کا مقصد اس کتاب کے پروگرام کو نافذ کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے اور اس کے ذریعے دنیا سے فتنہ و فساد کو مٹانا مقصود ہے۔

بہرے اور گونگے لوگ

فرمایا جو لوگ فساد فی الارض اور قطع رحمی کے مرتکب ہوتے ہیں أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت برستی ہے۔ لعنت کا معنی رحمت سے دوری ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسے لوگ اللہ کی رحمت کے قریب بھی نہیں بھٹک سکتے بلکہ اُن پر ہمیشہ پھٹکار ہی پڑتی رہتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فَأَصَمَّهُمْ اللہ تعالیٰ اُن کو بہرہ کر دیتا ہے جس کی وجہ سے اُن کے کان حق بات کو سُننے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ نیز وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ اُن کی آنکھوں کو اندھا کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ صحیح چیز کو دیکھنے کی طاقت ہی نہیں پاتے۔ اُن پر خواہشات کی تاریکی چھا جاتی ہے، خود غرضی غالب آجاتی ہے، وہ مفادِ عامہ کی طرف متوجہ ہی نہیں ہو پاتے۔ غرضیکہ انہیں اپنے مفاد کے علاوہ نہ کچھ سنائی دیتا ہے۔ اور نہ ہی کوئی چیز نظر آتی ہے۔ وہ بہرے اور اندھے ہو جاتے ہیں اور ان پر ہمیشہ لعنت پڑتی رہتی ہے۔ غرضیکہ اللہ نے آگاہ فرمایا ہے کہ اگر کسی وقت تم اقتدار میں آجاؤ حکومت مل جائے تو عدل و انصاف کو قائم کرنا، ظلم و زیادتی کا قلع قمع کرنا، کمزور مخلوق کی خدمت کرنا تاکہ خدا تعالیٰ کی خوشنودی کے ساتھ ساتھ مخلوق کی دعائیں بھی تمہارے شامل حال ہو جائیں۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿٢٤﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ۭ وَاَمْلٰى لَهُمْ ﴿٢٥﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ﴿٢٦﴾ فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ﴿٢٧﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿٢٨﴾ ع ۳

ترجمہ:- کیا نہیں غور کرتے یہ لوگ قرآن میں؟ کیا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں؟ ﴿۲۴﴾ بیشک وہ لوگ جو پھر گئے اپنی پیٹھوں پر بعد اس کے کہ واضح ہو چکی ہے اُن کے لیے ہدایت، شیطان نے اُن کو فریب دیا ہے اور دیر کے وعدے کیے ہیں ﴿۲۵﴾ یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے کہا اُن لوگوں سے جنھوں نے ناپسند کیا اُس چیز کو جس کو اللہ نے اتارا ہے، ہم تمہاری بات مانیں گے بعض معاملات میں، اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اُن کے پوشیدہ مشوروں کو ﴿۲۶﴾ پس کیسے ہوگا جب کہ وفات دیں گے اُن کو فرشتے، ماریں گے ان

کے چہروں اور ان کی پشتوں پر ﴿۲۷﴾ یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے پیروی کی اس چیز کی جو اللہ کو ناراض کرتی ہے اور ناپسند کیا انہوں نے اللہ کی خوشنودی کو ، پس اللہ نے ان کے اعمال کو ضائع کر دیا ﴿۲۸﴾

ربط آیات

یہ آیات بھی سابقہ آیات کے ساتھ منافقین کی مذمت کے سلسلہ میں مربوط ہیں۔ گذشتہ درس میں گزر چکا ہے کہ جب کوئی محکم سورۃ اتاری جاتی جس میں جہاد کا ذکر ہوتا تو منافق لوگ حضور علیہ السلام کی طرف اس طرح دیکھتے جیسے کوئی آدمی موت کی غشی میں مبتلا ہو۔ مطلب یہ کہ منافقین جہاد کے نام سے سخت خوفزدہ ہو جاتے اور اس سے بچنے کی کوشش کرتے۔ پھر فرمایا اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور دستور کے مطابق اچھی بات کرنی چاہیئے۔ جب کوئی معاملہ طے پا جائے تو اس پر عمل درآمد کر کے اس کو سچ کر دکھانا چاہیئے۔ جو لوگ اس سے روگردانی کریں گے ، وہ بدنظمی کا سبب بنیں گے اور فساد فی الارض کے مرتکب ہوں گے۔ فرمایا یہی لوگ قطع رحمی کرنے والے اور خدا کی لعنت کے مستحق ہیں۔ فرمایا اگر ایسے فسادی لوگوں کو اقتدار حاصل ہو جائے تو یہ لوگ عدل و انصاف اور امن و امان کے قیام کی بجائے فساد فی الارض اور قطع رحمی کے مرتکب ہوں گے ۔ ایسے لوگ شرائع الٰہیہ کو ذاتی اغراض پر قربان کر دیں گے اور تعیش کی زندگی کو ہی اپنا منتہائے مقصود بنا لیں گے۔

صاحب اولاد لونڈی کا مسئلہ

حضرت عمرؓ ایک موقع پر خطبہ دے رہے تھے تو آپ نے فرمایا کہ لوگو! میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے اندر قطع رحمی پھیل چکی ہے ۔ لوگوں نے عرض کیا ، حضرت! ہم تو اپنے آپ میں ایسی کوئی چیز نہیں پاتے ۔ آپ نے فرمایا کیا تم ان لونڈیوں کو بھی فروخت نہیں کر دیتے جن سے ان کے مالکوں کی اولاد ہوتی ہے ۔ یہی تو قطع رحمی ہے پھر آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ شاید کہ اگر تمہیں اقتدار حاصل ہو جائے تو تم

زمین میں فساد اور قطع رحمی کرنے لگو۔ لوگوں کو بات سمجھ میں آگئی اور انہوں نے صاحبِ اولاد لونڈیوں کو فروخت کرنا چھوڑ دیا۔

اللہ اور اس کے رسول نے لونڈیوں کو جو رعایات دی ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر کوئی لونڈی اپنے مالک کی اولاد جنتی ہے تو اُس کی وجہ سے لونڈی کو فروخت کرنے کا حق باقی نہیں رہتا۔ اُس لونڈی کو ایک درجہ کی آزادی حاصل ہو جاتی ہے اور اس کا فروخت کرنا قطع رحمی میں شمار ہوتا ہے۔ مکاتب کا بھی یہی حال ہے جب مالک اور غلام کے درمیان مکاتبت کا معاہدہ طے پائے تو وہ غلام آزاد ہو کر کاروبار کرنے لگتا ہے تاکہ مقررہ رقم مالک کو ادا کر سکے۔ اب ایسے غلام کی فروخت بھی روا نہیں رہتی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے غلام سے کہہ دے کہ میرے مرنے کے بعد تو آزاد ہے، تو اب اس غلام کو بھی کسی حد تک آزادی حاصل ہو گئی، اُس کو بھی فروخت نہیں کیا جا سکتا۔

تدبر فی القرآن

منافقین کے نفاق، شرارتوں اور ریشہ دوانیوں کے پیش نظر اللہ نے فرمایا اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے کہ اس کی تعلیم کیسی بے مثال ہے جو بنی نوع انسان کو شر و فساد کی تاریکیوں سے نکال کر امن و سلامتی کی روشنی کی طرف لاتی ہے اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے یہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں۔ اگر یہ لوگ قرآنِ کریم کے پروگرام پر غور کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ جس جہاد سے یہ منہ موڑتے ہیں اور اسے اپنے لیے ہلاکت کا سبب سمجھتے ہیں، یہی جہاد دنیا میں امن و امان کے قیام کا ضامن ہے اور اس کے ذریعے ترقی کی راہیں کھلتی ہیں۔ اس کے برخلاف جہاد سے گریز کرنے والوں کے دلوں پر تالے لگ جاتے ہیں اور وہ زنگ آلود ہو جاتے ہیں۔ سورۃ المطففین میں ہے۔

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (آیت۔۱۴)

ان کے بُرے اعمال کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گئے ہیں۔ سورۃ بقرہ

ہیں فرمایا خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ (آیت ۷) اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ اللہ کی نافرمانی کرتے کرتے ان کے دل سیاہ ہو چکے ہیں جو نیکی کی کسی بات کو قبول ہی نہیں کرتے۔

دین سے ارتداد

فرمایا کہ جو لوگ قرآن کے پروگرام کو تسلیم نہیں کرتے ان کے متعلق یہی سمجھا جائے گا کہ وہ مرتد ہو چکے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِھِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَھُمُ الْھُدٰی بے شک وہ لوگ جو پلٹ گئے اپنی پشتوں پر بعد اس کے کہ ان کے لیے ہدایت کا راستہ واضح ہو چکا ہے اَلشَّیْطٰنُ سَوَّلَ لَھُمْ ان کو شیطان نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے وَاَمْلٰی لَھُمْ اور ان کے ساتھ لمبے وعدے کیے۔ شیطان ان کو جنگ سے خوفزدہ کرتا ہے کہ جہاد میں شریک ہو گے تو مارے جاؤ گے اور تمہاری بیویاں بیوہ اور بچے یتیم ہو جائیں گے اور تمہارا مال بھی ضائع ہو جائے گا۔ اللہ نے شیطان کی ایسی ہی باتوں کو فریب اور دھوکہ قرار دیا ہے۔

عام طور پر مرتد سے وہ شخص مراد ہوتا ہے۔ جو دین اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لے یعنی یہودی، عیسائی، ہندو یا سکھ ہو جائے۔ تاہم اگر کوئی شخص کلمہ توحید پڑھنے کے باوجود دین کے احکام پر عمل کرنے سے گریز کرتا ہے، مثلاً جان بوجھ کر بلا عذر جہاد میں شریک نہیں ہوتا تو وہ بھی مرتد کے حکم میں آئے گا۔ اس سلسلے میں مرتد کی بعض علامات بھی بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً جو شخص نماز نہیں پڑھتا اور زکوٰۃ ادا نہیں کرتا اس کی وفاداری اسلام کے ساتھ مشکوک ہے۔ اسی طرح جو شخص جماعت میں شریک نہیں ہوتا وہ بھی اسی زمرہ میں آتا ہے۔ غرضیکہ جہاد ایک اتنی ضروری چیز ہے مگر منافق اس سے گریز کرتے ہیں۔ حالانکہ خود حضور علیہ السلام دس سالہ مدنی زندگی میں انیس جنگوں میں بنفس نفیس شریک ہوئے جن میں آٹھ یا نو غزوات میں بالفعل جنگ بھی ہوئی۔ جب اللہ کا نبی جہاد کی خود کمانڈ کرتا ہے تو پھر پیچھے رہ جانے والا منافق ہی ہو سکتا ہے۔

منافقوں کی دوغلی پالیسی

فرمایا منافقوں کو شیطان نے فریب دے رکھا ہے جس کی وجہ سے وہ جہاد میں شریک نہیں ہوتے۔ اُن کی حالت یہ ہے ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ کہ انہوں نے اُن لوگوں سے کہا جو اللہ کی نازل کردہ ہدایت کو ناپسند کرتے ہیں یعنی یہود و نصاریٰ پہ اپنے نفاق کو ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ ہم بعض معاملات میں تمہاری بات مانیں گے۔ مطلب یہ کہ ہم بظاہر تو مسلمانوں کے ساتھ ہیں لیکن اگر جنگ کا موقع آگیا تو ہم تمہارے خلاف میدان میں نہیں نکلیں گے۔ گویا اہلِ کتاب کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہیں۔ فرمایا وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ اللہ تعالیٰ اُن کے پوشیدہ رازوں اور مشوروں کو جانتا ہے کہ وہ کس قسم کی سازش کر کے اسلام دشمن قوتوں کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ سورۃ البقرہ میں منافقین کی اس دوغلی پالیسی کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جب وہ اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لا چکے ہیں، اور جب وہ اسلام کے دشمنوں کے پاس جاتے ہیں قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ (آیت ۱۴) تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ مسلمانوں سے میل جول کا مقصد تو محض اُن سے ٹھٹھا تمسخر کرنا ہے۔ ہم اُن سے بعض مفاد حاصل کرنے کے لیے اُن کی مجلسوں میں جاتے ہیں ورنہ ہماری تمام تر ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں اور ہم تمہاری ہی پارٹی کے آدمی ہیں۔

سزا الوقت موت

پھر اللہ نے ان منافقوں کی سزا کا ذکر بھی کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اُس وقت اُن کا کیا حال ہوگا۔ جب فرشتے اُن کی جانیں نکالیں گے يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ وہ اُن کے چہروں اور پشتوں پہ ضربیں لگائیں گے اور کہیں گے کہ اپنے کیے کا اب مزا چکھو۔ دنیا میں تم قرآنی پروگرام کی مخالفت کرتے رہے اور یہود و نصاریٰ سے ساز باز کر کے اہلِ ایمان کو نقصان پہنچاتے رہے۔ اب فرشتوں کی مار کا سامنا کرو۔ تمہاری منافقت کا یہی بدلہ ہے۔

فرمایا ذٰلِكَ یہ اس وجہ سے ہے بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ کہ انہوں نے اُس
چیز کی پیروی کی جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بنی۔ اللہ تعالیٰ کفر، شرک، یہودیت،
نصرانیت اور فتنہ فساد کو ناپسند کرتا ہے مگر تم نے ایسی چیزوں کا اتباع کر کے اللہ تعالیٰ
کی ناراضگی خرید لی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ
(القصص - ۷۷) بیشک وہ فساد اور فسادیوں کو پسند نہیں کرتا، نیز فرمایا وَلَا يَرْضٰى
لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ (الزمر - ۷) اللہ تعالیٰ اپنے
بندوں سے کفر کو ہرگز پسند نہیں کرتا اور اگر تم اُس کا شکر ادا کرو، اُس پر ایمان لے
آؤ تو وہ تم سے راضی ہو جائے گا۔ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران - ۱۹)
اللہ کے نزدیک پسندیدہ دین صرف اسلام ہے۔ اس کے ہاں توحید، ایمان
اور اطاعت کی قدر و منزلت ہے، اس کے علاوہ تمام ادیان مغضوب معتوب
اور گمراہ کن ہیں۔ اہلِ کتاب نے اصل دین میں ملاوٹ کر کے اسے یہودیت اور
نصرانیت بنا دیا ہے، اسی لیے اللہ نے اُن کو مغضوب علیہ اور گمراہ قرار دیا ہے

فرمایا منافق لوگ ایک تو اس وجہ سے سزا کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایسی
چیز کا اتباع کیا جو خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بنی، اور دوسری بات یہ وَكَرِهُوْا
رِضْوَانَهٗ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے پروگرام کو ناپسند کیا۔ اور
اللہ کی ناراضگی کے کاموں کو اختیار کیا۔ انہوں نے ہدایت کے راستے کو چھوڑ کر
گمراہی، ایمان اور توحید کو چھوڑ کر کفر و شرک اور نفاق کو اختیار کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا
فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ کہ اُن کے تمام نیک اعمال بھی برباد ہو گئے۔ وجہ یہ
ہے کہ اعمال کی قبولیت کا دار و مدار ایمان صحیح پر ہے۔ جب یہ لوگ اسی سے
خالی ہیں تو اللہ کے ہاں ان کے اعمال کی کچھ قدر نہ ہوئی اور سب کے سب
ضائع ہو گئے۔ قیامت والے دن کافروں کے ڈھیروں اعمال راکھ کے ڈھیر
کی طرح ہوا میں اُڑ جائیں گے کیونکہ وہ ایمان اور توحید کے تعلق سے خالی ہوں گے

درس ہشتم ۸ — آیت ۲۹ تا ۳۳

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ یُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴿۲۹﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَیْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِیْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۰﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰی نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِیْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِیْنَ ۙ وَنَبْلُوَا۠ اَخْبَارَكُمْ ﴿۳۱﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْهُدٰی ۙ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰهَ شَیْـًٔا ؕ وَسَیُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ﴿۳۲﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۳﴾

ترجمہ:- کیا گمان کرتے رہے وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے کہ ہرگز نہیں نکالے گا اللہ تعالیٰ اُن کے دلوں کے کینوں کو؟ (۲۹) اور اگر ہم چاہیں تو البتہ دکھا دیں آپ کو یہ لوگ پس آپ اِن کو پہچان چکے ہیں اُن کی نشانیوں سے، اور آگے بھی البتہ پہچان لیں گے اُن کو بات کے ڈھب سے، اور اللہ جانتا ہے تمہارے اعمال کو (۳۰) اور ہم ضرور آزمائیں گے تمھیں یہاں تک کہ معلوم کر لیں (ظاہر کر دیں) اُن لوگوں کو جو تم میں سے جہاد کرنے والے ہیں، اور صبر کرنے والے ہیں اور ہم

جا نچیں گے تمھاری خبروں کو (۳۱) بیشک وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور روکا انھوں نے اللہ کے راستے سے اور مخالفت کی انھوں نے رسول کی بعد اس کے کہ اُن کے لیے ہدایت واضح ہو چکی ہے وہ ہرگز نہیں نقصان پہنچا سکتے اللہ کو کچھ بھی۔ اور یقیناً اللہ تعالیٰ اُن کے اعمال کو ضائع کر دے گا (۳۲) اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی، اور نہ ضائع کرو اپنے اعمال کو (۳۳)

ربط آیات

جہاد فی سبیل اللہ کے سلسلہ میں منافقین کا کردار اور اُن کی مذمت بیان ہو رہی ہے۔ گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان گزر چکا ہے کہ جب جہاد سے متعلق کوئی محکم سورۃ نازل ہوتی ہے تو آپ منافقین کو اپنی طرف بڑی حیرت سے دیکھتے ہوئے پاتے ہیں جیسا کسی شخص پر موت کی غشی طاری ہو رہی ہو۔ پھر اللہ نے فرمایا کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے، کیا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں؟ جو لوگ ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد بھی قرآنی پروگرام کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ اُلٹے پاؤں پھر جاتے ہیں تو ایسے لوگوں کے حصے میں ہلاکت اور تباہی ہی آسکتی ہے۔ اللہ نے منافقین کا یہ کردار بھی بیان کیا کہ یہ لوگ جب اسلام دشمن افراد سے ملتے ہیں تو انہیں اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہیں۔ بوقت موت فرشتے ان کے چہروں اور پشتوں پر ضربیں لگائیں گے اور ان کی روحوں کو تذلیل و تحقیر کے ساتھ نکالیں گے اُن کا یہ حشر اس وجہ سے ہوگا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدہ چیز کا اتباع کیا، اور اس کی پسندیدہ چیز کو ناپسند کیا۔ خدا تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے اعمال کو ضائع کر دیا۔

منافق کی پہچان

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ کیا وہ لوگ گمان کرتے ہیں جن کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ

اللّٰہُ اَضْغَانَہُمْ کہ اللہ تعالیٰ اُن کے دلوں کے کینوں کو ہرگز ظاہر نہیں کرے گا؟
منافقت ایک خطرناک بیماری ہے۔ دیگر روحانی بیماریوں میں کفر، شرک، ارتداد اور
شک ہیں جن کی وجہ سے انسان نجات سے محروم ہو جاتا ہے۔ تو فرمایا جن لوگوں
کے دلوں میں بیماری ہے کیا وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ ان کے باطن کے کھوٹ، فریب،
حسد اور کینے کو ظاہر نہیں کرے گا۔ یہ اُن کی خام خیالی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسی چیزوں
کو کسی نہ کسی طریقے سے ظاہر کر دیتا ہے اور ان کو دنیا میں ہی رسوائی کا سامنا دیکھنا پڑتا
ہے۔ تو یہاں اللہ نے فرمایا ہے وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ اگر ہم چاہیں تو آپ
کو دکھا دیں کہ فلاں فلاں شخص منافق ہے جو اسلام اور اہل اسلام کے خلاف کینہ دوانیوں
میں مصروف ہے۔ اللہ نے یہ بھی فرمایا ہے فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيمٰهُمْ آپ
انہیں اُن کی نشانیوں سے پہچان لیں گے کہ یہ منافق ہیں۔ اُن کی پہچان کا دوسرا ذریعہ
یہ ہے وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ کہ آپ ان کو طریقہ گفتگو سے پہچان لیں گے
ایسے لوگ جب بات کرتے ہیں تو کسی نہ کسی موقع پر اُن کی اسلام دشمنی ظاہر ہو ہی جاتی
ہے۔ اس کے برخلاف جو ایمان والے ہیں اُن کا ایمان اُن کی گفتگو سے ہی جھلکتا
ہے۔ اہل ایمان کے بارے میں حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے اِتَّقُوْا مِنْ
فِرَاسَةِ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَرٰى بِنُوْرِ اللّٰهِ مومن کی فراست سے بچو کیونکہ
وہ اللہ کے عطا کردہ نور کے ساتھ دیکھتا ہے۔ سورۃ توبہ میں کثرت کے ساتھ
منافقوں کی مذمت بیان کی گئی ہے۔ فرمایا اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ
فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ (آیت ۱۲۶) کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ
انہیں ہر سال ایک یا دو مرتبہ آزمائش میں ڈالا جاتا ہے جس سے اُن کی منافقت
ظاہر ہو جاتی ہے اور وہ ذلیل ہو جاتے ہیں۔ کبھی وحی الٰہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ
منافقوں کی حرکات کی نشاندہی فرما دیتے ہیں اور کبھی اللہ کا رسول انہیں نور فراست
سے پہچان لیتا ہے کہ فلاں منافق ہے۔ کبھی اُن کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ اُن کی
منافقت کی غمازی کرتے ہیں اور کبھی اُن کی گفتگو کا طور طریقہ اُن کے نفاق کو ظاہر

کر دیتا ہے۔ فرمایا وَاللّٰهُ يَعْلَمُ أَعْمَالَكُمْ اے گروہ منافقین! اللہ تعالےٰ تمھارے اعمال کو جانتا ہے اس سے کوئی چیز مخفی نہیں۔ اگر ان کی کوئی چیز مخلوق سے مخفی رہ بھی جائے تو بہر حال اللہ تو جانتا ہے، اُس سے تو کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے اگر وہ دُنیا میں اُن کی کسی حرکت کو نہ بھی ظاہر کرے تو جزائے عمل کے وقت تو ان کا پردہ ضرور ہی فاش ہوگا، اور یہ بچ نہیں سکیں گے۔

مجاہرین اور صابرین کی آزمائش

ارشاد ہوتا ہے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ اور البتہ ہم تمھیں ضرور آزمائیں گے، یہاں تک کہ ہم جان لیں کہ تم میں سے مجاہد اور صابر لوگ کون ہیں۔ نَعْلَمَ کا لغوی معنیٰ تو جاننا ہی ہوتا ہے مگر یہاں پر ظاہر کرنا مراد ہے کیونکہ اللہ کے علم سے تو کوئی چیز بھی باہر نہیں۔ وہ تو ہر چیز کو ہر وقت جانتا ہے۔ بہر حال فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں مال و جان کی قربانی پیش کرنے اور ہر مصیبت پر صبر کرنے والوں کو ظاہر کر دے گا۔ وَنَبْلُوَا أَخْبَارَكُمْ اور ہم تمھاری خبروں یعنی حالات کو بھی آزمائیں گے۔ چنانچہ قرآن پاک میں جگہ جگہ اہلِ ایمان کی آزمائش کا ذکر آتا ہے۔ مثلاً سورۃ البقرۃ میں ہے اور ہم کسی قدر خوف، بھوک، مال، جانوں اور میووں کے نقصان سے تمھیں آزمائیں گے وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ (آیت - ۱۵۵) پس صبر کرنے والوں کو خوشخبری سُنا دیں۔ سورۃ العنکبوت کا آغاز اسی طرح ہوتا ہے أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُّتْرَكُوْا أَنْ يَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ کیا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں ایمان کے زبانی اقرار سے چھوڑ دیں گے اور اُن کی آزمائش نہیں کی جائیگی؟ نہیں بلکہ ہم نے ان سے پہلے لوگوں کو بھی آزمائش میں ڈالا، (اور ان کو بھی آزمائیں گے) پس اللہ تعالیٰ ضرور معلوم کرے گا کہ ان میں سے ایمان میں سچے کون ہیں اور جھوٹے کون؟ جنگ احزاب کے موقع پر فرمایا هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا (الاحزاب - ۱۱) وہاں پر مومنین کو آزمایا گیا اور وہ شدید طور پر ہلائے گئے۔ گویا یہ اُن کی سخت ترین آزمائش تھی۔

بہرحال فرمایا کہ ہم تمھارے حالات کو اچھی طرح آزمائیں گے۔ چنانچہ مجاہدین اور صابرین کی وقتاً فوقتاً آزمائش ہوتی رہی۔ جہاں تک منافقوں کی پہچان کا تعلق ہے تو اللہ نے ان کو بھی مختلف مواقع پر آزمایا۔ مثلاً جنگ احد میں منافقین کا گروہ بھی مسلمانوں کے ساتھ مدینہ سے نکلا مگر وہ سارے عبداللہ بن ابی کی قیادت میں میدان جنگ میں پہنچنے سے پہلے ہی واپس لوٹ گئے۔ اسی طرح جنگ تبوک کے موقع پر بھی اسی سے زائد منافقین نے حیلوں بہانوں سے جنگ کے لیے نکلنے سے گریز کیا اور اللہ نے ان کا پردہ چاک کیا۔ غزوہ بنی مصطلق کے موقع پر بھی ان کی آزمائش ہوئی مگر یہ اس میں ناکام ہوئے۔ انہوں نے مختلف حیلوں بہانوں سے مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ اپنے مقصد میں تو کامیاب نہ ہو سکے۔ البتہ ان کی اپنی خباثت ظاہر ہو گئی۔ اور بالآخر سورۃ المنافقون میں ان کی تمام چرب زبانی اور جھوٹ کا پول کھول دیا اور فرمایا یہ لوگ جو بھی دعویٰ کریں وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (آیت۔۱) خدا تو جانتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔ غرضیکہ اللہ کا فرمان ہے کہ ہم مومنوں اور منافقوں دونوں گروہوں کو آزمائیں گے اور ظاہر کر دیں گے کہ ان میں کون صبر کرنے والا اور مشقت برداشت کرنے والا ہے اور کون منافق ہے جو جان و مال کی بازی لگانے سے گریز کر رہا ہے۔

کفار کے اعمال کا ضیاع

آگے ارشاد ہوا اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا اور اللہ کے راستے سے روکا وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ اور اللہ کے رسول کی مخالفت کی مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى بعد اس کے کہ ہدایت واضح ہو چکی یعنی وحی الٰہی کے ذریعے احکام نازل ہو چکے۔ پھر اس کے بعد جن لوگوں نے کفر کیا اور خدا تعالیٰ کے راستے سے روکا، اللہ کے رسول کی مخالفت کی لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے یعنی وہ لوگ اسلام دشمن ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ بلکہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو ہی ضائع کر دے گا۔ اگر انہوں نے دنیا میں کوئی اچھا کام کیا ہے نماز

روزہ، حج وغیرہ سب مردود ہوں گے کیونکہ ان کا عقیدہ فاسد ہے۔ توحید پہ بھی صحیح ایمان نہیں رکھتے اور دلوں میں کھوٹ ہے۔

اللہ اور رسول کی اطاعت

پہلے منافقوں کی طرف سے اللہ کے رسول کی مخالفت کا ذکر تھا۔ اب اہل ایمان کو خطاب فرمایا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اس کے رسول کی وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو۔ گویا اعمال کی قبولیت کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری شرط ہے۔

اس آیت سے بعض ضمنی مسائل بھی متفرع ہوتے ہیں۔ مثلاً معتزلہ کا خیال ہے کہ جب کوئی شخص کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے گناہ کی وجہ سے اس کی ساری نیکیاں بھی برباد ہو جاتی ہیں۔ مگر اہل سنت والجماعت کا مسلک یہ ہے کہ اگر اس شخص کے دل میں صحیح ایمان موجود ہے اور وہ اللہ کی وحدانیت پر یقین رکھتا ہے تو کبیرہ گناہ کی وجہ سے اس کی نیکیاں تو ضائع نہیں ہوں گی۔ البتہ اس کو اس گناہ کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانوی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اعمال ضائع تو نہیں ہوں گے۔ البتہ ان میں وہ نورانیت نہیں رہے گی جب تک کہ وہ شخص اس کبیرہ گناہ سے توبہ نہ کرے۔ اعمال کی بربادی کی اصل وجہ شرک ہے۔ جب تک کسی شخص میں شرک کا مادہ موجود ہوگا، اس کی نماز، روزہ، صدقہ، خیرات، جہاد، حج غرضیکہ کچھ بھی قبول نہیں ہوگا، سب رائیگاں جائیں گے۔ اگر کوئی شخص توحید پر قائم تھا، نیک اعمال بھی انجام دیتا تھا مگر بعد میں کسی وقت شرک میں ملوث ہو گیا تو اس کی ساری نیکیاں برباد ہو گئیں۔

اسی طرح جو شخص مرتد ہو جائے اس کی بھی ساری نیکیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔ جیسے سورۃ البقرہ میں موجود ہے وَمَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَیَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ (آیت ۲۱۷) جو شخص اپنے دین سے پھر جائے اور اسی حالت میں اسے موت آ جائے کہ وہ کافر

ہی سبب ہے تو ایسے لوگوں کے اعمال دُنیا و آخرت میں برباد ہو جائینگے۔ علاوہ ازیں جس شخص کے دل میں شک یا نفاق پیدا ہو گیا یا اُس کا عقیدہ فاسد ہو گیا تو وہ بھی نیکیوں سے محروم ہو گیا۔ جو شخص صدقہ کر کے اُس پر احسان جتلاتا ہے یا اذیت پہنچاتا یا ریاکاری کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ بھی اعمال کو برباد کر بیٹھتا ہے۔ سورۃ البقرہ میں اللہ کا واضح فرمان ہے کہ اے ایمان والو! لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (آیت۔ ۲۶۴) اے لوگو! اپنے صدقات وخیرات کو ریاکاری کرنے والے آدمی کی طرح احسان جتلا کر اور اذیت پہنچا کر ضائع نہ کرو۔ مطلب یہ کہ ان امور سے نیکی تو برباد ہو گئی اور گناہ لازم آ گیا۔ اسی لیے فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس کے خلاف کر کے اپنے نیک اعمال کو برباد نہ کر بیٹھو۔

عمل شروع کر کے ترک کر دینا

اس آیت سے امام ابوحنیفہؒ نے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی نیک کام شروع کرنے کے بعد اُسے درمیان میں چھوڑ دیتا ہے تو اُسے اس کی قضا دینی ہوگی۔ مثلاً کوئی شخص نفلی روزہ رکھتا ہے اور کسی وجہ سے اُسے پورا کرنے کی بجائے درمیان میں افطار کر لیتا ہے تو اس کے بدلے اس کو روزہ رکھنا ضروری ہو جائے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے نفلی روزہ رکھا، مگر کسی وجہ سے توڑ دیا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا اِقْضِیَا مَكَانَہٗ یَوْمًا اٰخَرَ اس کی جگہ کسی دوسرے دن روزہ قضا کر لینا۔ البتہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ نفلی روزہ توڑنے سے قضا لازم نہیں آتی۔

بعض عبادات ایسی ہیں کہ شروع کرنے کے بعد اگر ترک کر دیا جائے تو تمام ائمہ کے نزدیک اُن کی قضا واجب ہوتی ہے۔ مثلاً حج یا عمرہ کا احرام باندھ کر کسی وجہ سے ارادہ ترک کر دیا تو اب اُس حج یا عمرہ کی قضا لازم ہو جائے گی۔ امام ابوحنیفہؒ اسی سے قیاس کرتے فرماتے ہیں کہ حج اور عمرے کی طرح نفلی نماز اور روزے کی قضا بھی ضروری ہوگی۔ انہیں ادا کرو اور اپنے اعمال کو باطل نہ کرو۔ آیت کا سیاق بتلاتا ہے کہ اے ایمان والو! کافر، مشرک اور مرتد کی طرح تم اپنے

اعمال کو ضائع نہ کر بیٹھنا یعنی کوئی ایسا کام نہ کرنا جس سے اعمال ضائع ہو جانیکا خطرہ ہو جیسے پہلے عرض کیا کہ ریاکاری، اذیت پہنچانے یا احسان جتلانے سے اعمال برباد ہو جاتے ہیں۔ تاہم امام ابوحنیفہؒ نے یہ دوسرا مسئلہ بھی بیان کر دیا ہے کہ کسی عمل کو شروع کر کے توڑ دیا جائے تو اس کی قضا لازم آئے گی۔

درس نمبر ۹ 　　　　 آیت ۳۴ تا ۳۸

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ مَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ﴿۳۴﴾ فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَتِرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ ﴿۳۵﴾ إِنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَإِنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا يُؤْتِكُمْ أُجُورَكُمْ وَلَا يَسْأَلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ ﴿۳۶﴾ إِنْ يَسْأَلْكُمُوهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوا وَيُخْرِجْ أَضْغَانَكُمْ ﴿۳۷﴾ هَا أَنْتُمْ هَٰؤُلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَمِنْكُمْ مَنْ يَبْخَلُ وَمَنْ يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَفْسِهِ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ﴿۳۸﴾

ترجمہ: بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور روکا اللہ کے راستے سے (دوسروں کو) پھر مر گئے (اسی حالت میں) اور وہ کفر کرنے والے تھے، پس ہرگز نہیں بخشے گا اللہ تعالیٰ ان کو ﴿۳۴﴾ پس نہ سست ہو تم (اے اہلِ ایمان) کہ تم پکارنے لگو صلح کی طرف، اور تم ہی بلند ہو گے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہو گا۔ اور ہرگز نہیں کم کریگا وہ تمہارے اعمال کو ﴿۳۵﴾ بیشک دنیا کی

زندگی کھیل اور تماشہ ہے اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور
تقویٰ اختیار کرو گے تو وہ دیگا تمھیں تمھارا بدلہ ، اور نہیں
مانگے گا وہ تم سے تمھارے سب مال (۳۶) اگر وہ مانگے
تم سے مال ، پھر وہ تاکید کرے تمھارے لیے تو تم
بخل کرنے لگو گے اور نکالے گا وہ تمھارے اندر
کے کھوٹ کو (۳۷) سنو اے لوگو ! تم کو بلایا جاتا
ہے تاکہ تم خرچ کرو اللہ کے راستے میں ۔ پس تم
میں سے بعض بخل کرتے ہیں ، اور جو بخل کرے گا
بیشک وہ بخل کریگا اپنے نفس کے لیے اور اللہ تعالیٰ
غنی ہے اور تم محتاج ہو ۔ اور اگر تم روگردانی کروگے تو
بدل دے گا وہ تمھاری جگہ دوسرے لوگوں کو ، پھر وہ نہیں
ہوں گے تمھارے جیسے (۳۸)

کفار کے لیے عدم معافی

جہاد کے ضمن میں منافقین کی مذمت بیان ہو رہی ہے ۔ قرآن پاک جس نظام
کو دنیا میں رائج کرنا چاہتا ہے اس کے مخالفین ملعون لوگ ہیں ۔ ایسے ہی کفار ،
مشرکین ، یہود ، نصاریٰ اور منافقین کا تعاقب پچھلی آیات میں بھی تھا اور آج کے درس
میں بھی ہو رہا ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بیشک وہ لوگ جنہوں
نے کفر کا شیوہ اختیار کیا ، یعنی خدا تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم نہ کیا ، اللہ کے نبیوں
کا انکار کیا ۔ قرآن کو وحی الٰہی نہ مانا ، اللہ کی کتابوں ، فرشتوں اور بعث بعد الموت
پر ایمان نہ لائے ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ دوسرل
کو بھی اللہ کے راستے سے روکا ، یعنی خود تو ایمان سے محروم تھے ، دوسروں کو قبول
کرنے پر مائل تھے ان کے راستے میں بھی طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کیں ، ان
کو ورغلایا ، لالچ دیا یا کسی اور طریقے سے حق کی طرف نہ آنے دیا ۔ دنیا کی زندگی میں
وہ اسی ڈگر پہ چلتے رہے ثُمَّ مَاتُوْا یہاں تک کہ انہیں موت آگئی وَهُمْ كُفَّارٌ

اس حالت میں کہ وہ کافر ہی ہے تو ایسے لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے
فَلَنۡ یَّغۡفِرَ اللّٰہُ لَہُمۡ کہ وہ انہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ انہیں اپنے
غلط عقائد اور بُرے اعمال کی وجہ سے ابدی سزا میں مبتلا ہونا پڑے گا۔

ثابت قدمی کی تلقین

پھر اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو تنبیہ فرمائی فَلَا تَہِنُوۡا دیکھو! کافروں
کی ایذا رسانیوں، افرادی قوت اور ساز و سامان سے مرعوب ہو کر سست نہ پڑ
جانا، اور اس قدر ہمت نہ ہار بیٹھنا وَ تَدۡعُوۡۤا اِلَی السَّلۡمِ کہ خود انہیں صلح کی دعوت
دینے لگو۔ صلح کی بات بجائے خود نہیں ہوتی بلکہ یہ تو طرفین کی خواہش پر ہوتی ہے اللہ
نے سورۃ الانفال میں اس کا یہ قانون بیان کر دیا ہے اِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ
فَاجۡنَحۡ لَہَا وَ تَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ (آیت ۶۱) اگر مخالف فریق صلح کے لیے
آمادہ ہو اور وہ اس کی پیش کش کرے تو اس کو قبول کر لو اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔
مطلب یہ کہ کمزوری یا بزدلی کی وجہ سے از خود صلح کی دعوت نہ دو بلکہ ہمت
اور حوصلے کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرتے رہو، اور تسلی رکھو وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ
تم ہی بلند یعنی غالب رہو گے وَ اللّٰہُ مَعَکُمۡ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت تمہارے
شامل حال ہے، تم اللہ کے دین کی خاطر جہاد کر رہے ہو، قرآن کے پروگرام کی ترویج
تمہارا مقصد ہے، تم دنیا کو امن کا گہوارہ بنانا چاہتے ہو۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ضرور
تمہاری مدد فرمائے گا۔ اور تمہیں کامیاب کرے گا۔ اور ساتھ یہ خوشخبری بھی دے دی کہ تم
جس خلوص نیت اور اللہ کی رضا کی خاطر میدان میں اترے ہو یہ بہت بڑا عمل ہے۔
وَ لَنۡ یَّتِرَکُمۡ اَعۡمَالَکُمۡ اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال میں کمی نہیں کرے گا۔
بلکہ ان کا پورا پورا بدلہ عطا فرمائے گا۔ گذشتہ درس میں بھی گزر چکا ہے اَطِیۡعُوا اللّٰہَ
وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ لَا تُبۡطِلُوۡۤا اَعۡمَالَکُمۡ لوگو! اللہ اور اس کے رسول کی
اطاعت کرتے رہو تو تمہارے نیک اعمال ضائع نہیں ہوں گے اور اللہ تعالیٰ
ان کی قدر دانی کرے گا اور تمہیں دشمن پر غلبہ حاصل ہو گا۔

دنیا کا تماشہ لہو و لعب ہے

آگے اللہ نے دنیا کی حقیقت کو بیان فرمایا ہے کہ یاد رکھو اِنَّمَا الۡحَیٰوۃُ

الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ بے شک دنیا کی زندگی تو محض کھیل تماشہ ہے اگر تم نے اس میں پھنس کر قرآن کے پروگرام کو ترک کر دیا تو یقیناً گھاٹے میں پڑ جاؤ گے، لہذا اس دنیا میں زیادہ دل نہ لگاؤ۔ یہ چند روزہ زندگی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں گزار دو۔ یہ دنیا تو بذاتہٖ لہو و لعب ہے اور اگر اس میں رہ کر تم مزید کھیل کود میں مصروف ہو گئے، کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، بیڈمنٹن وغیرہ کے کھیل ہی کھیلتے رہے یا انہیں ٹیلیویژن پر دیکھتے رہے تو تم نے اس دنیا کی زندگی کو ضائع کر دیا۔ اللہ نے عمر جیسی قیمتی پونجی دے کر دنیا میں بھیجا تھا مگر تم نے اس سے نیکی خریدنے کی بجائے اسے لہو و لعب میں گزار دیا تو کتنی بدقسمتی کی بات ہو گی۔

ایمان اور تقویٰ

فرمایا کھیل کود میں دل لگانے کی بجائے وَاِنْ تُؤْمِنُوْا اگر تم ایمان لاؤ گے اللہ تعالیٰ، اس کے رسولوں، کتابوں، ملائکہ اور بعث بعد الموت پر ایمان لاؤ گے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے وَتَتَّقُوْا اور تقویٰ کی راہ اختیار کرو گے یعنی کفر، شرک، نفاق، ارتداد اور معاصی سے بچ جاؤ گے، حدود شرع کا احترام کرو گے، ظلم و جور کو مٹا کر عدل و انصاف کو قائم کرو گے تو اس کا فائدہ یہ ہو گا۔ يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارا اجر عطا فرمائے گا اور تمہیں دنیا میں بھی کامیاب بنائے گا اور آخرت کا اجر تو لامحدود ہو گا۔

انفاق فی سبیل اللہ

فرمایا اگر ایمان اور تقویٰ کی راہ اختیار کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارا بدلہ عطا کرے گا۔ وَلَا يَسْئَلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ اور تمہارا سارے کا سارا مال تم سے طلب نہیں کرے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا موقع آئے گا۔ مثلاً زکوٰۃ ادا کرنا ہو گی، غریب محتاج کی اعانت مطلوب ہو گی یا جہاد میں جانا ہو گا ——————— تو اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ تم اپنا کل مال خرچ کر کے خود کنگال بن جاؤ۔ بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اپنی جائز ضروریات خورد و نوش، لباس، سواری، بیوی بچوں کے مناسب اخراجات برداشت کرنے کے بعد جو کچھ بچ جائے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دو۔ فرمایا اللہ تعالیٰ تمہارا خالق اور

مالک ہے، وہ تمہارا سارا مال حاصل کرنے کا بھی حق رکھتا ہے۔ اِنْ يَّسْئَلْكُمُوْهَا
اگر وہ ایسا مطالبہ کر دے فَيُحْفِكُمْ اور تاکیداً ایسا کرے تو تم اس امتحان میں ناکام ہو
جاؤ گے تَبْخَلُوْا تم بخل کرنے لگو گے یعنی سارا مال دینے کے لیے تیار نہیں ہو گے وَيُخْرِجْ
اَضْغَانَكُمْ تو وہ تمہارے اندر کے کھوٹ کو باہر نکال دے گا اور تم ذلیل ہو جاؤ گے
اسی لیے اللہ نے اپنی مہربانی سے تم پر تخفیف فرمائی ہے اور سارا مال طلب نہیں
کیا بلکہ اس کا کچھ حصہ مختلف مدات میں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔ خرچ کی بعض مدات
فرض ہیں جیسے زکوٰۃ اور حج، بعض واجب ہیں۔ جیسے صدقہ فطر اور قربانی۔ بعض
مدات سنت اور مستحب کی تعریف میں آتی ہیں جیسے غریب رشتہ داروں کی اعانت
پڑوسیوں اور غربا مساکین کا حق، تعلیم و تبلیغ کے اخراجات۔ بہرحال فرض واجب سے
لے کر سنت مستحب تک مختلف مدات اور مختلف درجات ہیں جن پر خرچ کرنے
کا حکم دیا جاتا ہے مگر یکدم سارے کا سارا مال خرچ کرنے کا اللہ حکم نہیں دیتا۔ البتہ اگر
کوئی اپنی مرضی سے سارا مال بھی خرچ کر دے جیسا کہ بعض صحابہؓ نے بعض مواقع پر
کیا تو یہ مزید فضیلت کا باعث ہوتا ہے۔

اسی سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لوگو! سُن لو تمہیں اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی دعوت
دی جا رہی ہے فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ اب تم میں سے بعض بخل کرتے ہیں
اور مطلوبہ مال خرچ نہیں کرتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ہمارا مال بچ جائے گا،
اور ہم آسودہ حال رہیں گے۔ مگر اللہ نے فرمایا وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ
نَّفْسِهٖ جو شخص بخل کرے گا تو اس کا وبال اسی پر پڑے گا، اس حکم عدولی کا نقصان
اسی کو ہو گا۔ یعنی اگر وہ حکمِ الٰہی کی تعمیل میں خرچ کر دیتا تو اس کا مال کم نہ ہوتا، بلکہ
اس کی وجہ سے اس کو بہت سے فوائد حاصل ہوتے۔ قرآن میں جگہ جگہ موجود ہے
مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ (الحدید۔ ۱۱)
جو شخص اللہ کو قرضِ حسنہ دے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے دوگنا کر کے لوٹائے گا۔ سورۃ بقرہ

میں ارشاد ہوتا ہے کہ جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے مال کی مثال
اُس دانے کی سی ہے جس سے سات بالیں اُگیں اور ہر بال میں سو سو دانے ہوں، گویا ایک
دانے کے بدلے سات سو دانے حاصل ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اللہ کی رضا کے لیے
خرچ کردہ مال کا اجر سات سو گنا تک ہوتا ہے، بلکہ فرمایا وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ
لِمَنْ يَّشَآءُ (آیت ۔ ۲۶۱) اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے اس سے بھی
زیادہ عطا کرتا ہے۔ شاہ عبدالقادر مفسر قرآن لکھتے ہیں کہ انفاق فی سبیل اللہ کا
عام مسلمانوں کو یہ ملا کہ حق تعالیٰ نے ملک فتح کرائے۔ تھوڑے عرصہ کے لیے اہل ایمان کو
اپنی طرف سے خرچ کرنا پڑا اس کے بعد اللہ نے خرچ کردہ مال سے سو سو گنا زیادہ دیا۔

فرمایا، یہ نہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کو ذاتی طور پر تمہارے مال کی ضرورت ہے، نہیں
بلکہ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وہ تو غنی اور بے نیاز ہے، اُسے تمہارے مال کی کیا ضرورت ہے۔
اس میں تو خود تمہارا ہی بھلا ہے کیونکہ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ محتاج تم ہو ضرورت
نہیں ہے۔ اس دنیا میں خرچ کرو گے تو یہاں بھی ایک کے بدلے ہزار ملے گا۔
اور پھر آخرت کا بدلہ تو لامتناہی ہے، لہٰذا بخل نہ کرو بلکہ بخوشی خاطر اس کی راہ
میں خرچ کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے انفاق کے بغیر بھی اپنے نبی کی مدد اور دین کو قائم
کر سکتا ہے۔ مگر اس طرح تمہاری ذلت کے اسباب پیدا ہو جائیں گے، لہٰذا جب وہ
خرچ کرنے کا حکم دے تو فوراً لبیک کہو اور اسی میں تمہاری بہتری ہے۔

اقوام کی تبدیلی

فرمایا وَاِنْ تَتَوَلَّوْا اور اگر تم روگردانی کرو گے، قرآن کے پروگرام کو جاری کرنے
کی بجائے اپنی خواہشات کے پیچھے چلنے لگو گے تو یاد رکھو کہ وہ اس بات پر بھی قادر ہے
کہ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وہ تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو کھڑا کر دے تمہیں
منظر سے ہٹا کر ایسے لوگوں کو لے آئے ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ جو تمہارے
جیسے نہیں بلکہ تم سے زیادہ بہتر ہوں گے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام
کے صحابہؓ نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی تو اللہ نے ان کو مستحکم کر دیا۔
انہوں نے جان و مال کی قربانیاں پیش کیں تو اللہ نے انہیں نصف دنیا کا والی

بنا دیا۔ جہاں انہوں نے مکمل طور پر اسلامی نظام نافذ کیا۔ انہوں نے دنیا میں قرآن کے نظام کو نافذ کیا تو اُن کی جگہ کسی دوسری قوم کو لانے کی ضرورت نہ پڑی۔ صحابہؓ کے بعد اللہ نے ایران والوں سے بڑا کام لیا، اُن میں بڑے بڑے فقہاء اور محدثین ہوئے جنہوں نے دین کی بڑی خدمت کی۔ اس کے علاوہ اللہ نے ترکوں سے بھی دین کی بڑی خدمت لی۔ تاتاری ابتدا میں اسلام کے بدترین دشمن تھے مگر پھر اللہ نے اُن کے دلوں کو پھیر کر اسلام کا سرپرست بنا دیا۔ جب مکہ والوں نے دین کو قبول نہ کیا تو یہ سعادت مدینے والوں کو حاصل ہو گئی۔ اللہ نے قریش کی بجائے انصار سے دین کی خدمت لی پھر جب عربوں میں سستی پیدا ہو گئی تو اللہ نے اُن کی جگہ سلجوقیوں اور تاتاریوں کو کھڑا کر دیا۔

بہرحال ایمان والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ مطلوبہ جانی اور مالی قربانی سے گریز نہ کرنا کیونکہ اس میں تمھارا ہی فائدہ ہے۔ اللہ نے بخل سے منع فرمایا، ایمان اور تقوے کی راہ اختیار کرنے کی تلقین کی اور اس کی حکمت بھی بیان فرما دی۔ جہاد کا حکم اور منافقین کی مذمت جس طرح اس سورۃ میں بیان کی گئی ہے، اسی طرح اگلی سورۃ فتح میں بھی یہ مضمون دہرایا گیا ہے اور اسلام کے اجتماعی نظام اور جماعتی نظم و نسق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

سورۃ الفتح
مکیۃ

سُوْرَةُ الْفَتْحِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّاَرْبَعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۃ فتح مدنی ہے یہ انتیس آیتیں ہیں اور اس کے چار رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ① لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ② وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ③

ترجمہ:۔ بیشک ہم نے فتح دی ہے آپ کو کھلی فتح ① تاکہ معاف کر دے اللہ تعالیٰ آپ کے لیے جو پہلے ہو چکیں آپ کے لیے لغزشیں، اور جو بعد میں ہوں گی، اور پوری کرے اپنی نعمت تجھ پر، اور راہنمائی کرے آپکی سیدھے راستے کی طرف ② اور مدد دے آپ کو اللہ تعالیٰ زبردست مدد ③

نام اور کوائف

اس سورۃ کا نام سورۃ الفتح ہے جو کہ اس کی پہلی اور اٹھارہویں آیت میں آمدہ لفظ فتح سے ماخوذ ہے۔ یہ سورۃ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی بلکہ ۶ھ میں حدیبیہ سے واپسی پر راستے میں نازل ہوئی۔ چونکہ یہ ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہے، اس لیے مدنی سورۃ کہلاتی ہے۔ اس کی انتیس آیتیں اور چار رکوع ہیں اور یہ سورۃ ۵۶۰ الفاظ اور ۲۴۰۰ حروف پر مشتمل ہے۔

تاریخی پس منظر

ہجرت کا چھٹا سال جا رہا تھا۔ ۵ھ میں غزوہ احزاب پیش آ چکا تھا۔ اس سے
پہلے بدر اور احد کی جنگیں ہو چکی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹی موٹی جھڑپیں واقع ہو چکی
تھیں جن کی وجہ سے مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان سخت کشیدگی پائی جاتی تھی فریقین
کو ہر وقت کسی مزید جنگ کا خطرہ درپیش رہتا تھا۔ مکے کے مسلمان بھاگ بھاگ کر
مدینہ طیبہ آ رہے تھے مگر قریش حتی الامکان ان کو روک رہے تھے اس دوران میں
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خواب دیکھا کہ آپ بمع صحابہؓ مکہ معظمہ تشریف لے
گئے ہیں اور وہاں عمرہ ادا فرمایا ہے۔ ظاہر ہے کہ پیغمبر کا خواب تو وحی الٰہی کی ایک
قسم ہے اور یہ سچا ہوتا ہے اور پھر آگے آیت ۲۷ میں اس کی توثیق بھی آ رہی ہے
حضور علیہ السلام نے اس خواب سے یہ اخذ کیا کہ انہیں عمرہ کی سعادت اسی سال
نصیب ہو رہی ہے، لہٰذا آپ نے صحابہؓ میں عمرہ کے لیے تیاری کا اعلان فرما
دیا اور آس پاس کے قبائل میں بھی پیغام بھیج دیا کہ ہم عمرہ کے لیے جا رہے ہیں، جو
کوئی جانا چاہے ہمارے ساتھ جا سکتا ہے۔

ذی قعدہ کے آغاز میں تقریباً ڈیڑھ ہزار افراد پر مشتمل یہ قافلہ عمرہ کے
لیے مدینہ طیبہ سے روانہ ہوا۔ ہدی کے اونٹ ہمراہ لیے۔ ذوالحلیفہ سے احرام
باندھا اور لبیک لبیک پکارتے ہوئے سفر شروع کر دیا۔ زمانۂ جاہلیت میں قریش
کا یہ دستور تھا کہ وہ حج و عمرہ کے لیے آنے والے کسی شخص کو نہیں روکتے تھے۔ خواہ وہ
ان کا کتنا ہی بڑا دشمن کیوں نہ ہو۔ اس کے باوجود حضور علیہ السلام نے مکے میں اپنا
ایک قاصد روانہ فرمایا تاکہ قریش کو بتلا دیا جائے کہ ہم لوگ عمرہ ادا کرنے کے لیے
آ رہے ہیں، ہمارا نہ کوئی سیاسی مقصد ہے اور نہ ہی ہم لڑائی کی نیت سے چلے ہیں
ہم نے احرام باندھ رکھے ہیں اور قربانی کے جانور ساتھ ہیں، لہٰذا ہمارے راستے میں
کسی قسم کی مزاحمت نہیں ہونی چاہیئے۔ جب یہ خبر قریش مکہ کو پہنچی تو وہ سخت
سٹ پٹائے۔ دستور کے مطابق وہ روک بھی نہیں سکتے تھے مگر وہ یہ بھی برداشت
نہیں کر سکتے تھے کہ مسلمان عمرہ ادا کریں۔

مسلمانوں کی یہ جماعت جب مکہ معظمہ سے دس بارہ میل کے فاصلے پر حدیبیہ کے مقام پر پہنچی جسے آج کل شمیسیہ بھی کہتے ہیں، تو مشرکین کی طرف سے اطلاع ملی کہ وہ مسلمانوں کو عمرہ ادا کرنے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں اور اگر مسلمان بضد ہوئے تو وہ جنگ کے لیے بھی تیار ہیں۔ اس موقع پر حضور علیہ السلام نے حضرت عثمانؓ کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا تاکہ وہ قریش مکہ کو باور کرائیں کہ ہم صرف عمرہ کرنا چاہتے ہیں جس کے بعد واپس چلے جائیں گے۔ لہٰذا وہ ہمارے راستے میں مزاحم نہ ہوں۔ مشرکین یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔ انہوں نے حضرت عثمانؓ کو پیش کش کی کہ اگر وہ چاہیں تو عمرہ ادا کر سکتے ہیں مگر باقی مسلمانوں کو یہاں نہیں آنے دیں گے۔ حضرت عثمانؓ نے ان کی یہ پیش کش قبول نہ کی اور فرمایا کہ جب تک حضور علیہ السلام اور باقی مسلمان عمرہ ادا نہیں کریں گے، وہ بھی ایسا نہیں کر سکتے۔

اس دوران میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ مشرکین نے حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا ہے یہ خبر ملنے پر حضور علیہ السلام نے صحابہؓ سے مشورہ کیا اور پھر یہ فیصلہ ہوا کہ اگر یہ خبر درست ہے تو پھر ہم حضرت عثمانؓ کا بدلہ لیے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ اگرچہ ہم جنگ کے لیے نہیں آئے اور نہ ہمارے پاس سامان ضرب و حرب ہے، مگر ہم اس قتل کو برداشت نہیں کر سکتے، خواہ ہم سارے کے سارے شہید ہو جائیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ایک درخت کے نیچے آپ نے بیعت لی جو بیعت رضوان کے نام سے مشہور ہے اور جس کا ذکر اس سورۃ میں بھی آ رہا ہے۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر غلط ثابت ہوئی اور قریش مکہ نے مسلمانوں کے ساتھ صلح کی پیش کش کی جس کے لیے انہوں نے کڑی کڑی شرائط رکھیں جن کا ذکر احادیث میں موجود ہے اور وہ یہ تھیں۔

(۱) یہ صلح دس سال تک نافذ العمل رہے گی اور اس دوران فریقین ایک دوسرے کے خلاف خفیہ یا اعلانیہ کوئی کارروائی نہیں کریں گے۔

(۲) اس دوران اگر قریش کا کوئی آدمی بھاگ کر مدینہ چلا جائے گا۔ تو اُسے واپس کر دیا جائے گا۔ اگر حضور کے ساتھیوں میں سے کوئی شخص قریش کے پاس آجائیگا تو اُسے واپس نہیں کیا جائے گا۔

(۳) عرب قبائل میں سے جو جس فریق کا حلیف بننا چاہے اُسے اختیار ہوگا۔

(۴) مسلمان اس سال عمرہ ادا کیے بغیر واپس چلے جائیں گے اور آئندہ سال صرف تین دن ٹھہر کر عمرہ ادا کر سکیں گے۔

مسلمانوں کو یہ شرائط بالکل پسند نہیں تھیں مگر حضور علیہ السلام نے ان کو منظور کر لیا۔ اس دوران کچھ ایسے واقعات بھی پیش آئے جن سے حضور علیہ السلام کے فیصلے کی تائید ہوتی تھی۔ مثلاً حدیبیہ کے مقام پر آکر حضور علیہ السلام کی اونٹنی خود بخود رک گئی اور کوشش کے باوجود آگے چلنے کے لیے تیار نہیں ہوتی تھی۔ آپ نے فرمایا حَبَسَهَا حَابِسُ الْفِيلِ اس اونٹنی کو اُسی ذات نے یہاں روک دیا ہے۔ جس نے ابرہہ کے ہاتھیوں کو منیٰ کے قریب روک دیا تھا اور انہوں نے مکہ پر چڑھائی سے انکار کر دیا تھا۔ اور پھر چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ذریعے اللہ نے حملہ آور لوگوں کو تہس نہس کر دیا۔ بہر حال صلح کا یہ معاہدہ طے پا گیا۔ حضور علیہ السلام نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ قربانی کے جو جانور ساتھ لاتے ہیں۔ وہ اسی مقام پر ذبح کر کے احرام کھول دیے جائیں۔ صحابہؓ نے تعمیل حکم کی اور اس کے بعد قافلہ مدینہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں یہ سورۃ فتح نازل ہوئی جس میں اللہ نے فتح کی بشارت سنائی۔ آپ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ آج رات مجھ پر ایک سورۃ نازل ہوئی ہے اَحَبُّ اِلَیَّ مِنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْھَا جو مجھے دنیا اور مافیہا سے زیادہ پیاری ہے۔ آپ نے یہ سورۃ تلاوت فرمائی تو صحابہؓ کا غم دور ہو گیا اور وہ سمجھ گئے کہ اگرچہ معاہدہ حدیبیہ بظاہر مسلمانوں کے خلاف جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اسی میں اہل ایمان کی بہتری رکھ دی ہے۔ یہ ذیقعدہ ۶ھ کا واقعہ ہے۔ اس کے تین ماہ بعد یعنی ۷ھ کے آغاز میں اللہ نے مسلمانوں کو خیبر فتح کرایا جس کی وجہ سے دولت کی ساری زمین ہاتھ آگئی

اور مال و دولت مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئے۔ بیعتِ رضوان میں شریک ہونے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ پہلا انعام تھا جس سے مسلمان خوشحال ہو گئے

پھر اسی سال حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہؓ نے عمرہ قضا ادا کیا۔ آپ نے ذی قعدہ کے مہینہ میں اُنہی صحابہؓ کو ہمراہ لے کر مکہ پہنچے جو بیعتِ رضوان میں شامل تھے۔ شرائطِ صلح کے مطابق مسلمانوں نے مکہ میں تین دن قیام کیا اور پھر واپس مدینہ چلے گئے۔ یہ عمرۃ القضاء کہلاتا ہے۔

مضامین سورۃ

مذکورہ پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ مبارکہ میں پیش آنے والے دس واقعات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ واقعہ حدیبیہ کے ضمن میں بیعتِ رضوان کا ذکر اور پھر معاہدہ صلح کا تذکرہ بھی آیا ہے۔ حضور علیہ السلام کو آنے والے خواب کا ذکر ہے اور ساتھ صحابہ کرامؓ کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ منافقین کا تعاقب اس سورۃ مبارکہ میں بھی کیا گیا ہے۔ اُن کی سازشوں کا پردہ فاش کیا گیا ہے اور پھر اُن کو سخت وعید بھی سنائی گئی ہے۔ حدیبیہ کی طرف روانگی کے وقت آپ نے بعض دیہاتی منافقوں کو بھی چلنے کی دعوت دی تھی مگر وہ سمجھتے تھے کہ مسلمان دشمن کے گھر میں خود جا رہے ہیں، یہ زندہ واپس نہیں آئیں گے۔ لہٰذا انہوں نے عمرہ کی ادائیگی کے لیے جانے سے انکار کر دیا۔ پھر جب آپ خیبر کی طرف روانہ ہوئے تو انہیں مسلمانوں کی فتح کا یقین تھا۔ لہٰذا مال حاصل کرنے کے لالچ میں انہوں نے ساتھ چلنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر حضور علیہ السلام نے منع فرمایا اور کہا کہ ہمارے ساتھ وہی لوگ جائیں گے جو واقعہ حدیبیہ کے وقت گئے تھے۔ اس طرح یہ منافق خیبر کے مال سے مستفید نہ ہو سکے۔ یہ واقعات بھی اس سورۃ میں اشارۃً مذکور ہیں۔

اس سورۃ مبارکہ میں اصلاح کے پہلو پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ انفرادی طور پر اصلاح کا آغاز عقیدے سے ہوتا ہے۔ پہلے انسان کے عقیدے کی اصلاح ہو پھر عمل کی اور پھر اخلاق کی۔ اس کے بعد اجتماعی اصلاحات کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر جو لوگ اصلاحی پروگرام کو قبول نہیں کرتے، اُن کے ساتھ جنگ کرنا پڑتی ہے

ذاتی اصلاح کے بعد قریبی رشتہ داروں کی اصلاح درکار ہوتی ہے۔ جیسے اللہ تعالٰی نے حضور علیہ السلام کو حکم دیا وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (الشعراء۔۲۱۴) آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈر سنا دیں تاکہ اُن کی اصلاح ہو جائے۔ اس کے بعد پھر پوری قوم کی اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ کا فرمان ہے اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (یوسف۔۲) ہم نے قرآن کو عربی زبان میں نازل فرمایا تاکہ تم سمجھ جاؤ۔ اللہ کے پیغمبر کی زبان عربی، آپ کی قوم کی زبان عربی، لہٰذا اللہ نے قرآن کو بھی عربی زبان میں نازل فرمایا تاکہ اس کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے اور مسلمانوں کی ایک اولین جماعت تیار ہو جائے جو اس قرآن کے پروگرام کو لے کر دنیا میں پھیل جائے تاکہ ساری دنیا کی اصلاح ہو جائے۔ غرضیکہ سورۃ ہٰذا میں یہ ساری باتیں آگئی ہیں۔

فتح مبین

ارشاد ہوتا ہے اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا بے شک ہم نے آپ کو (اے پیغمبر!) کھلی فتح سے نوازا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ معاہدہ حدیبیہ دس سال کے لیے کیا گیا تھا۔ مسلمانوں نے تو اس معاہدہ کی پوری پوری پاسداری کی مگر خود مشرکین جن کی شرائط پر معاہدہ ہوا تھا اُسے قائم نہ رکھ سکے اور انہوں نے خود ہی اس کو توڑ دیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ۸ھ میں اللہ نے مکہ کو فتح کرا دیا۔ چنانچہ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت میں مذکورہ فتح سے مراد فتح مکہ ہے۔ جس کی بشارت اللہ تعالیٰ نے سنا دی تھی۔ مگر یہ درست نہیں ہے۔ صحیح حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ لوگ فتح مکہ کو فتح مبین سمجھتے ہیں، مگر ہم صلح حدیبیہ کو فتح مبین سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس صلح کی وجہ سے جنگ کا خطرہ ٹل گیا، راستے کھل گئے۔ جس کی وجہ سے جب لوگوں نے مدینہ پہنچ کر مسلمانوں کے حالات دیکھے تو انہیں اسلام کی سچائی پر یقین آگیا اور وہ دھڑا دھڑ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ صلح حدیبیہ دراصل اسلام کے لیے ایک پھاٹک کا کھلنا تھا کہ لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے جس کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کو بڑی تقویت حاصل ہوئی

معاہدہ حدیبیہ دراصل پوری ملتِ اسلامیہ کے لیے فتح کی نوید تھی۔ اس کے بعد خیبر فتح ہوا۔ مکہ فتح ہوا اور پھر سارا عرب مسلمانوں کے زیرِ نگیں آگیا۔ بعض قبائل نے تھوڑی بہت مزاحمت کی جو جلدی ہی ختم ہوگئی اور عربوں کی اکثریت اسلام لے آئی۔ لہٰذا اس کو فتح مبین سے تعبیر کیا گیا ہے۔

عام معافی کی بشارت

معاہدہ حدیبیہ کو فتح مبین قرار دینے کے ساتھ ساتھ اللہ نے فرمایا لِیَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ اے پیغمبر! اللہ نے آپ کی تمام لغزشیں معاف فرما دی ہیں جو پہلے ہو چکیں اور جو بعد میں ہوں گی۔ ذنب کا عام فہم معنی گناہ ہوتا ہے مگر اللہ کا نبی چونکہ تمام گناہوں سے پاک ہوتا ہے اس لیے یہاں پر ذنب سے مراد چھوٹی موٹی لغزشیں ہیں جو کبھی کبھار ہو جاتی ہیں۔ اللہ نے ایسی معمولی خطاؤں سے بھی درگزر فرما دیا ہے۔ چونکہ یہ خطاب حضور علیہ السلام کو ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا حضور! آپ کو یہ معافی مبارک ہو مگر ہمارے لیے اللہ کا کیا حکم ہے؟ چنانچہ آگے چوتھی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے لیے بھی ایسی ہی بشارت سنا دی۔ اسی لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ جن لوگوں نے واقعہ حدیبیہ میں حصہ لیا اُن میں سے کوئی بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔ اُن میں سے صرف ایک شخص کو مستثنیٰ کیا گیا جو سُرخ اونٹ والا تھا۔ یہ درحقیقت منافق تھا اور اس نے بیعت بھی نہیں کی تھی۔

جن لغزشوں کی معافی کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے امام شاہ ولی اللہؒ اس کی توجیہہ اس طرح فرماتے ہیں کہ اللہ کے نبی کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت سے آپ اللہ کے نبی ہیں اور اس حیثیت میں آپ کی اطاعت تمام اہلِ ایمان پر فرض ہے۔ آپ کی دوسری حیثیت امیرِ جماعت کی ہے۔ آپ خدا کے خلیفہ بھی ہیں اور جماعت المسلمین کے امیر بھی۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جماعت کی غلطیوں میں اُن کا امیر بھی شریک سمجھا جاتا ہے۔ جماعت کو نفع ہو یا نقصان، فتح ہو یا شکست امیرِ جماعت پر بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے تو اس لحاظ سے جماعت کی غلطیوں میں چونکہ امیرِ جماعت بھی شامل ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسی ہی غلطیوں اور کوتاہیوں کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے کہ اُس نے آپ کی اگلی پچھلی سب خطائیں معاف فرما دی ہیں۔

اتمام نعمت

اس معانی کے علاوہ اللہ نے دوسری بات یہ فرمائی وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ اور تا کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی نعمت پوری کرے۔ اس نعمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے آپ کو نہ صرف منصب نبوت پر سرفراز فرمایا بلکہ آپ پر سلسلہ نبوت کو ختم کر دیا۔ پھر آپ کی بعثت کسی ایک قوم یا کسی خاص خطہ کی طرف نہیں بلکہ اللہ نے فرمایا وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (سبا۔ ۲۸) آپ کی بعثت تمام بنی نوع انسان کے لیے ہے۔ آپ کو اللہ نے غلبہ عامہ اور تامہ عطا فرمایا اور یہ غلبہ آپ کی امت کو بھی حاصل ہوا۔ آپ کا لایا ہوا دین ساری دنیا میں پھیلا اور قیامت تک قائم رہے گا۔ یہ سب انعامات ہیں جن کے متعلق اللہ نے فرمایا کہ اس نے اپنی نعمت آپ پر پوری کر دی۔

اور ساتھ یہ بھی فرمایا وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا اور آپ کی سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کی یعنی آپ اس صراط مستقیم پر قائم و دائم ہیں کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا خاص انعام ہے۔ اس کے علاوہ وَيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا اللہ نے آپ کی زبردست مدد فرمائی۔ واقعہ حدیبیہ میں ہی حضرت عثمانؓ کی شہادت کی افواہ اڑگئی مگر آپؓ کو اللہ نے سلامت رکھا۔ آپؓ بعد میں شہید بھی ہوئے مگر اس وقت تک مسلمان قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ چکے تھے اور نصف دنیا اسلام کے زیر نگیں آ چکی تھی۔ اس سے بڑی نصرت الٰہی کیا ہو سکتی ہے؟ اللہ نے عرب کے بے سرو سامان لوگوں کو جو محض قبائلی زندگی سے واقف تھے بڑی منظم اور عظیم سلطنتوں کا مالک بنا دیا کافر و مشرک مغلوب ہوئے اور دین اسلام دنیا بھر میں پھیل گیا۔

الغرض! آج کے درس میں چار باتوں کا ذکر آگیا ہے یعنی تفسیروں کی عام معانی نعمت کا اتمام، راہ راست پر استقامت اور زبردست نصرت الٰہی۔ اب اگلی آیات میں صحابہ کرامؓ کو دی گئی تسلی اور ان سے کیے گئے وعدوں کا ذکر آرہا ہے بیعت رضوان کا ذکر اس سے اگلے درس میں آئے گا۔

حٰم ۲۶   الفتح ۴۸

درس دوم ۲   آیت ۴ تا ۷

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِهِمْ ؕ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ۟ۙ (۴) لِّیُدْخِلَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَیُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِیْمًا ۟ۙ (۵) وَّیُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِیْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّیْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ؕ عَلَیْهِمْ دَآىِٕرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا (۶) وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا (۷)

ترجمہ :۔ وہ وہی ذات ہے جس نے اتارا اطمینان ایمان والوں کے دلوں میں تاکہ وہ زیادہ ہوں ایمان میں اُن کے ایمانوں کے ساتھ۔ اور اللہ ہی کے لیے ہیں لشکر آسمانوں اور زمین کے، اور اللہ تعالیٰ جاننے والا اور حکمت والا ہے (۴) تاکہ داخل کرے اللہ تعالیٰ ایماندار مردوں اور ایماندار عورتوں کو اُن بہشتوں میں کہ جاری ہیں جن کے نیچے نہریں۔ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اُن میں اور دور کر دے گا اللہ تعالیٰ

ان سے اُن کی برائیاں۔ اور یہ اللہ کے نزدیک بڑی کامیابی ہے ⑤ اور تاکہ سزا دے اللہ تعالیٰ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو، اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو جو گمان کرتے ہیں اللہ کے بارے میں بُرا گمان۔ انہی پر ہے بری گردش۔ اور اللہ تعالیٰ غضبناک ہوا اُن پر۔ اور اُن پر لعنت کی، اور تیار کیا اُن کے لیے جہنم۔ اور بہت بُری ہے لوٹنے کی جگہ ⑥ اور اللہ ہی کے لیے ہیں لشکر آسمانوں اور زمین کے، اور اللہ تعالیٰ زبردست اور حکمت والا ہے ⑦

ربطِ آیات

سورۃ کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ ایمان کو فتح مبین کی خوشخبری سنائی اور ساتھ اپنی زبردست نصرت کا بھی یقین دلایا۔ حضور علیہ السلام نے خواب میں دیکھا تھا کہ آپ صحابہؓ کے ہمراہ عمرہ کر رہے ہیں۔ مگر آپ ادائیگی عمرہ کے صحیح وقت کا اندازہ نہ کر سکے اور خیال فرمایا کہ شاید یہ سعادت اسی سال حاصل ہو جائے گی لہٰذا آپ ڈیڑھ ہزار جماعت صحابہؓ کے ہمراہ مکہ کی طرف چل پڑے۔ مگر جب آپ حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو مشرکین مکہ نے آپ کو عمرہ کے لیے مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ بالآخر گفت و شنید کے بعد طے پایا کہ مسلمان اس سال بغیر عمرہ کیے واپس چلے جائیں گے اور اگلے سال آکر ایسا کر سکیں گے۔ اگرچہ صحابہ کرامؓ کے لیے یہ فیصلہ سخت دل شکن تھا مگر حضور علیہ السلام کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اللہ نے فرمایا کہ اس سے ایمان داروں میں کمال درجے کا جذبہ اطاعت رکھ دیا تھا۔ اس اطاعت کا ذکر سورۃ ہذا میں کثرت کے ساتھ جگہ جگہ آیا ہے۔

نزولِ سکینت

اس موقع پر اکثر صحابہ کرامؓ کے دل میں سخت تردد تھا کہ وہ عمرہ نہیں کر سکے مگر اللہ کا نبی اس معاملہ میں بالکل مطمئن تھا کیونکہ آپ جان چکے تھے کہ اسی میں اسلام اور اہلِ اسلام کی بہتری ہے۔ باقی صحابہؓ میں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بھی کمال

درجے کا اطمینان حاصل تھا اور وہ اِس فیصلے پہ بالکل راضی تھے۔ اللہ نے اسی بات کا تذکرہ کیا ہے هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ خدا تعالےٰ کی ذات رحیم وکریم ہے جس نے اہلِ ایمان کے دلوں میں سکینت، اطمینان اور تسلی ڈال دی ہے۔ اگرچہ انہیں مذکورہ فیصلے سے رنج تھا مگر اطاعتِ رسول کے جذبہ نے انہیں یہ فیصلہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔

اس موقع پر حضور علیہ السلام نے صلح کی کمزور ترین شرائط قبول کیں۔ یہ چیز بھی صحابہؓ کے لیے پریشانی کا باعث تھی۔ حضرت عمرؓ نے فرطِ جذبات میں آکر عرض کیا، حضور! کیا اسلام برحق نہیں اور ہم سچے نہیں؟ فرمایا، کیوں نہیں، اسلام برحق ہے، اور ہم سچے ہیں۔ پھر عرض کیا، کیا ہمارے مقتول جنت میں اور کافروں کے مقتول جہنم میں نہیں جائینگے۔ آپ نے فرمایا، بالکل ایسا ہی ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا۔ پھر ہم اتنی کمزور شرائط کیوں تسلیم کریں۔ حضور علیہ السلام نے جواب دیا، میں اللہ کا نبی ہوں اور اللہ تعالیٰ ہرگز مجھے ضائع نہیں کریگا۔ حضرت عمرؓ نے یہی بات حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ بھی کی تو اُن کا جواب بھی یہی تھا کہ حضور علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں، اور اللہ تعالیٰ آپ کو ضائع نہیں کرے گا۔ بہرحال حضرت عمرؓ کی تسلی ہوگئی اور انہوں نے قربانی کر کے احرام کھول دیا۔ بہرحال فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل کر دی لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ تاکہ وہ بڑھ جائیں ایمان میں اُن کے ایمان کے ساتھ۔ صحابہ کرامؓ ایمان میں تو پہلے ہی کامل تھے۔ مگر دلوں میں سکینت نازل ہونے کی وجہ سے اُن کے ایمان مزید مضبوط ہوگئے اور وہ دین کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہوگئے۔

ارض وسما کے لشکر

ارشاد ہوتا ہے وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور اللہ ہی کے لیے ہیں لشکر آسمانوں اور زمین کے۔ آسمانوں کے لشکروں سے مراد اللہ کے فرشتے ہیں جن کے ذریعے اللہ نے ہدایت کو نازل فرمایا جو کہ دینِ توحید اور ایمان ہے جس میں انسانیت کی خدمت اور بنی نوع انسان کی بہتری کا پروگرام ہے۔ پھر یہ ہے

کہ فرشتے اللہ کی معصوم مخلوق ہیں جن کی صفت ہی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ سورۃ التحریم میں ارشاد ہے لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (آیت ۔ ۶) فرشتے اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے بلکہ جو بھی حکم دیا جاتا ہے اُسے بجا لاتے ہیں۔ اب اللہ نے حضور علیہ السلام کے توسل سے صحابہؓ کی جو جماعت تیار کی تھی، اُن کا خاصہ بھی یہی تھا کہ وہ فرشتوں کی طرح اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرتے تھے، نافرمانی نہیں کرتے تھے اور ہر قسم کی قربانی پیش کرنے کے لیے ہر وقت مستعد رہتے تھے۔ تو اللہ نے فرشتوں کے اس آسمانی لشکر کے ذریعے صحابہؓ کے زمینی لشکر پر سکون اور اطمینان نازل فرمایا۔ آسمانی لشکروں نے بدر اور حنین میں زمینی لشکروں کی براہ راست مدد کی۔ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ (آل عمران ۔ ۱۲۳) اللہ نے میدان بدر میں تمہاری مدد فرمائی حالانکہ اُس وقت تم بے سروسامان تھے۔ پھر آگے تین ہزار اور پانچ ہزار فرشتوں کے نزول کا ذکر بھی آتا ہے۔ اسی طرح سورۃ توبہ میں حنین کے موقع پر فرشتوں کے ذریعے مدد کا ذکر آتا ہے لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ (آیت ۔ ۲۵) اللہ نے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کی، خاص طور پر حنین والے دن۔ اور پھر فرمایا ثُمَّ أَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا (آیت ۲۶) پھر اللہ نے اپنے رسول اور مومنوں پر تسکین نازل فرمائی اور (تمہاری مدد کے لیے فرشتوں کے) لشکر نازل فرمائے جو تمہیں نظر نہیں آتے تھے۔ بہرحال فرمایا کہ اللہ ہی کے لیے ہیں لشکر آسمانوں اور زمین کے وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيمًا حَكِيمًا اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

خدا تعالیٰ نے وحی کے ذریعے علم و حکمت کو نازل فرمایا اور صحابہ کرام رضہ کو حکم دیا کہ وہ اس علم و حکمت کو لے کر دنیا میں پھیل جائیں اور اُسے بنی نوع انسان تک پہنچائیں۔ دین اسلام بلاشبہ علم و حکمت پر مبنی ہے جب کہ باقی تمام ادیان

یا اقوام شرک اور جہالت میں مبتلا ہیں۔ اللہ نے یہی بات سمجھائی ہے کہ دیکھو! اس نے
اہل ایمان کے لیے سکینت نازل فرما کر ان کے ایمان میں اضافہ کر دیا ہے اور ان کے
یقین مزید پختہ ہو گئے ہیں۔ ایمان کا اقرار تو بہر حال یکساں رہتا ہے اور اس میں اضافہ
نہیں ہوتا مگر اس کی طمانیت میں تو لازماً اضافہ ہو جاتا ہے جس میں وہ آسمانی لشکر
کی طرح ہمہ تن اطاعت شعار بن جاتے ہیں اور ہر قسم کی قربانی کے لیے ہمہ وقت
تیار رہتے ہیں۔

اہل ایمان کے لیے انعامات

بیعت رضوان کا مختصر تذکرہ گذشتہ درس میں ہو چکا ہے۔ جب حضرت عثمانؓ
کی شہادت کی خبر پہنچی تو صحابہ کرامؓ نے آپ کے خونبہا کے لیے مرمٹنے کی بیعت کی۔ یہ
بہت اہم فیصلہ تھا جس نے مشرکین کو صلح پر آمادہ کر دیا۔ اگرچہ انہوں نے بڑی
کڑی شرطیں پیش کیں مگر حضور علیہ السلام کی فراست نے یہ جانچ لیا تھا کہ اگرچہ یہ
شرائط بظاہر مسلمانوں کے خلاف ہیں مگر درحقیقت ان میں اہل اسلام ہی کا فائدہ
ہے۔ اور پھر ایسا ہی ہوا اور اللہ تعالیٰ نے بھی اسے فتح مبین قرار دیا۔

ان اہل ایمان کے متعلق خداوند تعالیٰ نے فرمایا لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ تاکہ داخل کرے اللہ تعالیٰ
مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بہشتوں میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ وجہ ظاہر ہے
کہ مومن آدمی ہمیشہ اللہ کی ذات پر بھروسہ کر کے ہر کام کرتے ہیں، ان کا ایمان
خدا تعالیٰ کی وحدانیت پر پختہ ہوتا ہے، جب کہ کفار و مشرکین اور منافقین میں یہ چیز
نہیں پائی جاتی۔ مسلمانوں کے قلب و ذہن میں ایک طرف خدا تعالیٰ کی رضا اور
دوسری طرف خدمت خلق کا شعور ہوتا ہے۔

رضائے الٰہی اور خدمت خلق

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ دین کا نچوڑ اور خلاصہ اَلتَّعْظِيْمُ لِأَمْرِ اللّٰهِ وَالشَّفَقَةُ
عَلٰی خَلْقِ اللّٰهِ اللہ کے حکم کی تعمیل اور مخلوق خدا پر شفقت ہے۔ مولانا احمد علی لاہوریؒ
اپنے درس میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو عبادت سے نبی کو اطاعت سے
اور مخلوق کو خدمت سے راضی کر لو کیونکہ دین کا لب لباب یہی ہے۔ امام شاہ ولی اللہؒ

بھی فرماتے ہیں کہ ہر شریف آدمی کا طبعی تقاضا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی رضا حاصل کرے اور بنی نوع انسان کی خدمت بجا لائے۔ خدمتِ خلق تو غیر مسلم بھی کرتے ہیں اور اس کے لیے بلند بانگ دعوے بھی کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات دعوے اصل خدمت سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کا دعویٰ یہی ہے کہ وہ انسانیت کی خدمت کرتے ہیں حالانکہ وہاں بدترین قسم کی ڈکٹیٹر شپ ہے ان کا نظامِ حکومت ایک فرد کی بجائے ایک جماعت کی مطلق العنانی ہے۔ اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ جہاں ضرورت ہو وہ اپنے سوشلزم کے اصولوں کو بھی فراموش کر دیتے ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دوسری جنگ عظیم میں کمیونزم کا بانی ملک روس امریکہ اور برطانیہ جیسے سرمایہ داروں کے ساتھ مل گیا اور اپنا مطلب نکال لیا۔ غرضیکہ غیر مذہب والوں کی خدمتِ خلق محض زبانی دعوے تک محدود ہوتی ہے جب کہ اصل خدمتِ خلق وہ ہے جو اسلام پیش کرتا ہے، اور جس کا مقصد دنیا میں تشہیر نہیں بلکہ اللہ کی رضا ہوتا ہے۔ اسلام کے عقیدۂ جزائے عمل سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اہلِ ایمان خدمتِ خلق کا معاوضہ کسی مخلوق سے نہیں بلکہ خالق سے طلب کرتا ہے جب کہ غیر ادیان والے اور دہریے لوگ اپنی نام نہاد خدمتِ انسانی کا معاوضہ اسی دنیا میں نقدی اجناس، عہدے یا اقتدار کی صورت میں وصول کرنے کے متمنی ہوتے ہیں اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ مومنوں کے لیے اللہ نے اپنے ہاں بہشت تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں خٰلِدِیْنَ فِیْھَا مومن لوگ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، وہاں کی نعمتوں سے مستفید ہوں گے اور وہاں سے کبھی نکالے نہیں جائیں گے یہ اُن کی خدمتِ خلق کا بدلہ ہوگا۔

اہلِ ایمان کے لیے ایک اور انعام یہ ہوگا وَیُکَفِّرَ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ کہ اللہ تعالیٰ ان سے اُن کی برائیاں اور کوتاہیاں دُور کر دیے گا۔ ظاہر ہے۔ جنگ کے دوران یا دیگر مواقع پر بشری تقاضوں کے مطابق انسانوں سے کچھ غلطیاں بھی سرزد ہو جاتی ہیں مگر اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اُن کو معاف فرمادے گا۔ وَکَانَ

ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا اور خدا تعالیٰ کے نزدیک یہ بہت بڑی کامیابی ہے کہ انسان کی غلطیاں معاف ہو جائیں اور وہ اللہ کی رحمت کے مقام جنت میں پہنچ جائے۔

بہرحال فرمایا کہ اللہ نے صحابہؓ کی جو جماعت تیار کی تھی اُن کا نظریہ اللہ کی رضا تھا۔ وہ اسی مقصد کے لیے خدمتِ خلق اور عبادت و ریاضت کرتے تھے اور ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا کہ اللہ انہیں بہشتوں میں داخل کرے گا اُن کی غلطیاں معاف فرما دیگا۔ اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

مشرکوں اور منافقوں کیلئے سزا

اس کے برخلاف فرمایا وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ اور تاکہ اللہ تعالیٰ سزا دے منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو۔ قرآن کے پروگرام کی مخالفت میں منافقوں اور مشرکوں کے دونوں گروہ ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ منافق وہ لوگ ہیں جو بظاہر تو کلمہ توحید پڑھتے ہیں۔ نبی کی مجلسوں میں بھی شریک ہوتے ہیں مگر جب جنگ پر جانا ہوتا ہے یا دوسری مشکل درپیش ہوتی ہے تو اُن کی خباثت ظاہر ہو جاتی ہے۔ اُن کے دل کفر سے لبریز ہوتے ہیں اور وہ ہمیشہ باطنی سازشوں کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتے ہیں۔ اُدھر مشرک ہیں جو کھلم کھلا دین کی مخالفت کرتے ہیں اُس کے راستے میں ہر رکاوٹ کھڑی کرتے ہیں اور اللہ کے دین اور اس کے پیروکاروں کو مغلوب کرنا چاہتے ہیں۔ منافقین اور مشرکین کے علاوہ یہود و نصاریٰ بھی اسی زمرہ میں آتے ہیں۔ وہ بھی اسلام کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے حقیقت میں اُن کا دین بھی دینِ ابراہیمی تھا۔ جس کا اعلان تھا حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ (الحج۔ ۳۱) صرف ایک خدا کی وحدانیت پر قائم ہو جاؤ اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ مگر انہوں نے اصل دین کو بگاڑ دیا اور کفر و شرک میں ہی مبتلا ہو گئے۔ ان کو بھی اللہ تعالیٰ سزا میں مبتلا کرے گا۔ قرآنی پروگرام سے انحراف کرنے والے بلکہ اس کی مخالفت کرنے والے قدیم ہندو اور جدید سکھ بھی ہیں اس کے علاوہ بدھ مت والے ہیں جو مشرق بعید کے ملکوں میں رہتے ہیں۔ یہ سب مشرکین

میں شامل ہیں اور سزا کے مستحق ہیں۔

اللہ کے متعلق بدگمانی

فرمایا اللہ تعالیٰ ان منافقوں اور مشرکوں کو سزا دے گا الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ برا گمان رکھتے ہیں۔ برے گمان سے یہی مراد ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم نہیں کرتے اور نہ اس پر بھروسہ کرتے ہیں۔ بلکہ اپنی خودساختہ سکیموں کو ہی اوّل و آخر سمجھتے ہیں اور انہی پر عمل کرتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے منافقوں کو عمرہ کے لیے ساتھ چلنے کی دعوت دی مگر انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات پر بدگمانی کی اور مسلمانوں کی ہلاکت کا خطرہ ظاہر کیا۔ اس لیے ان کی اکثریت اس موقع پر مسلمانوں کے ہمراہ نہ گئی۔ ادھر مشرکین مکہ کی بدگمانی یہ تھی کہ شاید مسلمان شہر مکہ اور بیت اللہ شریف پر قبضہ ہی کر لیں۔ لہٰذا انہوں نے اہلِ ایمان کو مکہ میں داخل ہی نہیں ہونے دیا اور صلح نامہ کی آڑ میں عمرہ کی ادائیگی اگلے سال پر ملتوی کرا دی۔ اگرچہ اس میں بھی مسلمانوں ہی کی بہتری تھی مگر مشرکوں نے اپنی بدگمانی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

فرمایا منافق اور مشرک بدگمانی کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ کہ اس بدگمانی کی بری گردش انہی پر پڑے گی اور بالآخر یہی مغلوب ہوں گے اور اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو غالب کرے گا۔ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ اور اللہ ان پر ناراض ہوا اور ان پر لعنت اور پھٹکار کی۔ چنانچہ یہ لوگ مغضوب اور ملعون ہوئے۔ اللہ نے دنیا میں بھی انہیں ناکام بنایا۔ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ اور آخرت میں ان کے لیے جہنم تیار کر دی ہے وَسَآءَتْ مَصِيْرًا جو کہ لوٹ کر جانے کی بہت ہی بری جگہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر بدگمانی کرنے والوں کا انجام بھی بیان فرما دیا۔

خدائی لشکر

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے خدائی لشکر والی بات کو دہرایا ہے وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور آسمانوں اور زمین کے لشکر خدا تعالیٰ ہی کے ہیں۔ آسمانی لشکر اللہ کے مقرب فرشتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں۔ اور زمینی لشکر میں آپ کے صحابہ کرامؓ ہیں جن کو حضور علیہ السلام نے آسمانی لشکر کے نمونے پر قائم کیا۔ ان کے پیش نظر بھی ہمیشہ اللہ کی رضا اور بنی نوع انسان کی

خدمت ہوتی ہے ۔ یہ ہر قربانی پیش کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں اور انہوں نے اپنی اطاعت کا نمونہ بہت سے اوقات پہ پیش کر دیا ۔ ان کی اس قربانی کے نتیجے میں اللہ نے اُن کو غالب بنایا اور دُنیا کی کوئی طاقت اُن کے مقابلہ میں نہ ٹھہر سکی ۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت تک کا زمانہ اجتماعی لحاظ سے ساری امت کے لیے نمونہ ہے ۔ انہی کے نقشِ قدم پہ چلنے والی جماعت کو کامیابی حاصل ہوگی ۔ مگر اس کے لیے شرائط بڑی سخت ہیں ، یہاں تو سر دھڑ کی بازی لگانی پڑتی ہے ، تب جا کر کامیابی نصیب ہوتی ہے فرمایا ارض وسما کے لشکر اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ اور اللہ تعالیٰ زبردست ، کمال قدرت کا مالک اور حکمت والا ہے ۔ وہ جو چاہے کرے ، اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہو سکتی اور اُس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا ۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو اللہ پہ بدگمانی کر کے اُس کے احکام کی تعمیل نہیں کرتے اور ہمیشہ کے لیے ناکام ہو جاتے ہیں ۔

حٰــمٓ ٢٦ — الفــتح ٤٨
درس سوم ٣ — آیت ٨ تا ١٠

إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿٨﴾ لِّتُؤْمِنُوا بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿٩﴾ إِنَّ ٱلَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ ٱللَّهَ يَدُ ٱللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ۚ فَمَن نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِۦ ۖ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِمَا عَٰهَدَ عَلَيْهُ ٱللَّهَ فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١٠﴾

ع ١٠

ترجمہ: بےشک ہم نے بھیجا ہے آپ کو شاہد بنا کر اور خوشخبری دینے والا اور ڈر سنانے والا ﴿٨﴾ تاکہ تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر، اور اس کی مدد کرو اور اس کی تعظیم کرو اور اس کی تسبیح بیان کرو صبح اور شام ﴿٩﴾ تحقیق وہ لوگ جو بیعت کرتے ہیں آپ سے بیشک وہ بیعت کرتے ہیں اللہ سے۔ اللہ کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں پر ہے۔ پس جو شخص توڑے گا، پس وہ توڑتا ہے اپنے ہی نقصان کے لیے۔ اور جو پورا کرے گا اس چیز کو جس پر اس نے اللہ سے عہد کیا ہے، پس عنقریب دے گا اس کو اللہ تعالیٰ اجرِ عظیم ﴿١٠﴾

ربطِ آیات

معاہدہ حدیبیہ میں کمزور شرائط کو مان کر صلح کی گئی تھی اس لیے ایمان والوں کے دلوں میں خلجان تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے رفع کیا اور ان

پر خاص اطمینان نازل فرمایا۔ اُن کے ایمان میں اضافہ فرمایا، اور بلند انعامات کی بشارت بھی دی۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی معافی کا اعلان بھی فرمایا اور حاصل ہونے والے انعامات کو فوزِ عظیم قرار دیا۔ اس کے برخلاف منافق اور مشرک مردوں اور عورتوں کے متعلق فرمایا کہ وہ بدگمانی کرتے ہیں۔ اُن پر بُری گردش پڑے گی، خدا تعالیٰ کا غضب اور لعنت ہوگی اور اُن کے لیے جہنم بھی تیار ہے۔ پھر فرمایا فتح و نصرت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ تمام آسمانی اور زمینی لشکر اللہ تعالیٰ کے ہیں۔ وہ آسمانی لشکر اُتار کر ایمان والوں کی تائید فرماتا ہے۔ اللہ کے نبی نے زمین پر صحابہؓ کی جماعت تیار کی ہے جو فرشتوں کی طرح تعمیلِ حکم کرتے ہیں اور پوری تنظیم کے ساتھ کام کرتے ہیں اور اللہ نے اُن کو بعد میں آنے والوں کے لیے بطور نمونہ بنایا ہے۔ جو اللہ اور اُس کے نبی کے بیان کردہ پروگرام کو آگے چلاتے ہیں۔ اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنے پیغمبر کی حیثیت کو واضح کیا ہے اور پھر بیعتِ رضوان میں شامل ہونے والی صحابہؓ کی جماعت کا تذکرہ ہے۔

پیغمبر بطور شاہد

پیغمبر علیہ السلام کی حیثیت کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا اے اللہ کے رسول! ہم نے آپ کو شاہد بنا کر بھیجا ہے۔ شاہد کا ایک معنی تو گواہ آتا ہے۔ جیسے سورۃ البقرہ میں ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (آیت ۔ ۱۴۳) اور اسی طرح ہم نے تمھیں افضل امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بن جاؤ، اور اللہ کا رسول تم پر گواہ بن جائے۔ اسی طرح سورۃ النساء میں واضح کیا گیا ہے فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا (آیت ۔ ۴۱) اُس وقت کیا منظر ہوگا جب ہم ہر امت سے گواہ لائیں گے اور پھر آپ کو آپ کی امت پر بطور گواہ پیش کریں گے۔ ساری امتوں کے انبیاء اپنی اپنی امت کی گواہی دیں گے اور پھر حضور علیہ السلام بھی اپنی امت کے بارے میں تبلیغِ رسالت کی گواہی

دیں گے کہ اللہ نے جو کام میرے سپرد کیا تھا، اور جو پیغام دے کر مجھے بھیجا تھا، وہ میں نے اپنی امت تک پہنچا دیا۔

شاہ عبدالقادرؒ شاہد کا معنی معلم کرتے ہیں، اور وہ سورۃ حج کی آخری آیت سے استدلال کرتے ہیں۔ جہاں اللہ نے فرمایا، لازم پکڑو ملت اپنے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی۔ اس نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے، اس سے پہلے بھی اور اس قرآن میں بھی لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ تاکہ رسول معلم (بتلانے والا) ہو تمہارا، اور تم معلم ہو لوگوں کے گویا حضور علیہ السلام کی ایک حیثیت معلم کی بھی ہے۔ معلم اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتا ہے اور پھر ان کے ذمے کام بھی لگاتا ہے۔ اسی طرح آپ کی دوسری حیثیت امیر جماعت کی بھی ہے یعنی آپ خلیفۃ اللہ اور امیر جماعت المسلمین بھی ہیں۔ بہرحال فرمایا کہ اے پیغمبر! ہم نے آپ کو شاہد یعنی گواہ یا معلم بنا کر بھیجا ہے۔

رضائے الٰہی

بحیثیت معلم حضور علیہ السلام کی اولین تعلیم اپنے صحابہؓ کے لیے یہ ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لائیں، اور دین اسلام کے تقاضوں کو پورا کریں۔ بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت فطرۃً ہر شخص کی روح میں ڈال دی ہے۔ اور اس محبت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی مرضیات پر چلے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی کمزور مخلوق کی خدمت کرے۔ قیامت والے دن لوگ اللہ کی محبت کے بڑے دعوے کریں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ ان کو جھٹلا دیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ اے آدم کے بیٹے! میں تیرے پاس بھوکا، پیاسا اور ننگا بن کر آیا تھا، میں تیرے پاس بحیثیت مسافر آیا تھا، مگر تو نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا؟ انسان حیران ہو کر عرض کرے گا کہ پروردگار! تو تو رب العالمین ہے، مختار مطلق اور ہر چیز پر قادر ہے، تو کیسے مسافر بن سکتا ہے اور کیسے بھوکا، پیاسا اور برہنہ ہو سکتا ہے؟ اللہ فرمائے گا کہ میرا فلاں بندہ تیرے پاس محتاج بن کر آیا تھا اس کے پاس کھانے پینے اور پہننے کے لیے کچھ نہیں تھا اسی طرح فلاں

بندہ تیرے پاس مہمان بن کر آیا تھا مگر تم نے اُن کی کوئی خدمت نہ کی۔ اگر تم بھوکے کو کھلاتے، پیاسے کو پلاتے، ننگے کو پہناتے اور مسافر کی خبر گیری کرتے تو آج میری رضا کو پاتے۔ تم اس امتحان میں ناکام ہوئے لہٰذا تمہارا جنت کا دعویٰ جھوٹا ہے۔

پیغمبر بحیثیت مبشر اور نذیر

اس کے برخلاف جو لوگ دین کا کام صحیح طریقے پر کرتے ہیں۔ ایک طرف اللہ کی مرضیات پر چلتے ہیں، اُس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں اور دوسری طرف مخلوقِ خدا کی خدمت بجا لاتے ہیں تو ایسے لوگوں کے لیے حضور علیہ السلام شاہد کے علاوہ وَمُبَشِّرًا یعنی خوشخبری دینے والے بھی ہیں۔ یہ لوگ خدا تعالیٰ کے ہاں کامیاب ہوں گے۔ اُن کو ترقی نصیب ہوگی اور اُن کو خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا۔ اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم نہیں کرتے، قرآنی پروگرام کی مخالفت کرتے ہیں، اپنی رجعت پسندانہ سرگرمیوں پر مصر ہیں، اُن کے لیے حضور علیہ السلام وَنَذِيرًا یعنی ڈر سنانے والے ہیں۔ یعنی آپ اُن کو اُن کے بُرے انجام سے ڈرانے والے ہیں۔

آگے اللہ نے عام لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ لِتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ تاکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرنا دین کی بنیاد ہے اور رسول اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہے۔ وہ اسی حیثیت میں اپنے آپ کو تمہارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اُس میں الوہیت والی کوئی بات نہیں ہے۔ تم اس پر بھی ایمان لاؤ اور اس کی اطاعت کرو۔ یہ ضروری ہے کیونکہ اللہ کا فرمان ہے مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (النساء۔ ۸۰) جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے گویا اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت کی۔ نیز فرمایا وَتُعَزِّرُوهُ اور اُس کی مدد کرو۔ یعنی اس کے دین کی مدد کرو۔ دین کی تعلیمات پر خود بھی عمل کرو اور اُسے دوسروں تک بھی پہنچاؤ۔ اس کا تذکرہ گذشتہ سورۃ محمد میں گزر چکا ہے إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ

اَقْدَامَکُمْ (آیت ۔ ۷) اگر تم اللہ یعنی اُس کے دین کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کریگا اور تمہارے قدم مضبوط کر دیگا۔

پھر اللہ نے عام لوگوں سے یہ بھی فرمایا وَتُوَقِّرُوْهُ اور اس کی تعظیم بجا لاؤ۔ اُس کی عزت اور توقیر کرو۔ ایسا کوئی کام نہ کرو جو اس کی عظمت کے خلاف ہو وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا اور صبح اور شام اُس کی تسبیح بیان کرو۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری ہر قسم کی تقصیریں معاف کر دیگا[1]

بیعت رضوان کی خصوصیت

بیعت رضوان کا ذکر تمہید کے طور پر پہلے اور دوسرے درس میں ہو چکا ہے۔ حدیبیہ کے مقام پر تقریباً پندرہ سو صحابہؓ کی جماعت نے حضور علیہ السلام کے دست مبارک پر بیعت کی تھی کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کا بدلہ لینے کے لیے ہم جانوں پر کھیل جائیں گے۔ چنانچہ اسی بیعت کے نتیجے میں اہل اسلام اور مشرکین مکہ کے درمیان صلح کا معاہدہ طے پایا جو صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس بیعت کا مزید ذکر آگے تیسرے رکوع میں بھی آرہا ہے، تاہم یہاں پر اس بیعت کی فضیلت کا تذکرہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ بیشک وہ لوگ جو آپ کے دست مبارک پر بیعت کرتے ہیں حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ان کے ہاتھوں کے اوپر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے مطلب یہ کہ جب وہ بیعت رضوان کر رہے تھے تو ان

---

[1] تُعَزِّرُوْهُ، وَتُوَقِّرُوْهُ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو تو اس کی وضاحت جیسا کہ ترجمہ میں کر دی گئی ہے۔ تینوں ضمائر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے اللہ تعالیٰ کی تائید و مدد سے دین کی مدد مراد ہے۔ اور اسی طرح مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا میں ہے کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وقار و عظمت سے خوف نہیں کھاتے یا اسکی توقع اور امید نہیں رکھتے اگر پہلی دو ضمیریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہوں تو بھی درست ہے آپکی تعظیم و توقیر اور مدد کرنا ہر ایک مسلمان کا فرض ہے بہر حال تُسَبِّحُوْهُ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف ہی راجع ہے (مسائل)

کے ہاتھوں کے اُوپر اللہ تعالیٰ کی شفقت، مہربانی اور تائید کا ہاتھ تھا۔ خدا کا نبی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اُس کے نازل کردہ پروگرام کو دنیا میں رائج کرنے کا عہد لے رہا تھا، اور یہی چیز اللہ تعالیٰ کو پسند تھی جس کی وجہ سے اُس نے اس بیعت کی تعریف فرمائی ہے اور اس بیعت کے کرنے والوں کو اپنی رضا کی خوشخبری دی ہے۔ اور پھر اس بیعت پر مستقیم رہنے کی تاکید بھی فرمائی ہے۔ فرمایا یاد رکھو! فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ پس جو کوئی اس بیعت کو توڑے گا۔ یعنی اپنے اس عہد کی خلاف ورزی کریگا تو اس کا وبال خود اسی پر پڑے گا۔ وہ اپنے نقصان اور خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا خود ذمہ دار ہوگا۔ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ اور جو پورا کریگا اُس چیز کو جو اُس نے اللہ تعالیٰ سے اقرار کیا ہے۔ یعنی جو شخص اللہ کے راستے میں سر دھڑ کی بازی لگانے پر قائم رہے گا۔ جو اللہ کی رضا کی خاطر تن من دھن سب کچھ قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہیگا، فرمایا فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔

بیعت کی اقسام

امام شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب القول الجمیل میں بیعت کی بہت سی قسمیں بیان کی ہیں۔ شاہ عبدالعزیز نے بھی اپنی کتابوں میں بیعت کا ذکر کیا ہے شاہ رفیع الدین نے بیعت سے متعلق ایک [illegible] رسالہ قلمبند کیا ہے۔ تو بیعت کی بہت سی قسمیں ہیں جن میں ایک بیعت بیعتِ اسلام ہے۔ لوگ یہی بیعت کر کے اسلام میں داخل ہوتے تھے دوسری بیعت ہجرت کے لیے تھی۔ لوگ اللہ کے نبی کے ہاتھ پر اللہ کے حکم کے مطابق ہجرت کر جانے کی بیعت یا عہد کرتے تھے تیسری بیعت جہاد تھی۔ جب جنگ کا موقع آتا تھا تو لوگ اس بات کی بیعت کرتے تھے کہ ہم اللہ کے راستے میں جان و مال کی قربانی پیش کرنے کے لیے تیار ہیں بعض صحابہؓ نے ارکانِ اسلام پر پابندی کی بیعت کی۔ حضرت جریرؓ کی بیعت اسی سلسلہ میں تھی کہ میں ارکانِ اسلام نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کی پابندی کروں گا اور ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کا سلوک کروں گا۔

بعض لوگوں نے حضور علیہ السلام کے دستِ مبارک پہ اس بات کی بیعت بھی کی کہ وہ سنت پر قائم رہیں گے اور بدعات سے بچتے رہیں گے۔ پھر عورتوں نے بھی اس بات کی بیعت کی کہ وہ شرک نہیں کریں گی، چوری نہیں کریں گی، زنا نہیں کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی، نہ اپنے ہاتھ پاؤں میں کوئی بہتان باندھیں گی (یعنی غیر کی اولاد کو خاوند کی طرف منسوب نہیں کریں گی) اور نہ نیک کاموں میں آپ کی نافرمانی کریں گی۔ اس بیعت کا ذکر سورۃ الممتحنہ میں موجود ہے۔ بیعت کی ایک قسم بیعتِ تبرک بھی ہے۔ حضرت زبیرؓ اپنے آٹھ سال کے بیٹے حضرت عبداللہؓ کو حضور علیہ السلام کی خدمت میں لے گئے اور آپ کے ہاتھ پہ بیعت کرایا۔ یہ یہی بیعت تھی، ورنہ بچے کے لیے بیعت کی ضرورت نہ تھی۔

بعض اوقات بزرگانِ دین کے کسی سلسلہ میں داخل ہونے کے لیے بیعت کی جاتی ہے یعنی بیعت سلوک کی بھی ہوتی ہے، جیسا کہ عام طور پہ بزرگانِ دین کے ہاتھ پہ بیعت کی جاتی ہے اور یہ مروج ہے۔ اس کا مطلب یہ اقرار کرنا ہوتا ہے کہ ہم ارکانِ دین کی پابندی کریں گے، عبادت و ریاضت اور ذکر و اذکار باقاعدگی سے انجام دیں گے تاکہ درجاتِ عالیہ نصیب ہوں اور اللہ کا تقرب حاصل ہو سکے۔

ایک بیعتِ خلافت ہوتی ہے جو خلیفہ کے انتخاب کے لیے ہوتی ہے۔ حضور علیہ السلام کے بعد لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی اور اسی طرح دیگر خلفائے راشدینؓ کی بیعت بھی ہوئی۔ بیعت کی یہ تمام قسمیں حضور علیہ السلام سے ثابت ہیں۔ البتہ اس مقام پر جس بیعت کا ذکر ہو رہا ہے وہ بیعت جہاد تھی جو تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابہؓ نے حضور علیہ السلام کے دست مبارک پر حدیبیہ کے مقام پہ کی تھی اور جس میں جان کی بازی لگا دینے کا عہد کیا تھا۔

شاہ رفیع الدینؒ فرماتے ہیں کہ بعض لوگ کسی بزرگ کے ہاتھ پہ محض دنیاوی فوائد حاصل کرنے کی بیعت کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بزرگ ہمارا کوئی معاملہ سلجھا دیں گے یا ہماری سفارش کر دیں گے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہ رسمی بیعت ہے جس

کا کچھ فائدہ نہیں۔ البتہ بیعت کی باقی جتنی اقسام بیان کی گئی ہیں، وہ درست ہیں۔

پیر کے اوصاف

حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ مزید فرماتے ہیں کہ کسی ایسے پیر یا بزرگ سے بیعت ہونا درست ہے، جس میں حسبِ ذیل اوصاف پائے جائیں۔

(۱) پیر کتاب و سنت کا علم رکھتا ہو۔ خود پڑھ کر علم حاصل کیا ہو یا کسی بزرگ کی صحبت حاصل کی ہو، بہر حال اس کے پاس کتاب و سنت کا علم ہونا چاہیئے۔

(۲) کبائر سے مجتنب اور صغائر پر اصرار نہ کرے، کبائر کا مرتکب بیعت کا اہل نہیں ہوتا کیونکہ وہ فساق میں شمار ہوتا ہے۔

(۳) بیعت لینے والا دنیا سے بے رغبت اور آخرت کی طرف رغبت رکھتا ہو۔

(۴) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عامل ہو۔ اپنے متعلقین کو اچھی بات کا حکم دے اور اگر ان میں کوئی بری بات دیکھے تو فوراً روک دے۔

(۵) پیر خود رَو نہ ہو، بلکہ یہ طریقہ اس نے بزرگوں سے سیکھا ہو یا ان کی صحبت اختیار کی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ باپ کی وفات کے بعد بیٹا جیسا کیسا بھی ہو گدی نشین ہو گیا نہ کسی سے سیکھا، نہ کسی کی صحبت اختیار کی اور نہ علم حاصل کیا۔ یہ سلسلہ تو تباہ کن ہے جو آجکل اکثر رائج ہے۔

اگر ان شرائط کو پورا کرنے والا کوئی بزرگ مل جائے تو اس کے ہاتھ پر بیعت کر لینی چاہیئے تاکہ انسان شیطان کے پھندے سے محفوظ رہ سکے۔ ویسے یہ بیعت نہ فرض ہے اور نہ واجب، البتہ سنت ہے۔ بزرگانِ دین میں سے حضرت دقاقؒ اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بھی منقول ہے کہ اگر کوئی کامل آدمی مل جائے تو بیعت کر لینی چاہیئے، البتہ کسی غلط کار، فاسق، شرکیہ اور بدعتیہ اعمال کرنے والے پیر کے ہاتھ پر بیعت کرنا ہرگز جائز نہیں۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست
پس بہر دستے نباید داد دست

اس قسم کے لوگ انسانی شکل میں شیطان ہیں، اس لیے ہر کسی کے ہاتھ پر ہاتھ نہیں رکھ دینا چاہیئے ورنہ وہ شرک اور بدعت میں مبتلا کر دیں گے اور انسان کو گمراہ کر کے رکھ دیں گے۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کا قول

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ دسویں صدی کے بزرگ ہوئے ہیں۔ آپ کا تعلق چشتیہ خاندان سے تھا۔ آپ شاہ عبدالحق ردولویؒ کے فرزند کے مرید تھے۔ آپ کا زمانہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا قریبی زمانہ ہے۔ آپ نے اپنے فارسی زبان کے مکتوبات میں اپنے زمانے کی عام پیری مریدی کا رد ان الفاظ میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"ہیہات ہیہات امروز از بد روز ما است کہ جہان از پیری و مریدی پُر شد و ہیچ خبر از مسلمانی نیست"

افسوس کہ آج کا زمانہ ہمارے لیے کتنا بُرا زمانہ ہے کہ سارا جہان پیری مریدی سے پُر ہے لیکن مسلمانی کی خبر بالکل نہیں۔

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں "امروز از بد روز ما است، پیری مریدی کجا این ہمہ جز بت پرستی و خود پرستی نیست" ہمارا دَور کتنا بُرا دور ہے کہ یہاں پیری مریدی نہیں بلکہ بت پرستی اور خود پرستی ہے۔ آج کل گدی نشین عام طور پر یہی کچھ کر رہے ہیں۔

پھر فرماتے ہیں کہ "امروز درویشی بلقمہ فروشی است" یعنی آج کی درویشی درویشی نہیں بلکہ یہ تو لقمہ فروشی ہے۔ یہ تو دین فروشی ہے کہ دنیا کا حقیر مال حاصل کرنے کے لیے پیری مریدی کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔ یہ گنبد، پختہ قبریں، چادریں اور چڑھاوے اسی مقصد کے لیے ہیں۔ حضرت گنگوہیؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "ما مریداں را..." خدا تعالیٰ ہم ایسے بدنصیب لوگوں کو اس قسم کی درویشی اور دین فروشی سے توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ "اول بایدے مسلمانی درست کنم بعدہٗ درویشی" ہم سب سے پہلے دین اور عقیدے کو درست کریں اور اس کے بعد درویشی اور پیری مریدی کی طرف توجہ دیں۔ اگر عقیدہ اور اسلام ہی درست نہیں تو اس پیری مریدی کا کیا فائدہ؟ آج کل کی پیری مریدی تو نرا دھوکہ اور فراڈ ہے۔ اس میں شرک اور بدعت کے سوا کچھ نہیں البتہ جیسا کہ امام شاہ ولی اللہؒ نے لکھا ہے اگر مذکورہ پانچ شرائط کا حامل کوئی بزرگ مل جائے تو اس کے ہاتھ پر بیعت کر لینی چاہیئے تاکہ انسان شیطان کے پھندے سے بچ جائے۔

سَيَقُولُ لَكَ الْمُخَلَّفُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ شَغَلَتْنَا أَمْوَالُنَا وَأَهْلُونَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُولُونَ بِأَلْسِنَتِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۚ قُلْ فَمَن يَمْلِكُ لَكُم مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ۚ بَلْ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١١﴾ بَلْ ظَنَنتُمْ أَن لَّن يَنقَلِبَ الرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَىٰ أَهْلِيهِمْ أَبَدًا وَزُيِّنَ ذَٰلِكَ فِي قُلُوبِكُمْ وَظَنَنتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَكُنتُمْ قَوْمًا بُورًا ﴿١٢﴾ وَمَن لَّمْ يُؤْمِن بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ فَإِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَعِيرًا ﴿١٣﴾ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۚ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٤﴾

ترجمہ :- عنقریب کہیں گے آپ کے سامنے پیچھے رہنے والے دیہاتی کہ مشغول کر دیا ہمیں ہمارے مالوں اور ہماری اولادوں نے ۔ پس آپ بخشش طلب کریں ہمارے لیے ۔ (اللہ نے فرمایا) کہتے ہیں یہ اپنی زبانوں سے وہ بات جو ان کے دلوں میں نہیں ۔ آپ کہہ دیجئے (اے پیغمبر) پس کون مالک ہو گا تمہارے لیے اللہ کے سامنے کسی چیز کا اگر وہ ارادہ کرے تمہارے بارے میں نقصان

کا یا ارادہ کرے تمہارے متعلق فائدہ پہنچانے کا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ، جو کچھ تم کام کرتے ہو، اس کی خوب خبر رکھنے والا ہے (۱۱) بلکہ تم نے گمان کیا کہ ہرگز نہیں واپس لوٹ کر آئیں گے اللہ کے رسول، اور ایمان والے اپنے گھروں کی طرف کبھی بھی۔ اور مزین کی گئی ہے یہ بات تمہارے دلوں میں، اور گمان کیا تم نے بُرا گمان، اور تھے تم لوگ ہلاک ہونے والے (۱۲) اور جو شخص ایمان نہیں لائے گا اللہ اور اس کے رسول پر، پس بیشک ہم نے تیار کی ہے کفر کرنے والوں کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ (۱۳) اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی۔ وہ بخشتا ہے جس کو چاہے اور سزا دیتا ہے جس کو چاہے۔ اور اللہ تعالیٰ بہت بخشش کرنیوالا مہربان ہے (۱۴)

ربط آیات

اس سورۃ مبارکہ میں فتح مبین اور رسولِ خدا اور اہلِ ایمان پر کیے گئے انعامات کا ذکر ہوا۔ معاہدہ حدیبیہ کی کمزور شرائط کی وجہ سے اہلِ ایمان کے دلوں میں جو ایک قسم کا شک اور افسوس پیدا ہو گیا تھا، اس کا ازالہ اللہ نے ایمان والوں کے دلوں میں تسلی اور اطمینان نازل فرما کر کیا اور اس طرح ان کے ایمان میں اضافہ فرما دیا۔ اللہ نے اہلِ ایمان کے مراتب عالیہ کا ذکر بھی کیا۔ حضور علیہ السلام نے اپنی تربیت کے ذریعے صحابہؓ کی جو جماعت تیار کی تھی اللہ نے اس کی حیثیت اور مرتبہ بھی بیان فرما دیا۔

خدا تعالیٰ نے دینِ حق اور قرآنی پروگرام کی مخالفت کرنے والے مختلف طبقات کا ذکر بھی کیا۔ ان میں منافق اور مشرک ہر دو گروہوں کے مرد و زن شامل ہیں۔ ان کے علاوہ یہود و نصاریٰ، صابی المجوسی اور بدصورت سب خدا تعالیٰ کے نازل کردہ پروگرام کے مخالف ہیں۔ ان سب کو بُرے انجام سے آگاہ کیا گیا

ہے پھر آسمانی لشکر یعنی فرشتوں کے ذریعے اہلِ ایمان کی تقویت اور تائید کا ذکر کیا پھر پیغمبر علیہ السلام کی حیثیت کے بارے میں فرمایا کہ اللہ نے آپ کو شاہد، مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے، اور ساتھ ساتھ ایمان والوں کو خدا تعالیٰ کی توحید اور نبی کی نبوت پر ایمان لاتے، پیغمبر کے لائے ہوئے دین کی مدد کرنے، پیغمبر خدا کی عزت و توقیر کرنے اور خدا تعالیٰ کی تسبیح و تہلیل کرنے کا حکم دیا۔

بیعتِ رضوان کے متعلق اللہ نے فرمایا کہ یہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد و پیمان کیا گیا تھا کہ اہلِ ایمان اس کی راہ میں سر دھڑ کی بازی لگانے سے گریز نہیں کریں گے۔ اسی بیعت کے نتیجے میں کفار اور اہلِ ایمان کے درمیان صلح ہوئی جسے فتح مبین کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس کی وجہ سے اسلام میں داخلے کے لیے تمام دروازے کھل گئے اور لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہونے لگے۔ صحابہؓ کا اخلاق اور عمل لوگوں کے سامنے آگیا اور لوگ قرآنی نظام کو سمجھنے لگے۔

اب اس رکوع میں اللہ نے منافقین کی مذمت بیان فرمائی ہے حضور علیہ السلام کے زمانہ میں تو اعتقادی منافق تھے جو بظاہر تو کلمہ پڑھتے تھے مگر حقیقت میں ان کے دل کفر کے ساتھ ہی مطمئن تھے۔ اس کے بعد کے ادوار میں اور موجودہ زمانے میں بھی اعتقادی منافق تو نہیں ہیں البتہ عملی منافقوں کی کثیر تعداد موجود ہے۔ منافقوں کی یہ قسم مسلمانوں میں بھی کثرت سے پائی جاتی ہے۔ جن کی زبان اور دل، قول اور فعل، ظاہر اور باطن آپس میں متضاد ہیں۔ آج کے زمانہ میں صحیح، سچے اور مخلص مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل ہے۔ بہر حال اسلام کے مخالفین میں منافقوں کو خاص حیثیت حاصل ہے۔ یہ باطنی طور پر اہلِ اسلام اور خود دینِ اسلام کو سخت نقصان پہنچانے والی جماعت ہے اللہ نے مختلف سورتوں میں ان کا حال بیان کر کے ان سے بچنے کی تلقین کی ہے، پھر ان کی باطنی خباثت کی وجہ سے ان کو جو رسوائی ہوتی ہے اللہ نے اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ لوگ مفاد پرست ہوتے ہیں۔ اگر کہیں فائدہ نظر آئے

تو مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں اور جہاں کسی نقصان کا خطرہ ہو وہاں پہلو بچا جاتے ہیں۔ چونکہ اللہ نے دین کی اقامت اور قیام امن کے لیے ہر مخالف دین سے جہاد کا حکم دیا ہے لہٰذا اس لحاظ سے جہاد کی زد ان منافقین پر بھی پڑتی ہے

واقعہ کا پس منظر

اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کے زمانے کے اعتقادی منافقوں کی اس خصلت کا ذکر کیا ہے کہ ان کے پیش نظر ہمیشہ ذاتی مفاد ہوتا ہے اور دین سے ان کی کوئی غرض نہیں ہوتی۔ چنانچہ ۶ھ میں جب حضور علیہ السلام نے عمرے کا ارادہ فرمایا تو مدینہ کے اطراف میں دیہاتی گنواروں کو بھی ساتھ چلنے کا پیغام بھیجا مگر ان میں سے جو منافق صفت لوگ تھے وہ اس سفر میں شامل نہ ہوئے ان کی عدم شمولیت کی وجوہات آگے آ رہی ہیں۔

پھر جب آپ اور آپ کے صحابہؓ سفر عمرہ سے بخیر و خوبی فتح مبین کی خوشخبری لے کر واپس آئے تو ان منافقین کو اپنی محرومی کا احساس ہوا۔ ابتداء میں تو وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو عمرہ کی ادائیگی کہاں نصیب ہوگی۔ ان کا تو جان بچا کر واپس آنے کی کوئی امید نہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ جن کفار و مشرکین نے مسلمانوں کو مدینہ میں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا اور احد اور احزاب جیسے واقعات پیش آ چکے ہیں وہ مکے میں گھرے ہوئے مسلمانوں کو کب واپس آنے دیں گے؟

منافقین کی حیلہ سازی

جب مسلمان مدینہ واپس آ رہے تھے تو منافقین کے دل میں خوف پیدا ہوا۔ کہ یہ بچ کر آ رہے ہیں، اب ہماری شامت آنے والی ہے، چنانچہ انہوں نے سفر عمرہ میں عدم شمولیت کے حیلے بہانے تلاش کرنے شروع کر دیے، مگر اللہ نے ان کے اس فعل کی خبر حضور علیہ السلام کو واپسی کے سفر کے دوران مدینہ پہنچنے سے پہلے ہی کر دی۔ چنانچہ جب آپ حدیبیہ سے چل کر بیس بائیس میل کی مسافت پر آئے تو رات کے وقت اللہ نے یہ سورۃ نازل فرمائی اور آپ کو بشارت سنائی اور ساتھ ساتھ منافقوں کی حیلہ سازی سے بھی آگاہ کر دیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے سَيَقُولُ لَكَ الْمُخَلَّفُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ سفر عمرہ سے پیچھے رہ جانے والے عنقریب آپ سے

کہیں گے شَغَلَتْنَا اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا ہمیں ہمارے مالوں اور گھر والوں نے اس سفر سے مشغول کر دیا۔ یعنی ہمارے بعد ہماری زمینوں اور باغات اور دیگر اموال۔ دولت، بھیڑ بکریاں وغیرہ کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا اور نہ کوئی ایسا شخص تھا جو ہمارے گھر بار کی خبر رکھتا۔ لہٰذا ہم آپ کے ساتھ شریک سفر نہ ہو سکے حالانکہ ہمارا دل تو چاہتا تھا کہ آپ کے ساتھ جائیں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس قسم کی پیشگی اطلاع حضور علیہ السلام کو بعض دیگر مواقع پر بھی ملی۔ مثلاً جب تحویل قبلہ کا حکم ہو رہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو پہلے ہی بتلا دیا سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا (البقرہ ۔ ۱۴۲) عنقریب احمق لوگ کہیں گے کہ مسلمان جس قبلہ یعنی بیت المقدس پر تھے اس سے کس چیز نے انہیں بیت اللہ شریف کی طرف پھیر دیا؟ پھر آگے اللہ نے خود ہی اس کا جواب بھی بتلایا کہ آپ کہہ دیں کہ مشرق و مغرب سب اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں، وہ جس کو چاہتا ہے سیدھے رستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

بہرحال پیچھے رہ جانے والے منافقین نے مال اور گھر بار کی حفاظت کا بہانا بنا کر اپنی کوتاہی کا اعتراف کیا۔ اور ساتھ ہی حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا۔ فَاسْتَغْفِرْ لَنَا آپ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کریں تاکہ اللہ تعالیٰ ہماری یہ کوتاہی معاف کر دے۔ جیسا کہ بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے۔ معافی کا عام اصول یہ ہے اِذَا اعْتَرَفَ الْعَبْدُ وَتَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ جب کوئی بندہ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے توبہ کر لیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ بھی اس کی توبہ کو قبول فرما لیتا ہے۔ ادھر ترمذی شریف اور ابن ماجہ میں یہ روایت بھی موجود ہے اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ گناہوں سے توبہ کرنے والا شخص ایسا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جب گناہ معاف ہو گیا۔ تو پھر وہ باقی نہ رہا۔ اسی اصول کے تحت منافقین نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ

ہمارے لیے بخشش کی دعا کریں۔

پیشتر اس کے کہ اللہ کا نبی منافقین کے لیے معافی طلب کرتا، اللہ نے پہلے ہی بتلا دیا یَقُولُونَ بِأَلْسِنَتِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ یہ لوگ اپنی زبانوں سے ایسی باتیں کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہیں، مطلب یہ کہ ان کے دل اور زبان میں تضاد ہے اور یہ سچی بات نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ ان کے دلوں میں تو کفر اور نفاق کی گندگی بھری ہوئی ہے اور یہ اس طریقے سے اپنے جرم کی پردہ پوشی کرنا چاہتے ہیں۔ پھر ساتھ ہی اللہ نے اس کا جواب بھی بتلا دیا۔ قُلْ اے پیغمبر! آپ ان سے کہہ دیں فَمَن يَمْلِكُ لَكُم مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا پس تمہارے لیے کون مالک ہوگا، اللہ کے سامنے اگر وہ تمہارے ساتھ نقصان کا ارادہ کرے یا تمہارے ساتھ فائدہ پہنچانے کا ارادہ کرے۔ ظاہر ہے کہ نفع و نقصان کا مالک تو صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس کی مشیت اور ارادے میں کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا تمہارا فیصلہ اپنی مشیت کے مطابق اللہ تعالیٰ ہی کریگا۔ یہاں پر نقصان کے ساتھ نفع کی بات کر کے منافقین کو قدرے امید بھی دلا دی کہ وہ اگر اب بھی راہ راست پر آجائیں، منافقت کو دل سے نکال کر پکے سچے مسلمان بن جائیں تو نہ صرف ان کی خطائیں معاف ہو جائیں گی بلکہ وہ اللہ کے ہاں اجر کے بھی مستحق بن جائیں گے۔ چنانچہ آگے چل کر ان منافقین میں سے بہت سے لوگ اسلام میں مکمل طور پر داخل ہو گئے۔ بہرحال فرمایا کہ اللہ تعالیٰ علیم کل ہے۔ بَلْ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا وہ تمہارے تمام کردہ اعمال سے اچھی طرح باخبر ہے لہٰذا تم اپنی چرب زبانی اور حیلہ سازی سے نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ وہ تمہارے ظاہر و باطن اعمال سے واقف ہے اور انہی کے مطابق تمہیں بدلہ دے گا۔

منافقین کی بدگمانی

آگے اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی اس بدگمانی کا ذکر کیا جس کی بناء پر وہ عمرہ کے سفر میں شامل نہ ہو سکے۔ فرمایا جو کچھ تم کہہ رہے ہو یہ جھوٹ ہے، حقیقت یہ ہے

بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ یَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰۤی اَهْلِیْهِمْ اَبَدًا
بلکہ تم نے یہ گمان کیا کہ اللہ کا رسول اور مومن لوگ اپنے گھروں کی طرف اب کبھی واپس نہیں آئیں گے بلکہ مشرکین کہ انہیں وہیں ختم کر دیں گے۔ یہ ہے اصل بات جس کی وجہ سے تم شریک سفر نہ ہوئے وَزُیِّنَ ذٰلِكَ فِیْ قُلُوْبِكُمْ اور یہ بات تمہارے دلوں میں مزین کر دی گئی تھی یعنی تم نے سمجھ لیا تھا کہ تمہاری سوچ بالکل درست ہے کہ مسلمان کبھی زندہ سلامت مدینے واپس نہیں آئیں گے وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ اور حقیقت میں یہ تمہاری سخت بدگمانی تھی جس کی وجہ سے وَكُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا تم ہلاک ہونے والے لوگ تھے۔ تم نے ایسی بدگمانی کر کے اپنی ہلاکت کو خود دعوت دی۔

اس سے یہ بات ثابت ہوئی وَمَنْ لَّمْ یُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ کہ جو کوئی شخص اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہیں لاتا۔ نہ اللہ کی وحدانیت کو مانتا ہے اور رسول کی رسالت کو تسلیم کرتا ہے اور اللہ کے نازل کردہ قرآنی پروگرام کو یکسر مسترد کر دیتا ہے۔ تو یقین جانو فَاِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ سَعِیْرًا کہ ہم نے کافروں کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ بھی تیار کر رکھی ہے یہ اس وجہ سے کہ یہ لوگ کامیابی کے راستے کو چھوڑ کر گمراہی اور مفاد پرستی کی راہ پر چل نکلے۔ لہذا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا کے مستحق ٹھہرے۔

معافی اور سزا کا قانون

آگے اللہ نے معافی اور سزا کا قانون بھی بتلا دیا ہے وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے وہی اس کائنات کا مالک، متصرف اور مدبر ہے۔ وہ قادر مطلق اور علیم کل ہے۔ لہذا جو شخص اللہ تعالیٰ کے فرستادہ نظام اور اس کے رسول کی رسالت کو تسلیم نہیں کرتا، وہ ہمیشہ کے لیے ناکام ہو جائے گا۔ اس کے برخلاف جو لوگ صراط مستقیم کے مسافر ہوں گے، اللہ کی وحدانیت اور رسول کی رسالت پر ایمان لائیں گے، وقوع قیامت اور جزائے عمل کا خوف دل میں رکھتے ہوں گے، اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے گا۔ اور وہ کامیاب ہو جائیں گے اسی لیے فرمایا یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ

وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ۔ اللہ تعالیٰ مختارِ کل ہے، وہ جس کو چاہے معاف کر دے اور جس کو چاہے سزا دے دے۔ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا اور نہایت مہربان ہے۔ بسا اوقات وہ مجرموں کو بھی فوری گرفت نہیں کرتا بلکہ مہلت دے دیتا ہے۔ وہ تو منافقوں جیسے پکے دشمنانِ اسلام اور موذی لوگوں کو بھی ڈھیل دیتا رہتا ہے اور یہی اس کے غفور اور رحیم ہونے کی علامت ہے۔

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انطَلَقْتُمْ إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ ۖ يُرِيدُونَ أَن يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ ۚ قُل لَّن تَتَّبِعُونَا كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِن قَبْلُ ۖ فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا ۚ بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿١٥﴾ قُل لِّلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ إِلَىٰ قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ ۖ فَإِن تُطِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللَّهُ أَجْرًا حَسَنًا ۖ وَإِن تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُم مِّن قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٦﴾ لَّيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ ۗ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ وَمَن يَتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٧﴾

ترجمہ : عنقریب کہیں گے پیچھے رہ جانے والے جب کہ تم جاؤ گے غنیمتوں کو لینے کے لیے ، چھوڑ دو ہمیں کہ ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں ۔ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی بات کو تبدیل کر دیں (اے پیغمبر) آپ کہہ دیں ، تم ہرگز ہمارے ساتھ نہ چلو ، اسی طرح ہے بات جو اللہ نے پہلے فرمایا

ہے ۔ پس کہیں گے یہ لوگ ، بلکہ تم ہمارے ساتھ
حسد کرتے ہو (نہیں ایسا نہیں) بلکہ یہ لوگ نہیں سمجھتے
مگر بہت کم (۱۵) آپ کہہ دیجئے پیچھے رہنے والے
دیہاتیوں سے کہ عنقریب تم کو بلایا جائے گا ایسی قوم
کے ساتھ لڑنے کے لیے جو سخت لڑنے والی
ہے ۔ پس تم ان سے لڑو گے یا پھر وہ مسلمان ہو جائیں
گے ۔ پس اگر تم نے تابعداری کی تو اللہ دیگا تم کو اچھا
اجر اور اگر روگردانی کی تم نے جیسا کہ تم نے پہلے روگردانی
کی تو وہ سزا دے گا تم کو دردناک سزا (۱۶) نہیں ہے
اندھے شخص پر کوئی حرج اور نہ لنگڑے پر کوئی حرج
اور نہ بیمار پر کوئی حرج ۔ اور جو شخص اطاعت کرے
گا اللہ کی اور اسکے رسول کی وہ اس کو داخل کرے گا باغوں میں کہ بہتی
ہیں ان کے سامنے نہریں ۔ اور جو روگردانی کرے گا اس کو
سزا دے گا دردناک سزا (۱۷)

ربط آیات

واقعہ حدیبیہ کی تفصیلات گذشتہ دروس میں گذر چکی ہیں ۔ چودہ یا پندرہ سو صحابہؓ
کی جماعت حضور علیہ السلام کی قیادت میں عمرہ کے لیے تیار ہوئی ۔ آپ نے مدینہ
کے اطراف میں رہنے والے منافق صفت گنوار دیہاتیوں کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت
دی ۔ انہوں نے خیال کیا کہ مسلمان اپنے دشمنوں کے گھر مکہ میں جا رہے ہیں ، وہ ان
کو زندہ سلامت واپس نہیں آنے دیں گے ۔ لہٰذا اس سفر میں مسلمانوں کے ہمراہ جانا
ہلاکت کو دعوت دینا ہے ۔ چنانچہ وہ لوگ عمرہ کی ادائیگی کے لیے ہمراہ چلنے پر تیار
نہ ہوئے ۔ پھر جب حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہ کرامؓ مکے سے واپس مدینہ
کی طرف آ رہے تھے تو راستے میں یہ سورۃ الفتح نازل ہوئی جس میں ایک طرف
تو مسلمانوں کو فتح مبین کی خوشخبری سنائی گئی اور دوسری طرف ان دیہاتی منافقوں کا

پردہ چاک کیا گیا۔ چنانچہ گذشتہ درس میں اس بات کا تذکرہ ہو چکا ہے کہ اللہ نے فرمایا کہ جب آپ بخیر و عافیت مدینہ طیبہ پہنچ جائیں گے سَیَقُولُ لَکَ الْمُخَلَّفُونَ مِنَ الْاَعْرَابِ تو بعض پیچھے رہ جانے والے منافق صفت دیہاتی آپ سے معذرت کریں گے کہ ہم اپنے مالوں اور گھروں کی حفاظت کے خیال سے آپ کے ہمراہ نہ جا سکے لہٰذا ہمارے لیے اللہ سے بخشش طلب کریں۔

مالِ غنیمت کی بشارت

صلح حدیبیہ جس کو اللہ نے فتح مبین قرار دیا بظاہر فتح نہیں تھی کیونکہ حضور علیہ السلام نے یہ صلح مسلمانوں کے حق میں نہایت کمزور شرائط پر کی تھی مگر حقیقت میں اس معاہدے نے اسلام میں داخلے کے لیے دروازے کھول دیے اور لوگ دھڑا دھڑ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ یہ فتح مبین اس لحاظ سے بھی تھی کہ اللہ نے مسلمانوں کو بہت سا مالِ غنیمت ملنے کی بھی خوشخبری سنا دی چنانچہ آج کی پہلی آیت میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ اس مالِ غنیمت سے مراد خیبر کی زمینیں اور اموال تھے جو عنقریب مسلمانوں کو ملنے والے تھے جب آپ مدینہ واپس پہنچے تو چند روز بعد ہی آپ نے خیبر کی طرف چلنے کا اعلان فرما دیا۔ اس بستی کے یہودی بڑے سازشی لوگ تھے جو اہلِ اسلام کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے اُن کی بیخ کنی کا وقت آ چکا تھا، لہٰذا آپ نے اُن پر حملہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ پہلے تو دیہاتی قسم کے منافق اس زعم میں تھے کہ مسلمان مکہ سے بچ کر نہیں آسکیں گے مگر جب وہ بخیر و عافیت واپس آ گئے، اسلام کو ترقی حاصل ہونے لگی تو انہیں یقین ہو گیا کہ اب مسلمان خیبر کو بھی فتح کر کے چھوڑیں گے اور وہاں کی زمینوں اور اموال سے فائدہ اٹھائیں گے۔ چنانچہ مالِ غنیمت کے لالچ میں آ کر اُن منافقوں نے بھی حضور علیہ السلام کی معیت میں خیبر کے معرکہ پر جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔

منافقین کے لیے پابندی

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اِن لوگوں کے خیبر کی طرف جانے اور وہاں کے مالِ غنیمت سے مستفید ہونے پر پابندی لگا دی۔ چنانچہ اللہ نے حضور علیہ السلام کو خطاب کر کے فرمایا سَیَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰی

مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا عنقریب تمھیں یہ حدیبیہ سے پیچھے رہنے والے منافقین کہیں گے جب کہ تم غنیمتوں کو لینے کے لیے خیبر کی طرف چلو گے ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ہمیں چھوڑ دو یعنی ہمیں اجازت دے دو کہ ہم بھی تمھارا اتباع کریں یعنی تمھارے ساتھ خیبر کی طرف چلیں، مگر اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ اسلام کے ساتھ مخلص نہیں ہیں بلکہ محض مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لیے آپ کے ساتھ جانا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہونی چاہیے کیونکہ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ یہ لوگ تو اللہ کی بات کو بدلنا چاہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ تو یہ ہے کہ خیبر کا مالِ غنیمت ان مجاہدین کے حصے میں آئے گا جنہوں نے حدیبیہ کا سفر اختیار کیا اور پھر وہاں پر بیعت رضوان میں شریک ہو کر سر دھڑ کی بازی لگا دینے کا عزم کیا۔ اور یہ لوگ تو مدینے میں بیٹھے رہے اب یہ غنیمت کے حقدار کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ تو غنیمت وصول کر کے اللہ کی بات کو بدلنا چاہتے ہیں مگر ایسا نہیں ہوگا۔

چنانچہ اللہ نے فرمایا کہ اے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا آپ ان منافق صفت لوگوں سے کہہ دیں کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ خیبر کی طرف نہ جاؤ كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ بات اسی طرح ہے جو اللہ نے پہلے ہی کہہ دی کہ یہ لوگ خیبر کی طرف نہ جانے پائیں۔ اللہ نے مزید فرما دیا کہ بات یہیں ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ جب ان منافقین پہ پابندی لگ جائے گی تو وہ اسے اپنی بری نیتوں پہ محمول کرنے کی بجائے فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا یوں کہیں گے کہ تم ہمارے ساتھ حسد کرتے ہو جس کی وجہ سے ہمیں ہمراہ لے جانے کے لیے تیار نہیں۔ تم چاہتے ہو کہ ہم مالی فائدہ نہ اٹھالیں۔ اللہ نے اس اعتراض کا جواب بھی دے دیا اور فرمایا بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ بڑے بے سمجھ ہیں مگر بہت کم۔ ان کی بے سمجھی یہی تھی کہ انہوں نے سفر حدیبیہ کو ہلاکت خیال کیا اور ساتھ نہ گئے، مگر جب مالی فوائد حاصل ہونے کا وقت آیا تو لپکے۔

کر شہیدوں میں شامل ہو لے گے۔ اللہ نے فرمایا، یہ لوگ اس مال سے مستفید نہیں ہو سکتے کیونکہ اس کا وعدہ تو اللہ نے حدیبیہ والوں سے کر رکھا ہے جنہوں نے ایسے آڑے وقت میں موت کی بیعت کی تھی۔

آئندہ کے لیے وعدہ

مذکورہ لوگوں نے وقتی طور پر اپنی منافقت کا اظہار کیا، مگر اللہ کے علم میں تھا کہ آئندہ چل کر ان میں سے بہت سے لوگ مخلص مسلمان بن جائیں گے، لہٰذا آئندہ کے لیے انہیں اُمید بھی دلا دی کہ وہ یکسر مایوس نہ ہوں بلکہ اگر وہ خلوصِ نیت کے ساتھ آئندہ مسلمانوں کا ساتھ دیں گے تو اللہ کے ہاں اُن کے لیے اجر کی کوئی کمی نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ اے پیغمبر! آپ ان پیچھے رہ جانے والے دیہاتیوں سے فرما دیں کہ آئندہ چل کر تمہارا پھر آزمائش ہو گی جب کہ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تم بلائے جاؤ گے، ایسی قوم کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے جو سخت جنگجو ہے تمہیں اُن سے مقابلہ کرنا ہو گا تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ تمہیں اُن سے جنگ کرنا ہو گا یا وہ از خود اسلام قبول کر لیں۔ مطلب یہ کہ اگر تم نے آئندہ پیش آنے والی جنگوں میں خلوص کے ساتھ حصہ لیا۔ فَاِنْ تُطِيْعُوْا اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت کی يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا تو اللہ تعالیٰ تمہیں اچھا اجر عطا فرمائے گا تمہیں مالِ غنیمت بھی ملے گا اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی بھی حاصل ہو گی۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے جس جنگجو قوم کے ساتھ مقابلے کا ذکر کیا ہے اس کے متعلق مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، بعض لوگ اسے مسیلمہ کذاب کے ساتھ ہونے والے معرکے پر محمول کرتے ہیں جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں پیش آیا۔ بعض اسے غزوہ حنین سے تعبیر کرتے ہیں جو خود حضور علیہ السلام کے زمانہ میں واقع ہوا۔ وہاں پر مسلمان ایک دفعہ مغلوب بھی ہو گئے مگر پھر اللہ نے غلبہ عطا فرمایا۔ اس واقعہ کا ذکر سورۃ توبہ میں مذکور ہے۔ البتہ شاہ ولی اللہؒ کی تحقیق زیادہ قرین قیاس ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس جنگجو قوم سے مراد روم اور فارس کے لوگ ہیں۔

نزولِ قرآن کے زمانے میں یہ دونوں سلطنتیں دنیا کی سپر پاور تسلیم کی جاتی تھیں۔ یہ باقاعدہ حکومتیں تھیں، جن کی بہت فوج تھی اور دیگر سارا سازوسامان موجود تھا۔ دنیا کی باقی چھوٹی موٹی سلطنتیں بعض روم کے زیرِ اثر تھیں اور بعض فارس کے۔ ان زبردست طاقتوں کے ساتھ مسلمانوں نے حضرت صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں فیصلہ کن جنگیں لڑیں۔ چنانچہ بنی حنیفہ کے ساتھ مقابلہ تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں پیش آیا اور ایرانیوں اور رومیوں کے ساتھ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں زبردست جنگیں ہوئیں۔ چنانچہ قادسیہ کی مشہور و معروف جنگ مسلسل تین دن رات تک لڑی گئی جس کے نتیجے میں اللہ نے ایرانی مجوسیت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ اُدھر شام کے علاقہ میں یرموک کا معرکہ بھی حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ خلافت میں پیش آیا اور جس میں اہلِ ایمان نے بڑی بڑی قربانیاں دیں۔ غرضیکہ اس جنگجو قوم سے روم اور فارس والے لوگ مراد ہیں۔ جن سے جنگوں کے نتیجے میں مسلمانوں کو کثیر مالِ غنیمت میسر آیا۔ صرف جنگ قادسیہ میں شریک ہونے والے مجاہدوں کے حصے میں دیگر سازو سامان کے علاوہ بارہ بارہ سو درہم نقدی بھی آئی۔

فرمایا اگر اطاعت کرو گے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی تو اللہ تمہیں اچھا اجر عطا کرے گا۔ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ اور اگر روگردانی کرو گے جیسا کہ پہلے کر چکے ہو، یعنی جہاد سے گریز کرو گے يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا تو اللہ تعالیٰ تمہیں دردناک سزا دیگا۔ دردناک سزاؤں میں جسمانی اور ذہنی سزا کے علاوہ غلامی کی سزا بھی شامل ہے۔ جب کوئی قوم غداری کا ارتکاب کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ انہیں دوسروں کی غلامی میں بھی جکڑ دیتا ہے۔ بہرحال اللہ نے امید بھی دلادی کہ اگر تم آئندہ صحیح جذبے اور خلوصِ نیت کے ساتھ جہاد میں شریک ہو گے تو اللہ تعالیٰ بہتر اجر عطا کرے گا اور اگر پہلے کی طرح منافقت کا اظہار کیا تو پھر اللہ تعالیٰ عذاب میں مبتلا کرنے پر بھی قادر ہے۔

معذوروں کے لیے استثناء

اگلی آیت میں جہاں اللہ نے بحیثیت مجموعی تمام اہلِ ایمان کو جنگ میں حصہ

لینے کا حکم دیا ہے وہاں معذوروں کو جنگ سے مستثنیٰ بھی قرار دیدیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ اندھے پر کوئی حرج نہیں ہے اگر وہ جنگ میں شریک نہیں ہوتا تو وہ معذور ہونے کی وجہ سے مستثنیٰ ہے۔ اسی طرح وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ لنگڑے پر بھی کوئی حرج نہیں ہے وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ اور نہ ہی بیمار پر کوئی گلہ شکوہ ہے کیونکہ وہ بھی لڑائی لڑنے کے قابل نہیں۔ اس قسم کا استثناء اللہ نے سورۃ توبہ میں بھی بیان فرمایا ہے کہ کمزوروں، مریضوں اور مال سے محروم لوگوں پر کوئی حرج نہیں إِذَا نَصَحُوا لِلّٰهِ وَرَسُولِهٖ (آیت۔۹۱) بشرطیکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے حق میں خیر خواہ ہوں۔ خیر خواہی کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً اگر جسمانی طاقت نہیں رکھتا اور مال موجود ہے تو وہ خرچ کرے۔ اگر مال بھی نہیں ہے تو زبانی طور پر ہی اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کا حق ادا کرے۔ اسلام کے حق میں تبلیغ کرے۔ نہ کہ دین کے خلاف پراپیگنڈا شروع کر کے دین کی بنیادوں کو کمزور کرنے کی کوشش کرے۔ اگر کوئی شخص معذور ہونے کے باوجود دین اور مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہے تو وہ معذوروں میں شمار نہیں ہوگا۔

اطاعت پر جنت کی بشارت

آگے فرمایا وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی تابعداری کرے گا، اُن کے دین کے ساتھ خیر خواہی کرے گا اور اُن کے احکام کی تعمیل کرے گا۔ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ اللہ تعالیٰ اُسے باغات میں داخل کرے گا جن کے سامنے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ تو آخرت کی جزا ہے۔ تاہم دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ انہیں اُن کی قربانی کی بدولت تسلط عطا فرمائے گا۔ یہودیوں نے اللہ کے دین کو بگاڑ دیا، نافرمان بن گئے تو اللہ نے اُن کو عطا کی ہوئی نعمت بھی چھین لی اور وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہو کر رہ گئے۔ بہرحال اس حصہ آیت کے مطابق مذکورہ انعام اطاعت پر ملتا ہے۔ جیسا کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو حاصل ہوا۔

روگردانی پر سزا

پھر فرمایا وَمَنْ يَتَوَلَّ اور جو کوئی روگردانی کرے گا۔ احکام الٰہی کو تسلیم نہیں کرے گا
اُن پر عمل پیرا نہیں ہو گا۔ اور خاص طور پر جہاد سے گریز کرے گا۔ تو اللہ نے فرمایا
يُعَذِّبْهُ عَذَابًا أَلِيمًا تو وہ اسے دردناک عذاب میں بھی مبتلا کر دے گا۔ عذاب
میں جسمانی، ذہنی اور مادی ہر قسم کی سزا شامل ہے۔ غلامی بھی بڑی شدید قسم کی سزا
ہے جس میں مسلمان عرصہ دراز سے مبتلا چلے آ رہے ہیں اور یہ اللہ اور اس کے رسول
کی نافرمانی ہی کا نتیجہ ہے۔ اسی غلامی کی وجہ سے مسلمان ذلیل ہو رہے ہیں۔ ان میں جہاد
اور قربانی کا جذبہ ختم ہو چکا ہے، ضمیر بک چکا ہے اور یہ لہو و لعب میں مشغول ہیں۔
مسلمانوں کی دنیا میں پچاس سے زیادہ ریاستیں ہیں مگر کوئی امریکہ کا غلام ہے۔ کوئی
روس کا اور کوئی کسی دوسرے یورپی ملک کا۔ آج کے مسلمان قرآن کے پروگرام کو فراموش
کر چکے ہیں اور اغیار کے باطل نظریات کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ طرح
طرح کی مشکلات میں گرفتار ہیں۔

صحابہ کرامؓ اور سلف صالحینؒ نے جذبہ جہاد کو بیدار کیا، موت کی فکر کو قبول کیا
تو ساری دنیا پر غلبہ حاصل کر لیا مگر آج مسلمان کی نہ سیاست اپنی ہے، نہ معیشت
اور نہ معاشرت، ہر معاملے میں نظریں غیروں کی طرف اٹھتی ہیں۔ ہمارے منصوبے
اغیار بناتے ہیں۔ اور پھر اُن پر عملدرآمد کراتے ہیں، ہمارے تمام وسائل اُن کی جیب
میں پڑے ہیں اور ہم لاچار بن کر اُن کا منہ تک رہے ہیں۔ جب تک مسلمان اپنے
پاؤں پر کھڑا نہیں ہو گا، اپنے مسائل کا حل خود تلاش نہیں کرے گا، اپنے وسائل
اپنی افرادی قوت کے ذریعے استعمال نہیں کرے گا، یہ غلامی کی زنجیروں سے
نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ ہمارے سلف نے تلوار کی دھار پر چل کر اس دین
کو زندہ رکھا۔ مسلمانوں کی تاریخ قربانیوں سے بھری پڑی ہے اللہ نے ان کو
دنیا میں عزت اور غلبہ دیا۔ مگر جب ہم اپنے ہی اصولوں کو ترک کر بیٹھے، سہل انگار
ہو گئے اور دوسروں کے اشاروں پر ناچنے لگے تو اللہ نے بھی ہم سے رخ پھیر لیا اور
ہمیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ
فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ
وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا
وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۹﴾ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ
كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ
النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ
صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۲۰﴾ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا
قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرًا ﴿۲۱﴾ وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ
لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۲۲﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ
قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚۖ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾

ترجمہ:- البتہ تحقیق اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے
جب کہ وہ بیعت کر رہے تھے آپ کے ہاتھ پر درخت
کے نیچے۔ پس اللہ نے معلوم کیا جو کچھ ان کے دلوں
میں تھا ۔ پس اتارا اس نے اطمینان ان پر ، اور بدلہ
دیا ان کو فتح قریب کا (۱۸) اور بہت سی غنیمتوں کا
جن کو وہ لیں گے ، اور اللہ تعالیٰ زبردست اور

حکمت والا ہے ⑲ اللہ نے وعدہ کیا ہے تمہارے ساتھ بہت سی غنیمتوں کا جن کو تم حاصل کرو گے پس جلدی کی ہے اُس نے تمہارے لیے اس (غنیمت) کو، اور روک دیا ہے لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے اور تاکہ یہ نشانی ہو ایمان والوں کے لیے، اور چلائے گا وہ تم کو سیدھے راستے پر ⑳ اور ایک دوسری فتح بھی ہے جس پر تم ابھی قادر نہیں ہوئے اللہ تعالیٰ احاطہ کرتا ہے اُس کا۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ㉑ اور اگر لڑتے تم سے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تو پشت پھیر کر چلے جاتے، پھر نہ پاتے وہ کسی کو حمایتی اور نہ مددگار ㉒ اللہ کا دستور ہے اُن لوگوں میں جو پہلے گزرے ہیں، اور ہرگز نہ پاؤ گے اللہ کے دستور میں تبدیلی ㉓

ربطِ آیات

پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے سفرِ حدیبیہ سے پیچھے رہ جانے والے منافق قسم کے کمزور لوگوں کی مذمت بیان فرمائی اور پھر پیچھے اور مخلص ایمانداروں کے متعلق فرمایا کہ جب آپ غنیمت حاصل کرنے کے لیے خیبر کی سرزمین کی طرف جائیں گے تو منافق لوگ بھی ساتھ جانے کی خواہش کریں گے، مگر اللہ نے منع فرما دیا کہ اللہ کا یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ خیبر کی طرف بھی وہی لوگ جائیں گے جو حدیبیہ کے مقام پر بیعتِ رضوان میں شامل تھے۔ جو لوگ وہاں نہیں گئے وہ خیبر کے مالِ غنیمت سے بھی محروم رہیں گے۔ پھر اللہ نے منافقوں کی گندی ذہنیت کا ذکر فرمایا کہ وہ یوں کہیں گے کہ تم حسد کی وجہ سے ہمیں خیبر کے سفر میں لے جانے کے لیے تیار نہیں ہو، اللہ نے فرمایا کہ ایسی بات نہیں ہے

بلکہ خود یہی لوگ بے سمجھ ہیں۔ جن کی نیت اور ارادے صحیح نہیں۔ جہاں فائدے کی بات نظر آتی ہے۔ وہاں دوڑ کر جاتے ہیں اور جہاں نقصان اٹھانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ وہاں سے پہلو بچا جاتے ہیں۔

پھر اللہ نے ساتھ ہی توقع بھی دلا دی کہ آئندہ تمہیں سخت جنگجو قوم کے ساتھ جنگ کی دعوت دی جائیگی۔ اگر تم نے وہاں صحیح عزم کا ثبوت دیا تو پھر تمہیں بہتری نصیب ہوگی۔ اللہ نے بعض معذوروں کو جہاد میں شرکت سے مستثنیٰ بھی قرار دے دیا جن میں اندھے، لنگڑے اور بیمار شامل ہیں۔ فرمایا اگر یہ جہاد میں شرکت نہ کریں تو ان پر کوئی حرج نہیں بشرطیکہ یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کے حق میں مخلص ہوں اور اپنے کسی فعل یا قول سے اسلام اور اہل اسلام کو نقصان نہ پہنچائیں البتہ تندرست آدمی جو جہاد میں حصہ لینے کی جسمانی یا مالی استطاعت رکھتا ہو وہ ضرور شریک ہو، اس کے لیے کوئی معافی نہیں ہے۔

اللہ کی رضا کا اعلان

اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے بیعت رضوان کرنے والوں کی تعریف کی ہے اور انہیں دوسرے لوگوں کے لیے بطور دلیل پیش کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ البتہ تحقیق اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا مومنوں سے اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ جب کہ وہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے، درخت کے نیچے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ حدیبیہ کے مقام پر ایک کیکر کا درخت تھا جس کے نیچے بیٹھ کر حضور علیہ السلام نے تقریباً پندرہ سو صحابہؓ سے سر دھڑ کی بازی لگا دینے کی بیعت لی تھی۔ آگے ارشاد فرمایا فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ پس معلوم کر لیا اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ان کے دلوں میں تھا یعنی اللہ تعالیٰ کو ان صحابہ کرامؓ کے خلوص و محبت اور جذبہ جہاد کا علم اچھی طرح تھا۔ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ پس اللہ تعالیٰ نے ان پر اطمینان و سکون نازل فرمایا۔ ان کے دل میں کمزور شرائط پر صلح کی جو خلش تھی وہ دور ہو گئی وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا اور ایک قریبی فتح بھی عطا فرمائی یعنی فتح خیبر کی خوشخبری دی جو واقعہ

حدیبیہ سے تین ماہ بعد ہی اللہ نے عطا کر دی۔ اور اس ضمن میں فرمایا وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا اور بہت سی غنیمتوں کا حصول بھی شامل تھا۔ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا اور اللہ تعالیٰ زبردست اور حکمت والا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو ہر چیز پر غالب ہے، وہ کفار کو تباہ و برباد کرنے پر بھی قادر تھا اور مسلمانوں کو بلا روک ٹوک عمرہ کروا سکتا تھا۔ مگر اس نے نہایت حکمت کے ساتھ ایسا انتظام فرمادیا کہ خود کفار کے ہاتھوں ایسی شرائط پیش کروائیں جن کی وجہ سے اسلام کو ترقی نصیب ہوئی اور وہ بہت جلد مغلوب ہو گئے۔

صلح حدیبیہ میں شریک مسلمانوں کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا أَنْتُمْ خَيْرُ أَهْلِ الْأَرْضِ تم روئے زمین پر بہترین لوگ ہو۔ نیز آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا لَا يَدْخُلُ النَّارَ أَحَدٌ بَايَعَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ جن لوگوں نے اس درخت کے نیچے بیٹھ کر میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے اُن میں سے کوئی بھی دوزخ میں نہیں جائے گا۔ اس جماعت میں عبد ابن قیس انصاری ایک منافق آدمی تھا وہ بیعتِ رضوان میں شریک نہیں ہوا تھا کیونکہ اُس کا سُرخ اونٹ گم ہو گیا تھا اور وہ اُسی کی تلاش میں پھر تا رہا۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ بیعتِ رضوان میں شریک لوگوں میں سے کوئی بھی جہنم میں نہیں جائے گا کیونکہ اللہ نے ان کی غلطیوں کو معاف کر دیا ہے سوائے سُرخ اونٹ والے کے۔

خلفائے راشدینؓ کے ایمان کی شہادت

امام ابو بکر جصاصؒ اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت میں خلفائے راشدینؓ کے کامل الایمان ہونے کی شہادت موجود ہے کیونکہ وہ سب اس بیعت میں موجود تھے اور اللہ نے سب کے لیے اپنی رضا کا اعلان فرمادیا۔ حضرت عثمانؓ بیعت کے وقت حدیبیہ کے مقام پر موجود نہیں تھے کیونکہ وہ مسلمانوں کے سفیر کی حیثیت سے کفار سے گفت و شنید کے لیے مکہ میں تھے۔ چنانچہ صحیحین میں موجود ہے کہ جب تمام حاضر صحابہؓ نے حضور علیہ السلام کے دستِ مبارک پر مذکورہ بیعت کر لی تو آپ نے فرمایا کہ اس وقت عثمانؓ ہم میں موجود نہیں ہیں، لہٰذا اُن کی طرف سے میں خود بیعت

کرتا ہوں۔ چنانچہ آپ نے اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر فرمایا کہ یہ عثمانؓ کی طرف سے بیعت ہے۔ روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے بعض صحابہؓ سے آغاز، درمیان میں اور پھر آخر میں کرر بیعت بھی لی جن میں ایک نوجوان صحابی سلمہ ابن اکوعؓ بھی شامل ہیں۔ تاریخ میں ان کے کارہائے نمایاں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ تمام صحابہؓ فضیلت کے لحاظ سے بدری صحابہؓ کے بعد دوسرے نمبر پر آتے ہیں۔ اور یہ سارے مخلص مسلمان تھے، اللہ اُن سے راضی ہو گیا۔

اب شیعہ لوگ خلفائے راشدینؓ اور دوسرے صحابہؓ کے متعلق گمراہ کن پراپگنڈا کرتے ہیں اور ان کے ایمان میں شک کرتے ہیں، حالانکہ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور حضور علیہ السلام نے اُن کو عام معافی کی بشارت بھی سنا دی۔ اُن کا ذکر آخری رکوع میں پھر آ رہا ہے۔ انہوں نے موت کی فکر کو قبول کرنے کی بیعت کی تھی اور حضور علیہ السلام کے دست مبارک پر ہاتھ رکھ کر واضح طور پر اقرار کیا تھا لَا نَفِرُّ کہ ہم دشمن کے مقابلے میں بھاگیں گے نہیں بلکہ آخر دم تک لڑیں گے۔ لہٰذا ان صحابہؓ کے ایمان میں شک کرنا بذات خود منافقت کی علامت ہے۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ جس دن سے مسلمانوں نے موت کی فکر کو قبول کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اُسی دن سے اُن پر زوال آنا شروع ہو گیا ہے۔ یہ برگزیدہ لوگ یرموک، قادسیہ، مصر اور خراسان کے معرکوں میں کھیل کود کے لیے تو نہیں گئے تھے، بلکہ جان ہتھیلی پر رکھ کر اللہ کی رضا کے لیے گئے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں خراسان کے چپہ چپہ میں کافروں سے جنگیں ہوئیں۔ ایک ایسا موقع بھی آیا کہ تین لاکھ خاقانی لشکر کے مقابلے میں مسلمان مجاہدوں کی تعداد صرف دس ہزار تھی۔ اتنی زبردست لڑائی ہوئی کہ ایک مجاہد بھی زندہ نہ بچا۔ پھر مسلمانوں کی دوسری جماعت آئی تو اللہ نے کافروں کے خلاف مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔ اسی موت کی فکر پر بیعت رضوان ہوئی تھی اور اس جماعت پر اللہ نے اپنی رضا کا اعلان فرما دیا تھا۔

قریبی فتح

دراصل صلح حدیبیہ مسلمانوں کی اخلاقی فتح (MORAL VICTORY) تھی جسے حضور علیہ السلام نے مسلمانوں کے حق میں کمزور شرائط کو بھی تسلیم کر لیا۔ لوگوں کے دل میں تردد تھا مگر اللہ نے اُن کے دلوں میں اطمینان نازل فرما کر اس تردد کو دور کر دیا البتہ قریبی فتح سے مراد خیبر کی فتح ہے جو معاہدہ حدیبیہ سے چند ماہ بعد ہی مسلمانوں کو حاصل ہو گئی۔ خیبر مدینہ سے تقریباً ایک سو میل دور بطرف شمال تھا یہ علاقہ بڑا سرسبز تھا۔ وہاں پہ زرخیز زمینیں اور ہرے بھرے باغات اور کنوئیں تھے۔ یہاں کے یہودیوں نے غزوہ خندق کے موقع پہ مسلمانوں کے خلاف سازش کی تھی، لہذا مسلمانوں نے اُن پہ حملہ کر کے اُن سے یہ علاقہ چھین لیا۔ جس سے مسلمانوں کی معاشی تنگی آسودگی میں تبدیل ہو گئی۔ اللہ نے فرمایا وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا اللہ نے تمہارے ساتھ بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے جن کو تم حاصل کرو گے فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ پس یہ غنیمت تمہارے لیے جلدی مقرر کر دی ہے۔ اس سے مراد بھی خیبر کی فتح اور وہاں سے آمدہ مال غنیمت ہے جو بہت تھوڑے وقت میں مسلمانوں کو حاصل ہو گیا۔ پھر بعد میں بڑی بڑی فتوحات ہوئیں اور مسلمانوں کو ہر چیز کی فراوانی حاصل ہو گئی۔

اس کے علاوہ فرمایا کہ اللہ نے تمہارے ساتھ یہ احسان بھی کیا وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ اور لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا، یعنی کافروں نے تم پہ ہاتھ نہ اٹھایا۔ چنانچہ نہ تو حدیبیہ کے مقام پہ لڑائی ہوئی اور نہ ہی خیبر کے معرکہ میں کوئی زیادہ مزاحمت ہوئی۔ ایک معمولی سی جھڑپ ہوئی اور پھر یہودی مغلوب ہو گئے مطلب یہ کہ مسلمانوں کو جنگ کے ذریعے جانی اور مالی نقصان بھی نہ ہوا۔ فرمایا ایسا اس لیے کیا وَلِتَكُونَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ تاکہ مسلمانوں کے لیے اس بات کی علامت بن جائے کہ اللہ تعالیٰ قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کا مالک ہے اور وہ اپنے وعدے کے مطابق مخلص مسلمانوں کو ہر موقع پہ غالب بنائے گا۔ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا اور تم کو سیدھے راستے کی راہنمائی بھی فرمائے گا۔ وہ تمہاری نیتوں اور ارادوں سے واقف ہے

لہذا وہ تمھیں ہر معرکے میں ثابت قدم رکھے گا اور کامیابی عطا فرمائے گا۔

فرمایا اس قریبی فتح کے علاوہ وَاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا دوسری فتح بھی ہے جس پر تم ابھی قادر نہیں ہوئے اور یہ بعد میں حاصل ہوگی قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا اللہ تعالیٰ نے اس فتح کا بھی احاطہ کر رکھا ہے اور وہ بھی جلدی ہی حاصل ہو جائے گی مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس فتح سے مراد فتح مکہ ہے جو ۸ھ میں مسلمانوں کو حاصل ہوگئی اور بعض لوگ دوسری فتوحات پر محمول کرتے ہیں جو مسلمانوں کو قلیل عرصہ میں حاصل ہوگئیں۔ فرمایا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ وہ تمھیں ہر طرح سے کامیابی عطا فرمائے گا بشرطیکہ تمھارا اخلاص، ایمان، جذبہ جہاد اور رضائے الٰہی کی طلب کمال درجے کی ہو جب تک تم مال وجان کی قربانی کے لیے مستعد رہو گے، اللہ تعالیٰ بھی اپنا وعدہ پورا کرتا رہے گا۔ اور تمھیں ہر معرکے میں فتح نصیب ہوتی رہے گی۔

کفار کی ناکامی

آگے ارشاد ہوتا ہے وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ اور اگر یہ کافر لوگ تمھارے ساتھ جنگ کرتے تو پشت پھیر کر بھاگ جاتے۔ یہ واقعہ حدیبیہ ہی سے متعلق بات ہو رہی ہے کہ وہاں پہ جنگ کی نوبت تو نہ آئی، تاہم اگر بالفرض کافر ہتھیار بند ہو کر تم سے جنگ شروع کر ہی دیتے تو پھر اللہ تعالیٰ کو تمھارا خلوص اور تمھاری جانبازی اس قدر پسند تھی کہ وہ تمھارے مقابلے میں ضرور شکست کھا جاتے۔ اگرچہ تم تعداد میں اُن سے کہیں کم تھے۔ اور پھر کافر لوگ بھاگتے وقت ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا نہ اُن کا کوئی حامی ہوتا اور نہ مددگار۔ مطلب یہ کہ انہیں شکست سے کوئی نہ بچا سکتا۔

فرمایا سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ یہ اللہ کا دستور ہے جو پہلے لوگوں میں بھی گزر چکا ہے۔ اللہ کے نبی اور اس کے مخلص پیروکاروں نے جب بھی دشمن کا مقابلہ کیا۔ تو اللہ نے انہیں کامیاب بنایا۔ درمیان میں خواہ کتنے ہی حوادثات پیش آئے ہوں، اہل ایمان کو جان و مال کی قربانی دینی پڑی ہو آزمائش

پر آزمائش آئی ہو مگر اللہ کے پرانے دستور کے مطابق فتح بالآخر اہلِ ایمان کو ہی حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ (المجادلہ-۲۱) کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب رہیں گے۔ اس کا یہ بھی فرمان ہے اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْهَادُ (المومن) ہم اپنے رسولوں اور اہلِ ایمان کی دنیا کی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں اور جب وہاں گواہ کھڑے ہوں گے (یعنی قیامت) کو بھی ہم اُن کی مدد کریں گے۔ اللہ کے اس وعدے کا اولین نمونہ حدیبیہ کے موقع پر ظاہر ہوا جب اللہ نے قلیل تعداد کے باوجود اُن کی مدد فرمائی۔ پھر آگے چل کر کبھی ہزاروں مسلمان لاکھوں کافروں، مشرکوں اور اہلِ کتاب پر غالب آتے رہے۔ فرمایا یہ اللہ کا دستور ہے وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا اور آپ اللہ کے دستور میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء اور اُن کے پیروکاروں کی مدد کر کے اُن کو غالب کرتا رہے گا۔

وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم
بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۚ وَكَانَ
اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ﴿٢٤﴾ هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَ
صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوفًا
أَن يَبْلُغَ مَحِلَّهُ ۚ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ
مُّؤْمِنَاتٌ لَّمْ تَعْلَمُوهُمْ أَن تَطَئُوهُمْ فَتُصِيبَكُم
مِّنْهُم مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ لِّيُدْخِلَ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ
مَن يَشَاءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ
عَذَابًا أَلِيمًا ﴿٢٥﴾ إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ
الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ
رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ
وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ
شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿٢٦﴾

ترجمہ :- اور اللہ تعالیٰ کی وہی ذات ہے جس نے
روک دیا اُن (مشرکین مکہ) کے ہاتھوں کو تم سے ، اور
تمہارے ہاتھوں کو اُن سے مکہ شہر کے قریب بعد اس

سے کہ تم کو اُن پر کامیاب کر دیا۔ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ
تم کام کرتے ہو اُس کو دیکھتا ہے (۲۴) وہ لوگ وہی
ہیں جنہوں نے کفر کیا اور روکا تمہیں مسجدِ حرام سے۔
اور قربانی کے جانور روکے ہوئے تھے (اس بات
سے) کہ پہنچیں وہ اپنے ٹھکانے تک۔ اور اگر نہ ہوتے
کچھ مومن مرد اور کچھ مومن عورتیں جن کو تم نہیں جانتے کہ
تم اُن کو پامال کر دوگے پس پہنچے گی تم کو اُن کی طرف
سے تکلیف بغیر علم کے، تاکہ اللہ تعالیٰ داخل کرے
اپنی رحمت میں جس کو چاہے۔ اور اگر وہ الگ ہوتے
تو ہم سزا دیتے اُن لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا اُن
میں سے دردناک سزا (۲۵) جب کہ ٹھہرایا اُن لوگوں نے
جنہوں نے کفر کیا اپنے دلوں میں اکڑ جاہلیت کی۔ پس
اُتاری اللہ نے تسلی اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر
اور لازم کر دیا اُن پر تقویٰ کا کلمہ، اور وہ اُس کے
زیادہ لائق تھے اور اُس کے اہل تھے۔ اور اللہ تعالیٰ
ہر ایک چیز کو جاننے والا ہے (۲۶)

شانِ نزول

سورۃ الفتح میں واقعہ حدیبیہ کے مختلف پہلوؤں کی طرف اشارات ملتے
ہیں۔ حدیبیہ کا معاہدہ طے پا جانے کے بعد بھی مشرکین کے بعض گروہوں نے
غنڈہ گردی کا مظاہرہ کیا، اور کچھ لوگ مختلف راستوں سے ہو کر مسلمانوں کے ٹھکانے
پر پہنچے تاکہ کسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کام تمام کر دیا جائے۔ اور یہ بات
نہ بھی پورا ہو تو کم از کم مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ کر کے اُن کو مشتعل تو کیا جا سکے گا،
اور اس طرح اُن کو اشتعال دلا کر اُن کو لڑائی پر آمادہ کیا جا سکے گا۔ مشرکین کے
اسی منصوبے کے تحت ایک مسلمان شہید بھی ہو گیا۔ سکیم کے مطابق کفار کے ستر

آدمی مسلمانوں میں افراتفری پیدا کرنے کے لیے پہاڑی کی پچھلی طرف سے اُترے اور انہوں نے مسلمانوں کو للکارا۔ اس پر کسی مسلمان نے بلند آواز سے یہ بھی کہا کہ ہمارے ساتھی ابن زنیم کو قتل کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا مسلمانو! مقابلے کے لیے نکل آؤ۔ ایسے موقع پر مسلمان مشتعل ہو سکتے تھے مگر ہوا یہ ہے کہ پیشتر اس کے کہ حملہ آور مزید کوئی نقصان پہنچاتے وہ سب کے سب مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ حضرت سلمہ بن اکوعؓ کسی درخت کے پاس تھے، وہاں پر چار مشرکین آئے اور آپ نے اکیلے ہی سب کو قابو کر لیا۔ پھر یہ سارے ستر آدمی قیدیوں کی صورت میں حضور علیہ السلام کے سامنے پیش کیے گئے۔ آپ چاہتے تو ان سے انتقام لیا جا سکتا تھا کیونکہ انہوں نے ایک مسلمان کو شہید بھی کر دیا تھا۔ مگر اس وقت تک معاہدہ حدیبیہ طے پا چکا تھا، اسلئے آپ نے مزید کوئی کارروائی کرنا مناسب نہ سمجھا، اور تمام قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ آپ نے فرمایا مِنْهُمْ بَدْءُ الْفُجُوْرِ وَثِنَاهُ یعنی برائی کی ابتدا بھی انہی کی طرف سے ہوئی اور اس کا دہرانا بھی انہی کی طرف سے ہوا ہے۔ لہٰذا ان کو چھوڑ دو۔ مسلمان اس موقع پر مکہ بھی فتح کر سکتے تھے مگر مصلحت اسی میں تھی کہ صلح کی پاسداری کی جائے کیونکہ یہ آگے چل کر مسلمانوں کے حق میں بہت مفید ثابت ہونے والی تھی۔ چنانچہ طرفین کی طرف سے کسی نے بھی باقاعدہ جنگ کا آغاز نہ کیا۔

جنگ سے اجتناب

آج کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ اللہ تعالیٰ کی ذات وہی ہے جس نے مشرکین مکہ کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا اور تمہارے ہاتھوں کو اُن کی طرف بڑھنے سے روک دیا۔ مطلب یہ کہ جنگ کی نوبت نہیں آئی اور یہ واقعہ کہاں پیش آیا بِبَطْنِ مَكَّةَ شہر مکہ کے قریب۔ بطن کا لغوی معنیٰ تو پیٹ ہوتا ہے یعنی عین مکہ کے بیچ مگر یہاں پر معنیٰ قریب ہے کیونکہ معاہدہ حدیبیہ شہر میں نہیں طے پایا تھا بلکہ تقریباً دس میل دُور حدودِ حرم پر یہ سارے واقعات پیش آئے مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ بعد اس کے کہ تم کو

اُن پر کامیاب کر دیا گیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ مشرکین کے ستر آدمی تمہاری گرفت میں آ چکے تھے۔ اگر تم انتقام لینا چاہتے تو لے سکتے تھے مگر حضور علیہ السلام نے معاہدہ صلح پہ عملدرآمد کرتے ہوئے تمام قیدیوں کو رہا کر دیا وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا اور تم جو بھی کام کرتے ہو سب اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہیں۔ مشرکین کی سازشیں اور شرارتیں اور اہل ایمان کا جذبہ ایمان و قربانی اور پھر اس پہ استقامت سب اللہ کے سامنے ہیں، اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

عدم تصادم کی مصلحت

آگے اللہ نے مشرکین کی مذمت بیان کرتے ہوئے فرمایا هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا۔ وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اور تمہیں مسجد حرام سے روکا یعنی بیت اللہ کا طواف کرنے اور صفا مروہ کی سعی کرنے کی اجازت نہ دی حالانکہ تم کسی جنگ کے لیے نہیں بلکہ خالصتاً عمرہ کی ادائیگی کے لیے آئے اور ہدی کے جانور بھی تمہارے ساتھ تھے اور پھر مکہ کا یہ قدیم سے دستور بھی چلا آ رہا تھا کہ قریش کسی بڑے سے بڑے دشمن کو بھی حج و عمرہ کی ادائیگی سے نہیں روک سکتے تھے مگر یہاں وہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خائف تھے اور سمجھتے تھے کہ مکہ میں داخل ہو کر شاید یہ باقی مسلمانوں کو بھی ساتھ لے جائیں، لہٰذا انہوں نے مکہ شہر اور مسجد حرام میں داخل ہونے سے روک دیا۔ فرمایا مشرکین نے نہ صرف اہل ایمان کو شہر میں داخلے سے روکا بلکہ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ قربانی کے جانوروں کو بھی قربان گاہ تک پہنچنے سے روکا، وہ جن کو مسلمان اپنے ساتھ لائے تھے اور جن کے گلوں میں قلادے پڑے ہوئے تھے جو کہ قربانی کے جانور کی معروف علامت سمجھی جاتی تھی۔ اللہ نے فرمایا کہ اگر مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دے دی جاتی تو یہ کامیاب ہو سکتے تھے مگر عدم تصادم میں ایک اور مصلحت بھی تھی، اور وہ یہ کہ مکہ کے بعض ایماندار مرد اور عورتیں اپنے ایمان کو چھپا کر مکہ میں گزر اوقات کر رہے تھے کیونکہ ان کے پاس ہجرت کر جانے کے لیے بھی وسائل موجود نہیں تھے۔ ایسے موقع پہ اگر مسلمان مکہ پہ چڑھائی کر دیتے تو مشرکوں

کے ساتھ وہ بے گناہ ایمان دار بھی مارے جاتے کیونکہ مشرک لازماً انہیں جنگ کے لیے آگے لاتے۔ اور اگر وہ انکار کرتے تو خود مشرکوں کے مظالم کا شکار بنتے۔ لہٰذا مصلحت اسی میں تھی کہ جنگ کو ملتوی کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ ایمان کو چھپانے والے یہ لوگ حضور علیہ السلام کو مشرکین کے منصوبوں سے بھی خفیہ طور پر آگاہ کرتے رہتے تھے۔ لہٰذا اُن کی ان خدمات کے پیش نظر بھی جنگ کو نہ چھیڑا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے اسی مصلحت کو یہاں بیان فرمایا ہے وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اور اگر نہ ہوتے مومن مرد اور مومن عورتیں جنہیں تم نہیں جانتے اَنْ تَطَئُوْهُمْ کہ جن کو تم لاعلمی کی وجہ سے پامال کر دیتے۔ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ تو اس لاعلمی کی وجہ سے تمہیں اُن کی طرف سے سخت تکلیف پہنچتی۔ مطلب یہ کہ اگر مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمان ہی مارے جاتے تو تمہیں اس کا سخت خلش ہوتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر جنگ کی اجازت نہ دی۔

عدم تصادم کی ایک مصلحت یہ بھی تھی لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ تاکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے اپنی رحمت اور مہربانی میں داخل کر دے۔ یعنی آج تو یہ مشرک اور کافر بڑے غرور و تکبر کا اظہار کر رہے ہیں اور ایمان کو قبول کرنے کیلئے ہرگز تیار نہیں ہیں، مگر عین ممکن ہے کہ تھوڑا سا موقع ملنے پر یہی لوگ ایمان لے آئیں اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی اُن کے شامل حال ہو جائے۔ پھر خاص طور پر کمزور اور نادار مسلمانوں کے متعلق فرمایا لَوْ تَزَيَّلُوْا اگر یہ مشرکین سے الگ ہوتے یعنی اُن میں رلے ملے نہ ہوتے جس کی وجہ سے اُن کو پہچاننا مشکل تھا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا تو ہم کافروں اور مشرکوں کو دردناک سزا دیتے۔ یہ تو ایمان کو مخفی رکھنے والے لوگوں کی وجہ سے فی الوقت مشرک بھی سزا سے بچ گئے، ورنہ ان کو پتہ چل جاتا کہ اللہ کے بندوں کو عمرہ کی ادائیگی سے کس طرح روکا جاتا ہے۔

صلح حدیبیہ کی ایک شق یہ بھی تھی کہ بیرونی افراد و قبائل میں سے جس کا جی

چاہے مسلمانوں کی حمایت کرے اور جس کا جی چاہے مشرکوں کا طرفدار بن جائے۔ اس معاملہ میں فریقین صلح کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اس شق کی وجہ سے کمزور مسلمانوں کو بھی حق مل گیا تھا کہ وہ اپنے ایمان کو کھلم کھلا اعلان کر کے مسلمانوں کی حمایت حاصل کر لیں۔ اور اس طرح مشرکوں کے مظالم سے بچ جائیں۔ صلح حدیبیہ میں یہ بھی ایک اہم مصلحت تھی۔

جاہلیت کی ہٹ دھرمی

اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی اس وقت کی ضد اور ہٹ دھرمی کی مذمت بیان کی ہے اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِیَّةَ حَمِیَّةَ الْجَاهِلِیَّةِ جب کہ ٹھہرائی کفر کرنے والوں نے اپنے دلوں میں جاہلیت کی اکڑ۔ مشرکین اور کفار کی جاہلانہ حمیت کی کئی مثالیں صلح حدیبیہ کے موقع پہ سامنے آئیں۔ مثلاً معاہدہ کے آغاز میں جب حضور علیہ السلام نے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لکھوایا تو مشرکین نے اعتراض کر دیا کہ ہم کسی رحمٰن اور رحیم کو نہیں جانتے، لہذا پرانے دستور کے مطابق بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ لکھا جائے۔ آپ نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے یہی الفاظ لکھوا دیئے۔ پھر آپ نے فریقین معاہدہ کے نام لکھوائے هٰذَا مَا قَاضٰى مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ یہ وہ معاہدہ ہے جو اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش مکہ کے درمیان طے پایا ہے۔ اس پہ پھر مشرکین کی طرف سے اعتراض ہوا کہ اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول تسلیم کر لیں تو پھر جھگڑا کیا رہ جاتا ہے۔ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے۔ اس کی جگہ محمد ابن عبد اللہ کے الفاظ لکھے جائیں حضور علیہ السلام نے یہ مطالبہ بھی مان لیا اور حضرت علیؓ سے فرمایا کہ محمد رسول اللہ کاٹ دو۔ وہ کہنے لگے کہ مجھ سے تو یہ کام نہیں ہو سکے گا۔ لہذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے دست مبارک سے رسول اللہ کے الفاظ کاٹ دیئے اور ان کی جگہ محمد ابن عبد اللہ لکھوا دیا۔

معاہدہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر مکے کا کوئی آدمی بھاگ کر مدینہ چلا جائیگا تو مسلمان اُسے واپس لوٹا دیں گے، اور اگر کوئی مدینہ سے بھاگ کر مکہ آجائے، تو اُسے واپس نہیں کیا جائے گا۔ صحابہؓ کو اس شرط کا بھی بڑا قلق تھا کیونکہ یہ شرط فریقین کی برابری کی حیثیت کے خلاف تھی۔ اُس وقت مشرکوں کی قید میں بہت سے ایماندار تھے

مگر اس شرط کی رو سے اُن کو رہا نہ کرایا جا سکا۔ مگر آگے چل کر اس شرط کا فائدہ بھی مسلمانوں کو ہی پہنچا۔ تو اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی اسی ضد، عناد، اکڑ اور جاہلانہ حمیت کا تذکرہ بیان کیا ہے کہ وہ کس قسم کے ہٹ دھرم لوگ تھے۔

نزولِ سکینت

ان حالات میں مسلمانوں کے دل سخت مغموم تھے کیونکہ حضور علیہ السلام نے مسلمانوں کے حق میں بڑی کمزور شرائط کو تسلیم کر لیا تھا۔ اس پر حضور علیہ السلام نے خوشخبری دی کہ صلح حدیبیہ کے ذریعے اسلام کو فتح حاصل ہو گی۔ صحابہؓ نے عرض کیا حضور! کیا یہی فتح ہے کہ ہم نے نہایت ہی کمزور شرائط پر سمجھوتہ کیا ہے تو آپ نے فرمایا، ہاں فَاَنْزَلَ اللّٰہُ سَكِیْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مومنوں پر اطمینان نازل فرمایا جس سے اُن کا سارا تردد دُور ہو گیا اور اطاعت کا جذبہ غالب آ گیا وَ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى اور اللہ نے اُن پر تقویٰ کا کلمہ لازم کر دیا۔ وَ كَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَ اَهْلَهَا اور یہی لوگ اس کلمہ کے زیادہ لائق اور زیادہ حقدار تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق اس کلمۂ تقویٰ سے مراد کلمۂ توحید لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ مومنوں نے اس کلمہ کے تقاضوں کو پورا کر کے ثابت کر دیا کہ وہی اس کے زیادہ حقدار تھے وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے مشرکوں کی نافرمانی، ضد اور عناد بھی اس کے علم میں ہے اور اہل ایمان کے جذبہ اطاعت کو بھی وہ اچھی طرح جانتا ہے انہوں نے موت کی بیعت کر کے اپنے اس جذبہ کا بھرپور انداز میں اظہار کر دیا۔ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے ازلی ابدی علم میں ہیں۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ۭ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿٢٧﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿٢٨﴾

ترجمہ:- البتہ تحقیق سچا کر دکھایا اللہ نے اپنے رسول کو خواب حق کے ساتھ۔ البتہ ضرور داخل ہو گے تم مسجد حرام میں، اگر اللہ نے چاہا، امن سے، مونڈنے والے ہو گے تم اپنے سروں کو اور (کچھ) کترنے والے ہو گے اپنے بالوں کو۔ تم پر کچھ خوف نہیں ہو گا۔ پس اللہ نے جانا جو تم نہیں جانتے۔ پس اللہ نے ٹھہرائی اس کے ورے ایک قریب فتح ﴿٢٧﴾ وہ وہی ذات ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت کے ساتھ اور سچے دین کے ساتھ تاکہ اس کو ظاہر کر دے تمام ادیان پر۔ اور کافی ہے اللہ تعالیٰ گواہی دینے والا ﴿٢٨﴾

واقعہ حدیبیہ کا خلاصہ

آج کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس خواب کا ذکر کیا ہے جو آپ نے عمرہ ادا کرنے سے متعلق دیکھا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ آپ مسجد حرام میں داخل ہوئے

ہیں، بیت اللہ کا طواف اور صفا مروہ کی سعی کی ہے، اور پھر کچھ لوگ سر منڈوا رہے
ہیں اور کچھ بال کترواتے رہے ہیں۔ جب حضور علیہ السلام نے اس خواب کا تذکرہ صحابہ کرامؓ
سے کیا تو وہ بیت اللہ شریف کی محبت میں بیتاب ہو گئے اور انہوں نے سمجھا
کہ انہیں عنقریب بیت اللہ شریف کی زیارت نصیب ہو گی۔ حضور علیہ السلام نے
سفرِ مکہ کا عام اعلان فرما دیا اور لوگوں نے تیاری شروع کر دی حتیٰ کہ تقریباً پندرہ سو
صحابہؓ کی جماعت نے عمرے کا احرام باندھا اور مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہدی
کے جانور بھی ہمراہ تھے اور صحابہؓ کا خیال تھا کہ اپنے پرانے دستور کے مطابق قریش مکہ
انہیں عمرہ کی ادائیگی سے نہیں روکیں گے۔ مگر جب یہ قافلہ حدیبیہ کے مقام پر پہنچا
تو مشرکین نے آگے جانے سے روک دیا۔ صحابہ کرامؓ کو سخت پریشانی لاحق ہوئی کہ اتنا
لمبا سفر کر کے آئے ہیں مگر منزلِ مقصود تک رسائی مشکل ہو رہی ہے۔ جیسا کہ گزشتہ
دروس میں بیان کیا جا چکا ہے مشرکین کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ جاری ہوا جس کے
نتیجے میں صلح کا معاہدہ طے پایا جس کی اولین شرط یہ تھی کہ مسلمان اس سال بغیر عمرہ
ادا کیے واپس چلے جائیں گے، البتہ آئندہ سال صرف تین دن مکہ میں قیام کر کے
عمرہ ادا کر سکیں گے۔ اگرچہ مسلمانوں کے حق میں یہ شرائط نہایت کمزور تھیں۔ مگر
اللہ کے نبی نے انہیں منظور کیا اور قربانی کے جانور وہیں ذبح کر کے احرام کھول
دیئے اور مدینہ کی طرف واپس روانہ ہو گئے۔ جب واپسی کا بیس بائیس میل کا سفر طے
ہوا تو راستے میں یہ سورۃ الفتح نازل ہوئی جس میں صلح حدیبیہ کو فتح مبین قرار دیا گیا،
اور اللہ نے مسلمانوں کے دلوں میں تسکین نازل فرما کر اُن کی خلش کو دور کر دیا اس
سورۃ میں مشرکین کی ضد اور ہٹ دھرمی کا ذکر ہوا، اور جنگ نہ کرنے کی حکمت
بھی بیان ہوئی۔ اس وقت مکہ میں بعض کمزور مسلمان تھے جنہوں نے اپنے ایمان کو
چھپا رکھا تھا اور وہ حضور علیہ السلام کو خفیہ پیغام بھی بھیجتے رہتے تھے۔ اگر اس
وقت جنگ شروع ہو جاتی تو مشرکین انہیں مسلمانوں کے سامنے لا کھڑا کرتے جس
کی وجہ سے سچے مسلمان خود مسلمانوں کے ہاتھوں مارے جاتے۔ اور اگر وہ لوگ مسلمانوں

کے خلاف نکلنے سے گریز کرتے تو مشرکین کے مظالم کا شکار بنتے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں جنگ کے التوا کی یہ بہت بڑی حکمت تھی۔ چنانچہ اللہ نے فرمایا کہ ہم نے تمھارے ہاتھ مشرکوں سے اور مشرکوں کے ہاتھ تم سے روک دیے یعنی جنگ کی نوبت نہیں آنے دی۔

اگرچہ مسلمان اس غیر متوقع واقعے سے مطمئن ہو چکے تھے مگر جب مدینہ واپس پہنچے تو منافقوں نے طعنہ زنی شروع کر دی کہ تم تو کہتے تھے کہ اللہ کے نبی کو خواب آیا ہے اور تم لوگ اس خواب کی صداقت پر یقین کر کے ہی عمرہ کے لیے روانہ ہوئے تھے مگر ناکام لوٹے۔ مسلمانوں نے اس بات کا ذکر حضور علیہ السلام کے سامنے بھی کیا، تو آپ نے فرمایا کہ میں نے جو خواب دیکھا تھا وہ بیان کر دیا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ خواب عمرہ کی ادائیگی کی ہی پیشین گوئی تھی، مگر میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ بیت اللہ کی زیارت اسی سال ہی نصیب ہو جائیگی۔ یہ خواب بالکل سچا ہے اور جیسا کہ صلح کے معاہدہ میں طے پایا ہم انشاء اللہ اگلے سال بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہو سکیں گے۔ چنانچہ اللہ نے اس درس میں اسی خواب کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی قریبی فتح کا بھی۔ اس کے علاوہ پورے عالم میں اسلام کی فتح کا قانون بیان فرمایا ہے، اور پھر سورۃ کی آخری آیت میں اُس جماعت کی صفات آ رہی ہیں جس کے ذریعے دین حق پوری دنیا میں غالب آنے والا تھا۔

نبی کا خواب

ارشاد ہوتا ہے لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ البتہ تحقیق اللہ نے اپنے نبی کے خواب کو حق کے ساتھ سچا کر دکھایا۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے رُؤْيَا الْاَنْبِيَآءِ وَحْيٌ یعنی نبیوں کا خواب ایک قسم کی وحی ہوتی ہے۔ جس کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ نبی کے خواب میں نفسانی یا شیطانی اثر کا احتمال نہیں ہوتا۔ البتہ خواب کی تعبیر میں اشتباہ یا تاخیر واقع ہو سکتی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہجرت سے متعلق جو خواب آیا تھا اُس میں بھی اسی قسم کا اشتباہ واقع ہوا تھا۔ آپ کو خواب میں ہجرت کا ایسا مقام دکھایا گیا تھا جہاں کھجور کے درخت، پانی اور

کھجوریں نظر آئیں، حضور علیہ السلام نے اس مقام کو یمن میں واقع ہجر کے مقام پر محمول کیا حالانکہ ہجرت کا مقام تو اللہ نے مدینہ کو مقرر فرمایا تھا۔ اور مذکورہ نشانیاں وہاں بھی پائی جاتی تھیں۔ اُس وقت مدینہ کو یثرب کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ مطلب یہ کہ نبی کا خواب تو بہرحال سچا ہوتا ہے، البتہ اس کی تعبیر میں اشتباہ ہو سکتا ہے، یا اس کی تکمیل میں تاخیر ہو سکتی ہے۔ عمرہ کی ادائیگی والے خواب کو بھی اللہ نے سچا قرار دیا ہے، تاہم اس کی تکمیل میں ایک سال کا وقفہ آ گیا۔

مسجد حرام میں داخلہ

فرمایا اللہ نے اپنے رسول کا خواب سچا کر دکھایا۔ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ تم انشاء اللہ عنقریب مسجد حرام میں پرامن طریقے سے داخل ہو گے۔ لَتَدْخُلُنَّ میں لام تاکید اور نون ثقیلہ ہے جس کا مطلب ہے کہ تم ضرور بضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے، یعنی اس میں شبہے والی کوئی بات نہیں ہے۔ انشاء اللہ کا لفظ عام طور پر ایسی جگہ استعمال کیا جاتا ہے جہاں کسی چیز کا سو فیصدی یقین نہ ہو بلکہ وہ کام اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہو۔ تاہم بعض مقامات پر انشاء اللہ کا لفظ بے یقینی کے طور پر نہیں بلکہ ادب کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کی مثال حضور علیہ السلام کی بتلائی ہوئی دعا میں بھی ملتی ہے جو قبرستان میں جا کر کی جاتی ہے۔ وہاں آتا ہے کہ اے قبروں والو! تم پر سلامتی ہو وَاِنَّا اِنْ شَآءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ اور ہم بھی انشاء اللہ تم سے جلد ملنے والے ہیں۔ اب اس بات میں تو کوئی شبہ نہیں کہ موت سب پر طاری ہونی ہے اور مرنے والوں کے ساتھ ہی جا کر ملنا ہے مگر یہاں بھی انشاء اللہ کا لفظ محض ادب کے لیے لایا گیا ہے۔ اس سے یہ تعلیم بھی ملتی ہے کہ مستقبل میں پیش آنے والے ہر معاملہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سونپ دینا چاہیئے، بلکہ اس بات کا حکم تو خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ الکہف میں دے دیا ہے۔ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (آیت ۲۳-۲۴) یعنی مستقبل کے کسی کام سے متعلق یوں نہ کہو کہ میں اسے کل انجام دے دوں گا، مگر ساتھ یوں کہو کہ اگر اللہ نے چاہا۔ گویا

اس کو اللہ کے سپرد کر دو۔ اگر اس کی مشیت ہوگی تو تمہارے ارادے کے مطابق کام ہو جائے گا، ورنہ نہیں۔

مذکورہ خواب میں ایک تو اللہ تعالیٰ نے امن و امان کے ساتھ مسجد حرام میں داخلے کی بشارت دی اور ساتھ عمرہ کی ادائیگی کی تصدیق اس طریقے سے کہ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ کہ تم میں سے بعض سروں کو اُسترے کے ساتھ منڈوانے والے ہوں گے اور بعض بالوں کو کتروانے والے۔ چونکہ حجامت عمرے کا طواف اور سعی کرنے کے بعد بنوائی جاتی ہے، اس لیے ان الفاظ میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ تم مسجد حرام میں داخل ہو کر عمرہ بھی ادا کرو گے۔ سر کا منڈوانا یا بالوں کا کترانا حج اور عمرے کا اہم رکن ہے، تاہم سر کا منڈوانا زیادہ افضل ہے۔ حضور علیہ السلام نے سر منڈوانے والوں کے لیے تین دفعہ دعا فرمائی اور بال کٹانے والوں کے لیے صرف ایک دفعہ۔ حجۃ الوداع کے موقع پر بھی خود حضور علیہ السلام نے سر کو منڈوایا تھا، لہٰذا یہ افضل ہے اور ساتھ فرمایا کہ عمرہ کی ادائیگی میں لَا تَخَافُوْنَ تم کسی قسم کا خوف محسوس نہیں کرو گے۔ مسجد حرام میں داخلے کے لیے بھی اٰمِنِيْنَ کا لفظ آچکا ہے اور یہاں عمرے کی ادائیگی کو بھی بلا خوف و خطر قرار دیا ہے۔ اور ساتھ یہ بھی فرمایا فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا اللہ تعالیٰ وہ کچھ جانتا ہے جو تم نہیں جانتے بظاہر تو عمرے کا التوا صحابہؓ کے لیے بڑا پریشان کن تھا، مگر اللہ نے فرمایا کہ اس التوا میں بھی تمہارے لیے کتنی بہتری ہے، یہ اللہ ہی جانتا ہے، تمہارے علم میں نہیں۔ اس نے اپنے علم اور حکمت کی بنا پر بہتری کیا ہے۔

قریبی فتح کی خوشخبری

فرمایا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا اور اس کے ورے اللہ نے قریبی فتح بھی رکھ دی۔ یعنی جو عمرہ ادا نہیں کر سکے اس کی قضا دینے سے پہلے پہلے اللہ تعالیٰ انہیں ایک قریبی فتح سے بھی نوازے گا۔ مطلب یہ ہے کہ عنقریب تمہیں ایک بہت بڑی فتح حاصل ہونے والی ہے جس میں تمہیں بہت سا مال و دولت، زمینیں اور باغات بھی غنیمت میں ملیں گے۔ اس فتح سے مراد

خیبر کی فتح ہے جو حدیبیہ سے واپسی کے جلدی بعد ہی حاصل ہو گئی۔ اہل ایمان خیبر کے اموال سے خوب مستفید ہوئے اور ان کی تنگدستی دور ہو گئی۔ مسلمانوں کے دلوں سے عمرے کی عدم ادائیگی کے قلق کو دور کرنے کے لیے اللہ نے اس قریبی فتح کی خوشخبری بھی راستے میں ہی سنادی۔ بہر حال اس پیشین گوئی کے مطابق اگلے سال یعنی ۷ھ میں مسلمانوں نے نہایت شان و شوکت کے ساتھ عمرہ ادا کیا، اور باعزت واپس آئے۔ یہ اخلاقی فتح یا فتح مبین تھی جس کا ذکر سورۃ کی ابتدا میں آچکا ہے۔ اور مادی فتح خیبر کی صورت میں حاصل ہوئی جس سے نہ صرف علاقے میں یہود کا اثر و رسوخ ختم ہو گیا بلکہ مسلمانوں کے ہاتھ بہت سامال، باغات اور زمینیں بھی آئیں۔

اسلام کی دائمی فتح

اب اگلی آیت میں اللہ نے اسلام کی دائمی فتح کا قانون بھی بتلادیا ہے ارشاد ہوتا ہے۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى اللہ تعالیٰ کی ذات وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت کے ساتھ بھیجا ہے۔ وَدِيْنِ الْحَقِّ اور ساتھ سچا دین بھی عطا کیا ہے۔ اور اس سے مقصود یہ ہے لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ تاکہ وہ اس سچے دین کو دوسرے ادیان پر ظاہر کر دے یعنی غالب کر دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے دین اسلام نازل ہی اس لیے کیا ہے تاکہ دنیا میں صرف یہی دین قائم رہے اور باقی سب ختم ہو جائیں۔ اسی موضوع کی آیات قرآن میں دوسری جگہ بھی موجود ہیں۔ مثلاً سورۃ صف اور سورۃ توبہ میں بھی یہی الفاظ ہیں هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ اور آخر میں ہے وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ اللہ کی ذات وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، تاکہ اسے باقی تمام ادیان پر غالب کر دیا جائے۔ اگرچہ مشرک لوگ اسے ناپسند ہی کریں۔ البتہ اس مقام پر ان آخری الفاظ کی بجائے وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا کے الفاظ ہیں یعنی اللہ ہی کافی ہے گواہی دینے والا۔

ہدایت دین کی روح اور اصل حکمت ہوتی ہے، اور دین حق، اعتقادات،

عبادات، معاملات، معاشرت، سیاست اور اخلاقیات سے متعلقہ اصول اور قوانین ہوتے ہیں۔ اس آیت میں مذکورہ غلبۂ دین کے متعلق شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ عام مفسرین اس آیت کا مفہوم سمجھانے سے عاجز رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضور علیہ السلام کی حیات مبارکہ میں تو دین حق کو کوئی غلبہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ اس وقت تک اسلام جزیرۃ العرب تک پھیلا تھا، اور اس کے باہر قیصر و کسریٰ جیسی عظیم سپر طاقتیں موجود تھیں جو ساری دنیا پر چھائی ہوئی تھیں۔ اس سلسلے میں حضرت ضحاکؒ فرماتے ہیں کہ اس غلبہ سے مراد وہ غلبہ ہے جو حضرت عیسٰی علیہ السلام کے دوبارہ نزول کے بعد دین حق کو حاصل ہوگا۔ اس کے برخلاف مفسر قرآن حضرت حسن ابن فضیلؒ کا قول ہے کہ اس غلبہ سے مراد سیاسی غلبہ نہیں بلکہ دلیل اور برہان کا غلبہ ہے۔ یعنی دلائل کی رو سے دین اسلام تمام ادیان پر ہمیشہ غالب رہے گا۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ دیگر مفسرین میں سے امام شافعیؒ کی توجیہہ زیادہ بہتر ہے کہ فسرک اہل کتاب اور عرب کے امی لوگوں دونوں گروہوں میں پایا جاتا تھا جس کو مغلوب کرنا مقصود تھا چنانچہ عرب کے سارے امی تو حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارکہ میں ہی مغلوب ہو گئے سارا عرب اسلام کے زیر نگیں آ گیا، بعض مشرک مارے گئے اور بعض نے اسلام قبول کر لیا اور اس طرح سارا جزیرۃ العرب شرک کی نجاست سے پاک ہو گیا۔ نصاریٰ میں سے نجران اور شام کے عیسائیوں نے مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کر کے جزیہ دینا قبول کر لیا اور اس طرح اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے وہ اسلام کے زیر نگیں آ گئے۔ یہودیوں میں سے بنی نضیر، بنی قریظہ، بنی قینقاع اور خیبر والے سب مغلوب ہو گئے۔ بعض جلا وطن کر دیے گئے اور بعض بالکل ہی ختم ہو گئے۔ چنانچہ اس لحاظ سے دین حق کو باقی ادیان پر غلبے کا نام دیا جا سکتا ہے۔

امام شاہ ولی اللہؒ اس توجیہہ سے مکمل اتفاق نہیں کرتے بلکہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں جس غلبۂ دین کی بات کی گئی ہے، وہ مکمل طور پر خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں واقع ہوا۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں تو قیصر و کسریٰ جیسی سپر طاقتیں

دنیا میں موجود تھیں، اور یہ دونوں ایک طرف اباحیت اور دوسری طرف ارداد کے عقیدے میں مبتلا تھیں۔ اباحیت کا معنی یہ ہے کہ وہ لوگ خور و نوش اور عورت کے معاملہ میں کسی قانونِ حلّت و حرمت کے پابند نہیں تھے۔ کھانے پینے اور دیگر استعمال کی چیزیں جہاں سے اور جیسے حاصل ہوتیں لے لیتے اور اس ضمن میں وہ کسی قانون کو نہیں جانتے تھے۔ اسی طرح جس عورت سے چاہتے تعلق پیدا کر لیتے۔ اس لحاظ سے وہ نکاح کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ادھر ارداد کا مطلب یہ لیتے تھے کہ جو جی چاہے کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے سب کچھ معاف کر دے گا، کوئی باز پرس نہیں، لہٰذا اس سلسلہ میں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کو مبعوث فرما کر اس تحریک کا آغاز کر دیا جس کے ذریعے یہ دونوں عالمی طاقتیں ختم ہو گئیں اور دینِ حق کو عمومی غلبہ حاصل ہو گیا۔ چنانچہ خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں روم، روس، افریقہ، حبشی، شام اور مصر وغیرہ قیصرِ روم کے ماتحت تھے، یہ مغلوب ہوئے۔ اور ادھر کسریٰ کے زیرِ تسلط خراسان، توران، ترکستان، زابلستان، باختر اور مجوسی سب مغلوب ہو گئے۔ اس کے علاوہ تمام یہودی، منشرک، ہندو، صابی قومیں بھی اسلام کے ماتحت آ گئیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں کسریٰ ختم ہوا تو مجوسیت دم توڑ گئی اور حنیفیت کا دور شروع ہو گیا۔ اور ادھر قیصر کا تسلط مصر، شام اور فلسطین سے ختم ہوا اور اسلام کو عمومی غلبہ حاصل ہو گیا۔

مسلمانوں کا زوال

مسلمانوں کا عروج پچاس سال یعنی واقعہ صفین تک مکمل ہو چکا تھا اور اس کے بعد مسلمانوں میں اندرونی طور پر اختلافات پیدا ہونے لگے جس ملوکیت کو مسلمانوں نے ختم کر کے اسلام کا نظام قائم کیا تھا، وہی ملوکیت خود مسلمانوں میں پیدا ہو گئی۔ اگرچہ دین کو مجموعی طور پر کافی دیر تک غلبہ حاصل رہا۔ مگر مسلمانوں میں چوتھی صدی تک کمزوری بڑھ گئی، جب کہ چھٹی صدی تک ضعف خطرناک حد تک بڑھا۔ اور پھر ساتویں صدی میں تاتاریوں کے حملے سے مسلمانوں میں زوال آ گیا جس میں وہ آج

تک پہنچتے رہتے ہیں۔ ترک مسلمانوں نے یورپ کی یلغار کا بڑی دیر تک مقابلہ کیا مگر
وہ بھی کمزوری کی حالت میں ہی ہے۔ آج مسلمان دنیا کی انتہائی پسماندہ قوم سمجھی جاتی
ہے جس کا نہ کوئی اپنا کلچر ہے نہ تہذیب اور نہ اخلاق۔ وہ اپنا دماغ اور اپنی سوچ تک
گنوا بیٹھے ہیں۔ اللہ کی کتاب اور اس کا دین اسلام بالکل سچا ہے اور وہ قیامت
تک قائم رہے گا مگر اس کے پیروکار ہی اس کے اصولوں کو ترک کر کے ذلیل و خوار
ہو رہے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ دلیل اور برہان کے لحاظ سے تو دین اسلام
ہمیشہ غالب رہا ہے مگر خدا تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ اسے سیاسی طور پر بھی تمام ادیان
پر غالب کر دیا جائے۔ اس دین کے اصول بلاشبہ ناقابل تنسیخ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا تمام
اقوامِ عالم کو چیلنج ہے۔ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ (البقرۃ۔۲۳) اگر تم سچے ہو
تو قرآن کی طرح ایک سورۃ ہی بنا لاؤ مگر یہ چیلنج آج تک کسی نے قبول نہیں کیا
جو کہ اللہ کی کتاب اور اس کے دین کی صداقت کی دلیل ہے۔

مسلمانوں کا بحیثیت جماعت فرض تھا کہ دین کے اس سیاسی غلبے کو قائم رکھتے
جو خلفائے راشدین کے زمانے میں حاصل ہو گیا تھا مگر ان کی نالائقی کی وجہ سے کام
بھی نامکمل ہی رہ گیا۔ اس سورۃ سے یہی سبق ملتا ہے کہ لوگ اگر واقعہ حدیبیہ
فتح خیبر اور فتح مکہ کو پیش نظر رکھیں تو آج بھی ان میں وہی جذبہ اطاعت و جہاد
قائم رہنا چاہیے جو کہ دورِ اول کے مسلمانوں میں موجود تھا۔ جب تک یہ جذبہ موجود
رہا دنیا پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور جب یہ جذبہ سرد پڑ گیا تو پھر مسلمانوں
میں نہ سیاسی غلبہ رہا، نہ اخلاقی نہ معاشی اور نہ معاشرتی۔ یہ خود دوسروں کے دست نگر
بن گئے اور قعرِ مذلت میں جا گرے۔

فرمایا اللہ کی ذات وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے
کر مبعوث فرمایا تاکہ وہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا
اور کافی ہے اللہ گواہی دینے والا۔ اس گواہی سے مراد اللہ کے رسول کی صداقت،
اس کے دین کی سچائی اور مسلمانوں کی اطاعت کی گواہی ہے۔ اللہ تعالیٰ گواہ ہے

کہ صحابہ کرامؓ نے دین کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں پیش کیں تو اللہ نے انہیں اخلاقی فتح کے ساتھ ساتھ سیاسی فتح بھی عطا فرمائی۔ اگر یہ جذبۂ اطاعت اب بھی قائم ہو جائے تو اللہ کی فتح و نصرت شامل حال ہو جائے گی۔ اللہ ہی اس حقیقت پہ گواہ کافی ہے

درس نہم ۹ آیت ۲۹

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِىْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِى التَّوْرٰىةِ ۖۚ وَمَثَلُهُمْ فِى الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾ ع ۴ ۱۲

ترجمہ :- محمد اللہ کے رسول ہیں ۔ اور وہ لوگ جو آپ کے ساتھ ہیں ، وہ شدید ہیں کفر کرنے والوں پر ، اور رحمدل ہیں اپنے درمیان ، تم دیکھو گے اُن کو رکوع کرنے والے ، سجدہ کرنے والے ۔ تلاش کرتے ہیں فضل اللہ کا اور اس کی خوشنودی ، اُن کی نشانی اُن کے چہروں میں ہے سجدے کے اثر سے ۔ یہ مثال ہے اُن کی تورات میں ، اور یہی مثال ہے اُن کی انجیل میں ۔ جیسا کہ کھیتی اپنا پٹھہ نکالتی ہے ، پھر اُس کو مضبوط کرتی ہے ، پھر وہ موٹا ہو جاتا ہے ، پھر کھڑا ہو جاتا ہے اپنی نال پر ۔ تعجب دلاتا ہے کھیتی کرنے والے کو تاکہ غصے میں ڈالے اُن کی وجہ سے کفر کرنے والوں کو ۔ وعدہ کیا

وعدہ کیا ہے اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے
اور جنہوں نے اچھے عمل کیے اُن میں سے بخشش کا
اور اجرِ عظیم کا (۲۹)

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے عمومی غلبہ یعنی اس دین کو تمام ادیان پر غالب کرنے کا ذکر کیا تھا۔ پھر اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ اللہ کی ذات وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ وہ اس دین کو تمام ادیان کے مقابلے میں غالب کر دے۔ اور اللہ ہی کافی ہے گواہی دینے والا۔ اب آخری آیت میں اُس جماعت کا ذکر ہے جس کے ذریعے اللہ نے اس دین کو دنیا میں غالب کیا اور آئندہ کے لیے بھی اس کو نمونہ بنایا۔

رسالت کی گواہی

گذشتہ دروس میں بیان ہو چکا ہے کہ صلح نامہ حدیبیہ تحریر کرتے وقت مشرکین نے اعتراض کیا تھا محمد رسول اللہ کی بجائے محمد ابن عبد اللہ لکھا جائے کیونکہ وہ آپ کی رسالت کا انکار کرتے تھے۔ اب اللہ نے اُن کے اس انکار کے جواب میں حضور علیہ السلام کی رسالت کی خود گواہی دی ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ محمد اللہ کے رسول ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جس چیز کو کفار اور مشرکین مٹانا چاہتے ہیں وہ ابد الآباد تک قائم رہے گی۔

صحابہؓ کی جماعت

دوسری ضروری چیز اللہ کے دین کو دوسرے ادیان پر غالب بنانا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صرف نبی کا کام نہیں بلکہ یہ ایک اجتماعی کام ہے جس کے لیے جماعت کی ضرورت ہے۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی مقصد کے لیے صحابہؓ کی جماعت کو تربیت دے کر تیار کیا تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس منشا کی تکمیل کر سکیں۔ اسی لیے فرمایا کہ محمد اللہ کے رسول ہیں وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اور وہ لوگ جو آپ کے ساتھ ہیں۔ یعنی آپ کے تربیت یافتہ صحابہؓ کی جماعت، وہ بھی غلبہ دین کے اجتماعی کام میں برابر کے شریک ہیں۔

اب پیغمبر علیہ السلام کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت میں آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اور اس منصب میں آپ کا کوئی شریک نہیں۔ آپ کی یہ حیثیت منفرد ہے۔

آپ پر وحی نازل ہوتی ہے، اور آپ معصوم ہیں۔ آپ کی دوسری حیثیت امیر جماعت کی ہے، اور اس منصب میں آپ اپنے صحابہؓ کے ساتھ شریک کار ہیں۔ دین کو غالب بنانے میں آپ کے ساتھ صحابہؓ کا بھی حصہ ہے۔ چنانچہ سورۃ توبہ میں ارشاد ہوا ہے لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (آیت ۸۸، ۸۹) اللہ کے رسول اور اس کے ایماندار ساتھیوں نے اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کیا ہے، انہی لوگوں کے لیے بہتری ہے۔ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بہشت تیار کر رکھے ہیں جن کے سامنے نہریں بہتی ہیں، یہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی اجتماعی کاوش سے اللہ نے فتح عطا فرمائی ہے اور دین اسلام کو دوسرے ادیان پر غالب کیا ہے۔ ان لوگوں کے متعلق گذشتہ رکوع میں بھی بیان ہو چکا ہے لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (آیت۔ ۱۸) اللہ تعالیٰ ان مومنوں سے راضی ہو گیا، جب کہ وہ درخت کے نیچے آپ کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کر رہے تھے۔ اسی جذبہ قربانی کی وجہ سے خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں مسلمانوں کو تمام دنیا پر سیاسی غلبہ حاصل ہو گیا۔ غرضیکہ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ سے صحابہ کرامؓ کی یہی جماعت مراد ہے۔

مشاورت کی اہمیت

اجتماعی امور میں مشاورت کی اہمیت مسلمہ ہے اور اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں تک کہ ایسے امور میں جہاں وحی الٰہی کے ذریعے کسی بات کا فیصلہ نہ کر دیا ہو خود اللہ کے نبیؐ بھی پابند ہیں کہ آپ امیر جماعت کی حیثیت سے اپنی جماعت کے ارکان سے مشورہ کر لیا کریں۔ بعض سیاسی یا انتظامی امور میں اللہ کی طرف سے واضح حکم نہیں آتا۔ بلکہ اسے اہل ایمان کی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ایسے ہی معاملات میں اللہ نے اپنے رسول کو حکم دیا ہے۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (آل عمران۔ ۱۵۹) یعنی آپ اپنے صحابہؓ سے مشورہ کر لیا کریں اور پھر تمام اہل ایمان کے حق میں بھی فرمایا وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ۔ ۳۸)

یعنی ان کے معاملات باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں۔ پھر جب کوئی معاملہ مشورہ کے ذریعے طے پا جائے تو پھر اللہ کا حکم ہے۔ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (آل عمران ۱۵۹) تو اللہ کی ذات پہ بھروسہ کرتے ہوئے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دو۔

مشاورت کے حکم سے متعلق بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے جو مشورہ کو استحباب کا درجہ دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ واجب ہے۔ امام ابوبکر جصاص کا یہی مسلک ہے۔ جب اللہ کے نبی بھی غیر منصوص امور میں باہمی مشورہ کے پابند ہیں تو دنیا کے باقی بادشاہ، صدور یا دیگر حکام کیسے مستثنیٰ ہو سکتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ مشاورت کو استحباب کے درجے میں رکھنے کی وجہ سے ہی لوگ اس کی ضرورت کو نظر انداز کر کے من مانی کرنے لگے ہیں۔ بقول مولانا عبید اللہ سندھی سرکاری خزانے کی امانت کو دنیا کے بادشاہوں امراء اور ڈکٹیٹروں نے اپنی شان و شوکت، لہو و لعب اور شہرت پرستی پر خرچ کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ معاملات میں کسی مشورہ یا رائے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے حالانکہ ناجائز امور میں ایک پیسہ بھی خرچ کرنا حرام ہے۔

صحابہ کرامؓ کے اوصاف

آگے اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کے صحابہؓ کے بعض اوصاف بیان کیے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ وہ کافروں پر بڑے سخت ہیں رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ البتہ آپس میں مہربان ہیں۔ جب آپس کی بات ہوتی ہے تو نہایت نرم دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور جب دشمنوں سے مقابلہ ہو تو سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں۔ فرمایا ان کی ایک نشانی یہ ہے تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا آپ ان کو دیکھیں گے رکوع کرتے ہوئے اور سجدے کرتے ہوئے۔ گویا وہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے محو عبادت رہتے ہیں۔ کسی بندے کا رکوع کرنا اس کے عہد تکلیف کو قبول کرنے کی علامت ہے۔ جب انسان اپنی پشت جھکا دیتا ہے تو وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ میں خدا تعالیٰ کے ہر فرمان کو قبول کروں گا۔ گویا یہ اس کے

اظہار اطاعت کا ایک ذریعہ ہے اس سے انسان کی عجز و انکساری کا ثبوت بھی ملتا ہے
اور پھر جب انسان سجدہ کرتا ہے تو یہ اس کی طرف سے مکمل فرمانبرداری کا اظہار
ہوتا ہے۔ پہلے سجدہ میں آدمی اپنے نفس کی طرف سے مکمل اطاعت کو پیش کرتا
ہے جب کہ دوسرے سجدے کے ذریعے وہ اپنے مال اور اپنے لواحقین کی طرف
سے بھی کامل اطاعت کا یقین دلاتا ہے۔ وہ اپنے خدا تعالیٰ کی انتہائی تعظیم بجا
لاتے ہوئے اقرار کرتا ہے کہ میں اپنے اور اپنے لواحقین کی طرف سے تمام ممکنہ
وسائل کو بروئے کار لاکر جانی اور مالی قربانی پیش کرنے کے لیے تیار ہوں۔
حضور علیہ السلام کے صحابہؓ کی ایک صفت یہ بھی ہے يَبْتَغُونَ فَضْلًا
مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وہ اپنی کمال اطاعت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا فضل اور
اُس کی رضا تلاش کرتے ہیں۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ فضل سے مراد
ارتفاق ہے یعنی اسی دنیا میں انسان اپنی زندگی بہتر طریقے سے بسر کرے۔ ظاہر ہے
کہ بہتر طریقے سے بسر اوقات کے وسائل رزق کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان
کاروبار کرتا ہے۔ محنت مزدوری کرتا ہے ملازمت اختیار کرتا ہے یا کھیتی باڑی
کرتا ہے تو مقصد یہی ہوتا ہے کہ ایسا کرکے زندگی کے لوازمات حاصل کرے
جس سے اُسے سکون اور اطمینان حاصل ہو۔ اس مقصد کا حصول تقویٰ کے
خلاف نہیں ہے۔ بلکہ اللہ نے خود تلاش رزق کی ترغیب دی ہے سورۃ الجمعہ
میں موجود ہے۔ لوگو! جب نمازِ جمعہ کی اذان ہو جائے تو کاروبار چھوڑ کر ذکر الٰہی
کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ
وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (آیت۔۱۰) جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو
زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل یعنی رزق تلاش کرو۔ کیونکہ تمہاری زندگی کا انحصار اسی
چیز پر ہے۔ مطلب یہ کہ فضل سے مراد لوازماتِ زندگی ہیں جن کے حصول کے لیے
انسان کو محنت مشقت کرنی پڑتی ہے
دوسری چیز جس کا بیان ذکر کیا گیا ہے۔ وہ رضوان ہے، شاہ صاحبؒ فرماتے

ہیں کہ رضوان سے مراد اقتراب ہے جس کا معنی خدا تعالیٰ کے قرب کا حصول ہے ۔ انسان عبادت و ریاضت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو کہ بہت بڑی چیز ہے ۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب جنتی جنت میں پہنچ جائیں گے اور انہیں وہاں کی تمام نعمتیں میسر آجائیں گی تو اللہ تعالیٰ دریافت فرمائیں گے کہ بتاؤ کسی اور چیز کی ضرورت ہے ؟ عرض کریں گے ، مولا کریم ! اس سے بڑھ کر ہمیں اور کیا ضرورت ہوگی ؟ اللہ فرمائے گا میں تمہیں ان سے بڑھ کر نعمت دینے والا ہوں اور وہ میری رضا ہے ۔ جاؤ ! آج کے بعد میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہوں گا ۔ الغرض اللہ نے صحابہ کرامؓ کی ایک صفت یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا کی تلاش میں رہتے ہیں ۔

پھر فرمایا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ اُن کی نشانی اُن کے سجدوں کے اثر سے اُن کے چہروں سے نمایاں ہوگی ۔ عام طور پر نمازی آدمی کی پیشانی پر سجدہ کا نشان پڑ جاتا ہے ۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی پیشانی رگڑ رگڑ کر محراب یا گٹھا بنانے کی کوشش کرے ، یہاں پر چہرے کی جس نشانی کا ذکر کیا گیا ہے ، اُس سے یہ نشانی ہرگز مراد نہیں ۔ بلکہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی روایت میں آتا ہے کہ جو شخص اس لیے ماتھا رگڑ کر نشان بناتا ہے کہ لوگ اسے عبادت گزار سمجھیں ۔ وہ خود منافق سمجھا جائے گا ، بہر حال جس نشانی کا یہاں ذکر کیا گیا ہے کہ صحابہؓ کے چہروں سے ظاہر ہے ، اُس سے تواضع اور انکسار کی نشانی ہے ۔

ریاضت کی وجہ سے ان کے چہروں سے خاص قسم کی کیفیت نمایاں ہوتی ہے ۔ اور خاص قسم کی روحانیت ٹپکتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ عبادت اور ریاضت کرتے کرتے اُن کے چہرے زرد بھی ہو سکتے ہیں جیسا سورۃ البقرہ میں فرمایا تَعْرِفُهُم بِسِيمَاهُمْ (آیت ۔ ۲۷۳) اُن کی محتاجی اُن کے چہروں سے نمایاں ہوتی ہے مگر وہ کسی سے سوال نہیں کرتے ۔ بہر حال فرمایا کہ اللہ کے نبی کے ساتھیوں کی نشانی اُن کے چہروں میں سجدے کے اثر سے ظاہر ہوتی ہے ۔

بعض مفسرین کرام ان نشانیوں کو الگ الگ شخصیات پر بھی محمول کرتے ہیں

مثلاً وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ کا مصداق حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں جن کو حضور علیہ السلام کی ہمیشہ معیت حاصل رہی۔ آپ غار میں بھی حضور علیہ السلام کے ساتھ تھے اور ہجرت میں بھی آپ کے ساتھی تھے۔ پھر فرماتے ہیں کہ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ سے مراد حضرت عمرؓ ہیں جو کافروں کے مقابلے میں بڑے سخت گیر تھے۔ اسی طرح رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کے مصداق حضرت عثمانؓ ہیں۔ جو مسلمانوں کے ساتھ نہایت ہی شفقت اور مہربانی کا سلوک کرنے والے تھے۔ اور پھر رُکَّعًا سُجَّدًا کا بہترین نمونہ حضرت علیؓ ہیں جو بڑے ہی عبادت گزار تھے۔ آپ کے خدام بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک ایک رات میں آپ کی زبان سے ہزار ہزار بار تکبیر سنتے تھے۔ گویا کہ آپ اتنی نمازیں پڑھتے تھے۔ ایک ہزار تکبیر سے نمازوں کی رکعات کی تعداد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ انسان میں جو تندی اور نرمی اپنی عبادت کی وجہ سے پیدا ہو، وہ سب عبادت گزاروں میں برابر ہوتی ہے۔ اور جو سختی یا نرمی ایمان سے سنور کر پیدا ہو، وہ سختی اپنی جگہ اور نرمی اپنی جگہ پر آتی ہے۔ اور یہی جماعت صحابہؓ کا شیوہ ہے۔ گویا یہ ایمان کا کمال ہے کہ جہاں سختی کی ضرورت ہوتی ہے وہاں سختی آتی ہے اور جہاں نرمی کی ضرورت ہو۔ وہاں نرمی پیدا ہو جاتی ہے۔

تورات اور انجیل کی بشارت

صحابہؓ کے اوصاف بیان کرنے کے بعد فرمایا ذٰلِکَ مَثَلُھُمْ فِی التَّوْرٰىۃِ وَمَثَلُھُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ان کی یہ مثال تورات میں بھی بیان کی گئی ہے اور انجیل میں بھی تورات میں صحابہؓ کی جماعت سے متعلق پیشینگوئی موجود ہے کہ " وہ فاران کی چوٹیوں سے جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدسیوں کی جماعت کے ساتھ۔ اس کے دائیں ہاتھ میں آتشین شریعت ہے اور وہ دنیا کی اقوام سے محبت کرتا ہے اور لوگ اس کے قدموں میں اکٹھے کیے جاتے ہیں۔" حضور علیہ السلام کا ایک لقب حاشر بھی ہے۔ دس ہزار قدسیوں سے مراد صحابہؓ کی وہ جماعت ہے جو فتح مکہ کے موقع پر آپ کے ہمراہ تھی۔ تاہم تورات کے موجودہ ایڈیشنوں میں اس لفظ کو تبدیل کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے حضور علیہ السلام کی رسالت ثابت ہوتی تھی اور جو یہودیوں کو ہرگز منظور نہیں

کھیتی کے ساتھ تشبیہ

فرمایا صحابہؓ کی اس جماعت کی مثال کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ ایک کھیتی یا پودے کی ہے جو اپنا پٹھا نکالتی ہے۔ فَاٰزَرَهٗ پھر اس کی کمر مضبوط ہو جاتی ہے فَاسْتَغْلَظَ پھر وہ موٹی ہو جاتی ہے فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ پھر وہ اپنے تنے پر کھڑی ہو جاتی ہے مطلب یہ کہ جس طرح زمین سے نکلنے والا ایک پودا نہایت ہی نرم و نازک اور کمزور ہوتا ہے مگر بعد میں وہ مضبوط ہو جاتا ہے بلکہ کڑیل درخت بن جاتا ہے، اسی طرح صحابہؓ کی جماعت ابتداء میں بالکل کمزور تھی، اس کی تعداد بھی قلیل تھی۔ مگر بعد میں اللہ تعالیٰ نے اسی جماعت کو مضبوط بنا دیا۔ جنہوں نے قیصر و کسریٰ جیسی عظیم سلطنتوں کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا اور پوری دنیا پر اسلام کو غالب بنا دیا۔

کھیتی کی مثال کے تسلسل میں فرمایا کہ جب وہ اپنے تنے پر کھڑی ہو جاتی ہے تو يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ تو کھیتی والے آدمی کو خوش کر دیتی ہے۔ وہ راضی ہو جاتا ہے کہ اس کی محنت ٹھکانے لگی اور اب وہ اس کا پھل پانے والا ہے۔ تو فرمایا اسی طرح اللہ نے صحابہؓ کی اس جماعت کو مضبوط بنا دیا ہے لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ تاکہ اس کی وجہ سے کافروں کو غصے میں ڈالے۔ کافر لوگ اہل ایمان کی ترقی کو دیکھ کر جلتے تھے اور غصے کی وجہ سے ان کے چہرے سیاہ ہو جاتے تھے۔ اسی لیے امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص حضور علیہ السلام کے صحابہؓ سے حسد کرتا ہے، ان سے جلتا ہے ان کے متعلق بدگمانی کرتا ہے، وہ کافروں میں شامل ہو جاتا ہے۔ کوئی سچا مسلمان صحابہؓ کے متعلق بدگمانی نہیں کر سکتا اور نہ ہی انہیں طعن و تشنیع کا نشانہ بنا سکتا ہے۔ یہ تو پاک لوگ تھے جن کی اللہ نے یہاں تعریف بیان کی ہے اور انہیں آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے بطور نمونہ پیش کیا ہے۔ آئندہ اگر کوئی انقلاب آئے گا تو وہ اسی جماعت کے نمونہ پر عمل کر کے لایا جا سکے گا۔ صحابہؓ کا جذبہ اطاعت و فرمانبرداری، دین کے ساتھ مکمل وفاداری، جان و مال کی قربانی اور موت کی فکر قبول کرنا۔ ان لوگوں کا طرہ امتیاز تھا۔ اور انہیں کے نقش قدم پر چلنے والے لوگ کامیابی سے ہمکنار ہوں گے۔

اہل ایمان سے وعدہ

آگے اللہ نے عام اہل ایمان سے ایک وعدے کا ذکر بھی کیا ہے وَعَدَ اللّٰهُ

الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں سے وعدہ کیا ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے اعمال انجام دیے مَّغْفِرَةً بخشش اور مغفرت کا یعنی اللہ تعالیٰ ان کے ان اعمال کی وجہ سے ان کی کوتاہیاں اور لغزشیں معاف فرمائے گا۔ انقلابی پروگرام پر عمل کرتے ہوئے بعض کوتاہیوں کا ارتکاب بعید از قیاس نہیں مگر اللہ نے سب کی معافی کا اعلان فرما دیا ہے۔ اور ساتھ ساتھ وَاَجْرًا عَظِیْمًا بہت بڑے اجر کا وعدہ بھی فرمایا ہے جو اُن کو آخرت میں میسر آئیگا۔ اللہ تعالےٰ ان لوگوں کی مساعی کا پورا پورا بلکہ بڑھا چڑھا کر بدلہ عطا کرے گا۔ اُن کو اپنی رحمت کے مقام میں داخل کرے گا جس سے وہ خوش ہو جائیں گے۔

سورۃ الحجرات
(مکمّل)
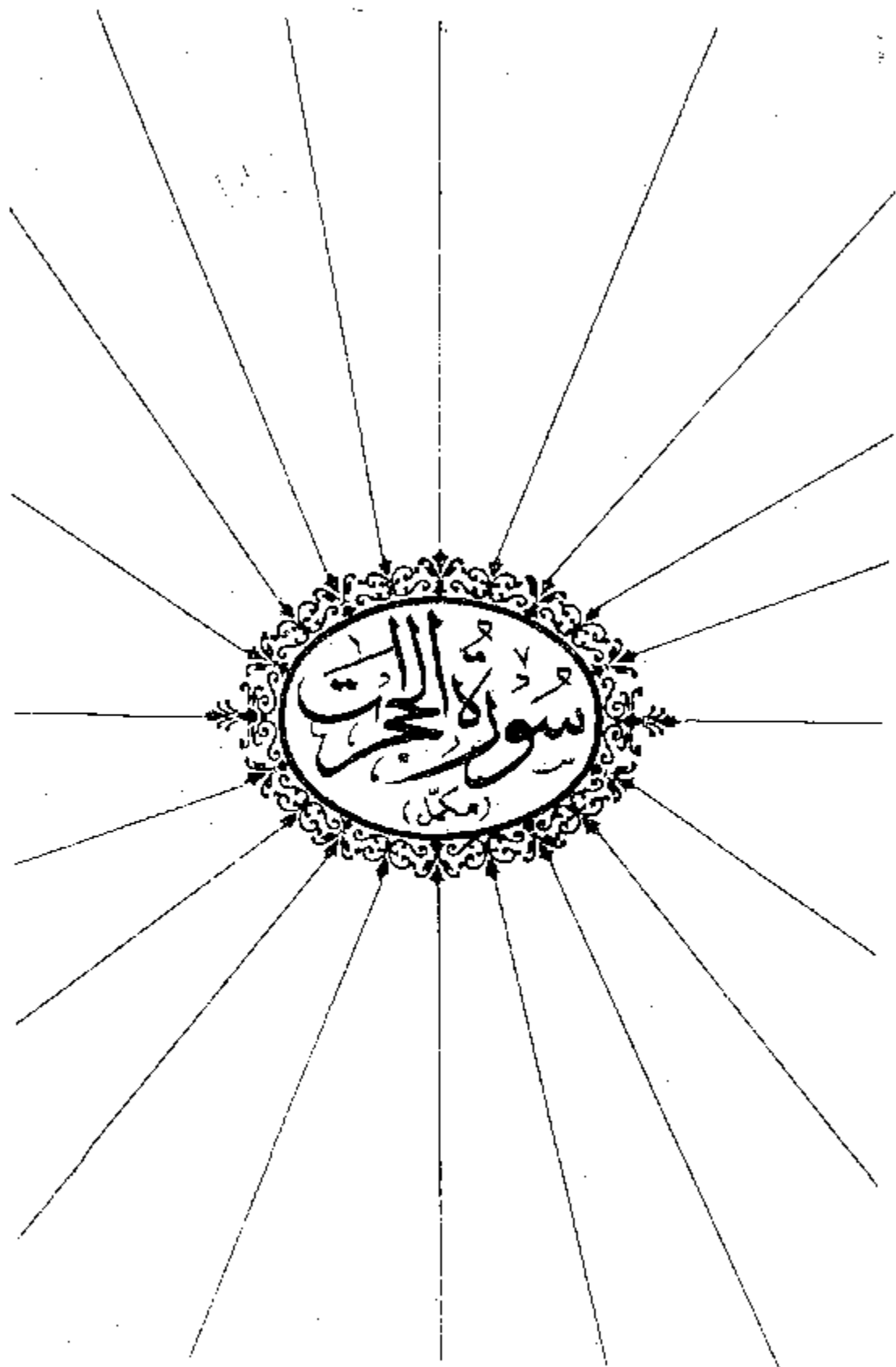
خـتم ۲۶ — الحجرات ۴۹

درس اول ۱ — آیت ۱

سُوْرَةُ الْحُجُرٰتِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانِيَ عَشْرَةَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۃ الحجرات مدنی ہے یہ اٹھارہ آیتیں ہیں اور اس میں دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ①

ترجمہ:۔ اے ایمان والو! نہ آگے بڑھو اللہ سے اور اس کے رسول سے۔ اور ڈرو اللہ سے۔ بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے ①

نام اور کوائف

اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ الحجرات ہے جو کہ اس کی آیت ۴ میں آمدہ لفظ سے ماخوذ ہے۔ حجرات حجرۃ کی جمع ہے جس کا معنی کمرہ یا مکان ہوتا ہے۔ اس سورۃ مبارکہ میں ان کمروں کا ذکر ہے جو حضور علیہ السلام نے مسجد نبوی کے ارد گرد تعمیر کرائے تھے اور جن میں امہات المومنین رہائش پذیر تھیں۔ ان کے علاوہ بعض دوسرے حضرات بھی ان مکانات میں رہتے تھے۔

یہ سورۃ ہجرت کے بعد مدنی زندگی میں سورۃ مجادلہ کے بعد نازل ہوئی۔ اس سورۃ مبارکہ کی اٹھارہ آیتیں اور دو رکوع ہیں۔ یہ سورۃ ۳۴۲ الفاظ اور ۱۴۷۶ حروف پر مشتمل ہے۔

سابقہ سورتوں کے ساتھ ربط

اس سورۃ مبارکہ کا سابقہ دو سورتوں کے ساتھ خصوصی ربط ہے۔ سورۃ فتح اور سورۃ محمد میں جہاد کا موضوع غالب ہے جس سے اصلاح عالم مقصود ہے جب کہ اس

سورۃ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی جماعت کے حقوق و آداب کا ذکر ہے۔ گویا اس سورۃ میں وہ اصول اور ضابطے بیان کیے گئے ہیں جن سے اصلاح نفس ہوتی ہے۔ اس طرح ان تین سورتوں میں اصلاح عالم اور اصلاح نفس کا پروگرام بیان کر دیا گیا ہے اور یہی ان سورتوں کا آپس میں ربط ہے۔

مضامین سورۃ

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے حاشیہ فتح الرحمان میں اس سورۃ کا خلاصہ اس طرح بیان فرمایا ہے کہ اس میں بعض آداب کی تعلیم دی گئی ہے مثلاً یہ کہ اللہ کے نبی کے اوامر و نواہی سے پہلے کوئی بات نہ کی جائے اور نہ نبی کے سامنے آواز بلند کی جائے۔ اس سورۃ میں یہ اصول بھی بیان کیا گیا ہے کہ کسی فاسق آدمی کی خبر کی تحقیق کر لی جائے اور بغیر تحقیق ایسی خبر پر عمل درآمد نہ کیا جائے۔ اگر مسلمانوں کا آپس میں جھگڑا ہو جائے تو ان کے درمیان صلح کرا دینی چاہیئے۔ مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ ٹھٹھا نہ کریں اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کریں۔ اس سورۃ میں غیبت کی سخت الفاظ میں ممانعت کی گئی ہے اور دوسرے شخص پر بدگمانی کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ نسب کی وجہ سے دوسرے کو حقیر جاننا اور اپنے نسب پر فخر کرنا قبیح بات ہے۔ اللہ نے اس سے بھی منع فرمایا ہے۔ پھر آخر میں منافقوں کی بعض خصلتوں کا ذکر کر کے ان کو زجر و توبیخ کی گئی ہے۔

درحقیقت یہ سورۃ مسلمانوں کے شہری قوانین (CIVIL LAW) پر مشتمل ہے۔ اس سے پہلی دو سورتوں میں جنگ اور صلح کے قوانین (LAWS OF THE WAR AND PEACE) کا ذکر تھا جب کہ یہ سورۃ مبارکہ غیر حربی قوانین پر مشتمل ہے بغرضیکہ اس سورۃ میں معاشرتی زندگی کے بارہ میں بڑے بڑے بارہ اصول بیان کیے گئے ہیں اگر ان میں تین ضمنی اصول بھی شامل کر لیے جائیں تو کل تعداد پندرہ ہو جائے گی۔ معاشرتی زندگی کا انحصار انہی اصولوں پر ہے۔ ان پر عمل پیرا ہونے سے قوم اور ملک میں نظم و ضبط پیدا ہوتا ہے جس سے داخلی اور خارجی اصلاح ممکن ہوتی ہے۔ انہی اصولوں پر عمل پیرا ہونے سے انسان فتنہ و فساد اور جنگ و جدل سے بچ سکتے ہیں اور ان

کی خلاف ورزی کی صورت میں معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور نوبت زوال تک پہنچ جاتی ہے۔

پیش قدمی کی ممانعت

آج کی آیت میں دو بڑے بڑے اصولوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلا اصول یہ ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول سے پیش قدمی نہ کرو یعنی ان کے حکم اور ان کی اجازت سے کسی معاملہ میں آگے نہ بڑھو۔ جب کسی معاملہ میں اللہ اور اس کے رسول کا حکم موجود ہو یا ایسا حکم متوقع ہو تو پھر اپنی رائے کو دخل نہ دو بلکہ اللہ اور پیغمبر کے فرمان کو توجہ سے سنو اور پھر اس پر بلا چون وچرا عمل پیرا ہو جاؤ۔ گویا اپنی خواہشات اور آرا کو اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے تابع بنا لو۔

غرضیکہ پہلے اصول میں نبی کریم ﷺ کے آداب اور حقوق اور پھر مسلمانوں کے آپس میں برادرانہ تعلقات قائم کرنے کے طور طریقے، مسلمانوں کے اجتماعی نظام کی بنیاد، اس میں خرابی کی صورت میں اس کا علاج وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ تمام جھگڑوں اور تنازعات کی بنیادی وجہ خود غرضی اور خود رائی ہوتی ہے جس کا علاج پہلے ہی اصول میں بتا دیا گیا ہے۔ اگر مسلمان اپنی شخصی آرا اور اغراض کو کسی بلند ترین معیار کے تابع کر دیں تو کوئی جھگڑا فساد نہیں ہوگا۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں لَا تَقُوْلُوْا خِلَافَ الْکِتٰبِ وَالسُّنَّةِ یعنی اللہ کی کتاب اور نبی کی سنت کے خلاف کوئی کام نہ کرو۔ اگر تم اپنے تمام امور کتاب و سنت کے تابع بنا لو گے تو تمہارے تمام حالات درست ہو جائیں گے، تہذیب و تمدن میں ترقی نصیب ہوگی اور اللہ کے ہاں بھی اجر کے مستحق بن جاؤ گے۔ بعض احکام کی تکمیل میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مگر اس سے بد دل نہیں ہونا چاہئے خواہ اس سلسلہ میں کتنی ہی تکلیف اٹھانی پڑے۔ اس کا نتیجہ بہر حال اچھا نکلے گا۔ دنیا و آخرت کی فلاح کا مدار اللہ اور اس کے رسول کی اتباع پر ہی ہے۔ بہر حال فرمایا کہ اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو یعنی اپنی رائے کو ان کے

حکم پر مقدم نہ رکھو، اور ہمیشہ انہی کے تابع فرمان رہو۔

تقویٰ یعنی خوفِ خدا

اس آیت کریمہ میں دوسرا اصول یہ بیان کیا گیا ہے وَاتَّقُوا اللّٰهَ اللہ سے ڈرتے رہو۔ تقویٰ بہت بلند اصول ہے جس کی وجہ سے انسان کو فلاح نصیب ہوتی ہے قرآن پاک میں تقویٰ اختیار کرنے کی بڑی تلقین کی گئی ہے۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں ارشادِ ربانی ہے وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (آیت - ۱۸۹) اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ نیز فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (آیت - ۱۹۴) تقویٰ اختیار کرو، بیشک اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے۔ سورۃ الطلاق میں ہے وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا (آیت ۔۴) جو اللہ سے ڈرتا ہے، تقویٰ اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے آسانی پیدا کر دیتا ہے۔ اسی سورۃ کی آیت ۲ میں ہے کہ جو تقویٰ اختیار کرتا ہے يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا اللہ اس کے لیے نکلنے کی راہ پیدا کر دیتا ہے وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (آیت - ۳) اور اسے ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے۔ جہاں سے اُسے گمان بھی نہیں ہوتا۔

شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے اپنی مشہور و معروف کتاب غنیۃ الطالبین میں تقویٰ کی تعریف میں یہ آیت نقل کی ہے اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ (النحل ۔ ۹۰) یعنی تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ عدل اور احسان کیا جائے، قرابتداروں کی مدد کی جائے، فحاشی، منکرات اور بغاوت سے اپنے آپ کو بچایا جائے۔ مطلب یہ کہ تقویٰ نیکی اختیار کرنے کا نام ہے۔ انسان کفر، شرک، نفاق اور کبائر سے بچ جائے، پھر مشتبہات سے بھی پرہیز کرے، تو وہ کمال درجے کا متقی ہے۔ سورۃ توبہ میں اللہ نے ایمان والوں کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی بیان کی ہے وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ (آیت ۔ ۱۱۲) وہ اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہوتے ہیں اور یہ بھی تقویٰ میں شمار ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے

ہے کہ "تقویٰ محافظت بر حدودِ شرع است" یعنی شریعت کی حدود کی حفاظت کرنا ہی تقویٰ ہے جس نے شریعت کے احکام کی پابندی کی وہ متقی ہے۔ اس کے علاوہ اپنے آپ کو دوسروں سے کم تر سمجھنا، عاجزی اور انکساری اختیار کرنا اور عدل و انصاف کو اختیار کرنا بھی تقویٰ میں شامل ہے تو اللہ نے یہاں دوسرا اصول تقویٰ بیان فرمایا ہے جس کی وجہ سے اطاعت کامل ہوتی ہے اور انسان اغراض و خواہشات کے شر سے محفوظ رہتے ہیں۔

فرمایا یہ بات بھی مدِنظر رکھو اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ بے شک اللہ تعالیٰ ہر بات کو سنتا ہے اور کائنات میں واقع ہونے والی تمام حرکات و سکنات کو جانتا ہے۔ کوئی چیز اُس کے احاطے سے باہر نہیں ہے تو اس سورۃ مبارکہ کی پہلی آیت میں یہ دو ضابطے بیان کر دیے ہیں جن پہ تہذیب و تمدن کا انحصار ہے، نیز جن پر جماعتی، ملکی اور عام معاشرے کے نظم و نسق کے استحکام اور بقا کا انحصار ہے۔ اور وہ ضابطے یہی ہیں کہ انسان اللہ اور اُس کے رسول کے حکم سے آگے نہ بڑھے۔ بلکہ متعلقہ حکم معلوم کر کے عملی پیش قدمی کرے۔ اور دوسرا ضابطہ تقویٰ ہے۔ آج کے زمانہ میں تقویٰ تو کم ہی نظر آتا ہے، بیشتر لوگ فسق و فجور میں ہی مبتلا ہیں۔ لاکھوں میں ایک آدھ ہی ملے گا جو اپنی خواہشات اور اغراض کو اللہ اور اس کے رسول کے حکم پہ قربان کر دے۔ اگر یہ بنیاد ہی خراب ہو گی تو معاشرتی نظام کیسے درست رہ سکتا ہے؟

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۲﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴿۳﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۴﴾ وَ لَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَیْهِمْ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۵﴾

ترجمہ :- اے ایمان والو ! نہ بلند کرو اپنی آوازوں کو نبی کی آواز پر ، اور نہ بولو جہر سے اُس کے سامنے بات کرنے میں جیسا کہ تم جہر کرتے ہو بعض بعض کے سامنے ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو ﴿۲﴾ بیشک وہ لوگ جو پست رکھتے ہیں اپنی آوازوں کو اللہ کے رسول کے پاس ، یہ وہی لوگ ہیں کہ اللہ نے اُن کے دلوں کو خالص بنا لیا ہے تقویٰ کے لیے ۔ اُن کے لیے بخشش اور اجر عظیم ہے ﴿۳﴾ بےشک وہ لوگ جو پکارتے ہیں آپ کو حجروں

کی دیواروں کے پیچھے سے اکثر اُن میں سے عقل نہیں رکھتے ④ اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ آپ اُن کی طرف نکل کر آتے تو یہ بہتر ہوتا اُن کے لیے۔ اور اللہ تعالیٰ بہت بخشش کرنے والا اور مہربان ہے ⑤

ربطِ آیات

اس سورۃ مبارکہ میں وہ اصول اور قوانین بیان کیے گئے ہیں جن پر عمل کر کے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی امن و سکون کا گہوارہ بن سکتی ہے۔ اُن کے جماعتی نظم و نسق میں استحکام پیدا ہو سکتا ہے اور اُن کے امورِ سلطنت بہتر طریقے سے انجام دیے جا سکتے ہیں۔ گذشتہ آیت کریمہ میں دو اصولوں کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ پہلا اصول یہ ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول کے فیصلے اور حکم سے پہلے پیش قدمی نہ کرو، بلکہ ہر حالت میں انہی کے فیصلے پر سر تسلیم خم کر دو۔ اور دوسرا اصول یہ بیان ہوا کہ تقویٰ اختیار کرو یعنی ہر حالت میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔

نبی کا ادب و احترام

اب تیسرے نمبر پر نبی علیہ السلام کے ادب و احترام کا اصول بیان کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے ایمان والو! لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ اپنی آوازوں کو نبی علیہ السلام کی آواز سے بلند نہ کرو۔ اور چوتھی بات یہ فرمائی وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اور نہ نبی کے سامنے اونچی آواز سے بولو جیسا کہ تم ایک دوسرے کے سامنے بلند آواز سے بولتے ہو۔ اگر ایسا کرو گے تو کہیں ایسا نہ ہو اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم نبی علیہ السلام کی مجلس میں بیٹھے ہو تو نبی کے ادب کا تقاضا یہ ہے کہ گفتگو کرتے وقت تمہاری آواز نبی علیہ السلام کی آواز سے کسی صورت میں بھی بلند نہیں ہونی چاہیئے اور اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ براہ راست بات کرو تو تمہاری آواز آپس کی گفتگو کی طرح اونچی نہیں ہونی چاہیئے۔ حضور علیہ السلام کی مجلس میں بیٹھ کر خواہ آپس میں بات چیت کرو یا خود حضور علیہ السلام کی ذات بابرکات

سے براہ راست مخاطب ہو۔ اپنی آواز کو ہمیشہ پست رکھو۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو ممکن ہے کہ اللہ کے نبی کے دل میں کدورت پیدا ہو جائے جس سے اللہ ناراض ہو جائے اور تمھارے تمام نیک اعمال بھی ضائع ہو جائیں۔ مسلمانوں کے لیے اللہ کا یہ حکم ہے کہ وہ اللہ کے نبی کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھیں، بے تکلفی اور اونچی آواز سے بات نہ کریں بلکہ شائستگی سے بات کریں۔ عام انسانی سوسائٹی کا بھی یہی دستور ہے کہ کوئی شائستہ اور مہذب بیٹا اپنے باپ کے سامنے، یا ایک لائق شاگرد اپنے استاذ کے سامنے، یا ایک مخلص مرید اپنے مرشد کے سامنے، یا ایک ماتحت اپنے افسر کے سامنے ہمیشہ ادب کو ملحوظ رکھتا ہے اور اونچی آواز سے بات نہیں کرتا۔ ادھر اللہ کا نبی ہے جس کا مرتبہ ہر مخلوق سے زیادہ ہے اور اس کے ادب و احترام کو ہر ادب پر فوقیت حاصل ہے، لہٰذا پوری احتیاط رکھنی چاہیے کہ اللہ کے نبی کی مجلس میں بیٹھ کر کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے جس سے آپ کے ادب و احترام میں فرق آتا ہو۔ حضور علیہ السلام کی ناخوشی کی وجہ سے ایک امتی کا کوئی ٹھکانا باقی نہیں رہے گا اور ہو سکتا ہے کہ اس کی عمر بھر کی ساری محنت ہی برباد ہو جائے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم کے مطابق اعمال کا ضیاع کفر، شرک، نفاق یا ریا سے ہوتا ہے، اور محض آواز بلند کرنے سے ایسا نہیں ہوتا تاوقتیکہ یہ فعل استخفاف، استہزا یا ایذا رسانی کے لیے ہو۔ خاص طور پر اگر اللہ کے نبی کی شان میں اس قسم کی بے ادبی یا گستاخی کی جائے تو کفر لازم آتا ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کے اعمال ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ مفسرین یہ بھی فرماتے ہیں کہ جس طرح حضور علیہ السلام کی حیات طیبہ میں آپ کا ادب ملحوظ رکھنا ضروری تھا، اسی طرح آپ کی وفات کے بعد آپ کی احادیث اور فرامین کو پڑھتے اور سنتے وقت بھی ادب کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے اور اگر کوئی شخص حضور علیہ السلام کی قبر شریف پر حاضر ہوتا ہے تو وہاں بھی ادب و احترام کی پاسداری ہونی چاہیے۔ امام جلال الدین سیوطیؒ، حضرت شیخ الاسلامؒ اور بعض دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کے

خلفاء، علمائے ربانیین اور اولوالامر حضرات کے ساتھ بھی درجہ بدرجہ ادب سے پیش آنا چاہیے کیونکہ فرقِ مراتب کے بغیر بہت سی خرابیاں، بگاڑ اور فتنے پیدا ہوتے کا خطرہ ہے۔ دیگر محترم ہستیوں میں صحابہ کرامؓ، محدثینؒ، متکلمینؒ، مجتہدینؒ، فقہاؒ اور دیگر بزرگانِ دین لائقِ احترام ہیں جنہوں نے دینِ اسلام کی حتی الامکان خدمت کی ہے۔

صحابہ کرامؓ کا عمل

اپنے نبی کا ادب و احترام صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر کون کر سکتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک مجلس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ موجود تھے۔ آپ کے پاس بنی تمیم کے کچھ لوگ آئے۔ حضور علیہ السلام ان میں سے کسی شخص کو ان کا امیر مقرر کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قعقاع ابن معبدؓ کا نام تجویز کیا۔ دوسری طرف حضرت عمر فاروقؓ نے اقرع ابن حابسؓ کے حق میں رائے دی۔ اس ضمن میں دونوں حضرات کا آپس میں تکرار ہو گیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ عمرؓ! تم ہمیشہ میری رائے کی مخالفت کرتے ہو۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں نے بالکل ٹھیک رائے دی ہے۔ اس تکرار میں دونوں حضرات کی آوازیں بھی بلند ہو گئیں۔ پھر جب یہ آیت نازل ہوئی تو دونوں حضرات اپنی اس حرکت پر سخت نادم ہوئے اور پھر اس کے بعد نبی علیہ السلام کی مجلس میں کبھی اونچی آواز سے بات نہیں کی، بلکہ عمر بھر اپنی آوازوں کو پست رکھا حتیٰ کہ حضرت عمرؓ کی بات کو سمجھنے کے لیے اُن سے بار بار پوچھنا پڑتا تھا۔ آپ اس قدر محتاط ہو گئے کہ اونچا بولنے سے کہیں اعمال ہی ضائع نہ ہو جائیں۔

حضرت ثابت ابن قیس انصاریؓ کی آواز بھی قدرتی طور پر بلند تھی۔ جب بھی بات کرتے اونچی آواز میں کرتے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ہی ضائع ہو جائیں، تو حضرت ثابتؓ اپنی آواز کی بلندی کے ڈر سے گھر میں بیٹھ گئے۔ کہنے لگے کہ اگر حضور علیہ السلام کی مجلس میں میری آواز بلند ہو گئی تو مجھے ڈر ہے کہ میرے اعمال ہی ضائع نہ ہو جائیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت معاذؓ سے دریافت

کیا کہ ثابتؓ نظر نہیں آ رہا ہے، کیا وہ بیمار ہو گیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا حضور! وہ تو میرا ہمسایہ ہے مگر مجھے اُس کی بیماری کی کوئی خبر نہیں۔ پھر جب گھر جا کر آپ کا پتہ کیا تو انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ میری آواز قدرتی طور پر بلند ہے اور مجھے اپنے منافق ہونے کا خطرہ ہے۔ لہٰذا میں اعمال کے ضیاع کے ڈر سے گھر میں بیٹھ گیا ہوں۔ آپ کو اس بات کی خبر ہوئی تو فرمایا کہ اُس نے آیت کا مطلب ٹھیک سے نہیں سمجھا، اُس کے اعمال ضائع نہیں ہوں گے اور وہ تو جنتی ہے۔ پھر جب حضرت ثابت بن قیسؓ حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا قیسؓ کے بیٹے! کیا تمہیں یہ چیز پسند نہیں کہ تمہاری زندگی پسندیدہ گزرے اور تم شہادت کی موت پاؤ؟ اس پر حضرت ثابتؓ خوش ہو گئے۔ چنانچہ پھر ایسا ہی ہوا۔ آپ کی زندگی تو پسندیدہ ہی تھی کیونکہ آپ کا رجوع ہمیشہ نیکی کی طرف رہتا تھا۔ پھر آپ کی شہادت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ خلافت میں ہوئی۔ مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ میں حضرت خالد بن ولیدؓ سپہ سالار تھے اور حضرت ثابت بن قیسؓ اور حضرت سالمؓ اس فوج میں شامل تھے۔ اس لڑائی میں بارہ سو یا سترہ سو حفاظ قرآن اور قاری شہید ہوئے اور ہلاک شدگان کی کل تعداد ستائیس ہزار تک پہنچتی ہے۔ یہ بہت بڑا فتنہ تھا جس کو اللہ نے فرو کیا۔ اس جنگ میں بعض مواقع ایسے بھی آئے کہ مسلمانوں کو پسپا ہونا پڑا۔ اس موقع پر حضرت ثابتؓ اور آپ کے ساتھی مجاہد سالمؓ کے درمیان اس معاملہ میں گفتگو ہوئی تو حضرت سالمؓ کہنے لگے کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارکہ میں تو مسلمان کبھی پسپا نہیں ہوئے۔ اس پر دونوں حضرات نے کہا کہ ہم دشمن کا مقابلہ اس طریقے سے کریں گے کہ بھاگنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔ چنانچہ انہوں نے میدان جنگ میں گڑھا کھودا اور پھر اس میں پاؤں لٹکا کر دشمن کا مقابلہ کیا حتیٰ کہ دونوں حضرات نے جام شہادت نوش فرمایا۔

امام قرطبیؒ اور بعض دوسرے مفسرین نے لکھا ہے کہ جب حضرت ثابتؓ شہید ہوئے تو انہوں نے عمدہ قسم کی زرہ پہن رکھی تھی۔ شہادت کے بعد یہ زرہ کسی دوسرے

مسلمان نے اتار کر اپنے پاس رکھ لی۔ پھر اتفاق ایسا ہوا کہ کسی مسلمان کو حضرت ثابتؓ
خواب میں ملے اور اس سے کہا کہ فلاں آدمی نے میری زرہ اتار لی ہے اور اسے فلاں
مقام پہ رکھا ہوا ہے۔ آپ نے یہاں تک نشاندہی کی کہ یہ زرہ ایک ہانڈی کے نیچے
ہے اور اس کے اوپر فلاں فلاں سامان پڑا ہے اور زرہ اتارنے والا شخص شہر کے فلاں
حصے میں رہتا ہے۔ پھر آپ نے خواب دیکھنے والے شخص کو یہ وصیت بھی کی کہ مدینہ
جا کر خلیفہ وقت حضرت ابو بکر صدیقؓ سے کہنا کہ میں نے فلاں آدمی کا اتنا قرض دینا ہے
اس کو نظر انداز نہ کریں۔ جب وہ آدمی مدینہ واپس آیا تو اس نے خواب کا سارا واقعہ
حضرت صدیقؓ کو بتا دیا۔ چنانچہ ان کی نشاندہی کے مطابق وہ زرہ بھی برآمد ہو گئی، اور
خلیفہ وقت نے اس صحابی رسول کی وصیت کو بھی پورا کیا۔ حضرت ثابتؓ کو اللہ
نے یہ شرف بخشا کہ آپ کی خواب والی وصیت کو نافذ کیا گیا۔ اس کے علاوہ اس
قسم کا کوئی واقعہ تاریخ میں نہیں ملتا۔

با ادب لوگوں کی تعریف

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کا ادب و احترام ملحوظ رکھنے والے
لوگوں کی تعریف فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ
عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ بے شک وہ لوگ جو اللہ کے رسول کے پاس اپنی آوازوں کو پست
رکھتے ہیں أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ یہی وہ لوگ
ہیں کہ جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے خالص کر دیا ہے۔ جو لوگ نبی کی
مجلس میں بیٹھ کر اپنی آوازوں کو پست رکھتے ہیں اللہ نے ان کے دلوں میں ادب
کی تخم ریزی کی ہے اور ان کو تقویٰ اور طہارت کے لیے خالص بنا دیا ہے۔
لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ان کے لیے بخشش اور اجر عظیم ہے

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ شعائر اللہ میں سے چار
اعظم شعائر ہیں یعنی قرآن پاک، پیغمبر کی ذات مبارکہ، خانہ کعبہ اور نماز۔ ان چاروں
شعائر کی تعظیم زیادہ ملحوظ رکھنی چاہیئے۔ چونکہ پیغمبر کی ذات بھی ان اعظم شعائر میں
شامل ہے لہٰذا آپ کے ادب کے خلاف کوئی بات نہیں ہونی چاہیئے۔ خلفائے راشدینؓ

اور دیگر صحابہ کرامؓ نے نبی کے آداب کا بہترین نمونہ پیش کیا۔

باہر سے آوازیں دینے کی ممانعت

ایک دفعہ قبیلہ تمیم کا ایک وفد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ملاقات کے لیے حاضر ہوا۔ آپ اس وقت ازواج مطہراتؓ میں سے کسی ام المومنینؓ کے کمرے میں آرام فرما رہے تھے۔ جونہی یہ لوگ وہاں پہنچے تو انہوں نے باہر سے آوازیں دینی شروع کر دیں یَا مُحَمَّدُ اُخْرُجْ اِلَیْنَا یعنی اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے پاس باہر تشریف لائیں۔ اگلی آیت میں اللہ نے اسی واقعہ پر لوگوں کو تنبیہ فرمائی ہے ارشاد ہوا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَکْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ بیشک وہ لوگ جو آپ کو کمروں کی دیواروں کے پیچھے سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر سمجھ نہیں رکھتے۔ باہر سے آوازیں دیکر انہوں نے بے عقلی کی بات کی کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت آپ کسی اہم کام میں مصروف ہوں یا آپ پر وحی نازل ہو رہی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ آرام فرما رہے ہوں اور فوری طور پر باہر نہ آنا چاہتے ہوں۔ ایسی حالت میں زور زور سے آوازیں دینا خلاف تہذیب اور بعید از عقل ہے۔ ایک معمولی حیثیت کا آدمی بھی اپنے معمولات میں اس قسم کی مداخلت برداشت نہیں کرتا چہ جائیکہ نبی کی ذات کو وقت بے وقت زحمت دی جائے اور آپ کے ادب و احترام کا خیال نہ رکھا جائے۔ اگر ضروری ہی بلانا تھا تو کسی بچے کے ذریعے اندر پیغام بھیجا جا سکتا تھا، باہر سے آوازیں دینا تو بالکل ناشائستگی کا مظاہرہ تھا۔ اللہ نے فرمایا وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَیْهِمْ اور اگر وہ لوگ صبر کرتے حتیٰ کہ حضور علیہ السلام خود ان کے پاس باہر نکل آتے لَکَانَ خَیْرًا لَّهُمْ تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا۔ مطلب یہ کہ ان لوگوں کو چاہیے تھا کہ باہر سے آوازیں دینے کی بجائے حضور علیہ السلام کے خود باہر تشریف لانے کا انتظار کرتے کہ ادب نبوت کا یہی تقاضا تھا۔ یہ چوتھا اصول ہو گیا۔

ادب واحترام کی مثال

امام جلال الدین سیوطیؒ، امام قرطبیؒ اور بعض دوسرے مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ جلیل القدر صحابی اور حضور علیہ السلام کے چچا زاد بھائی تھے

حضور علیہ السلام کی وفات کے بعد آپ ہی کے حکم کے مطابق جب حضرت ابی ابن کعبؓ کے گھر قرآن سیکھنے کے لیے جاتے تو جا کر آپ کے دروازے پر بیٹھ جاتے یا وہیں کھڑے رہتے۔ آپ نہ تو باہر سے آواز دیتے اور نہ دروازہ کھٹکھٹاتے۔ پھر جب حضرت ابی ابن کعبؓ خود گھر سے باہر تشریف لاتے تو ان سے ملاقات ہوتی ایک دفعہ حضرت ابیؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا کہ جب آپ آتے ہیں تو دروازے پر دستک دے دیا کریں۔ انہوں نے کہا کہ شیخ (بزرگ یا استاد) قوم میں اس طرح ہوتا ہے جس طرح نبی اپنی قوم میں ہوتا ہے۔ اور اللہ کے نبی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اگر یہ لوگ صبر کرتے حتیٰ کہ نبی علیہ السلام خود ان کے پاس نکل کر آتے تو یہ ان کے لیے بہتر ہوتا، لہٰذا میں اپنے شیخ کو آواز دے کر یا دروازہ کھٹکھٹا کر تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ میں تو ادب کی خاطر آ کر بیٹھ جاتا ہوں کہ باہر آئیں گے تو ملاقات ہو جائے گی۔

تمام بزرگانِ دین نے ادب کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ ادب کی وجہ سے ہی فیض حاصل ہوتا ہے۔ جیسے فارسی کا مقولہ ہے۔

ع باادب شو باادب شو باادب

بے ادب محروم ماند از فضلِ رب

ہمیشہ باادب رہو کیونکہ بے ادب آدمی اللہ کے فضل سے محروم رہتا ہے۔

فرمایا اگر یہ صبر کرتے یہاں تک کہ حضور علیہ السلام خود باہر تشریف لاتے تو یہ ان کے لیے بہتر ہوتا۔ اس تنبیہ کے باوجود اللہ نے مایوس نہیں کیا بلکہ فرمایا وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے وہ چھوٹی موٹی کوتاہیوں کو معاف کر دیتا ہے، لہٰذا محتاط رہیں کہ آئندہ خلافِ ادب کوئی حرکت نہ ہو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝٦ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝٧ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝٨

ترجمہ :- اے ایمان والو ! اگر لائے تمھارے پاس کوئی
فاسق خبر، پس خوب تحقیق کر لو ، اس وجہ سے کہ کہیں تم
تکلیف نہ پہنچاؤ کسی قوم کو نادانی کے ساتھ ، پھر ہو جاؤ
تم اپنے کیے پر پشیمان ⑥ اور جان لو ! کہ بیشک تمھارے
درمیان اللہ کا رسول ہے ۔ اگر وہ مانے گا تمھاری بات
بہت سے معاملات میں تو تم مشقت میں پڑ جاؤ گے ۔ لیکن
اللہ نے محبت ڈال دی ہے تمھارے اندر ایمان کی ،
اور مزین کیا ہے اس کو تمھارے دلوں میں ۔ اور
نفرت ڈال دی ہے تمھارے اندر کفر ، نافرمانی اور گناہ
کی ، یہی لوگ ہیں ہدایت پانے والے ⑦ یہ اللہ کا فضل

ہے اور اُس کی نعمت ۔ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا
اور حکمتوں والا ہے ⑧

ربطِ آیات

مسلمانوں کی جماعتی اور اجتماعی زندگی کو درست رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے
اس سورۃ مبارکہ میں بڑے اہم ضوابط بیان کیے ہیں ۔ پہلا ضابطہ یہ بیان فرمایا
ہے کہ اللہ اور اس کے رسُول کے حکم سے آگے نہ بڑھو اور دوسرا یہ کہ ہر حالت میں
اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو یعنی تقویٰ اختیار کرو ۔ اللہ نے تیسرا ضابطہ یہ دیا کہ پیغمبر علیہ السلام
کی آواز سے اپنی آواز کو بلند نہ کرو اور آپ کے جانشینوں کے ساتھ بھی اسی ادب و
احترام کا سلوک کرو ۔ گویا کہ جب تم نبی سے گفتگو کرو تو اپنی آواز کو پست رکھو اور
اس طرح کڑک کر نہ بولو جس طرح آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بلند آواز سے
گفتگو کرتے ہو ۔ اگر ایسا کرو گے تو تمہارے تمام اعمال ضائع ہو جانے کا خطرہ ہے
پھر اللہ نے اُن لوگوں کی تعریف کی جو نبی علیہ السلام کی مجلس میں بیٹھ کر اپنی آوازوں
کو پست رکھتے ہیں ۔ فرمایا اللہ نے اُن کے دلوں کو تقویٰ کے لیے خاص کر دیا ہے
اور اُن کے لیے بخشش اور اجرِ عظیم کا وعدہ ہے ۔

اللہ نے اُن لوگوں کی مذمت بیان کی جو نبی علیہ السلام کو گھر سے باہر نام لے
کر پکارتے ہیں ، فرمایا اُن میں سے اکثر بے عقل ہیں ۔ اگر یہ صبر کرتے حتیٰ کہ اللہ
کے نبی خود گھر سے باہر تشریف لے آتے تو یہ اُن کے لیے بہتر ہوتا کیونکہ ہو سکتا
ہے کہ اُس وقت اللہ کے رسول آرام فرما رہے ہوں ، کسی اہم امور کی انجام دہی
میں مصروف ہوں یا آپ پر وحی نازل ہو رہی ہو ۔ بہر حال آپ کو باہر سے آوازیں
دینا یا دروازہ کھٹکھٹانا ناپسندیدہ فعل ہے ۔ یہ چوتھا اصول ہے ۔

حجرات و امہات المومنین

جب حضور علیہ السلام نے مسجد نبوی تعمیر کرائی تو اس کے اطراف میں امہات المومنین
کی رہائش کے لیے چھوٹے چھوٹے کمرے بھی تعمیر کروائے جن کے دروازوں پر معمولی
قسم کے موٹے پردے لٹک رہے ہوتے تھے ۔ یہ مکانات کچے تھے جن کی چھتیں
بھی بہت اونچی نہیں تھیں اور حضور علیہ السلام اپنی باری کے مطابق انہی کمروں میں

سے کسی کمرے میں آرام فرمایا کرتے تھے۔ یہ کمرے دوسری صدی میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانے تک قائم رہے۔ پھر جب مسجد کی توسیع کی ضرورت پیش آئی تو اس خلیفہ نے ان حجرات کو مسجد میں شامل کر لیا۔ توسیع کی ضرورت حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں بھی پیش آئی تھی مگر یہ توسیع مسجد کی محراب والی جانب کی گئی تھی۔ لہٰذا یہ حجرات اسی طرح قائم رہے تھے۔ انہی حجرات میں سے ایک حجرہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا تھا۔ جس میں اب آپ علیہ السلام کی قبر مبارک ہے۔ اس سے پچھلے حصے میں حضرت فاطمہؓ کی رہائش تھی اور یہ حصہ بھی اب تک محفوظ ہے البتہ باقی حجرات کا اب کوئی نشان باقی نہیں رہا۔ سوائے حضرت صدیقؓ کے کھڑکی کے جس کے متعلق حضور علیہ السلام نے خود اجازت دی تھی کہ آپ یہ دروازہ یا کھڑکی مسجد کی طرف رکھ سکتے ہیں۔ مسجد نبوی کی مغربی دیوار میں اس جگہ کی نشاندہی ایک کتبے کے ذریعے اب بھی موجود ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جس دن یہ حجرات مسجد نبوی میں شمولیت کے لیے گرائے جا رہے تھے تو مدینہ کے لوگ اس یادگار کے ختم ہو جانے کی وجہ سے بہت روئے تھے۔ بہرحال اس سورۃ میں آمدہ لفظ حجرات کے لفظ میں بہت سے حقائق پوشیدہ ہیں۔ یہ حجرات اللہ کے معصوم نبی اور کائنات میں افضل ترین ہستی کی ازواج مطہراتؓ کے استعمال میں تھے جن کے متعلق اللہ نے سورۃ احزاب میں فرمایا یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (آیت - ۳۲) اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو یعنی تمہیں اللہ نے جہان بھر کی عورتوں پر فضیلت بخشی ہے۔ بہرحال یہ سادہ کمرے تھے جن میں کسی قسم کا تکلف نہیں کیا گیا تھا۔ اگرچہ عمارات میں توسیع کرنا مباح ہے لیکن تکلف بہرحال مذموم ہے۔ اس کی وجہ سے طبقاتی کشمکش پیدا ہوتی ہے اور پھر آپس میں نفرت کے جذبات ابھرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے ایمان کا تعلق سادگی کے ساتھ ہی ہے اور امہات المؤمنینؓ کے یہ حجرات اس کا بہترین نمونہ تھے۔

معاملات کی تحقیق کا حکم

اب اللہ نے پانچواں اصول یہ بیان فرمایا ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اے ایمان والو اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا

جب کوئی فاسق آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو کہیں ایسا نہ ہو اَنْ تُصِیْبُوْا
قَوْمًا بِجَهَالَةٍ کہ تم کسی قوم کو نقصان پہنچا بیٹھو فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ
نٰدِمِیْنَ اور پھر اپنے کیے پر پشیمان ہونا پڑے ۔ لہذا کسی ایسے آدمی کی لائی ہوئی
خبر کی اچھی طرح جانچ پڑتال کر لیا کرو تاکہ اس کی صحت یا عدم صحت کا یقین ہو
جائے اور اس کے بعد مناسب کاروائی عمل میں لاؤ۔ فاسق کا عمومی معنی گنہگار ہے
جب کہ یہاں پر جھوٹا آدمی مراد ہے ۔ ظاہر ہے کہ اگر بلا سوچے سمجھے کسی جھوٹے
آدمی کی اطلاع پر کوئی کاروائی کی جائے گی تو اس سے نہ صرف دوسرے لوگوں
کا نقصان ہوگا بلکہ اپنا نقصان ہو جانا بھی عین ممکن ہے ۔

آیت کا پس منظر

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے ایک شخص ولید بن عقبہ کو
قبیلہ بنو مصطلق سے زکوٰۃ کا مال وصول کرنے کے لیے بھیجا ۔ یہ شخص گھوڑے پر
سوار ہو کر چل دیا ۔ جب اس قبیلہ کو حضور علیہ السلام کے قاصد کی آمد کی خبر ملی تو وہ
اپنے دستور کے مطابق ہتھیار بند ہو کر استقبال کے لیے باہر نکلے ۔ اس شخص کی
اُس قبیلہ کے ایک آدمی سے دیرینہ دشمنی تھی ۔ اس نے سمجھا کہ قبیلہ کے لوگ مجھے
قتل کرنے کے لیے باہر نکلے ہیں چنانچہ وہ لوگوں کو اس حالت میں دیکھ کر راستے سے
ہی مدینہ واپس لوٹ آیا اور حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اُس
قبیلے کے لوگ تو مجھے قتل کرنے کے لیے نکل آئے تھے ، لہذا میں جان بچا کر بھاگ
آیا ہوں ۔ یہ سن کر عام مسلمان اور خود حضور علیہ السلام کو بھی سخت غصہ آیا کہ اُن لوگوں نے
ہمارے نمائندے کیساتھ ایسا برا سلوک کیا ۔ آپ نے اُس قبیلہ کے ایک سرکردہ آدمی
کی طرف پیغام بھیج کر اپنی تشویش کا اظہار کیا جب اہل قبیلہ کو یہ پیغام پہنچا تو وہ
بھی سخت پریشان ہوئے کہ اس شخص نے ہمارے استقبال کا غلط مطلب لیا چنانچہ
قبیلہ کا ایک وفد حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارے حالات سے
آگاہ کیا ۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں یہ آیت اسی سلسلہ میں نازل ہوئی ۔
ولید بن عقبہ کی غلط فہمی کی وجہ سے مسلمان سخت طیش میں تھے اور اگر وہ بلا تحقیق

بنو مصطلق پر حملہ کر دیتے تو دونوں طرف کے مسلمانوں کا کس قدر جانی اور مالی نقصان ہوتا۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی فاسق آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تصدیق کر لیا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کو نقصان پہنچا بیٹھو جس کا بعد میں تم ہی کو رنج ہو۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا یہاں پر فاسق سے مراد گنہگار نہیں بلکہ جھوٹ بولنے والا ہے۔ اس قاصد نے واپس آکر یہ خبر دی کہ قبیلہ بنو مصطلق کے لوگ مجھے مارنے کے لیے باہر نکلے تھے حالانکہ ایسی بات نہیں تھی۔

جھوٹ کا دور دورہ

کسی خبر کی تحقیق کر لینا بہت بڑا ضابطہ ہے۔ موجودہ زمانے میں تباہی اور بربادی کی ایک وجہ اسی ضابطہ پر عمل درآمد کا فقدان ہے۔ نشر و اشاعت کے اس زمانے میں اخبارات اکثر جھوٹی خبریں شائع کر دیتے ہیں۔ جن کی وجہ سے متعلقہ فرد، جماعت یا ملک کا مشتعل ہو جانا فطری امر ہے۔ جھوٹی خبروں کی وجہ سے بدگمانی، نفرت اور دشمنی پیدا ہوتی ہے۔ جو بہت بڑے جانی اور مالی نقصان کا پیش خیمہ بنتی ہے۔

انگریز کا قائم کردہ نظام شہادت بھی اسی قبیل سے ہے۔ اس نظام کے تحت کوئی گواہ ٹھیک ٹھیک گواہی نہیں دے سکتا۔ اللہ کا فرمان تو یہ ہے۔ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ (الطلاق ۲) گواہی اللہ کے لیے ٹھیک ٹھیک دو۔ مگر یہاں صورت حال یہ ہے کہ وکلاء حضرات عدالت میں پیش کرنے سے پہلے ہر گواہ کو اس کی گواہی خود پڑھاتے ہیں اور تاکید کرتے ہیں کہ یوں کہنا اور یوں نہ کہنا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں گواہ صحیح صحیح گواہی نہیں دے پاتا جس کے نتیجے میں نہ تو لوگوں کو انصاف میسر آتا ہے اور نہ معاشرے میں امن و امان قائم ہوتا ہے۔ اسلام جھوٹی گواہی کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ اگر امن و سکون کی ضرورت ہے تو سچی گواہی دینا ہوگی، جھوٹ کا قلع قمع کرنا ہوگا۔ تاکہ عدل و انصاف مہیا ہو سکے اور دنیا میں امن قائم ہو سکے۔

ہمارا معاشرہ اس وقت جھوٹی خبروں اور افواہوں میں گھرا ہوا ہے۔ جھوٹی

خبروں کی اشاعت وبالِ جان بن چکی ہے اَکْذَبُ النَّاسِ الْاَخْبَارِیُّوْنَ کے مطابق اخبار
والے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں جو بلا تحقیق جھوٹی خبریں شائع کر دیتے ہیں۔ اسی طرح تاریخ
میں بھی بہت سی اناپ شناپ باتیں پائی جاتی ہیں جو ناقابلِ اعتماد ہوتی ہیں یہ شرف تو
صرف محدثین کرام کو حاصل ہے کہ انہوں نے ہر روایت کی پورے طریقے سے چھان
بین اور تحقیق کرنے کے بعد اس کو نقل کیا۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر کوئی فاسق آدمی
خبر لائے تو اس پر فوراً عمل شروع نہ کر دو بلکہ پہلے اس کی اچھی طرح تحقیق کر لو،
ایسا نہ ہو کہ نادانی میں کوئی ایسا قدم اٹھا بیٹھو جو بعد میں پشیمانی کا باعث بن جائے۔

فاسق کے متعلق احکام

فاسق کا لغوی معنی ترکِ فرمان یا اطاعت سے باہر نکل جانے والا ہوتا ہے،
اور اس لحاظ سے اس کا اطلاق گنہگار آدمی پر بھی ہوتا ہے۔ جو شخص جھوٹ بولتا ہے
غلط بیانی کرتا ہے وہ بھی فاسق ہے۔ تاہم فاسق آدمی کی مطلق خبر کو ناقابلِ اعتبار
نہیں سمجھا جاتا۔ امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ بعض معاملات میں فاسق کی خبر بھی
مقبول ہوتی ہے، مثلاً لین دین کے معاملہ میں فاسق کی بات کو تسلیم کیا جائے گا۔
اگر کوئی فاسق آدمی خبر دے کہ فلاں آدمی نے ہمارے پاس فلاں چیز بطور ہدیہ بھیجی ہے
تو اس پر اعتبار کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر فاسق آدمی یہ دعویٰ کرے کہ اسے فلاں
چیز کی فروخت کے لیے مامور کیا گیا ہے تو ایک مسلمان آدمی کو حق پہنچتا ہے کہ
اگر وہ چاہے تو اس چیز کو خرید سکتا ہے۔ اگر کسی فاسق نے خبر دی کہ فلاں شخص کے
گھر میں داخلے کے لیے اجازت طلب کی گئی ہے، تو اس کی یہ خبر بھی درست
تسلیم کی جائیگی۔ اسی طرح بعض معاملات میں بچے، غلام یا ذمی کی خبر بھی مقبول ہوتی ہے
فاسق کی شہادت اور روایت بھی عام حالات میں معتبر سمجھی جاتی ہے۔ اہل
بدعت اور خواہشات کے بندے سب فاسق ہیں مگر ان کی شہادت اور روایت
معتبر ہے لیکن ایسے معاملات میں فاسق کی خبر، شہادت یا روایت ناقابل قبول
ہوگی جن میں کسی نقصان کا اندیشہ ہو۔ اسی طرح غیر عادل آدمی کی گواہی بھی معتبر نہیں
ہوتی، گمراہ کے لیے اللہ نے قرآن پاک میں دو شرائط رکھی ہیں۔ یعنی گمراہ وہ ہوتا

چاہیئے جو اخلاق اور دیانت کے اعتبار سے عادل اور پسندیدہ ہو۔ ایسے شخص کی گواہی بلاشبہ قابلِ قبول ہے۔

اطاعتِ رسول پر لزوم

ارشاد ہوتا ہے وَاعْلَمُوٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ جان لو کہ تمھارے درمیان اللہ کا رسول موجود ہے۔ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ اگر وہ بہت سے معاملات میں تمھاری بات کو مان لے گا تو تم مشقت میں پڑ جاؤ گے۔

لہٰذا یہ خواہش نہ کرو کہ اللہ کا نبی تمھاری بات ضرور ہی مان لے۔ شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں کہ اگر تمھارا مشورہ نبی کی بارگاہ میں قبول نہ ہو تو اس کا بُرا نہ مانو کیونکہ اللہ کا رسول تو اللہ کے حکم پر عمل کرتا ہے اور اس عمل میں تمھارا ہی فائدہ ہے۔ اگر اللہ کا نبی تمھاری بات مانا کرے اور ہر کوئی اپنے ہی بھلے کی بات کرے تو پھر وہ کس کس کی بات پر چلے گا۔ ایسی صورت میں تم مشقت میں پڑ جاؤ گے۔ اللہ کا نبی بعض معاملات میں مشورہ تو کر لیتا ہے مگر ضروری نہیں کہ وہ ہر ایک کی بات کو تسلیم کرے۔ اور اگر کسی شخص کی بات نہ مانی جائے تو مخالفت شروع کر دی جائے، یہ تو بہت ہی بُری بات ہے۔ مقصد یہ ہے کہ تمام معاملات میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہی کو مقدم رکھنا چاہیئے۔

فرمایا اگر اللہ کا نبی بہت سے معاملات میں تمھاری بات کو مانے تو تم مشقت میں پڑ جاؤ گے وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ مگر اللہ نے ایمان کو تمھارے لیے محبوب ٹھہرا لیا ہے اور اس کو تمھارے دلوں میں مزین کر دیا ہے۔ یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ اُس نے تمھارے دلوں میں ایمان کی تخم ریزی کر دی ہے جس کی وجہ سے تم اسے پسند کرتے ہو۔ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ نیز اللہ تعالیٰ نے تمھارے دلوں میں کفر، نافرمانی اور گناہ سے متعلق نفرت پیدا کر دی ہے جس کی وجہ سے تم ان چیزوں کو ناپسند کرتے ہو۔ فرمایا اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ایسی ہی صفات کے حاملین لوگ نیکی اور راہِ راست پر ہیں۔ فرمایا فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ

وَنِعْمَةً یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اُس کا احسان ہے کہ اُس نے تمھارے دلوں میں یہ چیزیں ڈال دی ہیں۔ لہٰذا اگر اللہ کا نبی تمھاری کوئی بات نہ مانے تو اس کا بُرا نہ مناؤ بلکہ نبی کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ۔ ایمان دار آدمی وہی ہیں جو اپنی رائے پر اللہ اور اس کے رسول کے حکم کو مقدم جانتے ہیں اور یہی ہدایت کا راستہ ہے۔ فرمایا وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور تمام حکمتوں کا مالک ہے۔ وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے۔ تم اُن چیزوں کو نہیں جانتے جن سے اللہ تعالیٰ واقف ہے۔ وہ اپنے علم بے پایاں اور حکمت کے مطابق جو احکام دیتا ہے اُن کو بلا چوں وچرا تسلیم کر لینا ہی مخلوق کے حق میں بہتر ہے۔

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ۖ فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ ۚ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا ۖ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ﴿٩﴾ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿١٠﴾

ترجمہ :- اگر ایمان والوں میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں ، پس صلح کراؤ ان دونوں کے درمیان ۔ پس اگر ایک بغاوت کرے ان میں سے دوسرے کے خلاف ، پس تم اس کے ساتھ لڑو جو بغاوت کرتا ہے یہاں تک کہ وہ لوٹ آئے اللہ کے حکم کی طرف ۔ پس اگر وہ لوٹ آئے تو صلح کراؤ ان کے درمیان عدل کے ساتھ اور انصاف کرو ، بے شک اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے انصاف کرنے والوں کو ﴿۹﴾ بیشک ایمان والے بھائی بھائی ہیں ، پس صلح کراؤ اپنے بھائیوں کے درمیان ۔ اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے تاکہ تم پر رحم کیا جائے ﴿۱۰﴾

ربطِ آیات

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بہتر طریقے سے بسر کرنے اور نظامِ حکومت کو صحیح طریقے پر قائم کرنے سے متعلق اس سورۃ میں

بڑے اہم اصول و ضوابط بیان فرماتے ہیں۔ پہلا اصول یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو، اور ہر حالت میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ پیغمبر خدا کی مجلس میں اپنی آواز کو بلند نہ کرو اور نہ ہی آپ کے سامنے زور سے بولو۔ پھر فرمایا کہ اگر کوئی جھوٹا آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس پر بلا تحقیق عمل نہ شروع کر دو بلکہ اس کی اچھی طرح تفتیش کر لو تاکہ نادانی میں کسی قوم کو نقصان نہ پہنچا بیٹھو جس سے بعد میں پشیمان ہونا پڑے۔ فرمایا یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ کا رسول تمہارے درمیان موجود ہے۔ اللہ نے ایمان کو تمہارے دلوں میں مزین کیا ہے اور کفر، نافرمانی اور گناہ کی نفرت ڈالی ہے، لہٰذا اس بات کا یہی تقاضا ہے کہ تم مذکورہ اصولوں پر سختی سے کاربند رہو، تاکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کامیاب ہو سکو۔

مصالحت کا ضابطہ

اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے چھٹا اہم اصول یہ بیان فرمایا ہے وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا اگر اہل ایمان کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا تو ان دونوں کے درمیان صلح کرا دو۔ اگر مسلمانوں کی جماعت میں خلیفہ وقت یا اس کا مقرر کردہ حاکم موجود ہے تو اولین ذمہ داری اُس پر عائد ہوتی ہے کہ وہ دو متحارب فریقوں کے درمیان صلح کا بندوبست کرے اور اگر حاکم موجود نہیں ہے تو پھر ساری جماعت المسلمین کا فرض بنتا ہے کہ وہ دو گروہوں کے درمیان پیدا ہونے والے جھگڑے کو مٹانے کی کوشش کریں۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک میں اس قسم کے کئی واقعات پیش آئے جن میں آپ نے مخاصم فریقوں کے درمیان صلح صفائی کرا دی۔ کئی مواقع پر مہاجرین اور انصار کے درمیان مخاصمت پیدا ہوئی تو آپ نے اُن کے درمیان صلح کرا کے جھگڑے کو ختم کیا۔ مدینہ طیبہ میں اوس اور خزرج کے قبائل سینکڑوں سال سے آباد تھے۔ اور اُن کی آپس میں دشمنی بھی بڑی پرانی تھی۔ زمانۂ جاہلیت میں ان دو خاندانوں کی آپس میں معمولی معمولی باتوں پر لمبے عرصہ تک لڑائیاں ہوتی رہیں حتیٰ کہ ایک لڑائی

ایک سو بیس سال تک نسلاً بعد نسلٍ چلتی رہی حضور علیہ السلام مدینہ پہنچے تو آپ نے ان دو قبیلوں کے درمیان تمام پرانے جھگڑوں کو ختم کرا دیا۔ ان کی دشمنی جاتی رہی اور وہ باہم شیر و شکر بن کر رہنے لگے۔

حدیث شریف میں غزوہ بدر سے پہلے کا ایک واقعہ آتا ہے۔ ہجرت کے بعد قریبی زمانہ میں حضور علیہ السلام اپنے ایک صحابی حضرت سعد ابن عبادہؓ کی بیمار پرسی کے لیے تشریف لے گئے۔ اُس وقت تک رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی ابھی زبانی طور پر بھی ایمان نہیں لایا تھا اور صحابی کا گھر اسی منافق کے محلہ میں تھا حضور علیہ السلام گدھے پر سوار اُس محلہ میں پہنچے تو وہاں عبداللہ بن ابی اور اس کے بعض ساتھی بیٹھے تھے۔ ان پر گدھے کے چلنے کی وجہ سے کچھ گرد و غبار اڑ کر پڑا، تو عبداللہ کے منہ سے نکلا، صاحب اپنے گدھے کو ہم سے دور رکھیں کیونکہ اس کے پاؤں کی گرد و غبار اور اُس کی بُو ہمیں تکلیف دیتی ہے۔ لہذا آپ ہماری مجلسوں میں نہ آیا کریں۔ وہاں پر ایک مسلمان بھی موجود تھا۔ جس نے اس ناشائستہ کلمے کا بڑا برا منایا، اور آپ سے مخاطب ہو کر یہ عرض کیا کہ حضور! آپ ہماری مجلسوں میں ضرور آیا کریں۔ یہ تو ہمارے لیے باعث برکت ہوگا۔ کلمات کے اس تبادلہ پر دونوں میں الجھاؤ پیدا ہوگیا۔ ایک طرف عبداللہ کے حامی تھے۔ تو دوسری طرف کچھ مسلمان بھی جمع ہوگئے۔ کافی تکرار ہوا حتیٰ کہ ایک دوسرے پر لاٹھی اور جوتے بھی چلے۔ حضور علیہ السلام اپنی سواری سے اترے، فریقین کو سمجھایا اور ان کے درمیان مصالحت کرادی جس سے معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

ایک انصاری اور اس کی بیوی کے درمیان تنازعہ پیدا ہوگیا۔ بیوی میکے جانا چاہتی تھی مگر خاوند اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ جب بیوی نے اصرار کیا تو خاوند نے اُس کو مکان کی اُوپر والی منزل میں بند کر دیا۔ بیوی نے کسی ذریعے سے اپنے خاندان والوں کو اس زیادتی کی اطلاع کر دی، وہ لوگ آگئے اور خاوند سے پوچھ گچھ کی۔ اتنے میں اُس شخص کے خاندان والوں کو اس تنازعہ کی خبر ملی تو وہ بھی پہنچ گئے۔

فریقین میں تکرار ہوا۔ دھینگا مشتی ہوئی اور پھر نوبت لڑائی تک پہنچ گئی جب اس بات کی خبر حضور علیہ السلام کو ہوئی تو آپ نے فریقین کے درمیان صلح صفائی کرا دی اور اس طرح جنگ و جدل کا ایک بڑا خطرہ ٹل گیا۔ اس قسم کے دیگر واقعات بھی ملتے ہیں کہ دو مومن فریقین میں جھگڑا پیدا ہوا تو آپ نے صلح صفائی کرا دی۔ الغرض اللہ نے اس آیت کریمہ میں یہی بات سمجھائی ہے کہ اگر مومنوں کے دو گروہوں کے درمیان لڑائی جھگڑا ہو جائے تو ان کے درمیان صلح کرا دو۔

اس سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ دو مومن آدمیوں کا آپس میں لڑنا کبیرہ گناہ ہے مگر اس کے باوجود انہیں مومن ہی کہا گیا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے قِتَالُ الْمُؤْمِنِ كُفْرٌ وَسِبَابُهُ فِسْقٌ یعنی کسی مومن آدمی کے ساتھ لڑنا کفر ہے جب کہ اس کو گالی دینا فسق ہے۔ تاہم کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے بھی آدمی دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا، اسی لیے فرمایا کہ متحارب گروہوں کی آپس میں صلح کرا دیا کرو۔ جھگڑے تنازعے میں دو افراد بھی ملوث ہو سکتے ہیں، دو خاندان بھی اور دو جماعتیں، پارٹیاں یا فرقے بھی۔ اس کے علاوہ دو ملک بھی متحارب فریق بن سکتے ہیں۔ ہر جگہ یہی اصول کارفرما ہے کہ جھگڑا جہاں بھی ہو اُسے رفع کر کے فریقین کے درمیان صلح کرا دو۔

صحابہؓ میں اختلافات

حضور علیہ السلام کا اپنا زمانہ مبارکہ تو خیر القرون یعنی بہترین زمانہ تھا۔ اس کے بعد اختلافات پیدا ہونے شروع ہوئے جو پھیلتے ہی چلے گئے اور آج تک معاملات سلجھنے کی بجائے الجھتے ہی رہے ہیں۔ حضور علیہ السلام کے بعد آپ کے صحابہؓ کرام میں بھی اختلافات پیدا ہوئے مگر ان کی بنیاد نفسانیت پر نہیں بلکہ اجتہاد پر تھی۔ اللہ نے تمام صحابہؓ کے حق میں اپنی خوشنودی کا اعلان کر دیا ہے لہذا ہمیں ان کے بارے میں کلام نہیں کرنا چاہیئے۔ انہوں نے دین کے لیے عظیم خدمات انجام دیں، اللہ نے ان کی کوتاہیوں اور لغزشوں کو معاف کر دیا ہے۔ اسی لیے ہمارے بزرگوں میں سے حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ فرماتے ہیں کہ مجھے صحابہ کرامؓ کے اختلافات

کے بارے میں شرح صدر حاصل ہے اور مجھے یقین ہے کہ صحابہؓ میں سے کسی کا اختلاف نفسانیت، خود غرضی یا ضد کی بنا پر نہیں تھا۔ بلکہ محض اجتہادی اختلاف تھا۔ صحابہؓ میں سے حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے درمیان بھی اختلاف رائے ہوا۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان لشکر کشی وغیرہ سب اجتہادی اختلافات تھے۔ امام قرطبیؒ نے امام حسن بصریؒ سے نقل کیا ہے کہ کسی نے کہا کہ اختلافات تو صحابہ کرامؓ کے درمیان بھی پیدا ہوئے اور پھر ان کے درمیان جنگیں بھی ہوئیں۔ اس کے جواب میں امام حسن بصریؒ نے فرمایا کہ صحابہؓ کے اختلافات کے وقت وہ خود وہاں موجود تھے جب کہ ہم وہاں موجود نہیں تھے۔ اس وقت کے حالات کو وہ جانتے تھے جب کہ ہم ان کو نہیں جانتے لہٰذا جس معاملہ میں صحابہؓ نے اتفاق کیا ہم نے اس کا اتباع کیا۔ اور جس چیز میں انہوں نے اختلاف کیا، ہم نے اس میں توقف کیا۔ کم از کم ہمیں کسی ایسے معاملہ میں ضد اور عناد کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے۔

امام شافعیؒ اور امیر المومنین عمر ابن عبدالعزیزؒ کے بارے میں منقول ہے کہ جب ان سے صحابہ کرامؓ کے اختلافات کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ ان لوگوں کے خون سے اللہ نے ہماری تلواروں کو پاک رکھا ہے یعنی ہماری تلواروں نے ان کا خون بہانے میں حصہ نہیں لیا۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی زبانوں کو بھی ان کے اختلافات سے پاک رکھیں۔ شاہ ولی اللہؒ بھی فرماتے ہیں "ما موریم از کف لسان درحق ایشاں" کہ جہاں صحابہ کرامؓ میں آپس کے اختلافات کا تذکرہ ہو وہاں ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اپنی زبانوں کو روک رکھیں اور سب کو بہتری کے ساتھ یاد کریں۔ ہمیں اللہ کے نبی کی طرف سے یہی حکم دیا گیا ہے۔ اگر صحابہ کرامؓ کے بارے میں زبان کھول گئی۔ ان پر نکتہ چینی کی گئی یا طعن و ملامت کا دروازہ کھولا گیا تو دین کا دروازہ درہم برہم ہو جائے گا کیونکہ وہ لوگ دین کے اولین راویان اور دین کو دنیا میں پھیلانے والے اولین معلمین ہیں۔ اگر صحابہؓ پر اعتماد اٹھ گیا۔ تو پھر نہ قرآن

پر اعتماد برقرار رہے گا، نہ حدیث پر اور نہ سنت پر۔ غرضیکہ صحابہ کرامؓ کے بارے میں
یہی عقیدہ رکھنا چاہیئے کہ وہ سب کے سب عادل تھے۔

حضرت علیؓ سے دریافت کیا گیا کہ آپ نے جن لوگوں کے خلاف جنگیں لڑی ہیں
کیا وہ مشرک تھے؟ فرمایا نہیں، بلکہ جن کے خلاف جنگ جمل یا جنگ صفین لڑی گئی
وہ تو شرک سے بھاگنے والے تھے۔ پھر پوچھا گیا، کیا وہ منافق تھے؟ فرمایا نہیں منافقوں
کی صفت تو اللہ نے یہ بیان کی ہے۔ وَلَا يَذْكُرُونَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيلًا (النساء ۱۴۲)
کہ وہ اللہ کا ذکر کم ہی کرتے ہیں مگر یہ لوگ تو پورے طریقے سے خدا کی یاد میں لگے
رہتے ہیں۔ پھر پوچھا گیا کہ آخر آپ نے ان کے خلاف جنگ کیوں کی؟ حضرت علیؓ
نے فرمایا اِخْوَانُنَا بَغَوْا عَلَيْنَا یہ ہمارے بھائی ہیں مگر انہوں نے ہمارے خلاف سرکشی
اختیار کی اس لیے ان کے خلاف جنگ کرنا پڑی۔ شیعوں کی مشہور کتاب نہج البلاغہ میں بھی
ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے خطبے کے دوران فرمایا کہ ہمارے اور شامیوں کے درمیان اختلاف
کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ ہمارا دین ہی الگ الگ ہے بلکہ دِيْنُنَا وَاحِدٌ ہمارا دین تو
ایک ہی ہے ہماری کتاب بھی ایک ہے اور نبی بھی ایک ہے اِلَّا مَا اخْتَلَفْنَا فِيْ
دَمِ عُثْمَانَ البتہ ہمارا اور ان کا اختلاف حضرت عثمانؓ کے خون بہا کے بارے میں ہے
یہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے خون کے ذمہ دار ہم یا ہماری جماعت ہے جب کہ
حقیقت یہ ہے وَنَحْنُ بَرَاءٌ ہم اس خون سے بری ہیں۔ ہم اس میں ہرگز شریک
نہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ہم ان سے دین میں بڑھ کر نہیں اور وہ ہم سے بڑھ کر
نہیں۔ بہرحال مسلمانوں کے اختلافات کے دوران سمجھوتے اور صلح صفائی کی کوششیں
عام طور پر ناکام ہی ہوئی ہیں۔ بہت شاذ معاملات ایسے ہوئے ہیں۔ جہاں کہیں معاملہ
سلجھ گیا ہو۔

مناظرین کی بدقسمتی

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان بالعموم لڑتے بھڑتے ہی ختم ہوئے ہیں بادشاہت
ملی تو دوسروں کو ختم کیا یا خود مٹ گئے۔ عالم اسلام میں اس قسم کے اختلافات ہمیشہ
رہے ہیں۔ موجودہ زمانے میں ایران اور عراق کے درمیان ایک چھوٹے سے علاقے کا تنازعہ

گذشتہ آٹھ سال سے چل رہا ہے۔ اس جنگ میں پانچ لاکھ عراقی اور سات لاکھ ایرانی ہلاک ہو چکے ہیں۔ اور جو زخمی ہوئے ہیں وہ الگ ہیں، مالی نقصان کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ اپنی پوری کوشش کے باوجود مسلم امہ فریقین کی صلح کرانے میں ناکام رہی ہے۔ بالآخر یہ مسئلہ عراق کی طرف سے متنازعہ علاقہ سے یکطرفہ دستبرداری اور جنگ بندی کی بنا پر ختم ہو گیا۔ مگر اس کے بعد عراق نے کویت پر بزور قبضہ کر لیا۔ تمام مسلمان ممالک نے صلح صفائی کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ آخر کار امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک کی مشترکہ افواج نے کویت کو واگزار کرایا۔ بہرحال اللہ نے یہ ضابطہ بتلا دیا ہے کہ آپس میں حسد اور بغض نہ کرو، ایک دوسرے کی مخالفت نہ کرو۔ حد سے زیادہ نہ بڑھو۔ اور بھائی بھائی بن کر رہو۔

فرمایا اگر دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے پر سرکشی کرے فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي تو سارے مل کر بغاوت کرنے والے کی سرکوبی کرو حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ یہاں تک کہ سرکشی کرنے والا اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ مطلب یہ کہ زیادتی کرنے والے فریق کو مجبور کر دو کہ وہ حکم الٰہی کی تعمیل کر کے سرکشی اور زیادتی کو ختم کر دے۔ عام طریقے سے صلح نہ ہونے کی صورت میں اللہ نے زیادتی کرنے والے فریق کو طاقت کے ذریعے مغلوب کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔ عالمی تنظیم اقوام متحدہ (U.N.O.) پر تو اکثر و بیشتر کافر، مشرک، دہریے، یہود، ہنود، نصاریٰ اور کمیونسٹ قابض ہیں۔ وہ اگر مسلمانوں کی آپس میں صلح نہیں کراتے تو ان سے کیا گلہ ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خود مسلمانوں نے اس طرف کبھی سنجیدگی سے پیش رفت نہیں کی۔ فساد کو ختم کرنے کا آخری طریقہ یہی ہے کہ سارے مل کر ظالم کا ہاتھ روک دو۔

فرمایا اس آخری کارروائی کے نتیجے میں فَإِنْ فَاءَتْ اگر زیادتی کا مرتکب فریق خدا کے حکم کی طرف لوٹ آئے یعنی وہ صلح پر آمادہ ہو جائے فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا

بِالْعَدْلِ تو اُن کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو۔ وَاَقْسِطُوْا اور ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ حقدار کو اُس کا حق دلاؤ۔ اور ظالم کو سرزنش کرو۔ فرمایا انصاف کرو کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ظلم و زیادتی، بے انصافی، طرفداری، خود غرضی، اور رشوت ستانی سے فساد ہی پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمیشہ عدل و انصاف کو پیش نظر رکھو، اور اسی کے مطابق صلح کراؤ۔ کیونکہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اختلاف بھائیوں میں بھی ہو سکتا ہے اور اس کو سلجھانے کا طریقہ یہی ہے۔ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ کہ اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو۔ عدل و انصاف اور صلح جوئی ہی معاشرے کے امن و امان کی ضمانت ہے۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے اس ضابطے کی ہمیشہ مخالفت کی۔ ہماری تاریخ شر و فساد سے بھری پڑی ہے۔ مسلمانوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کافروں سے بھی بدتر سلوک کیا۔ برصغیر میں سوریوں، مغلوں، تغلق خاندان اور دوسروں کے ساتھ اختلافات نے کیا گل کھلائے، عباسیوں، امویوں اور عثمانیوں کے اختلافات نے لاکھوں آدمی موت کے گھاٹ اتار دیئے۔ کیا یہ بھائیوں جیسا سلوک ہے؟ اللہ نے تو فرمایا کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ان کے درمیان لڑائی جھگڑے کی بجائے صلح ہونی چاہیئے۔

فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰہَ اللہ سے ڈرتے رہو۔ انسان کا تقویٰ ہی اُسے صلح پر آمادہ کر سکتا ہے۔ خوف خدا قوانینِ شرع کی پابندی کا احساس دلاتا ہے۔ کفر، شرک، نفاق اور معاصی سے بچنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر انسان میں فسق و فجور ہو گا تو شر و فساد کو فروغ حاصل ہو گا۔ اس لیے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ تم احکام الٰہی کی پابندی کرو گے اس کا خوف رکھو گے تو وہ بھی تم پر رحم فرمائے گا۔ ورنہ نتیجہ ظاہر ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۱﴾

ترجمہ :- اے ایمان والو ! نہ ٹھٹھا کرے کوئی قوم دوسری قوم سے ، شاید کہ وہ ان سے بہتر ہوں ۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں سے ، شاید کہ وہ ان سے بہتر ہوں ۔ اور نہ عیب لگاؤ ایک دوسرے پر اور نہ بُرے لقب ڈالو بُرا ہے فسق کا نام ایمان کے بعد ۔ اور جو شخص توبہ نہیں کرے گا ، پس یہی لوگ ہیں بے انصاف ﴿۱۱﴾

ربط آیات

اس سورۃ مبارکہ میں مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی نظام کو درست رکھنے کے لیے ضابطے بیان کیے جا رہے ہیں ۔ گذشتہ درس میں چھٹا اصول یہ بیان ہوا تھا کہ اگر اہل ایمان کے دو گروہوں کے درمیان کوئی ناچاقی ہو جائے تو ان کی آپس میں صلح کرا دیا کرو اور سرکشی کرنے والے کو سارے مل کر مجبور کر دو کہ وہ اللہ کے قانون کی طرف لوٹ آئے یعنی زیادتی کرنے سے باز آجائے ۔ فرمایا متنازعہ معاملات کو حق و انصاف کے ساتھ سلجھا دو ۔ کیونکہ سارے مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں ۔ اب آج کی آیت میں اللہ نے وہ وجوہات بیان فرمائی ہیں جن کی بناء پر بالعموم جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اور پھر اختلافات وسیع ہو کر اشتعال پیدا ہوتا ہے اور نوبت جنگ

جدال تک پہنچ جاتی ہے۔

تمسخر کرنے کی ممانعت

اب ساتواں ضابطہ اللہ نے یہ بیان فرمایا ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے ایمان والو لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ کوئی قوم دوسری قوم سے ٹھٹھا تمسخر نہ کرے کیونکہ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ شاید کہ وہ ان سے بہتر ہوں تمسخر اسی صورت میں ہوتا ہے۔ جب تمسخر کرنے والا دوسرے شخص یا جماعت کو حقیر سمجھتا ہے اور اپنی بڑائی مقصود ہوتی ہے۔ گویا ٹھٹھا تمسخر سے دوسرے کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہے۔ مگر اللہ نے فرمایا کہ یہ بڑا شنیع فعل ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ جس شخص یا جماعت کو تم تحقیر کا نشانہ بنا رہے ہو وہ اللہ کے نزدیک تم سے بہتر ہوں اور تم اپنی نادانی کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو دعوت دے رہے ہو۔ نیز فرمایا وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں سے مذاق کریں۔ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْھُنَّ شاید کہ تمسخر کا نشانہ بننے والی تمسخر کرنے والیوں سے اللہ کے ہاں بہتر ہوں عورتوں میں یہ قباحت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے کہ اپنی تو خود نمائی کرتی ہیں اور دوسری عورتوں کو حقیر سمجھتی ہیں اور پھر ان کا مذاق اڑاتی ہیں۔ کبھی شکل و صورت پر طعنہ زنی ہوتی ہے تو کبھی کپڑوں کی تراش خراش پر اعتراض ہوتا ہے، کبھی چال ڈھال میں عیب جوئی کی جاتی ہے تو کبھی بچوں کی دیکھ بھال پر اعتراض ہوتا ہے۔ غرضیکہ عورتوں میں یہ چیز زیادہ پائی جاتی ہے مگر اللہ کا فرمان ہے کسی کو تحقیر کی نظر سے دیکھنے سے پہلے اس بات کو ذہن میں رکھ لینا چاہیئے کہ کہیں تحقیر کا نشانہ بننے والی تحقیر کرنے والی سے بہتر ہی نہ ہو۔

اس آیت کریمہ میں عورتوں کے مقابلے میں مردوں کے لیے قوم کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ لغوی اعتبار سے قوم کا اطلاق مردوں پر ہی ہوتا ہے لیکن مجازاً اس کا اطلاق عورتوں پر بھی ہوتا ہے۔ بعض مواقع پر قوم کا ذکر کر کے مرد و زن دونوں مراد لیے گئے ہیں۔ تاہم یہاں پر وضاحت کر دی گئی ہے کہ قوم سے مراد صرف مرد ہیں۔ بہر حال اللہ نے اس مقام پر مرد و زن

کی الگ الگ اصناف کا ذکر کر کے اس فعل شنیع کی قباحت کو مزید واضح کر دیا ہے

خوش طبعی کی اباحت

ٹھٹھا اور تمسخر تو بلاشبہ مذموم ہے کہ اس سے دوسرے کی تذلیل مقصود ہوتی ہے تاہم اگر کسی کی خوش طبعی کے لیے کوئی ایسی بات کی جائے تو اس کو مزاح کہتے ہیں۔ اور یہ چیز شریعت میں روا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ صحابہؓ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا تُدَاعِبُنَا وَاَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰہِ آپ اللہ کے رسول ہو کر ہم سے دل لگی کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا لَا اَقُوْلُ اِلَّا حَقًّا یعنی میں حق کے سوا کچھ نہیں کہتا۔ حضور علیہ السلام اپنے خادم حضرت انسؓ کو ذَا الْاُذُنَیْنِ (دو کانوں والے) کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ایسا آپ ازراہ تفنن کہتے تھے مگر حقیقت بھی یہی ہے کہ ہر شخص کے دو کان ہی ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت انسؓ کے کان قدرے بڑے ہوں، اس واسطے کان والے کہہ کر مخاطب فرماتے تھے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ "بات توجہ سے سنو" بہر حال آپ اس قسم کا مزاح بھی فرما لیتے تھے۔

اسی طرح ایک شخص نے جہاد کے لیے حضور علیہ السلام سے سواری طلب کی تو آپ نے فرمایا۔ میں تمھیں اونٹنی کے بچے پر سوار کراؤں گا۔ وہ شخص پریشان ہو گیا اور عرض کیا حضورؐ! میں اونٹنی کے بچے کو لے کر کیا کروں گا۔ مجھے سواری کے لیے جانور چاہیئے۔ اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا، بھائی! بڑا اونٹ بھی تو کسی اونٹنی کا بچہ ہی ہوتا ہے۔ یہ بھی مزاح تھا اور اس قسم کی اور بھی کئی باتیں نبی علیہ السلام سے منقول ہیں۔

الغرض! مزاح ایسی چیز ہے جس سے کسی کی تحقیر و تذلیل مقصود نہیں ہوتی بلکہ خوش طبعی اور دل لگی مطلوب ہوتی ہے۔ ترمذی شریف کی روایت میں ہے لَا تُمَارِ اَخَاکَ وَلَا تُمَازِحْہُ اپنے بھائی سے جھگڑا بھی نہ کرو اور مزاح بھی نہ کرو۔ محدثین کرام فرماتے ہیں کہ ٹھٹھا تمسخر تو حرام ہے اور بعض لوگ اسے مکروہ تحریمی بھی کہتے ہیں لیکن مزاح جائز ہے بشرطیکہ حدود کے اندر ہو۔ سورۃ بقرہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں آتا ہے کہ جب ایک آدمی قتل ہو گیا تو آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ ایک گائے

ذبح کر کے اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا اس مقتول کو مارو تو یہ زندہ ہو کر قاتل کی نشاندہی کر دے گا۔ اس پہ لوگ کہنے لگے اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا کیا آپ ہم سے ٹھٹا کرتے ہیں؟ تو موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (آیت ۔ ۶۷) پناہ بخدا کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں مطلب یہ کہ ٹھٹا کرنا تو جاہلوں کا کام ہے، میں اللہ کا نبی ہو کر ایسا کام کیسے کر سکتا ہوں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں آتا ہے لَوْ سَخِرْتُ بِالْكَلْبِ خَشِيْتُ اَنْ اَكُوْنَ كَلْبًا اگر میں کسی کتے کے ساتھ بھی ٹھٹا کروں تو مجھے ڈر ہے کہ خدا مجھے کتا ہی نہ بنا دے۔ گھٹیے مذاق سے نفرت پیدا ہوتی ہے، پھر تنازعات پیدا ہوتے ہیں اور لڑائی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اسی لیے اللہ نے یہاں فرمایا ہے کہ نہ مرد مردوں کے ساتھ ٹھٹا کریں اور نہ عورتیں عورتوں کے ساتھ۔

عیب جوئی کی ممانعت

آگے اللہ نے اگلا ضابطہ یہ بیان فرمایا ہے وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ اور نہ تو ایک دوسرے پر عیب لگاؤ اور نہ ہی برے القاب سے یاد کرو۔ لمز کا معنیٰ عیب لگانا ہوتا ہے جیسے سورۃ الھمزۃ میں فرمایا وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ (آیت ۔ ۱) خرابی ہے ہر پس پشت غیبت کرنے والے کے لیے اور سامنے طعنہ دینے والے کے لیے۔ طعنہ زنی آنکھوں کے اشاروں سے بھی ہوتی ہے اور ہاتھ، پاؤں، سر یا دیگر اعضاء کے اشاروں سے بھی جب کہ ہمزہ یعنی غیبت صرف زبان کے ساتھ ہوتی ہے۔ طعنہ زنی کی مثال حدیث میں اس طرح آتی ہے کہ بعض خواتین نے ہاتھ کے اشارے سے ام المؤمنین حضرت صفیہؓ کے بارے میں کہا کہ یہ تو اتنی پست قد ہے۔ جب اس واقعہ کا حضور علیہ السلام کو پتہ چلا تو آپ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ تم نے ایسی غلیظ بات کی ہے کہ اگر یہ تمام سمندروں میں ملا دی جائے تو سارے کے سارے کڑوے ہو جائیں کیونکہ یہ سخت حقارت کی بات ہے۔ ایک اور موقع پر کسی نے حضرت صفیہؓ کو طعن کیا کہ یہ یہودی کی بیٹی ہے۔ حضرت صفیہؓ نے اس بات کی شکایت حضور علیہ السلام سے

کی تو آپ نے فرمایا، ایسا کہنے والی بہت بُرا کرتی ہیں۔ انہیں کس بات پر فخر ہے ؟ پھر فرمایا، صفیہؓ ! اگر کوئی ایسی بات کرے تو تم کہہ دیا کرو کہ میرا باپ نبی تھا (یعنی موسیٰ علیہ السلام) میرا چچا نبی تھا (یعنی ہارون علیہ السلام) اور میرا خاوند اللہ کا نبی ہے۔ پھر تم مجھ پر کس بات میں فخر کرتی ہو۔ حضرت صفیہؓ نے اپنی خوشی خاطر سے اسلام قبول کیا اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے نکاح کیا۔ اللہ نے ان کو ام المومنین ہونے کا شرف بخشا تو اُن پر طعن کرنا کس قدر بری بات ہے۔

ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو کافر، فاسق یا یہودی وغیرہ کہہ دے تو اُسے پکڑ کر عدالت میں لے جاؤ۔ جرم ثابت ہونے پر اسلامی عدالت مجرم کو بیس ۲۰ درے مارنے کی سزا دے گی۔ بہر حال ایسے القاب بھی جائز نہیں جن میں دوسرے شخص کے لیے عیب پایا جائے۔ لہٰذا کسی کو بُرے لقب سے مت یاد کرو۔ ہاں بعض تعارفی نام سے کر پکارنا جائز ہے۔ بعض آدمی کسی عیب کی وجہ سے ہی مشہور ہو جاتے ہیں مثلاً لنگڑا حافظ یا گنجا وکیل وغیرہ۔ حدیث میں اَعْرَج (لنگڑا) یا اَخْفَش (چھوٹی آنکھ والا) کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ اسی طرح اَعْمَش (کمزور نظر والا) کا لفظ بھی آتا ہے۔ یہ تعارفی نام مشہور ہو جاتے ہیں اور ایسا نام لینے میں پہچان مقصود ہوتی ہے نہ کہ حقارت۔ اور جہاں تذلیل و حقارت مقصود ہوگی وہاں ایسا نام لینا ناجائز ہوگا۔ اللہ نے اس کی ممانعت فرمائی ہے۔

اسی طرح کسی کی نقالی کر کے تحقیر کرنا بھی ناجائز ہے۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہمارا سارا معاشرہ نقالی پر مبنی ہے۔ آج نقلیں اتارنے کو فن کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ فلمی اداکاروں کی ساری نقالی (ایکٹنگ) فن کہلاتی ہے۔ اسی طرح کارٹون سازی بھی نقالی ہے جس سے تحقیر کا پہلو نکلتا ہے۔ مگر انگریزی تہذیب میں اس کو عیب نہیں سمجھا جاتا۔ کسی بڑے سے بڑے آدمی کا بھی کارٹون شائع کر دیا جائے تو کارٹونسٹ کا کچھ نہیں بگڑتا کیونکہ اسے معاشرتی اور قانونی تحفظ حاصل ہے۔ مگر

اللہ کے قانون میں یہ عیب ہے کیونکہ اس سے تحقیر مقصود ہوتی ہے۔

ایمان کے بعد فسق

ارشاد ہوتا ہے بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ ایمان کے بعد فسق کا نام بہت ہی بُرا ہے۔ ایمان لانے کے بعد گناہ کے کام کرنا تو جاہلیت کے زمانے کی باتیں ہیں۔ جب ایمان قبول کر لیا ہے تو پھر کسی کے ساتھ ٹھٹھا تمسخر کرنا، بُرے القابات سے یاد کرنا، کسی کی عیب جوئی کرنا اور لقالی کرنا تو گویا فاسق بننا ہے ایمان تو بڑی عزت والا نام ہے۔ ایک ایماندار آدمی پر فسق کا اطلاق بہت ہی بُری چیز ہے، اس سے بچنا چاہیئے اور کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیئے جس سے آدمی فاسق بنتا ہو۔ فرمایا اس قسم کے کام کرنے اور فاسق بننے کے بعد وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ جو توبہ نہیں کرے گا، ایسی حرکات سے باز نہیں آئے گا۔ فرمایا فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ یہی لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ظالم اور بے انصاف ہیں۔ یہ ضرور اللہ کی گرفت میں آئیں گے۔ ہاں اگر ٹھٹھا تمسخر اور عیب جوئی کرنے کے بعد توبہ کر لی، آئندہ کے لیے ایسا کام نہ کرنے کا پختہ عہد کیا۔ تو ایسا شخص اللہ کی گرفت سے بچ جائے گا ورنہ سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾

ترجمہ:- اے ایمان والو ! بچتے رہو بہت سی بدگمانیوں سے ، بیشک بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور نہ جستجو کرو (کسی کے راز کی) اور نہ غیبت کریں تم میں سے بعض بعض کی ۔ کیا تم پسند کرتے ہو کہ کھائے کوئی اپنے مُردہ بھائی کا گوشت ؟ پس تم اس کو ناپسند کرتے ہو ۔ اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے ، بیشک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے ﴿۱۲﴾

ربط آیات

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے انفرادی اور اجتماعی نظام کی درستگی کے لیے بعض ایسے قوانین وضع فرمائے ہیں جن پر عملدرآمد سے شہری زندگی امن وامان اور خوشگوار طریقے سے بسر ہو سکتی ہے ۔ منجملہ ان ضوابط کے گزشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کو ٹھٹا اور تمسخر کرنے سے منع فرمایا تھا ۔ اللہ نے فرمایا کہ ہو سکتا ہے کہ جن مردوں یا عورتوں کو ٹھٹا کیا جا رہا ہے ۔ وہ اللہ کے نزدیک ٹھٹا کرنے والوں سے بہتر ہوں ۔ اسی طرح اللہ نے ایک دوسرے کی عیب جوئی اور بُرے القاب کے ساتھ پکارنے سے بھی منع فرمایا ۔ کیونکہ یہ چیزیں نافرمانی کی تعریف میں آتی ہیں جس کی وجہ سے آپس میں نفرت کے جذبات ابھرتے ہیں ، جھگڑے

تنازعے کھڑے ہوتے ہیں اور پھر سوسائٹی کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ ایمان لانے کے بعد فسق کا ارتکاب بہت بڑی بات ہے اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ نیز فرمایا کہ جو لوگ ان باتوں کا ارتکاب کر کے پھر توبہ بھی نہیں کریں گے تو اُن کا شمار ظالموں میں ہوگا اور وہ سزا کے مستحق بن جائیں گے۔

بدگمانی کی ممانعت

اب آج کی آیت کریمہ میں اللہ نے تین مزید ضابطے بیان فرمائے ہیں جن پر عملدرآمد سے پورا انفرادی اور اجتماعی نظام درست ہو سکتا ہے، اور امورِ سلطنت خوش اسلوبی سے انجام دیے جا سکتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اے ایمان والو! بہت سی بدگمانیوں سے بچتے رہو، کیونکہ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ بعض بدگمانیاں گناہ میں داخل ہیں۔ مفسرِ قرآن امام ابوبکر جصاص لکھتے ہیں کہ گمان کئی قسم کا ہوتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے متعلق کسی بدگمانی کا شکار ہونا حرام اور ممنوع ہے، اور اللہ کے متعلق اچھا گمان رکھنا ہر انسان کا فرض ہے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے لَا یَمُوْتَنَّ اَحَدُكُمْ اِلَّا وَهُوَ یُحْسِنُ الظَّنَّ بِاللّٰهِ تم میں سے کوئی شخص نہ مرے مگر اس حال میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق اچھا گمان رکھتا ہو۔ حدیث قدسی میں یہ بھی آتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ میں تو اپنے بندے کے گمان کے پاس ہوتا ہوں۔ اگر میرا بندہ میرے متعلق اچھا گمان رکھتا ہے تو وہ مجھے ویسا ہی پائے گا اور اگر برا گمان رکھتا ہے تو یہ اسی کے لیے وبالِ جان ہوگا۔

حضور علیہ السلام کا یہ فرمان بھی ہے اِیَّاكُمْ وَالظَّنَّ اِنَّ الظَّنَّ اَكْذَبُ الْحَدِیْثِ اپنے آپ کو بدگمانی سے بچاؤ کیونکہ بدظنی جھوٹی ترین بات ہوتی ہے سوءِ ظن کسی مسلمان کے خلاف بھی جائز نہیں جس شخص کی ظاہری حالت اچھی ہو اس کے خلاف بلا وجہ بدگمانی رکھنا ممنوع ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان کو اپنے بھائی کے بارے حسنِ ظن ہی رکھنا چاہئے جب منافقین بعض لوگوں نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی تو اُن کے لیے اللہ کی وعید آگئی لَوْلَاۤ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَیْرًا (النور-۱۲) جب تم نے ایسی بات سنی تھی تو مومن مردوں اور مومن عورتوں نے

اپنے دلوں میں نیک گمان کیوں نہ کیا۔ بہرحال ہر مسلمان کے بارے میں اچھا گمان رکھنا مستحب ہے۔

مباح گمان

امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ بعض گمان جائز بھی ہیں، مثلاً اگر کسی شخص کو نماز کے دوران رکعات کی تعداد میں شک پڑ جائے تو اسے ظنِ غالب پر عمل کرنا ہوتا ہے اگر اس کے غالب گمان میں تین رکعات پڑھی ہیں تو اس کے مطابق نماز پوری کرے یا اگر سمجھتا ہے کہ چاروں رکعتیں ہو گئیں ہیں تو اس کے مطابق عمل کرے، اسی طرح فروعات میں جس مسئلہ میں قرآن، سنت یا اجماعِ صحابہؓ کے ذریعے صراحت نہ ہو۔ وہاں پر ائمہ مجتہدین اجتہاد کے ذریعے مسئلہ کا حل پیش کرتے ہیں۔ اور یہ بھی ایک گمان ہی ہوتا ہے جس پر عمل کیا جاتا ہے۔ بہرحال گمان کی بہت سی قسمیں ہیں۔ اللہ نے عام بدگمانی کی ممانعت فرمائی ہے کیونکہ جب کسی کے متعلق بدگمانی پیدا ہوتی ہے تو پھر غلط بیانی، اتہام اور مخالفت کا دور شروع ہو جاتا ہے برائی سامنے آتی ہے، کمزوریاں ظاہر ہوتی ہیں اور پھر طبائع میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اے ایمان والو! بدگمانی سے بچتے رہو، یہ نواں ضابطہ ہو گیا۔

تجسس کی ممانعت

اب دسواں ضابطہ اللہ نے یہ بیان فرمایا وَلَا تَجَسَّسُوْا اور تجسس نہ کرو یعنی کسی کے عیب کی ٹوہ نہ لگاتے پھرو کیونکہ کسی کا راز تلاش کرنا اور پھر اسے فاش کر دینا بہت بُری بات ہے۔ اس سے دلوں میں کینہ، نفرت اور عداوت پیدا ہوتی ہے جس کا نتیجہ جنگ و جدل کی صورت میں نکلتا ہے۔ اسی لیے سعدی صاحبؒ نے کہا ہے کہ جو چیز ظاہری طور پر سامنے آئے گی۔ اسی کا اعتبار کیا جائے گا۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اندرونِ خانہ کسی کا کھوج لگاتا پھرے۔ فارسی کا مقولہ بھی ہے "اندرونِ خانہ محتسب راچہ کار" یعنی کوتوال کو اندرونِ خانہ امور سے کیا سروکار ہو سکتا ہے؟ اسے تو ظاہری حالات کے مطابق ہی مواخذہ کرنا چاہیئے ابوداؤد شریف کی روایت میں آتا ہے کہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس لایا

گیا اور کہا گیا کہ اس کی ڈاڑھی سے شراب کے قطرے گر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہمیں کسی کے بھید ٹٹولنے سے منع کیا گیا ہے۔ اگر ہمارے سامنے کوئی چیز ظاہر ہو گی۔ تو ہم اس پر پکڑ سکتے ہیں۔ بہر حال کسی کے عیوب کا کھوج لگانے سے منع کیا گیا ہے۔

غیبت کی ممانعت

آگے اللہ نے گیارھواں ضابطہ غیبت سے متعلق بیان فرمایا ہے غیبت انسانی سوسائٹی میں بالعموم پائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا اور تم میں سے بعض لوگ بعض دوسرے لوگوں کی غیبت نہ کریں۔ حدیث شریف میں غیبت کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے ذِکْرُكَ اَخَاكَ بِمَا یَکْرَہُ یعنی تو اپنے بھائی کے متعلق اس کی غیر حاضری میں ایسی بات کرے جس کو وہ ناپسند کرتا ہو۔ پوچھنے والے نے پوچھا کہ حضور! اگر وہ عیب یا خامی واقعی اس میں پائی جاتی ہو تو پھر بھی یہ غیبت ہو گی؟ آپ نے فرمایا یہی تو غیبت ہے کہ کسی میں کوئی خامی پائی جاتی ہو اور تو اس کا ذکر اس کی غیر حاضری میں کرے۔ اور اگر وہ عیب اس میں نہیں پایا جاتا اور تو اس کو بیان کرتا ہے تو پھر تو یہ بہتان ٹھہرا جو غیبت سے بھی بڑا گناہ ہے۔ ابو داؤد شریف کی حدیث میں منافقین کی مذمت ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

یَا مَعْشَرَ مَنْ اٰمَنَ بِلِسَانِہٖ وَلَمْ یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قَلْبِہٖ لَا تَغْتَابُوْا الْمُسْلِمِیْنَ وَلَا تَتَّبِعُوْا عَوْرَاتِھِمْ فَاِنَّہٗ مَنِ اتَّبَعَ عَوْرَاتِھِمْ یَتَّبِعِ اللّٰہُ عَوْرَتَہٗ وَمَنْ یَّتَّبِعِ اللّٰہُ عَوْرَتَہٗ یَفْضَحْہُ فِیْ بَیْتِہٖ (ابوداؤد ص)	اے وہ لوگو جو زبان سے ایمان لائے ہو اور ایمان ابھی ان کے دلوں میں نہیں اترا ہے مسلمانوں کی غیبت نہ کیا کرو۔ اور ان کے پوشیدہ عیبوں کے پیچھے نہ پڑا کرو کیونکہ جو ایسا کرے گا اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی اس کے ساتھ ایسا ہی ہو گا۔ اور جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا معاملہ ہو گا اللہ تعالیٰ اس کو اس کے گھر میں ہی ذلیل کر دے گا۔

حضور علیہ السلام نے معراج کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میرا گزر بعض ایسے

لوگوں پر سے ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ لوگ ان ناخنوں کے ساتھ اپنے چہروں کو نوچ رہے تھے ۔ میں نے حیران ہو کر جبریل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں ، تو انہوں نے بتایا هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ لُحُوْمَ النَّاسِ (ابوداؤد) کہ یہ وہ لوگ ہیں جو زندگی میں لوگوں کے گوشت کھایا کرتے تھے یعنی غیبت کیا کرتے تھے ۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ غیبت اس قدر گھناؤنا جرم ہے کہ یہ کسی چھوٹے بچے ، پاگل ، کافر یا ذمی کے خلاف بھی نہیں ہونا چاہیئے ۔ غیبت کلام کے ساتھ بھی ہوتی ہے ، اشارے کے ساتھ بھی اور فعل کے ساتھ بھی ۔ کوئی شخص زبان سے تو غیبت نہیں کرتا مگر کسی لنگڑے کی نقل اتارتا ہے تاکہ اس کی تحقیر ہو تو یہ بھی غیبت میں داخل ہے ۔ آنکھوں کے اشاروں سے بھی تحقیر کی جاتی ہے اور یہ بھی غیبت ہے جیسے سورۃ المطففین میں فرمایا وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ (آیت ۳۰) جب آسودہ حال کفار و مشرکین غریب اہل ایمان کے پاس سے گزرتے تھے تو آنکھوں کے اشاروں سے ان کی تحقیر کرتے کہ دیکھو یہ جنت کے والی جا رہے ہیں ۔ پھٹے پرانے کپڑے ، چہرے پژمردہ مگر اپنے آپ کو جنت کی حوروں کے خاوند کہتے ہیں ۔ غرضیکہ یہ چیز بھی غیبت میں داخل ہے ۔ جہاں تک عیب جوئی کا تعلق ہے ۔ تو مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص چوری ، بدکاری یا شراب نوشی جیسے جرم میں مبتلا تھا ۔ مگر بعد میں تائب ہو گیا تو پھر اس کو عیب دار لقب سے یاد کرنا روا نہیں کہ یہ عیب جوئی میں شمار ہو گا ۔ ہاں ! اگر کوئی شخص معصیت پر اصرار کرتا ہے تو اس کا معاملہ مختلف ہے ۔

بعض مباحات

مفسرین کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ صاحب ہوی (خواہش پرست) اور بدعات کے مرتکب لوگوں کی برائی کو ظاہر کرنا غیبت نہیں بلکہ یہ ضروریات دین میں شامل ہے حدیث کے راویوں پر جرح کرنا بھی غیبت نہیں کیونکہ اس سے دین ، سنت اور شریعت کی حفاظت مطلوب ہوتی ہے ۔ امام حسن بصریؒ نے بھی فرمایا کہ بدعتی کی بدعت کو ظاہر کرنا غیبت میں شمار نہیں ہوتا ۔ اگر کوئی فاسق آدمی علی الاعلان فسق کی بات کرتا ہے ، بےحیائی

سے محبت بھی نہیں تو اُس کی برائی کا اظہار بھی جائز ہے۔ اسی طرح جب کوئی مقدمہ
عدالت میں پیش کیا جائے تو دعویدار اپنے مدِمقابل کے عیوب و نقائص تحریری یا زبانی طور
پر پیش کر سکتا ہے۔ کیونکہ ایسی چیزوں کا اظہار حصولِ انصاف کے لیے ضروری ہوتا
ہے۔ اور یہ بھی غیبت کے دائرہ میں نہیں آتا۔ اگر کوئی شخص دوسرے شخص سے مشورہ
طلب کرے تو مشورہ دینے والا حقیقت کے اظہار کے طور پر عیب والی بات
کو ظاہر کر سکتا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ حضرت ابُوسفیانؓ کی بیوی حضرت ہندہؓ نے
حضور علیہ السلام کے پاس شکایت کی کہ میرا خاوند بڑا کنجوس آدمی ہے، مجھے خرچ بھی پورا
نہیں دیتا اگر میں اس کے مال میں سے اُس کے علم کے بغیر حسبِ ضرورت لے
لوں جس سے میری اور میرے بچوں کی کفالت ہو سکے تو کیا یہ جائز ہے؟ آپ نے
فرمایا ہاں یہ روا ہے۔ اور یہ چیز غیبت میں شمار نہیں ہوتی۔

ایک صحابیہ فاطمہ بنت قیسؓ کو اُس کے خاوند نے طلاق دے دی جس کے بعد عدت
بھی گزر گئی۔ اُس عورت نے حضور علیہ السلام سے مشورہ طلب کیا کہ فلاں فلاں آدمی نے
مجھے نکاح کا پیغام بھیجا ہے، اس سلسلہ میں مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ اُن اشخاص میں سے
ایک معاویہؓ بھی تھے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اَمَّا مُعَاوِيَةُ فَصُعْلُوكٌ
لَا مَالَ لَهٗ یعنی معاویہ تو کنگال آدمی ہے اُس کے پاس کوئی مال بھی نہیں ہے تمہارے
لیے یہ رشتہ موزوں نہیں ہے۔ اسی طرح ابوجہمؓ نامی شخص نے بھی نکاح کا پیغام بھیجا
تھا۔ اُس کے متعلق آپ علیہ السلام نے فرمایا اَمَّا اَبُوْجَهْمٍ فَلَا يَضَعُ عَصَاهُ
عَنْ عَاتِقِهٖ یا فرمایا ضَرَّابٌ لِلنِّسَاءِ یعنی ابوجہم تو لٹھ مار ہے۔ اُس کی لاٹھی ہر وقت
اُس کے کندھے پر رہتی ہے جس سے وہ عورتوں کو مارتا ہے۔ اُس سے بھی تمہیں
تکلیف پہنچنے کا خدشہ ہے میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ تم اسامہ بن زیدؓ سے نکاح
کر لو۔ اسامہؓ اگرچہ رنگ کے سانولے تھے مگر اُن میں بہت سی خوبیاں بھی پائی
جاتی تھیں۔ تو فاطمہؓ نے بادلِ نخواستہ حضرت اسامہؓ کو قبول کر لیا۔ مگر بعد میں کہا کہ میری
حالت قابلِ رشک تھی، مجھے اسامہؓ کے پاس بڑا سکھ پہنچا۔ اللہ نے اولاد بھی صالح

عطا فرمائی۔ بہرحال مقصد یہ ہے کہ مشورہ دیتے وقت کسی کے عیب کا اظہار یا ظالم کے ظلم سے بچنے کے لیے اُس کی خرابی بیان کرنا بھی غیبت میں شمار نہیں ہوتا۔

مردہ بھائی کا گوشت کھانا۔

بہرحال اللہ نے عام حالات میں غیبت کرنے سے سخت الفاظ کے ساتھ منع فرمایا ہے کہ دیکھو اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ کیا تم میں سے کوئی شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرتا ہے ظاہر ہے کہ تم اس سے کراہت ہی کرو گے۔ مطلب یہ کہ غیبت کرنا مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف ہے۔ مردار سے تو ویسے ہی انسان کو نفرت ہوتی ہے چہ جائیکہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ امام جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی تفسیر میں امام ابن القرسؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اضطرار کی حالت میں اگرچہ مردار کا گوشت مباح ہو جاتا ہے مگر انسان کا گوشت ایسی حالت میں بھی نہیں کھانا چاہیئے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح کوئی شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند نہیں کرتا اسی طرح کسی کی غیبت بھی نہیں کرنی چاہیئے۔ امام بیہقیؒ نے غیبت کا کفارہ یہ دُعا لکھی ہے اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا وَلَهٗ اے اللہ! ہمیں بھی معاف فرما اور جس کی غیبت کی گئی ہے اس کی غلطیوں سے بھی درگزر فرما۔

فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ بیشک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنیوالا اور نہایت مہربان ہے۔ اگر کوئی شخص غلطی کر کے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی جوش میں آجاتی ہے اور اُس کی غلطی معاف ہو جاتی ہے اگر کوئی شخص غیبت کا ارتکاب کر بیٹھا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنی چاہیئے اور آئندہ کے لیے ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔

درس ہفتم ۷ آیت ۱۳

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾

ترجمہ:- اے لوگو! بیشک ہم نے پیدا کیا تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے ، اور بنائے ہیں ہم نے تمہارے لیے شعوب اور قبیلے تاکہ تم آپس میں متعارف رہو سکو بیشک تم میں سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو زیادہ تقویٰ والا ہے بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہے ، اور ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے ﴿۱۳﴾

ربط آیات

اب تک گیارہ اصول بیان ہو چکے ہیں جو انسانی معاشرہ کی درستگی کے لیے ضروری ہیں۔ ان اصولوں پر عمل کرنے سے جھگڑے تنازعے اور اختلافات نہیں پیدا ہوتے اور جماعتی اور ملکی نظم و نسق خوش اسلوبی سے قائم رہتا ہے۔ یہ ضوابط اس طرح بیان کیے گئے ہیں (۱) اللہ اور اس کے رسول کے حکم سے آگے نہ بڑھو۔ (۲) ہر حالت میں ڈرتے رہو۔ (۳) پیغمبر اسلام کی آواز سے اپنی آواز کو بلند نہ کرو (۴) آوازوں کو پست رکھنا حصولِ تقویٰ کا ذریعہ ہے (۵) ہر فاسق کی خبر کی تحقیق کر لیا کرو۔ (۶) مومنوں کے دو گروہوں کے درمیان اگر تنازعہ ہو جائے تو صلح کرا دیا کرو (۷) ایک دوسرے سے ہنسی مذاق نہ کیا کرو (۸) ایک دوسرے کی عیب جوئی نہ کرو اور برے القاب سے ایک دوسرے کو نہ پکارو (۹) بدگمانی سے بچتے رہو (۱۰) تجسس نہ کرو۔ (۱۱) غیبت نہ کرو۔ اب آج کی آیت

ہیں بارھواں اصول یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ قبیلے، خاندان، برادری اور رنگ و نسل کی بناء پر ایک دوسرے پر فخر نہ کرو۔ بلکہ اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ باعزت وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

نسلِ انسانی کی تخلیق

ارشاد ہوتا ہے یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اے لوگو! اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی بیشک ہم نے پیدا کیا ہے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے۔ انسان خواہ کسی رنگ اور نسل کے ہوں، کسی ملک کے رہنے والے ہوں، یا کوئی زبان بولتے ہوں، وہ سارے کے سارے ایک مرد اور ایک عورت یعنی حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کی اولاد ہیں۔ سورۃ النساء کی ابتدائی آیت میں اللہ کا فرمان ہے، کہ اے لوگو! اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا یعنی آدم علیہ السلام سے، پہلے آدم علیہ السلام سے اس کا جوڑا بنایا اور پھر اس جوڑے سے ساری نسلِ انسانی کو تخلیق کیا۔ یہ نسل آئندہ بھی تا قیامِ قیامت پھیلتی ہی رہے گی۔ سورۃ الملک میں فرمایا ھُوَ الَّذِیْ ذَرَاَکُمْ فِی الْاَرْضِ وَاِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ (آیت ۲۴) خدا کی ذات وہ ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلا دیا، اور پھر تم اسی کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے۔ اب کوئی سید بنے یا پٹھان، مغل بنے یا صدیقی فاروقی وغیرہ مگر حقیقت میں یہ سب ایک ہی جوڑے کی اولاد ہیں۔

اس سے کئی باطل مذاہب کی تردید ہوتی ہے۔ مثلاً ہنود چار ذاتوں کے قائل ہیں جن میں سے بعض کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور بعض کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔ اُن کے عقیدے کے مطابق برہمن برہما جی کے منہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ باعزت ہیں اور شودر اس کے پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں اس لیے حقیر ہیں۔ اس طرح انہوں نے نسلِ انسانی کو چار ذاتوں یعنی برہمن، کھتری، ویش اور شودر میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اُن کا ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ انسان ایک ایک جوڑے سے ایک ایک کر کے پیدا نہیں ہوئے بلکہ جیسے کائنات پیدا ہوئی ہے ہر سرشتی

(دور) میں اللہ تعالیٰ بہت سے لوگوں کو بیک وقت پیدا کرتا ہے اور پھر ان میں سے چار کو منتخب کر کے چار صحیفے دیتا ہے۔ یہ نظریہ بھی غلط ہے، اور صحیح بات وہی ہے جو قرآن و حدیث سے ثابت ہوتی ہے۔

اس معاملہ میں ڈارون کی تھیوری بھی غلط ہے۔ پچھلی صدی کے اس سائنسدان نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ انسان ابتدا میں بندر تھے۔ پھر ترقی کرتے کرتے انسان بن گئے۔ اس نظریہ کی تردید یورپی سائنس دانوں نے بھی کی ہے۔ اسی ڈارون کے نظریہ کو پرویز نے بھی اختیار کیا ہے، وہ بھی کہتا ہے کہ اولین انسان ایک نہیں تھا بلکہ سب سے پہلے پوری نوع انسانی پیدا ہوئی تھی۔ یہ شخص کوئی بلند پایہ آدمی نہیں تھا بلکہ محض قلم چلانے کا عادی تھا، جو ذہن میں آیا لکھ دیا۔ اس نے قرآن کی تفسیر کے نام پر بھی گمراہی کی بہت سی باتیں چلائی ہیں جو کسی طرح بھی قابل قبول نہیں۔

شعوب اور قبائل

فرمایا لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ اور پھر تمہارے شعوب اور قبائل یعنی چھوٹے اور بڑے قبیلے بنا دیے۔ شعوب شعب کی جمع ہے جس کا معنی بڑا قبیلہ ہے، اور پھر اس کے نیچے بہت سی شاخیں نکلتی ہیں۔ شعب کے نیچے قبیلہ آتا ہے، پھر عمارہ، پھر فخذ، پھر بطن، پھر فصیلہ، پھر اُسرہ اور پھر عائلہ جس سے مراد ایک خاندان یا فیملی ہوتا ہے۔ فرمایا یہ خاندان اور قبیلے ہم نے اس لیے نہیں بنائے کہ تم اس قبیلے کی وجہ سے ایک دوسرے پر فخر کرو، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے لِتَعَارَفُوْا تاکہ تم آپس میں متعارف رہو یعنی ایک دوسرے کو پہچان سکو کہ یہ فلاں قبیلے کا آدمی ہے اور یہ فلاں خاندان کا فرد ہے۔ جب لوگ قبیلے کی بنا پر اپنے آپ کو بعض دوسروں پر فوقیت دینے لگتے ہیں، تو دوسروں کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔ ان سے طعن تشنیع کرتے ہیں، عیب جوئی کرتے ہیں اور پھر لڑائیاں جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ مگر اللہ نے فرمایا کہ ہم نے یہ تقسیم قبائل محض تعارف کے لیے بنائی ہے۔ اس سے غلط مطلب نہیں لینا چاہیئے۔

بعض خاندانوں کو اللہ نے ان کے بعض خصائل کی وجہ سے خود شرف بخشا ہے۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان میں سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کو منتخب فرمایا۔ پھر اس میں سے قریش کو اور پھر قریش میں بنو ہاشم کو منتخب کر کے اُس میں سے مجھے منتخب فرمایا۔ اس انتخاب کی وجہ سے وہ خاص خصوصیات رہیں جو دوسرے خاندانوں میں نہیں پائی جاتیں۔ سیرت نگار اور مؤرخین لکھتے ہیں اور یہ چیز احادیث سے بھی ثابت ہے کہ حضور علیہ السلام سے لیکر حضرت آدم علیہ السلام تک پورا خاندانی نسب بالکل پاک صاف ہے اور اسمیں بدکاری کی کوئی آلائش نہیں ہے یہی خصوصیت ہے جسکی وجہ سے آپ کے خاندان کو دیگر خاندانوں پر شرف حاصل ہے۔ مگر اس شرف کا حاصل یہ ہونا چاہیئے کہ اس خاندان کے لوگ خدا تعالیٰ کا شکر ادا کریں، نہ کہ دوسروں کو حقیر سمجھیں۔ حقیقت میں تمام شعوب اور قبائل کی جڑ بنیاد تو ایک مرد اور ایک عورت ہی ہیں لہٰذا کسی کو روا نہیں کہ وہ دوسروں کے مقابلے فخر کا اظہار کرے۔

امام جعفر صادقؒ سے منقول ہے کہ جب کوئی شخص اُن کی تعریف کرتا کہ آپ حضور علیہ السلام کے اہل بیت میں سے ہیں تو آپ نہایت عاجزی کے ساتھ جواب دیتے کہ یہ درست ہے کہ خدا تعالیٰ نے مجھے اس خاندان میں پیدا فرمایا ہے۔ مگر میں کوئی دعویٰ نہیں کرتا کیونکہ اگر قیامت والے دن حضور علیہ السلام نے پوچھ لیا کہ اللہ نے تمہیں جو شرف بخشا تھا تو نے اسے قائم کیوں نہ رکھا یعنی بنی نوع انسان کی خدمت کیوں نہیں کی تو میرے پاس کیا جواب ہوگا؟ میں تو بہت شرمسار ہوں۔ اسی سلسلے میں صحیح احادیث میں حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک بھی ہے تَعَلَّمُوا مِنْ اَنْسَابِکُمْ مَا تَصِلُوْنَ بِہٖ اَرْحَامَکُمْ اپنے نسب میں سے کم از کم اتنا سیکھو جس سے تم صلہ رحمی کر سکو۔ خاندان سے تعلق تو محض تمھارا تعارف ہے۔ اگر آپکے دور کے رشتے دار ہیں تو اُن کا تم پر اخلاقی حق ہوگا، اور اگر قریبی رشتہ دار ہیں تو وراثت میں اُن کا حق پہچاننا ضروری ہے۔ نیز تکلیف اور پریشانی میں ان کی مالی، اخلاقی اور جسمانی مدد بھی کرنا لازمی ہے، صلہ رحمی ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے خاندان میں

محبت پیدا ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے خدا تعالیٰ مال میں اضافہ فرماتا ہے۔ یہی چیز انسان کے آثار کو دیر تک قائم رکھتی ہے۔ نیک نامی اور شہرت بھی صلہ رحمی کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

فخر کرنے کی ممانعت

حضرت حذیفہؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا كُلُّكُمْ بَنُوْ آدَمَ وَآدَمُ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور ان کو اللہ نے مٹی سے پیدا فرمایا لہذا لَيَنْتَهِيَنَّ أَقْوَامٌ يَفْتَخِرُوْنَ بِآبَائِهِمْ جو لوگ اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرتے ہیں وہ اس حرکت سے باز آجائیں۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ وہ اپنے ان آباؤ اجداد کے ساتھ فخر کرنا ترک کردیں جو جہنم کے کوئلے بنے ہوئے ہیں، ورنہ لَيَكُوْنَنَّ أَهْوَنَ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الْجُعَلِ الَّذِيْ يُدَهْدِهُ الْخِرَاءَ بِأَنْفِهِ یہ متکبر لوگ اس کالے کیڑے سے بھی ذلیل ہوں گے جو غلاظت کی گولیاں بنا بنا کر اپنی ناک کے ساتھ لڑھکاتا ہے دوسری روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ اہل ایمان کو یہ بات سکھائی گئی ہے کہ لَا يَفْخَرُ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ تم میں سے بعض دوسروں پر فخر نہ کریں، بلکہ ہمیشہ تواضع اور انکساری کو اختیار کرو۔ صحیح روایت میں حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد بھی موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے دلوں اور اعمال کی طرف دیکھتا ہے، لہذا تمہارا فرض ہے اللہ کی منشاء کے خلاف دل میں بھی کوئی بات نہ لاؤ۔ وہ تو تمہارے عقیدے اخلاص اور نیت کو دیکھتا ہے کہ وہ کیسے ہیں اور تم اعمال کس قسم کے انجام دے رہے ہو۔ انسان کا شرف نسل اور خاندان کی بنا پر نہیں بلکہ عقیدے اور عمل کی بنا پر ہے۔

ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ حسب سے سوسائٹی کا تعلق ہوتا ہے بعض آدمی سوسائٹی کے اعتبار سے بلند سمجھے جاتے ہیں۔ حسب مال سے پیدا ہوتا ہے جب کہ شرف اور بزرگی تقویٰ سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر انسان میں تقویٰ موجود ہے تو اسے عزت اور تکریم بھی حاصل ہے۔ جب مکہ فتح ہوا تو حضور علیہ السلام

نے نسلی تفاخر کے خاتمے کے لیے حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا۔ بعض مشرکوں کے لیے یہ بڑا ناگوار گزرا کہ بلالؓ حبشی نسل کا ہو کر خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دے گا۔ بعض مشرکین نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اچھا ہوا میرا باپ مرگیا ہے ورنہ وہ ایسا ذلت ناک منظر نہ دیکھ سکتا۔ بعض نے کہا خاموش رہو، اللہ تعالیٰ ہماری اس حالت کو ضرور ظاہر کر دے گا۔ بہرحال جب بلالؓ نے اذان پڑھی تو حضور علیہ السلام نے یہی آیت تلاوت فرمائی یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ ..... الآیۃ اس موقع پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خطبہ بھی ارشاد فرمایا یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَذْهَبَ عَنْكُمْ عُبِّیَّةَ الْجَاهِلِیَّةِ وَتَعَظُّمَهَا بِاٰبَآئِهَا لوگو! بیشک اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کے زمانہ کی نخوت کو دور کر دیا ہے اور آباؤ اجداد کے نام سے نخوت وغرور کو بھی ختم کر دیا ہے۔

رنگ و نسل کا امتیاز

اب دو قسم کے لوگ ہوں گے بَرٌّ تَقِیٌّ نیک اور متقی اور فَاجِرٌ شَقِیٌّ هَیِّنٌ عَلَى اللّٰهِ یا فاجر اور بدبخت ہوں گے جو خدا تعالیٰ کے سامنے ذلیل ہوں گے۔ آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا اَلنَّاسُ بَنُوْ اٰدَمَ تمام انسان آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ وَخَلَقَ اٰدَمَ مِنْ تُرَابٍ اور آدم علیہ السلام کو اللہ نے مٹی سے پیدا فرمایا۔ پھر آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ ..... اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ متقی ہے اس سلسلے میں ہمارے قومی شاعر علامہ اقبالؒ نے بھی کہا ہے۔

بتانِ رنگ و بو کو چھوڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ افغانی نہ ایرانی

رنگ و نسل کا یہ تفاوت سرخ، سفید، زرد اور سیاہ رنگ کے بت ہیں اور اس بت پرستی میں مشرق و مغرب کے سبھی لوگ شامل ہیں، کوئی جاہلیت کی وجہ سے اور کوئی نخوت جاہلیت کی وجہ سے۔ چنانچہ امریکہ میں آج بھی سفید فام لوگ سیاہ رنگ والوں کو ذلیل اور حقیر سمجھتے ہیں۔ دونوں اقسام کے لوگوں کے ہوٹل الگ

الگ میں سکول اور کالج علیحدہ ہیں، ہسپتال مختلف ہیں۔ گورے لوگ کالے لوگوں کو اپنے اداروں میں داخلے کی اجازت نہیں دیتے۔ افریقہ میں کئی صدیوں سے سفید فام انگریز آباد ہیں وہ اپنی اسمبلیوں میں مقامی کالے لوگوں کو نہیں بیٹھنے دیتے۔ اس ملک کے اصل باشندے سیاہ فام ہیں مگر انگریزوں نے وہاں زبردستی قبضہ کر رکھا ہے ان کی آزادی کے لیے ساری دنیا سے آواز اٹھ رہی ہے مگر قابض قوم ٹس سے مس نہیں ہوتی برطانیہ میں بھی یہ تفاوت کسی حد تک موجود ہے بعض گلیوں میں اگر کالا آدمی چلا جائے تو قتل کر دیا جاتا ہے یا اس کی سخت تذلیل کی جاتی ہے۔ مگر اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا یہ تمام تعصبات، انسانیت اور فطرت کے خلاف ہیں۔ حضرت ملا جامیؒ نے بھی کہا ہے

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

جب تو عشق کا بندہ یعنی ایماندار بن گیا ہے، خدا کی وحدانیت اور نبی کی نبوت و رسالت پہ ایمان لے آیا ہے تو پھر نسب کو ترک کر دے، اس میں دلچسپی نہ لے کیونکہ اس راہ میں فلاں ابن فلاں کی کچھ حقیقت نہیں ہے۔

الغرض! بلال حبشیؓ، سلمان فارسیؓ اور صہیب رومیؓ نے وہ مقام حاصل کیا کہ اس سے بلند کوئی مقام نہیں۔ حضرت علیؓ کا شعر بھی ہے۔

اَلنَّاسُ مِنْ جِهَةِ التِّمْثَالِ اَكْفَاءٌ
اَبُوْهُمُ اٰدَمُ وَالْاُمُّ حَوَّاءُ

ہم شکل ہونے کی وجہ سے تمام انسان کفو یعنی برابر ہیں کیونکہ سب کا باپ آدم علیہ السلام اور ماں حواؑ ہیں۔

فَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمْ مِّنْ اَصْلِهِمْ شَرَفٌ
يُفَاخِرُوْنَ بِهٖ فَالطِّيْنُ وَالْمَاءُ

اگر اصل اور ذات کے اعتبار سے کوئی حسب نسب ہے تو وہ مٹی اور گارا ہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اسی چیز سے پیدا فرمایا تھا۔

کفو کا مسئلہ

یہاں پر کفو کا ایک شرعی مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ امام مالکؒ تو برادریوں کے کفو کے قائل ہی نہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہر مومن دوسرے مومن کا کفو ہے خواہ وہ کسی خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔ البتہ دوسرے فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ کفو کا مسئلہ ثابت ہے مگر یہ صرف مسلمانوں کی معاشرت کو درست رکھنے کے لیے ہے کوئی ایک پیشہ اختیار کرنے والے خاندان کا فرد اسی کسب والے خاندان کا مناسب کفو بن سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے حالات میں مناسبت پائی جاتی ہے۔ تاہم یہ بنیادی مسئلہ نہیں ہے بلکہ بنیادی چیز وہی ہے جو اللہ نے بیان کر دی ہے کہ تم میں سے اللہ کے نزدیک باعزت وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔ سید، شیخ، پٹھان یا مغل کہلانے میں کوئی شرف نہیں ہے۔

ذات پات کی تقسیم

ذات پات کی تقسیم نے مسلمانوں کو بہت ذلیل کیا ہے جس کی وجہ سے ایک ذات والے دوسری ذات والوں کو کمتر سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں میں ذات پات کی یہ تقسیم ہندوؤں کی طرف سے آئی ہے جو کسی طرح بھی مستحسن نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس خود ساختہ تقسیم کی جڑ بنیاد ہی اکھاڑ کر رکھ دی ہے اور یہ اہم اصول سمجھا دیا ہے کہ اگر دنیا میں فی الواقعہ کسی خاندان کو شرف حاصل ہے تو اُسے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے نہ کہ دوسروں کو ذلیل اور حقیر سمجھنے لگیں۔ عزت و شرف کا معیار تو دین اور تقویٰ ہے نہ کہ ذات اور برادری۔ تم میں سے زیادہ شرف والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ خَبِیۡرٌ بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے وہ تمہارے عزم اور نیت کو بھی جانتا ہے اور تمہارے نخوت اور تکبر سے بھی واقف ہے اصل چیز تقویٰ اور عبادت ہے جس کی بنا پر انسانوں کو عزت حاصل ہوتی ہے۔ تقویٰ کو اختیار کرنا چاہیئے اور باقی چیزوں کو چھوڑ دینا چاہیئے کیونکہ خود ساختہ ذات پات اور غرور و تکبر کی وجہ سے ہی معاشرے میں خلفشار پیدا ہوتا ہے اور پھر لڑائی جھگڑے تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

درس ہشتم ۸ آیت ۱۴ تا ۱۸

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ اِنْ تُطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَا یَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَیْــٴًـا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِیْنِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۶﴾ یَمُنُّوْنَ عَلَیْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ یَمُنُّ عَلَیْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾ ع

ع ۲ ۸ ۱۴

ترجمہ :- کہا دیہاتی گنواروں نے کہ ہم ایمان لائے ہیں آپ کہہ دیجئے (اے پیغمبر!) کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم مسلمان ہوگئے ہیں ، اور نہیں داخل ہوا ابھی

ایمان تمہارے دلوں میں۔ اور اگر تم اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی تو وہ نہیں کمی کرے گا تمہارے لیے تمہارے اعمال میں سے کچھ بھی۔ بیشک اللہ تعالے بہت بخشش کرنے والا اور نہایت مہربان ہے ⑭ بیشک ایمان والے وہ ہیں جو ایمان لائے ہیں اللہ اور اس کے رسول پر، پھر انہوں نے نہیں شک کیا، اور جہاد کیا ہے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں یہی لوگ ہیں سچے ⑮ آپ کہہ دیجئے، کیا تم جتلاتے ہو اللہ کو اپنا دین۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ تعالے ہر چیز کو جاننے والا ہے ⑯ یہ لوگ احسان جتلاتے ہیں آپ پر کہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے، نہ احسان جتلاؤ مجھ پر اپنے اسلام کا، بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ہدایت دی ہے ایمان کے لیے، اگر تم سچے ہو ⑰ بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے پوشیدہ چیزیں آسمانوں اور زمین کی۔ اور اللہ تعالے دیکھنے والا ہے جو کچھ تم اعمال کرتے ہو ⑱

ربطِ آیات

اب تک اس سورۃ مبارکہ میں وہ بارہ بڑے بڑے اصول وضوابط بیان ہو چکے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی حالات درست رہ سکتے ہیں اور مسلم معاشرہ امن و امان کا گہوارہ بن سکتا ہے اب آخر میں اللہ تعالے نے اُن لوگوں کا شکوہ کیا ہے جو ایمان کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر ان میں ایمان پورے طریقے سے راسخ نہیں ہوا۔ بعض ایسے لوگوں کا بھی شکوہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ اسلام لانے کا احسان جتلاتے ہیں۔ اللہ نے اُن کو بھی جواب دیا ہے۔

کہ اسلام لا کر تم نے اللہ کے نبی پر احسان نہیں کیا بلکہ اللہ نے تم پر احسان کیا ہے کہ اُس نے ایمان کی طرف تمہاری راہنمائی فرمائی ہے۔

ایمان کا دعویٰ

ارشاد ہوتا ہے قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا گنوار دیہاتیوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ مگر اللہ نے جواباً فرمایا قُلْ اے پیغمبر! آپ ان ایمان کے دعویداروں سے کہہ دیں لَّمْ تُؤْمِنُوْا کہ تم ایمان نہیں لائے۔ وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا بلکہ کہو کہ ہم صرف مسلمان ہوئے ہیں۔ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں پورے طریقے سے داخل نہیں ہوا۔ جب کسی کے دل میں ایمان راسخ ہو جاتا ہے تو وہ ایمان لانے کا دعویٰ نہیں کرتا جب ایمان دل میں جڑ پکڑ جائے تو پھر آدمی نہ غلیبت کرتا ہے۔ نہ عیب جوئی نہ کسی مسلمان کے بارے میں بدگمانی کرتا ہے اور نہ نسلی اعتبار سے کسی کو حقیر سمجھتا ہے۔ ایسا آدمی نہ تو کسی کو ٹھٹھا تمسخر کرتا ہے اور نہ اپنی برتری کا اظہار کرتا ہے ایماندار آدمی ایک دوسرے کو برے القاب سے بھی یاد نہیں کرتے اور نہ وہ جنگ و جدل اور نافرمانی کی باتوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ فرمایا جب تم میں معاصی کی بہت سی چیزیں موجود ہیں تو پھر تم ایمان کا دعویٰ کیسے کر سکتے ہو؟

شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں کہ ایک شخص کہتا ہے کہ ہم نے دین مسلمانی کو قبول کیا ہے اس بات کے کہنے میں تو کوئی حرج نہیں۔ اور دوسرا کہتا ہے کہ ہمیں پورا یقین ہے کہ ہم پورے طور پر ایمان اور یقین کی بات سے متصف ہو چکے ہیں، تو جب یقین پورا ہے تو اُس کے آثار کہاں ہیں؟ وہ بھی تو دکھائی دینے چاہئیں۔ جب پورا یقین ہو تو آدمی ایسے دعوے سے ڈرتا ہے اور شرماتا ہے یعنی ایسا دعویٰ نہیں کرتا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ابھی تک ان کے دلوں میں ایمان پورے طریقے سے راسخ نہیں ہوا۔ بلکہ انہوں نے جماعت میں داخل ہونے کے لیے صرف کلمہ پڑھا ہے اور ظاہری طور پر مسلمان ہوئے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اور اگر تم حقیقت

ہیں اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کروگے لَا یَلِتْکُمْ مِّنْ اَعْمَالِکُمْ شَیْئًا تو وہ تمہارے اعمال میں سے کسی چیز کو کم نہیں کرے گا بلکہ تمہارے اعمالِ صالحہ کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ اور جو کوتاہیاں سرزد ہو چکی ہیں یا کمزوریاں پیدا ہوئی ہیں، اُن کو درگذر فرمائے گا۔ کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ بیشک اللہ تعالیٰ بہت بخشش کرنے والا اور نہایت مہربان ہے۔ اس مقام پر اللہ نے دیہات کے رہنے والوں کو اعراب کے لفظ سے موسوم کیا ہے۔ یہ لوگ بعض مفاد حاصل کرنے کے لیے ایمان کا دعویٰ کرتے تھے حالانکہ اِن کے دلوں میں ایمان پورے طریقے سے راسخ نہیں ہوا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ انہیں مالِ غنیمت میں دوسروں کی نسبت زیادہ حصہ دیا جائے، نیز انہیں دیگر مراعات بھی دی جائیں۔ مگر اللہ نے اِن کی حالت یہ بیان فرمائی ہے۔ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ کُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا یَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ (التوبۃ - ۹۷) دیہاتی لوگ اکثر کفر اور نفاق میں پختہ ہوتے ہیں اور زیادہ لائق ہیں کہ وہ نہ جانیں اُن حدود کو جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیے ہیں۔

شہریوں اور دیہاتیوں میں بڑا فرق ہوتا ہے حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ مَنْ سَکَنَ الْبَادِیَۃَ جَفَا جو دیہات میں رہ گیا وہ زیادتی کرنے والا ہوگا شہری زندگی زیادہ مہذب ہوتی ہے۔ اچھی سوسائٹی نصیب ہوتی ہے، اچھے لوگوں سے میل ملاقات کا موقع ملتا ہے، تعلیم و تہذیب کے مواقع فراہم ہوتے ہیں، اچھی باتیں سننے اور پڑھنے میں آتی ہیں۔ جب کہ دیہات میں یہ چیزیں کم ہی میسر آتی ہیں۔ اسی لیے دیہاتی لوگ اکثر جہالت میں ہی پختہ ہوتے ہیں۔ ان میں حسد اور چوہدراہٹ کا مادہ نمایاں ہوتا ہے، ایک دوسرے کے خلاف اختلافات، جھگڑا فساد اور گالی گلوچ اکثر رہتا ہے کیونکہ انہیں اچھی سوسائٹی نصیب نہیں ہوتی۔ اسی کمزوری کی وجہ سے حضور علیہ السلام کے زمانہ میں بعض دیہاتیوں نے ایمان کا دعویٰ کیا مگر

ایمان کی علامات قرآن میں مفقود تھیں اور محض زبانی دعویٰ تو کچھ معنی نہیں رکھتا۔
بہرحال فرمایا کہ اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی صدقِ دل سے اطاعت کرو گے تو
تمہارے اعمال میں کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔

سچے ایمانداروں کی علامات

فرمایا اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ حقیقت
میں ایماندار وہ ہیں جو دل کی گہرائیوں سے ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول پر۔
وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی صفاتِ کمال پر یقین رکھتے ہیں اور ان تمام
چیزوں کی صدقِ دل سے تصدیق کرتے ہیں جن کی تصدیق کرنا ضروری ہے اور
جن کے بغیر آدمی صحیح معنوں میں ایماندار نہیں ہو سکتا۔ سچا اور حقیقی ایماندار آدمی وہ
ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات، کتب، ملائکہ، تمام انبیاء، حشر نشر
اور تقدیر پر صحیح طریقے پر یقین رکھتا ہے۔ فرمایا ایمان لانے کے بعد ثُمَّ لَمْ
يَرْتَابُوْا پھر انہوں نے کسی قسم کا شک کبھی نہیں کیا بلکہ ایمان میں پختگی حاصل کی ہے
جو شخص دین کی کسی بات میں شک کرتا ہے وہ منافق ہوتا ہے یا ایمان سے
بالکل ہی خالی ہو جاتا ہے۔ اگر دل میں ذرا بھی شک یا تردد آ گیا تو ایمان ضائع
ہو گیا۔ اللہ نے منافقوں کے متعلق فرمایا ہے۔ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ
يَتَرَدَّدُوْنَ (التوبۃ۔ ۴۵) وہ شک و تردد میں ہی مبتلا رہتے ہیں

فرمایا اہلِ ایمان وہ ہیں کہ ایمان لانے کے بعد شک کبھی نہیں کیا وَجَاهَدُوْا
بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اور انہوں نے اللہ کے راستے
میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کیا ہے۔ صلح و جنگ کے قوانین سورۃ
قتال اور سورۃ الفتح میں گزر چکے ہیں۔ اور جہاد بھی ایک ایماندار آدمی کا اہم فریضہ
ہے۔ سچا ایماندار کبھی جہاد سے پیچھے نہیں رہتا اور منافق آدمی ہمیشہ اس سے بچنے
کی کوشش کرتا ہے تو فرمایا سچے مومن وہ ہیں جو جہاد میں کود پڑنے میں کوئی دریغ
نہیں کرتے۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ یہی لوگ سچے ہیں حضور علیہ السلام
کے صحابہؓ میں یہ صفات بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ ان کے دلوں میں یقین راسخ

تھا۔ اور ہر موقع پر جانی اور مالی قربانی پیش کرتے تھے۔ اس کے برخلاف منافق لوگ ظاہری طور پر اسلام کے بعض اعمال بھی انجام دیتے تھے مگر ان کے دل ایمان سے خالی تھے۔ اسی لیے ایسے لوگوں کے دعویٰ ایمان کو اللہ نے رد فرمایا ہے۔

دیندار ہونے کا احسان

اللہ تعالیٰ نے محض زبانی ایمان کا دعوےٰ کرنے والوں کی تردید فرمائی ہے ارشاد ہوتا ہے قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ کیا تم اللہ کو اپنی دینداری جتلاتے ہو کہ ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے؟ فرمایا حقیقت یہ ہے وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ وہ ہر شخص کی نیت اور ارادے کو جانتا ہے اور یہ بھی کہ یہ شخص صحیح معنوں میں ایماندار ہے یا شک و تردد میں مبتلا ہے۔ اس کی غرض فاسد تو نہیں اور یہ کیوں ایمان کا دعویٰ کرتا ہے۔ فرمایا تم کیسی دینداری جتلاتے ہو حالانکہ اللہ تو سب کچھ جانتا ہے اور یہ بھی کہ تمھاری دینداری کس معیار کی ہے اور یاد رکھو! وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مکمل علم رکھتا ہے کہ سچا دیندار کون ہے اور پورا یقین کس کو حاصل ہے، صحیح ایمان کس کے دل میں ہے، کون ریاکاری کر رہا ہے اور کون مفاد حاصل کرنے کے لیے ایمان کا دعویدار ہے۔

فرمایا يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا یہ لوگ آپ پر احسان جتلاتے ہیں کہ وہ مسلمان ہو گئے یعنی انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ فرمایا قُلْ اے پیغمبر! آپ ان سے کہہ دیں لَا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ جتلاؤ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ بلکہ یہ تو اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمھیں ایمان کے لیے ہدایت دی ہے تمھیں ایمان لانے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ اس کی توفیق کے بغیر تم ایمان کی دولت حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا اپنا احسان جتلانے کی بجائے تمھیں اللہ تعالیٰ کا احسان مند ہونا چاہیئے جس نے تمھاری دین کی طرف راہنمائی کی اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

اگر تم ایمان کے دعوے میں سچے ہو تو پھر اللہ کا احسان مانو نہ کہ اپنا احسان جتلاؤ، جیسا کہ کسی نے کہا ہے۔

؎ منت منہ کہ خدمت سلطان ہمی کنی
منت ازو شناس کہ بہ خدمت بداشتت

بادشاہ کی خدمت گذاری کا احسان نہ جتلاؤ، بلکہ احسان تو اس کا مانو جس نے تمہیں اس خدمت کا موقع فراہم کیا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ احسان اللہ کا مانو جس نے تمہیں ایمان لانے کی توفیق بخشی کیونکہ اس کی توفیق کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔

بعض قبائل کے ناجائز مطالبات

سورۃ کے آخر میں یہ باتیں اللہ نے شکوے کے طور پر کہی ہیں۔ بعض قبائل حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر کہتے تھے کہ ہم تو مسلمانوں سے لڑے بھڑے بغیر اسلام لے آئے ہیں حالانکہ لوگوں نے بڑی بڑی جنگیں لڑیں اور پھر جب بالکل مغلوب ہو گئے تو ایمان قبول کر لیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ہم زیادہ مخلص ہیں لہٰذا ہمیں مال غنیمت، بیت المال یا دوسرے حقوق میں فوقیت دی جائے۔ اللہ نے اس کی بھی تردید فرمائی ہے۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ کیا ایسے لوگ اپنے دعویٰ ایمان میں سچے بھی ہیں یا نہیں؟ یہ تو ان کے آثار سے ہی معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ ایمان کے تقاضے پورے کر رہے ہیں یا نہیں۔ اگر خلوص نہیں ہے تو پھر تو وہی منافقوں والا دعویٰ ایمان ہے۔ جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ایک سچا ایماندار جب دل کی گہرائیوں سے ایمان لاتا ہے تو پھر اس میں شک و تردد نہیں کرتا اور نہ ہی وہ مفاد پرستی کا شکار ہوتا ہے۔ وہ تو مال و جان کے ساتھ قربانی پیش کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے اور اسلام لانے کا احسان نہیں جتلاتا۔ اس کے برخلاف منافقوں کا حال یہ ہے کہ مالی مفاد حاصل ہوتا ہے تو اہل ایمان کے ساتھ رہتے ہیں ورنہ پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ان کا مقصد محض مالی مفاد حاصل کرنا ہوتا ہے۔ دگرنہ دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

فرمایا إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ بیشک اللہ تعالیٰ

جانتا ہے آسمان اور زمین کی پوشیدہ چیزیں ۔ اللہ تعالیٰ سے تو کوئی چیز پوشیدہ
نہیں ہے ۔ اس غیب سے وہ چیزیں مراد ہیں جو مخلوق کے اعتبار سے پوشیدہ ہیں
ورنہ اللہ تعالیٰ تو ہر حال میں عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ہے وہ تو ہر ظاہر اور باطن
چیز کو جاننے والا ہے ۔ فرمایا وَاللّٰهُ بَصِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ جو کچھ تم کرتے
ہو ۔ وہ سب اللہ کی نگاہ میں ہے ۔ وہ تمام اعمال سے خوب واقف ہے بلکہ نیت اور
ارادے کو بھی جانتا ہے ۔ اسے علم ہے کہ کس کا عقیدہ اور عمل صحیح ہے اور کس کے عقیدے
اور عمل میں فساد ہے ۔ یہ تمام چیزیں جزائے عمل کے وقت سامنے آجائیں گی اور اسی کے مطابق
فیصلے ہوں گے ۔

سُوْرَۃُ ق
(مکیۃ)

حٰمٓ ۲۶ — قٓ ۵۰

درس اوّل ۱ — آیت ۱ تا ۵

سُوْرَةُ قٓ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ خَمْسٌ وَّاَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّثَلٰثُ رُكُوْعَاتٍ

سورۃ قٓ مکی ہے اور یہ پینتالیس آیتیں ہیں اور اس میں تین رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ① بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ② ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ③ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ④ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ⑤

ترجمہ:۔ قٓ قسم ہے بزرگی والے قرآن کی ① بلکہ ان لوگوں نے تعجب کیا ہے کہ آیا ہے ان کے پاس ایک ڈر سنانے والا انہی میں سے ۔ پس کہا کفر کرنے والوں نے کہ یہ عجیب چیز ہے ② کیا جب ہم مر جائیں گے اور ہو جائیں گے مٹی ۔ یہ لوٹ کر آنا تو بہت بعید ہے ③ تحقیق ہم جانتے ہیں جو کم کرتی ہے زمین ان میں سے ۔ اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے حفاظت

کرنے والی ④ بلکہ جھٹلایا ان لوگوں نے حق کو جب کہ ان کے پاس آگیا۔ پس یہ لوگ الجھی ہوئی بات میں مبتلا ہیں⑤

منازل قرآن

صحابہ کرامؓ نے قرآن پاک کو سات منزلوں میں تقسیم کر لیا تھا۔ اس سورۃ مبارکہ سے ساتویں منزل شروع ہورہی ہے جو آخر قرآن تک جائے گی۔ پہلی منزل میں قرآن پاک کی تین لمبی سورتیں سورۃ البقرہ، سورۃ آل عمران اور سورۃ النساء ہیں۔ اس کے بعد دوسری منزل میں پانچ سورتیں سورۃ المائدہ، سورۃ الانعام، سورۃ الاعراف، سورۃ الانفال اور سورۃ التوبہ آتی ہیں۔ پھر تیسری منزل میں سات سورتیں یعنی سورۃ یونس، سورۃ ہود، سورۃ یوسف، سورۃ الرعد، سورۃ ابراہیم، سورۃ الحجر اور سورۃ النحل ہیں۔ چوتھی منزل میں نو سورتیں ہیں جن کے نام سورۃ بنی اسرائیل، سورۃ الکہف، سورۃ مریم، سورۃ طٰہٰ، سورۃ الانبیاء، سورۃ الحج، سورۃ المومنون، سورۃ النور اور سورۃ الفرقان ہیں۔ اس کے بعد پانچویں منزل میں گیارہ سورتیں ہیں جن کے نام سورۃ الشعراء، سورۃ النمل، سورۃ القصص، سورۃ العنکبوت، سورۃ الروم، سورۃ لقمان، سورۃ الٓمٓ السجدۃ، سورۃ الاحزاب، سورۃ سبا، سورۃ الفاطر اور سورۃ یٰسٓ ہیں۔ آگے چھٹی منزل میں ۱۳ سورتیں۔ سورۃ الصّٰفّٰت، سورۃ ص، سورۃ الزمر، سورۃ المؤمن، سورۃ حٰمٓ السجدۃ۔ سورۃ الشوریٰ، سورۃ الزخرف، سورۃ الدخان، سورۃ الجاثیہ، سورۃ الاحقاف، سورۃ محمد، سورۃ الفتح اور سورۃ الحجرات آتی ہیں۔ اور سورۃ قٓ سے آگے آخر تک ساتویں منزل ہے۔ اس کو مفصل کہا جاتا ہے۔ جس میں چھوٹی چھوٹی ۶۵ سورتیں ہیں۔

سورۃ قٓ کی فضیلت

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس سورۃ مبارکہ کو اجتماع والی نماز یعنی نماز جمعہ اور عیدین کے موقع پر اکثر تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ بعض اوقات جمعہ کے دن فجر کی نماز میں بھی یہ سورۃ پڑھ لیتے تھے۔ امام ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ بڑے اجتماعات میں یہ سورۃ تلاوت کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں انسان کی پیدائش، بعث بعد الموت، حشر و نشر، جزائے عمل، ثواب و عقاب اور جنت دوزخ کا ذکر ہے حضور علیہ السلام

کی ایک صحابیہ ام ہشام بنت حارثہؓ کا بیان ہے کہ میں حضور علیہ السلام کے پڑوس میں رہائش پذیر تھی اور ڈیڑھ دو سال تک وہاں رہی۔ کہتی ہیں کہ ہم اتنے قریبی پڑوسی تھے کہ تنورنا واحدٌ کہ ہمارا روٹی پکانے کا تنور مشترکہ تھا۔ صحابیہؓ کا بیان ہے کہ میں نے سورۃ قٓ حضور علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے سن کر یاد کی۔ آپ یہ سورۃ جمعہ کے دن منبر پر بھی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔

نام اور کوائف

اس سورۃ کا نام اس کے ابتدائی حرف قٓ سے ماخوذ ہے۔ اس سے پہلے تین سورتیں مدنی تھیں جب کہ یہ سورۃ مبارکہ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ یہاں سے لے کر سورۃ الحدید تک تمام سورتیں مکی ہیں اور آگے سورۃ المجادلہ سے لے کر سورۃ التحریم تک پھر مدنی سورتیں آ رہی ہیں۔ اور پھر تیسویں پارے میں زیادہ تر مکی سورتیں ہیں۔

اس سورۃ مبارکہ کی پینتالیس آیات اور تین رکوع ہیں۔ یہ سورۃ ۳۹۵ الفاظ اور ۱۴۹۰ حروف پر مشتمل ہے۔

سورۃ کا آغاز حرفِ مقطعہ قٓ سے ہوتا ہے۔ مفسرین کرام نے تقریب فہم کے لیے اس حرف کے مختلف معانی بیان کیے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ حرف قٓ کا اشارہ اللہ تعالیٰ کی صفت قادر کی طرف ہو۔ ظالم اور مظلوم کی جنگ تو دنیا میں چلتی رہتی ہے اور خدا تعالیٰ قادر ہے کہ وہ مظلوم کو ظالم سے اس کا حق دلائے۔ حرف قٓ سے اللہ تعالیٰ کی اُن صفات کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے جن میں یہ حرف استعمال ہوتا ہے مثلاً قدوس، خالق، قہار، قدیر، قابض، حقیقت، حق، قوی، مقتدر، منتقم، مقسط، رقیب، رزاق وغیرہ۔ یاد رہے کہ اس سورۃ مبارکہ میں پینتالیس سے زیادہ مرتبہ حرف قٓ استعمال ہوا ہے۔

حرف قٓ

بعض فرماتے ہیں کہ قٓ قف کا مخفف ہے یعنی اے محمد! فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ (ہود ۱۱۲) آپ اور آپ کے ساتھ توبہ کرنے والے یعنی ایمان والے صراطِ مستقیم پر قائم رہیں۔ جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ قٓ سے مراد صراطِ مستقیم اور قیامت دونوں ہوں کیونکہ صراطِ مستقیم پر چلنے اور قیامت کا

ذکر بھی اس سورۃ میں موجود ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ق قرآن کے ناموں میں سے کوئی نام ہو۔ امام ابو حنیفہؒ کے پیروکاروں میں سے چوتھی صدی کے بڑے متقی امام ابو اللیث فقیہ فرماتے ہیں کہ ق سے مراد ہے اَللّٰهُ قَآئِمٌ بِالْقِسْطِ یعنی خدا تعالیٰ انصاف پر قائم ہے۔ بعض مفسرین یہ بھی فرماتے ہیں کہ ق کا اشارہ قدرت الٰہی اور قرب الٰہی کی طرف بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے آگے آ رہا ہے۔ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (آیت - ۱۶) ہم انسان کی شہ رگ سے بھی قریب ہیں۔ بعض سے منقول ہے کہ ق سے جبل ق مراد ہے جو کہ ایک پہاڑ ہے۔

شیخ ابن عربیؒ جیسے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ ق سے قلب محمد کی طرف اشارہ ہے آپ کے قلب مبارک کو وہ خصوصیت حاصل ہے جو کسی دوسرے قلب کو حاصل نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ (الشعراء - ۱۹۳-۱۹۴) اس قرآن کو جبریل علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے آپ کے قلب پر نازل کیا تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں۔ ق سے قلب محمد کی طرف اشارہ اسی طرح ہے۔ جیسے سورۃ ص میں ص کا اشارہ صورت محمد کی طرف ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان کی صورتوں میں سے حضور علیہ السلام کی صورت مبارکہ کو سب سے حسین و جمیل بنایا ہے اور اس کو کمال درجے کے اعتدال پر رکھا ہے۔ چنانچہ چوتھی صدی کے عظیم فلسفی منطقی اور طبیب شیخ ابن سیناؒ نے لکھا ہے کہ حضور علیہ السلام کا جسم مبارک اَعْدَلُ الْاَجْسَامِ یعنی تمام اجسام سے زیادہ معتدل تھا۔ بہر حال ق سے مراد قلب محمدی بھی ہو سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بہترین شرف بخشا ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ ق کا اشارہ قضاء اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے فیصلے کی طرف بھی ہو سکتا ہے۔ اور ص سے مراد صدق اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی صداقت کی طرف بھی ممکن ہے۔

مفسر قرآن امام رازیؒ (المتوفی ۶۰۶ھ) سلطان محمد غوریؒ کے زمانہ میں ہوئے ہیں۔ آپ عظیم المرتبت اور عالم فاضل انسان تھے، تفسیر کے علاوہ بعض دیگر کتابیں

بھی لکھی ہیں۔ آپ نے صرف قٓ کا مطلب ایک دوسرے طریقے سے سمجھایا ہے۔
فرماتے ہیں کہ عبادت تین طریقوں سے ہوتی ہے یعنی قلب سے، زبان سے اور اعضاء و
جوارح سے۔ قلب کی عبادت یہ ہے کہ انسان کا عقیدہ صحیح ہو، اور اُس کی نیت
اور ارادہ پاک ہو۔ پھر فرماتے ہیں کہ زبان کی عبادت یہ ہے کہ انسان زبان سے اللہ
کی حمد و ثنا اور تسبیح و تہلیل بیان کرے، دیگر پاکیزہ کلمات زبان پر لائے اور قرآن
پاک کی تلاوت کرے اور اعضاء و جوارح کی عبادت قیام، رکوع، سجود، قومہ اور قعدہ
سے ہوتی ہے۔ اعضاء کی عبادت کا مفہوم کبھی سمجھ میں آجاتا ہے مگر عام لوگ اس کا
مفہوم کم ہی سمجھتے ہیں۔ مثلاً حج کا احرام، سعی، رمی وغیرہ ایسی عبادات ہیں جن کا مطلب
آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لیے بعض لوگ رمی کرتے وقت چھوٹی چھوٹی کنکریوں کی
بجائے بڑے بڑے پتھر مارنے لگتے ہیں۔ اسی طرح قلبی عبادت کی بعض چیزیں دلائل
سے سمجھی جا سکتی ہیں۔ مثلاً اللہ کی وحدانیت اور وقوع قیامت عقلی اور نقلی دلائل سے
سمجھی جا سکتی ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات اور انبیاء علیہم السلام کی صداقت بھی
دلائل سے سمجھ میں آجاتی ہے مگر بعض چیزیں دلائل سے بھی سمجھ میں نہیں آتیں مثلاً
پل صراط پر سے گزرنا جو ایک باریک چیز ہے اور پھر اعمال کا وزن ایسی چیزیں ہیں
جو ہمارے ادراک میں نہیں آتیں، تاہم ان پر اعتقاد رکھنا ضروری ہے اور یہ
چیز قلبی عبادت میں داخل ہے۔ زبانی عبادت میں تلاوت قرآن اور ذکر اذکار
کے الفاظ سمجھ میں آتے ہیں جو ہم اپنی زبان سے ادا کرتے ہیں مگر بعض چیزیں ہماری
سمجھ سے بالاتر ہیں جیسے قرآن پاک کے متشابہات اور حروف مقطعات وغیرہ۔ لہٰذا
ان کی تلاوت ہی عبادت میں شامل ہے، ان کو سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ امام جلال الدین
سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ اس معاملہ میں انسان کا اعتقاد یہی ہونا چاہیئے۔ اَللّٰہُ اَعْلَمُ
بِمُرَادِہٖ بِذٰلِکَ ان حروف سے جو بھی مراد ہے اس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے
اور ہمارا اس پر ایمان ہے۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنے طریقے پر حروف قٓ کے متعلق فرماتے

لہ جلالین ص۴۲

ہیں کہ اس سے ایسی قباحتوں کی طرف اشارہ ہے جو پتھر کی طرح سخت ہو چکی ہوں، کیونکہ ان میں قوت اور شدت والا معنی پایا جاتا ہے۔ اور ان قباحتوں کا مقابلہ قوتِ قدسیہ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ چنانچہ اسی مقصد کے لیے وعظ و نصیحت کی جاتی ہے اور نشانیاں پیش کی جاتی ہیں تاکہ یہ قباحت اور اُس کی شدت اور قوت دور ہو جائے اور اس کی بجائے اصلاح پیدا ہو جائے۔ بہرحال یہ تمام معانی محض تقریبِ فہم کے لیے ہیں۔ ان سے حقیقی معنی مراد نہیں کیونکہ اس کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے

قرآن کی قسم

ارشاد ہوتا ہے وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ بڑی بزرگی اور عظمت والے قرآن کی قسم ہے کہ لوگ اس پر ایمان نہیں لائے۔ یہ جوابِ قسم ہے جسے محذوف مانا جاتا ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دور یعنی حضور علیہ السلام، صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے ابتدائی زمانہ تک علمی مبادی میں سے کتاب کی شکل میں صرف قرآن پاک تھا اور اس کے علاوہ کوئی چیز کتابی صورت میں موجود نہیں تھی۔ حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد ہمام ابن منبہؒ کے صحیفہ کا پتہ پہلی صدی کے نصف تک ہی ملتا ہے کیونکہ حضرت ابوہریرہؓ کی وفات ۵۹ھ کے قریب ہوئی ہے اور آپ کے شاگرد نے یہ صحیفہ جمع کیا تھا۔ اس کے بعد پہلی صدی کے آخر میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جن کا دورِ خلافت صرف دو اڑھائی سال ہے، نے فرمایا کہ قرآن تو موجود ہے لیکن حضور علیہ السلام کی احادیث کے متعلق تشویش ہے کہ وہ کہیں ضائع نہ ہو جائیں، لہٰذا انہوں نے اپنے زمانے کے ایک جلیل القدر تابعی امام زہریؒ کو احادیث کا ذخیرہ جمع کرنے کی ہدایت کی۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا تھا اِنِّیْ خِفْتُ دُرُوْسَ الْعِلْمِ وَذَهَابَ الْعُلَمَاءِ مجھے علم اور علماء کے چلے جانے کا خطرہ ہے اگر یہ عالم رخصت ہو گئے تو علم کی حفاظت کون کرے گا۔ لہٰذا احادیث کو جمع کرو۔ چنانچہ یہیں سے تدوینِ حدیث کا کام شروع ہوا۔ پھر تیسری صدی یعنی امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے زمانے تک احادیث کا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا۔ راویوں کی چھان بین بھی ہو چکی تھی۔ اور یہ اس لیے ضروری تھا کہ قرآن کی تفہیم کا بنیادی ذریعہ احادیث مبارکہ ہی ہیں۔

بہرحال حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مساعی سے احادیث اور پھر دیگر کتب کی تدوین شروع ہوگئی۔ تاہم ابتداء میں کتابی صورت میں صرف قرآن حکیم ہی تھا۔ تو اللہ نے اس بزرگی والے قرآن کی قسم اٹھا کر کہا کہ اکثر لوگ اس پر ایمان نہیں لائے بلکہ اس کا انکار کر رہے ہیں

رسالت پر تعجب

قرآن کے بعد رسالت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا بَلْ عَجِبُوٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ کہ وہ قرآن پر تو ایمان نہ لائے بلکہ اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ ان کے پاس انہی میں سے ایک ڈرانے والا آگیا ہے۔ حالانکہ یہ کوئی تعجب والی بات نہیں ہے کیونکہ انسانی سوسائٹی میں نبوت و رسالت کا سلسلہ شروع سے چلا آرہا ہے اور آپ سے پہلے ایک لاکھ سے زیادہ انبیاء تشریف لا چکے تھے۔ یہ سب انسان تھے اور انسانوں کی راہنمائی کے لیے ان کو اللہ نے مبعوث فرمایا تھا۔ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَیْءٌ عَجِیْبٌ بہرحال حضور علیہ السلام کے اعلانِ نبوت پر کافر کہنے لگے کہ یہ بڑی عجیب چیز ہے کہ ہمیں میں سے ایک آدمی نبی بن کر آجائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ (القمر - ۲۴) کیا ہم اپنے میں سے ایک آدمی کا اتباع شروع کر دیں تو یہ بیوقوفی کی بات ہے۔ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی اس حکمت کو نہیں سمجھتے تھے جو انسانی سوسائٹی میں کام کرتی ہے بلکہ اسے اپنے آپ پر قیاس کر کے کہتے تھے کہ یہ تو ہمیں میں سے ایک آدمی ہے۔ بھلا اس کا اتباع ہم کیسے کر سکتے ہیں۔

بعث بعد الموت پر اعتراض

ایک طرف تو انہوں نے رسالت کا انکار کر دیا اور دوسری طرف وقوع قیامت اور جزائے عمل کو بھی جھٹلا دیا کہنے لگے ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا جب ہم مر جائیں گے۔ اور مٹی کے ساتھ مٹی ہو جائیں گے تو پھر کیسے زندہ ہو جائیں گے؟ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِیْدٌ انسان کا مرنے کے بعد دوبارہ لوٹ آنا تو بالکل بعید از عقل ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ تحقیق ہم جانتے ہیں کہ زمین نے ان کے اجسام میں سے کونسی چیز کم کی ہے یعنی مرنے کے بعد ان کے جسم اپنی اصلی حالت پر نہیں رہے وہ گل سڑ کر مٹی میں مل گئے ہیں۔ مگر ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہر جسم کا کون کونسا حصہ مٹی کے کس کس

ذرے میں گم ہو چکا ہے۔ لہٰذا جب قیامت کو ہم انہیں دوبارہ زندہ کرنا چاہیں گے تو مٹی میں ملے ہوئے تمام ذرات کو اکٹھا کر لیں گے اور پھر اُن سے دوبارہ جسم کا ڈھانچہ کھڑا کر کے اُسے زندہ کر دیں گے۔ لہٰذا ان بدبختوں کے زعم کے برخلاف بعث بعد الموت ہمارے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ انسانی اجسام کی تحلیل کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کے اجسام تو بالکل محفوظ رہتے ہیں، اور زمین اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اسی طرح بعض شہداء کے اجسام بھی محفوظ رہتے ہیں۔ تاہم عام لوگوں کے اجسام گل سڑ کر مٹی میں مل جاتے ہیں۔ اور حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ انسان کے پورے جسم میں سے صرف دمچی کی ہڈی کسی نہ کسی صورت میں محفوظ رہتی ہے۔ مستدرک حاکم کی روایت میں آتا ہے کہ اس دمچی کی ہڈی میں رائی کے دانے کے برابر مادہ حیات قائم رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ قیامت کو اسی مادے سے انسان کو دوبارہ کھڑا کرے گا۔

اعمال کی حفاظت کا نظام

شاہ عبد القادرؒ ایک دوسرے طریقے پر بات کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ انسان کی ہر چیز تو ضائع نہیں ہوتی۔ مثلاً انسان کی روح محفوظ رہتی ہے اور اسی طرح انسان کے اعمال بھی اُس کے نسمے میں محفوظ ہوتے ہیں۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے تمام اعمال اُس کے نفس سے نکلتے ہیں، لہٰذا کوئی آدمی کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا جس کا بیج اُس کے نفس میں موجود نہ ہو۔ پھر جب کوئی شخص وہ عمل بار بار کرتا ہے تو اس کے لیے ایسا کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اور جب ان اعمال کے نتائج کا وقت آتا ہے تو یہ اعمال پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اور انسان کے نفس کے دامن کو پکڑ لیتے ہیں اور اس طرح ان اعمال کو شمار کر لیا جاتا ہے۔ قیامت کے دن تمام اعمال کھل کر سامنے آ جائیں گے اور پھر ان کا حساب کتاب ہو جائے گا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں موجود ہے وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا (آیت ۱۳) ہم نے ہر انسان کے اعمال کو کتابی صورت

میں اُس کے گلے میں لٹکا دیا ہے جسے ہم قیامت والے دن نکالیں گے اور ہر انسان اسے کھلا ہوا دیکھ سکے گا۔ پھر اُس سے کہا جائے گا۔ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۚ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (آیت ۱۴) اپنی کتاب پڑھ لے۔ آج تو خود ہی اپنا محاسب کافی ہے۔

انسان کے اعمال کی حفاظت اس وجہ سے بھی ہوتی رہتی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں وقتاً فوقتاً اپنے اعمال کو یاد کرتا رہتا ہے اور سوچتا رہتا ہے کہ میں نے فلاں فلاں وقت میں فلاں فلاں مقام پر یہ یہ کام کیا تھا۔ اس طرح ان اعمال کی حفاظت ہوتی رہتی ہے اس کے علاوہ انسان کے ذہن میں بھی اُس کے اعمال محفوظ رہتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے علم محیط میں بھی ہر چیز محفوظ ہے۔ اگر کوئی چیز انسانی نظروں سے غائب بھی ہو جائے تو اللہ کے علم میں تو ہے وہ جب چاہے اسے نکال لے گا اور پھر فرمایا وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ کہ ہمارے پاس حفاظت کرنے والی ایک کتاب بھی تو ہے۔ اس سے مراد لوح محفوظ ہے جس میں ہر چیز اللہ کے پاس درج ہے۔ تو فرمایا انہیں کس بات پر تعجب ہے کیا انسان دوبارہ زندہ نہیں ہوگا۔ اور حساب کتاب کی منزل نہیں آئے گی؟ فرمایا ضرور آئیگی اور ہر ایک کو اُس کے اعمال کا بھگتان کرنا ہوگا۔

تکذیب حق

ارشاد فرمایا حقیقت یہ ہے بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ بلکہ ان لوگوں نے حق کو جھٹلایا ہے لَمَّا جَآءَهُمْ جب کہ وہ ان کے پاس آگیا فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ اور یہ لوگ الجھی ہوئی یعنی پریشان بات میں ہی مبتلا ہیں۔ مریج دراصل اُس باغ یا سبزہ زار کو کہتے ہیں جس کے پودے اور درخت آپس میں الجھے ہوئے ہوں اور وہاں پریشانی کی سی کیفیت طاری ہو۔ ان لوگوں کی مثال بھی ایسی ہی ہے۔ یہ اسی بات میں الجھے رہتے ہیں کہ مرنے کے بعد ہمارے اجسام کے منتشر ذرات کیسے جمع ہوں گے اور پھر انسان کیسے جی اٹھے گا۔؟ ان لوگوں کی پریشانی کی حالت اس بات سے بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ ایمان لانے کی بجائے اللہ کے نبی کو کبھی شاعر کہتے کبھی کاہن کبھی مجنون اور کبھی کذاب (نعوذ باللہ) وہ قرآن کو خود ساختہ کلام کہتے اور

وقوعِ قیامت اور حشر نشر کا صاف سے انکار کر دیتے۔ اسی لیے فرمایا کہ یہ لوگ پریشان کن حالات میں پڑے ہوئے ہیں۔

اس لفظ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ قیامت اور حشر کا منکر اگر انسانی سوسائٹی میں کوئی تنظیمی کام انجام دے گا تو اسے فیصلہ کن حالت تک نہیں پہنچا سکے گا۔ کیونکہ کسی فیصلہ پر پہنچنے کے لیے وحدتِ فکر کی ضرورت ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لانے سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی سے انسان کے اعمال کو یکسوئی حاصل ہوتی ہے۔ وحدتِ فکر کے بغیر دنیاوی امور بھی الجھے ہوئے ہی رہیں گے۔ اور کفار و مشرکین کی طرح ایسے لوگ ہمیشہ متزلزل ہی رہیں گے۔

اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَیْفَ بَنَیْنٰهَا وَ زَیَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ﴿۶﴾ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِیْجٍ ﴿۷﴾ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ ﴿۸﴾ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِیْدِ ﴿۹﴾ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِیْدٌ ﴿۱۰﴾ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْیَیْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا ؕ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ﴿۱۱﴾ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ﴿۱۲﴾ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ ﴿۱۳﴾ وَّاَصْحٰبُ الْاَیْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ؕ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِیْدِ ﴿۱۴﴾ اَفَعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ؕ بَلْ هُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ﴿۱۵﴾ ع ۱۵

ترجمہ:۔ کیا نہیں دیکھا اِن لوگوں نے آسمان کی طرف اُن کے اُوپر کہ کس طرح ہم نے بنایا ہے اس کو ، اور زینت بخشی ہے اس کو اور نہیں ہے اس میں کسی قسم کی کوئی دراڑ ﴿۶﴾ اور زمین کو پھیلایا ہم نے ، اور رکھ دیے اس میں بوجھل پہاڑ ، اور اگائی ۔ ہم نے اس میں ہر

قسم کی بارونق چیز ⑦ یہ بصیرت اور نصیحت ہے ہر بندے کے لیے جو رجوع رکھتا ہے ⑧ اور اتارا ہم نے آسمان کی طرف سے بابرکت پانی ، پس اگائے ہم نے اس کے ساتھ باغات اور کھیت جو کاٹے جاتے ہیں ⑨ اور کھجوریں لمبی لمبی جن کے خوشے ہیں تہہ بہ تہہ ⑩ یہ روزی ہے بندوں کے لیے ، اور زندہ کیا ہم نے اس (پانی) کے ساتھ مردہ زمین کو ، اسی طرح ہو گا دوبارہ نکلنا ⑪ جھٹلایا ان سے پہلے قوم نوح نے ، اور کنوئیں والوں نے اور قوم ثمود نے ⑫ اور قوم عاد نے اور فرعون نے اور لوط کے بھائیوں نے ⑬ اور جنگل میں رہنے والوں نے اور تبع کی قوم نے ۔ سب نے جھٹلایا اللہ کے رسولوں کو ، پس ثابت ہو گیا میرا عذاب سے ڈرانا ⑭ کیا ہم تھک گئے ہیں پہلی مخلوق کو بنا کر ؟ نہیں بلکہ یہ لوگ اشتباہ میں پڑے ہوئے ہیں نئی پیدائش کے متعلق ⑮

ربط آیات

ابتدائے سورۃ میں قرآن کریم کی عظمت کو بیان کیا گیا ہے ۔ پھر اللہ نے پیغمبر علیہ السلام کی رسالت اور وقوع قیامت کا انکار کرنے والوں کا رد کیا ، اور فرمایا کہ یہ کون سی تعجب کی بات ہے کہ اللہ نے انہی میں سے ایک شخص کو منذر بنا کر بھیجا ہے اور اس کے ذریعے اپنا پیغام مخلوق تک پہنچایا ہے ۔ انسانی تاریخ سے ثابت ہے کہ پہلے بھی اللہ تعالیٰ انسانوں ہی سے رسول بنا کر ان کی طرف بھیجتا رہا ۔ اب اللہ کا آخری رسول بھی انہی میں سے ہے تو یہ کوئی عجیب بات تو نہیں ہے ۔

اللہ نے دوسری بات یہ فرمائی کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم مر جائیں گے ، اور ہمارے اجسام ریزہ ریزہ ہو کر مٹی میں رل مل جائیں گے تو ہم دوبارہ کیسے اٹھائے جائیں گے

گے ؟ یہ تو بعید از عقل معلوم ہوتا ہے۔ اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ جسم کا جتنا حصہ زمین اپنے اندر جذب کر لیتی ہے، ہم اُس کو جانتے ہیں، لہٰذا ضرورت کے وقت ہم وہ تمام منتشر شدہ اجزاء جمع کر کے انسان کو دوبارہ کھڑا کر دیں گے۔ فرمایا یہ تمام چیزیں لوحِ محفوظ میں بھی محفوظ ہیں، لہٰذا انسان کے اعضاء کو جوڑ کر دوبارہ زندہ کر لینا ہمارے لیے کچھ مشکل نہیں۔ یہ لوگ تو محض شک اور تردد میں پڑے ہوئے ہیں۔

دلائلِ قیامت
(۱) آسمان کی تخلیق

اللہ تعالیٰ نے وقوعِ قیامت کی دلیل کے طور پر فرمایا اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَیْفَ بَنَیْنٰهَا کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اُسے کس طرح بنایا ہے وَزَیَّنّٰهَا اور ہم نے اُس کو کیسی رونق بخشی ہے وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ اور اس میں کوئی دراڑ یا سوراخ نہیں ہے۔

قرآن پاک میں مختلف مقامات پہ آسمان کو قدرت کی دلیل کے طور پہ پیش کیا گیا ہے۔ جیسے سورۃ النبأ میں فرمایا وَبَنَیْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا (آیت ۱۲) اور ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔ سورۃ لقمان میں ارشاد ہوا خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (آیت ۱۰) اُس نے آسمانوں کو ستونوں کے بغیر پیدا کیا جیسے تم دیکھتے ہو۔ جہاں تک آسمان کی رونق کا تعلق ہے تو یہ گرد و غبار اور ابر سے پاک آسمان پہ رات کے وقت دیکھی جا سکتی ہے جب کہ سیارے اور ستارے قندیلوں اور فانوسوں کی طرح جگمگ جگمگ کر رہے ہوتے ہیں۔ انسان کا تعمیر کردہ مکان کتنا بھی مضبوط ہو، مگر کچھ عرصہ بعد شکست و ریخت کا شکار ہو جاتا ہے مگر قدرت کا قائم کردہ یہ نظامِ شمسی لاکھوں سال سے چل رہا ہے مگر اس کے آسمان میں ذرہ بھر بھی دراڑ نہیں آئی۔ کیا یہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ تامہ اور حکمتِ بالغہ کا نمونہ نہیں ہے ؟ دوسری جگہ فرمایا لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ (المؤمن ۔ ۵۷) آسمانوں اور زمین کی پیدائش انسانوں کی پیدائش سے بڑا کام ہے۔ انسان تو ایک چھوٹی سی ہستی ہے، جب کہ اللہ نے زمین و آسمان جیسی بڑی بڑی چیزوں کو بہترین نظام کے ساتھ پیدا فرمایا ہے۔ اس

حقیقت ہے کہ بغیر نطفہ انسان کی دوبارہ پیدائش کیوں دشوار معلوم ہوتی ہے۔

(۲) زمین کا پھیلاؤ۔

آسمان کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا کیا انہوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کس طرح پھیلا دیا ہے۔ زمین کو اس قدر ہموار بنا دیا ہے کہ انسان اور جانور اس پر آسانی کے ساتھ چلتے پھرتے ہیں اور کاروبارِ زندگی انجام دیتے ہیں۔ زمین نہ تو اتنی نرم ہے کہ انسان اور جانور اس میں دھنس جائیں اور نہ اتنی سخت ہے کہ اس سے کام ہی نہ لیا جا سکے۔ چنانچہ لوگ زمین پر سڑکیں اور عمارات تعمیر کرتے ہیں، اس کو کھود کر اس میں کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ جس سے پھل پھول اور غلہ حاصل ہوتا ہے جو انسانوں اور جانوروں کی خوراک بنتا ہے۔ زمین کو چاروں طرف سے پانی نے گھیر رکھا ہے، اس کے باوجود اس میں ٹھہراؤ پیدا کر دیا ہے جس کی وجہ سے اس پر شب و روز تمام کام انجام دیے جاتے ہیں۔

بعض لوگ مَدَدْنٰهَا کے لفظ سے یہ مراد لیتے ہیں کہ زمین چپٹی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ زمین ایک گیند کی مانند گول ہے ایک عام گیند کا قائم ہونا تو دشوار ہے مگر زمین کا قطر چوبیس ہزار میل ہے، اور اتنا بڑا کرہ ہونے کی وجہ سے اس کی گولائی محسوس نہیں ہوتی موجودہ زمانے میں سائنس داں زمین کی حدود سے نکل کر فضا کا سفر اختیار کرتے ہیں۔ جب وہ اوپر جاتے ہیں تو انہیں زمین بھی اسی طرح گول دکھائی دیتی ہے جس طرح ہم زمین سے چاند کو ایک گیند کی شکل کا دیکھتے ہیں۔ زمین کے پھیلاؤ کی مثال ریاضی والے اس طرح دیتے ہیں کہ اس زمین پر واقع بتیس ہزار فٹ بلند پہاڑ کی حیثیت اتنی ہے۔ جتنا ایک گز کے اوپر انچ کا ستارہواں حصہ رکھ دیا جائے۔ اس لیے زمین چپٹی دکھائی دیتی ہے حالانکہ یہ گول ہے۔

(۳) پہاڑ اور نباتات

اللہ نے زمین کا ذکر کر کے فرمایا وَاَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ ہم نے اس میں بوجھل پہاڑ رکھ دیے تاکہ زمین کے رہنے والوں میں اضطراب پیدا نہ ہو۔ اب اضطراب دو قسم سے ہے۔ پہلے اضطراب کی مثال ایک کشتی کی ہے کہ جس پر

ایک طرف زیادہ بوجھ ہو تو وہ مضطرب ہو کر ڈولنے لگتی ہے، لہذا اس کا توازن قائم رکھنے کے لیے اس کے دونوں طرف بوجھ کو برابر کر دیا جاتا ہے۔ زمین پر پہاڑ رکھنے کا ایک مقصد بھی یہی ہے کہ زمین غیر متوازن ہو کر ڈولنے نہ پائے۔ اس بات کا تذکرہ اللہ نے سورۃ الانبیاء میں بھی فرمایا ہے۔ وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَن تَمِيدَ بِهِمْ (آیت-۳۱) ہم نے زمین میں بوجھل پہاڑ رکھ دیے ہیں تاکہ یہ ڈولنے نہ پائے۔

دوسرا اضطراب معنوی ہے۔ یعنی اللہ نے جگہ جگہ پہاڑ رکھ دیے ہیں کہ ان کے بغیر لوگ بہت سی اشیاء سے محروم رہتے جو ان کے اضطراب کا باعث ہوتا۔ مثلاً پہاڑوں سے بیش قیمت پتھر، سونا، چاندی، کوئلہ، لوہا اور دیگر معدنیات حاصل کی جاتی ہیں۔ ان پر بڑے بڑے درخت ہوتے ہیں جن سے عمارتی لکڑی حاصل ہوتی ہے۔ پہاڑوں پر پیدا ہونے والی جڑی بوٹیوں سے کام لیا جاتا ہے اور یہاں پیدا ہونے والے پھلوں سے لوگ مستفید ہوتے ہیں۔

فرمایا وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ اور ہم نے اس زمین میں ہر قسم کی بارونق چیزیں بھی پیدا کی ہیں۔ یہ بھی زمین کی ایک اضافی خصوصیت ہے۔ زمین پر ہر قسم کے درخت، پودے، گھاس، پھل اور اناج پیدا ہوتا ہے۔ جو انسانی اور حیوانی زندگی کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ اس زمین پر اربوں کی تعداد میں انسانی آبادی کے علاوہ لاکھوں، کروڑوں حیوانات اور بے شمار کیڑے مکوڑے بھی ہیں۔ جن کی مختلف قسمیں، مختلف شکلیں اور مختلف رنگ ہیں۔ یہ سب چیزیں اللہ نے زمین میں ہی پیدا کی ہیں۔ اور یہ سب کچھ تَبْصِرَةً وَذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ بصیرت اور نصیحت ہے ہر اس شخص کے لیے جو خدا تعالیٰ کی طرف رجوع رکھتا ہے۔ آسمان و زمین کی تخلیق، انسانوں، حیوانوں، نباتات، جمادات، سمندروں اور دریاؤں کی تخلیق، نیز پہاڑوں، میدانوں اور ریگزاروں کی وسعت کو دیکھ کر صاحب عقل انسان میں بصیرت پیدا ہوتی ہے اور وہ ان ہی نشانیوں سے خدا تعالیٰ

کی قدرت اور اس کی وحدانیت کو سمجھ سکتا ہے۔ یہ سب اللہ کی قدرت کے دلائل ہیں ۔ ان میں غور کرنے والا کوئی شخص وقوع قیامت اور بعث بعد الموت کا انکار نہیں کر سکتا ۔ بصیرت اور نصیحت سے یہی مراد ہے

(۳) بارش کا نزول

پھر فرمایا وَ نَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا اور ہم نے آسمان کی طرف سے بابرکت پانی نازل کیا ۔ سورۃ الفرقان میں مَآءً طَهُوْرًا (آیت ۴۸) کا لفظ آیا ہے ۔ یعنی ہم نے آسمان کی طرف سے پاکیزہ پانی اتارا ہے ۔ طہور اس چیز کو کہا جاتا ہے جو خود پاک ہو اور دوسری چیزوں کو پاک کرتی ہو ۔ گویا پانی کو اللہ تعالیٰ نے آلۂ طہارت یعنی پاکیزگی کا ذریعہ بنایا ہے ۔ پانی ایک ایسی چیز ہے جس پر ہر چیز کی زندگی کا دار و مدار ہوتا ہے ۔ سورۃ الانبیاء میں فرمایا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (آیت ۳۰) ہم نے پانی کے ذریعے ہر چیز کو حیات بخشی ۔ پانی انسانی جسم کی ایک اہم ضرورت ہے جس میں پانی کی کمی سے موت واقع ہو جاتی ہے ۔ انسان کے جسم میں گردش کرنے والے خون میں اسی (۸۰) فیصد پانی اور بیس (۲۰) فیصد باقی غذائی مواد ہیں ۔ اور اسی خون کے ذریعے جسم کے مختلف ساختوں کو غذا مہیا کی جاتی ہے ۔ لہذا اس سے پانی کی اہمیت کی وضاحت ہوتی ہے ۔

اللہ نے بارش کے پانی کو بابرکت فرمایا ہے ۔ بارش کے موقع پر ایک دفعہ حضور علیہ السلام نے اپنی آستین سے کپڑا ہٹا کر ہاتھ مبارک آگے کر دیا تاکہ بارش کے قطرات اس حصہ جسم پر پڑیں ۔ آپ نے بارش کا پانی اپنے جسم پر مل لیا ۔ دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا کہ یہ پانی تازہ تازہ آسمان کی طرف سے نازل ہوا ہے جو کہ بابرکت ہے ۔ جب یہ زمین پر گرتا ہے تو پھر اس میں کئی کثافتیں بھی شامل ہو جاتی ہیں لہذا براہ راست نازل ہونے والا پانی بڑا بابرکت اور پاکیزہ ہے ۔

پانی ذریعہ کاشت ہے

فرمایا ہم نے آسمان کی طرف سے پانی نازل فرمایا جو کہ بابرکت ہے فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ پھر ہم نے اس پانی کے ذریعے باغات اور کاٹی جانے والی فصل اگائی ۔ ظاہر ہے کہ پانی کے بغیر نہ کوئی چیز کاشت کی جا سکتی ہے

اور نہ اس سے پھل یا اناج وغیرہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ تو کاشتکاری میں پانی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے جس کے نتیجے میں پھل، پھول، اناج اور سبزیاں ترکاریاں پیدا ہوتی ہیں جو انسانوں اور جانوروں کی خوراک بنتی ہیں۔ یہاں پہ دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے پہلی چیز باغات ہیں، جن پر پھل آتا ہے جو توڑ لیا جاتا ہے اور درخت قائم رہتے ہیں۔ ان درختوں پہ بار بار پھل آتا ہے۔ جسے برداشت کر کے استعمال میں لایا جاتا ہے دوسری چیز حب الحصید یعنی وہ کھیتیاں یا فصلیں ہیں جو پک جانے پر مکمل طور پر کاٹ لی جاتی ہیں اور پھر اگلے موسم میں دوبارہ کاشت کی جاتی ہیں۔ اناج کی فصلوں کے علاوہ سبزی ترکاری اور چارہ وغیرہ بھی اسی مد میں شامل ہیں۔

پھر فرمایا وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ، ہم نے لمبی لمبی کھجوریں بھی پیدا فرمائیں۔ آم کی طرح کھجوروں کی بھی سینکڑوں اقسام ہیں کھجور کا درخت بالعموم لمبا اور بڑا دیرپا ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے کھجور کے درخت کو ایک مومن کے ساتھ تشبیہ دی ہے کہ جس طرح ایک مومن آدمی کے دل میں ایمان ہوتا ہے اور وہ عبادت و ریاضت میں مداومت اختیار کرتا ہے، اس طرح کھجور کا درخت بھی ہمیشہ سرسبز رہتا ہے اس کا پھل ایک مومن آدمی کی طرح مفید ہوتا ہے جس سے شربت، شیرہ بنایا جاتا ہے اور بعض علاقوں میں کھجور کو خوراک کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ بہر حال فرمایا کہ ہم نے لمبی لمبی کھجوریں پیدا کیں لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيدٌ جن کے خوشے تہہ بہ تہہ ہیں۔ اور یہ تمام چیزیں رِزْقًا لِّلْعِبَادِ بندوں کے لیے روزی کا ذریعہ ہیں اناج پھل، کھجوریں، سبزیاں وغیرہ نہ صرف انسانوں کی خوراک ہیں۔ بلکہ جانور بھی انہی چیزوں پہ پلتے ہیں۔ چارہ وغیرہ تو خاص طور پہ جانوروں کے لیے اگایا جاتا ہے، تاہم اناج کا بھوسہ اور درختوں کے پتے وغیرہ بھی جانوروں کی خوراک بنتے ہیں۔

بعث بعد الموت پہ دلیل

پھر فرمایا وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا اور ہم نے پانی کے ذریعے مردہ زمین کو زندہ کیا۔ جب بارش نہیں ہوتی تو زمین خشک ہو کر ناقابل کاشت بن جاتی ہے اسی لیے اس کو مردہ کہا گیا ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ بارش نازل فرماتا ہے تو اس میں روئیدگی کی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ اور جب اس میں بیج بویا جاتا

ہے تو یہ پھل پھول لاتی ہے۔ زمین کی زندگی سے یہی مراد ہے۔ فرمایا جس طرح تم مردہ زمین کی زندگی کا روزمرہ مشاہدہ کرتے ہو کَذٰلِكَ الْخُرُوجُ اسی طرح تم مرنے کے بعد زندہ ہو کر قبروں سے دوبارہ نکلو گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کو اللہ تعالیٰ ایسی بارش برسائے گا جس کے نتیجے میں انسانی اجسام زمین سے اس طرح نکلیں گے جیسے زمین سے پودے نکلتے ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ اب مرنے زندہ ہو کر کیوں نہیں نکلتے؟ تو بھائی! اللہ کا یہ قانون ہے کہ اس نے ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے، جب وہ وقت آجاتا ہے تو وہ کام بھی ہو جاتا ہے۔ وقوعِ قیامت اور دوبارہ زندگی کا بھی ایک وقت مقرر ہے۔ جونہی وہ وقت آئے گا، اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا فرمائے گا کیونکہ اس کا فرمان ہے کہ جس طرح ہم نے مخلوق کو پہلی دفعہ پیدا کیا اسی طرح ہم اس کو دوبارہ بھی اٹھائیں گے وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ (الانبیاء-۱۰۴) یہ ہمارا وعدہ ہے جسے ہم پورا کر کے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ایسی عقلی دلیل بیان فرمائی ہے جس کو کوئی بھی عقلمند آدمی رد نہیں کر سکتا۔

سابقہ اقوام کی تکذیب

آگے اللہ نے تسلی کے طور پر فرمایا کہ وقوعِ قیامت اور بعث بعد الموت کا انکار مشرکین مکہ ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ سابقہ اقوام بھی اسی ڈگر پر چلتی رہی ہیں۔ چنانچہ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ ان سے پہلے قومِ نوح نے بھی اسی طرح تکذیب کی۔ وہ بھی تعجب کرتے تھے کہ مرنے کے بعد انسان دوبارہ کیسے زندہ ہو جائیں گے، آج تک تو کسی کو زندہ ہوتے دیکھا نہیں۔ وَاَصْحٰبُ الرَّسِّ اور کنوئیں والوں نے بھی جھٹلایا۔ قرآن میں سورۃ الحج اور سورۃ الفرقان میں بھی اس کنوئیں کا ذکر آیا ہے مگر یہ تصریح موجود نہیں ہے کہ یہ کنواں کہاں تھا اور اس کی طرف منسوب لوگ کون تھے؟ اس کنوئیں کے محلِ وقوع کے متعلق مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ یہ کنواں ملک انطاکیہ میں تھا۔ بعض نے یمن میں حضر موت کے قریب بتاتے ہیں۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں حضرت صالح علیہ السلام کے ساتھ

بیچ رہنے والے قوم ثمود کے لوگ رہتے تھے۔ اللہ نے وہاں پر کسی نبی کو بھیجا تاکہ انہیں راہ راست کی طرف لایا جاسکے۔ اُن لوگوں نے نہ صرف نبی کو جھٹلایا بلکہ اُسے قتل بھی کر دیا جس کی وجہ سے اللہ نے ساری قوم کو ہلاک کر دیا۔ دوسری جگہ فرمایا بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيدٍ (الحج-۴۵) کنوئیں معطل پڑے ہیں اور محلات خالی پڑے ہیں جن کے رہنے والے ختم ہو گئے۔ بعض یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ کنواں حضرت شعیب علیہ السلام کی سرزمین میں واقع تھا۔ بہر حال یہ ایک کنواں تھا جس کے ارد گرد رہنے والوں نے وقوع قیامت اور بعث بعد الموت کی تکذیب کی۔

وَثَمُودُ اور قوم ثمود نے بھی اسی طرح جھٹلایا۔ سورۃ الشعراء میں ہے۔ اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ (آیت-۱۵۳) تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (آیت-۱۵۴) تم تو ہماری طرح کے ایک انسان ہو۔ انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام سے اونٹنی کا معجزہ بھی طلب کیا مگر اُسے پانے کے باوجود اس کا نہ صرف انکار کیا بلکہ اللہ کے حکم کے خلاف اونٹنی کو قتل کر دیا اور پھر ساری قوم ہلاک ہو گئی۔

وَعَادٌ اور قوم عاد کا بھی یہی حال تھا۔ انہوں نے بھی ہود علیہ السلام کی تکذیب کی وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ (حٰمٓ السجدة-۱۵) اللہ کی آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے۔ اور اپنے پیغمبر سے کہا اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ (ھود-۵۴) کہ تمہیں ہمارے معبودوں کی بد دعا لگ گئی ہے

وَفِرْعَوْنُ اور قوم فرعون نے بھی ایسا ہی کیا۔ انہوں نے نہ صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کی تکذیب کی بلکہ موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور ان پر الزام لگایا کہ وہ مصر کے باشندوں کو وہاں سے نکال دینا چاہتے ہیں اور یہ بھی کہا کہ موسیٰ علیہ السلام تمہارا دین بدل دینا چاہتا ہے۔ اللہ نے اس کو بمع قوم کے بحیرہ قلزم میں غرق کر دیا۔ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ اور لوط علیہ السلام کے بھائیوں یعنی اُن کی قوم نے بھی اُن کو جھٹلایا اور کہنے لگے اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ (الاعراف-۸۲) یہ بڑے پاکباز بنتے پھرتے

ہیں، ان کو اپنی بستیوں سے نکال دو۔ آخر اللہ نے ان کی پوری بستی الٹ دی اُوپر سے پتھروں کی بارش کی اور وہ ساری قوم ہلاک ہو گئی۔

وَاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم تھی جو جنگل کے رہنے والے تھے۔ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ (العنکبوت۔۳۷) انہوں نے بھی اپنے پیغمبر کو جھٹلایا، پھر ایک چیخ آئی اور وہ اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل گرے پڑے تھے۔ وَقَوْمُ تُبَّعٍ اور تبع کی قوم نے بھی تکذیب کی۔ تبع اپنے حمیر قبیلے کا سردار تھا، یہ خود مسلمان تھا مگر اس کی ساری قوم کافر تھی۔ بعض فرماتے ہیں کہ تبع نبی تھا مگر اس کی تصریح نہیں ہے فرمایا كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ان سب اقوام نے اپنے اپنے رسولوں کی تکذیب کی پس میرا ڈر ٹھیک ثابت ہوا اور یہ سب لوگ سزا کے مستحق ٹھہرے یہ مکے والوں کو عبرت دلائی جا رہی ہے کہ اگر وہ بھی پرانی قوموں کے نقش قدم پر چلتے ہیں تو ان کا انجام بھی ان سے مختلف نہیں ہو گا۔

اللہ نے پھر پہلی بات بعث بعد الموت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ کیا ہم پہلی مخلوق کو پیدا کر کے تھک گئے تھے، اور کیا ان کو دوبارہ پیدا کرنے کی ہم میں طاقت نہیں رہی تھی؟ فرمایا ایسا نہیں ہے بلکہ جس طرح ہم نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کر دیا تھا اسی طرح دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہیں۔ جب تم خود اپنی پہلی پیدائش کو تسلیم کرتے ہو تو دوسری تخلیق کا کیسے انکار کرتے ہو؟ دوسری جگہ فرمایا کہ ہمارے لیے ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ یہ تو نادانی اور جہالت کی بات ہے کہ ہم پہلی بار مخلوق کو پیدا کر کے عاجز آ گئے ہیں۔ فرمایا بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ بلکہ یہ لوگ نئی تخلیق کے سلسلے میں دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ اگر یہ مذکورہ دلیل پر ذرا بھی غور کرتے تو بات سمجھ میں آ جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں یہ اشتباہ میں پڑے ہوئے ہیں۔

درس سوم ۳ — آیت ۱۶ تا ۲۲

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚۖ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿۱۶﴾ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ﴿۱۷﴾ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴿۱۸﴾ وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ﴿۱۹﴾ وَنُفِخَ فِى الصُّوْرِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ﴿۲۰﴾ وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ﴿۲۱﴾ لَقَدْ كُنْتَ فِىْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿۲۲﴾

ترجمہ :۔ اور البتہ تحقیق ہم نے پیدا کیا انسان کو اور ہم جانتے ہیں اُن باتوں کو جو وسوسہ کرتا ہے اُس کے ساتھ اُس کا نفس ، اور ہم زیادہ قریب ہیں اُس سے اُس کی دھڑکتی ہوئی رگ سے ﴿۱۶﴾ جب کہ لیتے ہیں دو لینے والے دائیں اور بائیں طرف سے جو بیٹھے ہوئے ہیں ﴿۱۷﴾ نہیں بولتا وہ کوئی لفظ مگر اُس کے پاس ایک نگران ہوتا ہے تیار ﴿۱۸﴾ اور آئی بیہوشی موت کی حق کے ساتھ ۔ یہ وہ چیز ہے جس سے تو بچتا تھا ﴿۱۹﴾ اور پھونکا جائے گا صور میں ، یہ وعدہ ہے ڈرانے کے دن کا ﴿۲۰﴾

اور آ گیا ہر نفس کہ اس کے ساتھ ہوگا ایک چلانے والا اور ایک گواہی دینے والا (۲۱) البتہ تحقیق تھا تو غفلت میں اس دن سے - پس ہم نے کھول دیا ہے تجھ سے تیرے پردے کو - پس تیری آنکھ آج بہت تیز ہے (۲۲)

ربط آیات

پہلے اللہ نے نبوت و رسالت کے منکرین کا شکوہ کیا، پھر قیامت کے منکرین کا رد کیا اور اس پر عقلی اور نقلی دلائل پیش کیے - پھر عبرت کے طور پر اللہ نے چند سابقہ اقوام کا حال ذکر کیا کہ انہوں نے نبوت و رسالت اور وقوع قیامت کو جھٹلایا تو ان کا انجام بھی بہت برا ہوا - اللہ کا ڈرانا برحق ثابت ہوا اور یہ لوگ مبتلائے عذاب ہوئے - وقوع قیامت اور بعث بعد الموت کے متعلق فرمایا کہ کیا ہم مخلوق کو پہلی دفعہ پیدا کر کے تھک گئے تھے کہ دوبارہ پیدا کرنا محال ہو جائے گا ؟ اس میں کون سی خلاف عقل اور تعجب انگیز بات ہے ؟ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق کا ذکر فرمایا - پھر فرمایا کہ یہ لوگ دوبارہ زندگی کو کیوں محال سمجھتے ہیں جب کہ ہم جانتے ہیں کہ انسانی جسم کا کتنا حصہ کس زمین نے ہضم کر لیا ہے اور اسی طرح اس کے منتشر ذرات کہاں کہاں موجود ہیں - جب ہم چاہیں گے ان ذرات کو اکٹھا کر کے انسان کا ڈھانچہ پھر سے کھڑا کر دیں گے -

وساوس نفسانی

بیرونی مشاہدات کا ذکر کرنے کے بعد اللہ نے انسان کی تخلیق اور اس کی اندرونی کیفیات کا ذکر فرمایا ہے - ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ اور البتہ تحقیق ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ اور ہم ان چیزوں کو بھی جانتے ہیں جن کے ساتھ اس کا نفس وسوسہ کرتا ہے - مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں ہے، وہ تو انسان کے دل میں پیدا ہونے والے وسوسہ کو بھی جانتا ہے - وسوسہ ایک معمولی سے خیال کا نام ہے جو انسان کے دل میں غیر اختیاری طور پر پیدا ہوتا ہے - عربی زبان میں اس کو ہاجس

کہتے ہیں اگر یا ایک ہلکا سا خیال آیا اور چلا گیا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو خیال آتا ہے وہ فوری طور پر نہیں جاتا بلکہ تھوڑی دیر توقف کے بعد جاتا ہے۔ اس کو خاطر کہتے ہیں۔ بعض اوقات کوئی قبیح خیال بھی آجاتا ہے جس کو حدیث نفس کہا جاتا ہے اس پر بھی اس وقت تک مواخذہ نہیں جب تک زبان سے اس کا تلفظ ادا نہ کیا جائے یا اس پر عمل نہ کیا جائے انسان کے نفس میں بعض چیزیں ایسی بھی آتی ہیں جن سے انسان لطف اندوز ہوتا ہے اس کو ہم کہتے ہیں ادنیٰ بھی ادنیٰ درجے کا ارادہ سمجھا جاتا ہے۔ البتہ انسان کے دل میں جو خیال اگر پختہ ہو جاتا ہے اس کو عزم یا پختہ ارادہ کہا جاتا ہے۔ یہ ضرور قابل مواخذہ ہے۔ اس کے علاوہ باقی تمام وساوس قابل مواخذہ نہیں۔ فرمایا یہ باریک ترین چیزیں بھی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔

قربت خداوندی

نیز یہ بھی فرمایا وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ اور ہم تو انسان کی دھڑکتی ہوئی رگ سے بھی اس سے زیادہ قریب ہیں۔ حبل الورید شاہ رگ کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعے جسمانی خون سر کی طرف جاتا ہے اور جس کے کٹنے سے جسم اور روح کا تعلق ختم ہو کر انسان ہلاک ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اتنی قریب شاہ رگ بھی نہیں جس پر انسان کی موت اور زندگی کا انحصار ہے۔ اس ضمن میں شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں کہ انسان کی شاہ رگ اس کے نفس یا جان سے تو باہر ہے مگر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم تو شاہ رگ کے اندر والی چیز سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

امام بیضاویؒ اور امام بغویؒ اور بعض دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی یہ قربت باعتبار علم ہے کیونکہ وہ انسان کے اندرونی اور بیرونی حالات کو اس حد تک جانتا ہے جس حد تک انسان خود بھی اپنے حالات سے واقف نہیں۔ مثلاً انسان اپنے جسم کے جس عضو کو دیکھ سکتا ہے اُسے تو جانتا ہے مگر جسم کے جس حصے پر اس کی نظر نہیں پڑتی اُس کو نہیں جانتا۔ مگر اللہ تعالیٰ انسان کے ایک ایک بال سے واقف ہے لہٰذا وہ انسان کی اپنی ذات سے بھی اس کے زیادہ قریب ہے۔

اس کے برخلاف قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی انسان کے ساتھ قربت محض علمی نہیں بلکہ ذاتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا قرب کسی مکان زمان یا کسی خاص کیفیت کے ساتھ مقید نہیں ہے کیونکہ اس کی ذات تو ان چیزوں سے منزہ اور مبرا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ قرب وہی ہے جو معلول کو اپنی علت کے ساتھ یا سائے کو اپنی اصلی چیز کے ساتھ ہوتا ہے۔ دیکھئے! سائے کی ہستی اصل چیز پر موقوف ہے، اگر اصل نہیں ہے تو سایہ بھی معدوم ہو جائے گا۔ اسی طرح ہر چیز کی علت تو خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ تو جو قرب معلول کو اپنی علت کے ساتھ ہوتا ہے، وہی قرب اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے ساتھ ہے اور یہ قرب ذاتی ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی قیومیت ہر چیز میں مؤثر بالذات ہے۔ تاہم قاضی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس قرب کو ظاہری دلیل سے معلوم نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کو فراست کے ساتھ ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور قرب بھی ہے جو خدا تعالیٰ کے بندوں کو حاصل ہوتا ہے اس کو بھی ظاہری دلیل کی بجائے فراستِ ایمانی کے ساتھ ہی محسوس کیا جا سکتا ہے یہ قرب بھی کسی زمان و مکان یا مسافت کا محتاج نہیں ہوتا کہ کسی خاص وقت میں ایک مقام سے دوسرے مقام تک مسافت طے کر لی جائے تو انسان کسی چیز کے قریب ہو جائے، بلکہ حدیث کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرب ذاتی ہے، خدا تعالیٰ اور بندے کے درمیان غفلت کے ستر ہزار پردے ہیں۔ اور جتنے پردے ہٹتے جاتے ہیں اتنا ہی قرب حاصل ہوتا جاتا ہے مگر یہ قرب کسی خاص کیفیت کے ساتھ متکیف نہیں ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ خدا کی ذات کو لوگوں کے ساتھ جو قرب حاصل ہے اس کی صورت یہ ہے "ہست رب الناس را با جان ناس۔ اتصال بے تکیف بے قیاس۔"

گویا یہ قرب کسی کیفیت میں ظاہر نہیں کیا جا سکتا، اور نہ ہی یہ چیز قیاس میں آ سکتی ہے۔ تاہم جب یہ قرب حاصل ہو جاتا ہے تو انسان کے اوصاف و کردار میں بھی خدا تعالیٰ

کی اطاعت اور خوشنودی میں بسر ہونے لگتے ہیں اور پھر ان سے نافرمانی نہیں ہوتی۔
شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ بندے سے شاہ رگ سے
بھی زیادہ قریب باین معنیٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تجلی اعظم کا عکس انسان کے نفس ناطقہ
اور روح الٰہی پر پڑتا رہتا ہے۔ روح کے بہت سے مراتب ہیں اور خدا کی تجلی اعظم
کا عکس اس کے انتہائی مرتبہ پر پڑتا ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو ہر فرد کے
ساتھ اس کی ذات سے بھی زیادہ قرب حاصل ہے۔ یہ قرب آج محسوس نہیں
ہوتا کیونکہ درمیان میں بے شمار پردے حائل ہیں۔ جب انسان کی یہ مادی حیات ختم
ہوگی اور وہ اس مادی خول سے باہر نکلے گا تو درمیان کے سارے پردے ہٹ جائیں گے
تو اس وقت اس کو قرب کا احساس ہوگا۔ اگر اس نے دنیا کی زندگی میں بہیمیت پر
قابو پا کر ملکیت کو اختیار کر لیا ہے تو اس کو راحت حاصل ہوگی، اور اگر اس نے دنیا
میں اپنے حالات کو خراب کر لیا ہے اور پستی میں چلا گیا ہے تو پھر اس کو سخت تکلیف ہوگی
کیونکہ تجلی اعظم کی کشش تو اوپر کی طرف ہوگی اور یہ شخص نیچے کی طرف جا رہا ہوگا۔ اسی لیے
فرمایا کہ خدا تعالیٰ کو انسان کے ساتھ اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قرب حاصل ہے

ہر قول و فعل کا ریکارڈ

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے ہر فعل حتیٰ کہ دل میں پیدا ہونے
والے وسوسے کو بھی جانتا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اس نے انسان کے قول و
فعل کی حفاظت کا ایک غیر متزلزل نظام قائم کر رکھا ہے۔ اسی چیز کے متعلق فرمایا۔
اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ جب کہ دو لینے والے
لے لیتے ہیں جو کہ اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے ہوئے ہیں، یعنی انسان کے ہر
قول و فعل کو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ دو فرشتے ریکارڈ کر لیتے ہیں۔ ان سے
مراد کراماً کاتبین فرشتے ہیں جو ہر انسان کے ساتھ مقرر ہیں اور جن کے متعلق سورۃ
الانفطار میں ہے كِرَامًا كَاتِبِيْنَ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ (آیت ۱۱، ۱۲)
یہ کراماً کاتبین فرشتے ہیں جو تمہارے ہر فعل کو جانتے ہیں اور تمہارے ہر قول اور

فعل کو نوٹ کرتے ہیں۔ اسی لیے یہاں فرمایا مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ انسان اپنی زبان سے کوئی لفظ نہیں بولتا مگر اُس کے پاس ایک نگران تیار ہوتا ہے جو فوراً اس بات کو محفوظ کر لیتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ انسان سے سرزد ہونے والے بعض اقوال وافعال اتنے باریک ہوتے ہیں کہ فرشتے ان کی نقش گری نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ تم اسی طرح لکھ دو، اس کی نقش گری ہم خود کر لیں گے۔ بہر حال انسان کی زبان سے نکلنے والی ہر اچھی اور بُری بات اللہ تعالیٰ کے ریکارڈ میں درج ہوتی رہتی ہے اور اُس کی مثل بنتی رہتی ہے۔

اس سے یہ قانون بھی سمجھایا گیا ہے کہ انسان کو اپنی زبان پر قابو رکھنا چاہیے کوئی غلط بات زبان سے نہیں نکالنی چاہیئے کیونکہ یہ ریکارڈ ہو رہی ہے اور اس کا جواب دینا پڑے گا۔ ایک صحابیؓ نے حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی خدمت میں عرض کیا حضور! کیا زبان کی باتوں پر بھی مواخذہ ہوگا؟ آپ نے فرمایا هَلْ يَكُبُّ فِي النَّارِ اِلَّا حَصَائِدُ اَلْسِنَتِهِمْ یہی تو زبان سے کاٹی ہوئی باتیں ہیں جو دوزخ میں اوندھے منہ گرانے والی ہیں۔ بعض اوقات انسان زبان سے کوئی کلمہ ادا کرتا ہے مگر سمجھتا ہے کہ اس کا کچھ مواخذہ نہیں ہوگا حالانکہ وہی کلمہ اُس شخص کو جہنم کی گہرائی میں پھینکے جانے کا سبب بن جاتا ہے۔ بعض اوقات انسان اپنی زبان سے روا روی میں کوئی اچھا کلمہ ادا کرتا ہے جس کی وجہ سے خدا تعالیٰ اُس کو بلند مرتبے پر فائز کر دیتا ہے حالانکہ انسان کو اس کا شعور تک نہیں ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنی زبان سے ہمیشہ اچھی بات کرنی چاہیئے کیونکہ اُس کا ایک ایک لفظ ریکارڈ ہو رہا ہے جو قیامت والے دن اس کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔

سکرات موت

اب محاسبہ اعمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ موت کی بیہوشی حق کے ساتھ آگئی۔ جب انسان کی زندگی کے خاتمے کا وقت آتا ہے تو اُس پر موت کی بیہوشی طاری ہونے لگتی ہے۔ فرمایا

ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ یہ وہی چیز ہے جس سے تو بچنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کا یہ اٹل فیصلہ ہے کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (العنکبوت - ۵۷) ہر نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ موت سے بچنے کی تیری کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی، تجھے بالآخر اس گھاٹی سے گزرنا پڑا، اور موت کے کمرات طاری ہو گئے، یہ سکرات بڑے تلخ ہوتے ہیں، اسی لیے حضور علیہ السلام نے یہ دعا سکھائی ہے اَللّٰهُمَّ سَهِّلْ عَلَيْنَا سَكَرَاتِ الْمَوْتِ وَغَمَرَاتِ الْمَوْتِ الخ! اہم پر موت کے سکرات اور اس کی تلخیوں کو آسان کر دے۔

بعث بعد الموت

اس دنیا میں ہر شخص کے لیے انفرادی موت آتی ہے۔ پھر جب قیامت برپا ہوگی اور پہلا صور پھونکا جائے گا تو اس وقت دنیا پر موجود ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ اس کے بعد پھر بعث بعد الموت اور حساب کتاب کی منزل آئے گی جس کے متعلق فرمایا وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ اور صور میں پھونکا جائے گا۔ اس سے دوسرا صور مراد ہے فرمایا ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ یہ ڈرانے کے دن کا وعدہ ہے۔ اب حساب کتاب کی منزل شروع ہونے والی ہے۔ یہ وہی دن ہے جس سے اللہ کے پیغمبر لوگوں کو ڈراتے تھے۔ اس دن کے متعلق فرمایا وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ اور ہر شخص اللہ کی بارگاہ میں اس حالت میں آئے گا کہ اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا اور ایک گواہ ہوگا۔ سائق کا معنی ہانکنے والا ہوتا ہے۔ جدید عربی میں ڈرائیور کو بھی سائق کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی گاڑی کو ہانکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک فرشتہ تو انسان کو ہانک کر عدالت کی طرف لے جائے گا اور دوسرا فرشتہ اس کا اعمال نامہ پیش کریگا۔ گویا اس کی کارکردگی پر گواہ ہوگا۔ دنیا میں بھی عام طور پر یہی دستور ہے کہ ایک سپاہی مجرم کو پکڑ کر عدالت میں پیش کرتا ہے اور دوسرا شخص اس کے خلاف چالان پیش کرتا ہے۔ غرضیکہ اللہ کے ہاں پیشی کے لیے بھی ہر شخص کے ساتھ دو فرشتے ہوں گے۔

پھر ارشاد ہوگا لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا دنیا کی زندگی میں تو آج کی کارروائی سے غفلت میں پڑا ہوا تھا۔ اللہ کے پیغمبر اور ڈرانے والے آتے رہے اور تجھے اس دن کی ہولناکیوں سے خبردار کرتے رہے مگر تو نے اُس وقت اس کی کچھ پرواہ نہ کی کیونکہ اُس وقت تجھے یہ منزل نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے برخلاف آج صورتِ حال یہ ہے فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ کہ ہم نے تجھ سے تیرے پردے کھول دیے ہیں۔ آج تجھیں وہ تمام چیزیں نظر آرہی ہیں جن کا تو انکار کیا کرتا تھا۔ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ آج تیری آنکھ بہت تیز ہوگئی ہے آج تجھے فرشتے، جنت، دوزخ، عرشِ الٰہی وغیرہ سب چیزیں نظر آرہی ہیں۔ اب تجھے یقین آیا ہے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور پیغمبروں نے ٹھیک بات کہی تھی، مگر آج کا پچھتاوا تیرے کسی کام نہیں آئے گا۔ اور تجھے ذرے ذرے کا حساب دینا ہوگا۔

وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ﴿۲۳﴾ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۲۴﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ ﴿۲۵﴾ الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ﴿۲۶﴾ قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۲۷﴾ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ﴿۲۸﴾ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۲۹﴾

ترجمہ :- اور کہے گا اُس کا ساتھی کہ یہ وہی چیز ہے جو میرے پاس ہے تیار ﴿۲۳﴾ (ارشاد ہوگا) ڈال دو جہنم میں ہر ناشکر گزار، عنادی کو ﴿۲۴﴾ وہ بہت روکنے والا ہے نیکی سے، تعدی کرنے والا اور شک میں ڈالنے والا ہے ﴿۲۵﴾ جس نے اللہ کے ساتھ دوسرے کو الٰہ بنا رکھا ہے، پس ڈال دو اُس کو سخت عذاب میں ﴿۲۶﴾ کہے گا اُس کا ساتھی اے ہمارے پروردگار! میں نے تو اس کو سرکشی میں نہیں ڈالا، لیکن یہ خود ہی گمراہی میں دُور پڑا ہوا تھا ﴿۲۷﴾ فرمائے گا (پروردگار) نہ جھگڑا کرو میرے پاس، اور تحقیق میں نے پہلے ہی بھیج دی تھی تمہاری طرف عذاب کی وعید ﴿۲۸﴾

نہیں تبدیل کی جاتی بات میرے پاس، اور نہیں ہوں میں ذرہ بھر بھی زیادتی کرنے والا بندوں پر (۲۹)

ربطِ آیات

اللہ تعالیٰ نے وقوعِ قیامت کے دلائل ذکر کیے اور اس کا انکار کرنے والوں کا رد کیا۔ پھر انسان کی تخلیق اور اس کی مخفی باتوں تک کو جاننے کا ذکر کیا۔ نیز فرمایا کہ ہم تو انسان کی رگِ گردن سے بھی اس کے زیادہ قریب ہیں اللہ تعالیٰ نے انسان کے تمام اعمال کی حفاظت کے لیے ہر شخص کے دائیں بائیں دو فرشتے مقرر کر رکھے ہیں جو انسان کا ہر قول و فعل نوٹ کر رہے ہیں۔ آگے یقیناً جزائے عمل پیش آنے والی ہے اور اس کا زیادہ تر انحصار فرشتوں کی انہی رپورٹوں پر ہوگا۔ پھر فرمایا جب انسان کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو اس پر موت کی بےہوشی طاری ہو جاتی ہے اور یہ وہی چیز ہے جس کو انسان عمر بھر ٹالنے کی کوشش کرتا رہتا ہے مگر اس سے بچ نہیں سکتا۔

یہ تو ہر شخص کی انفرادی موت کا ذکر تھا، پھر جب مجموعی طور پر پورے عالم کی عمر ختم ہو جائے گی تو اللہ نے فرمایا کہ ایک صور پھونکا جائے گا۔ یہ وہی دن ہوگا جس سے اللہ کے سارے نبی لوگوں کو ڈراتے رہے اور جس کے لیے تیاری کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ اس دن ہر شخص کو اللہ کی عدالت میں حاضر ہو کر اپنے اعمال کی جوابدہی کرنا ہوگی۔ اور جزا یا سزا سے دوچار ہونا ہوگا۔ اس دن ہر آدمی کے ساتھ ایک ہانکنے والا ہوگا جو اسے ہانک کر رب العزت کی بارگاہ کی طرف لے جائے گا اور دوسرا اعمال نامہ بردار ہوگا جو اس کے اعمال کا ریکارڈ پیش کرے گا۔ گویا فرشتہ آدمی کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی پیش کرے گا فرمایا اے غافل انسان! آج تو غفلت میں پڑا ہوا ہے اور تجھے کچھ نظر نہیں آتا تو محاسبہ اعمال کی منزل پر یقین نہیں لاتا۔ مگر جب وہ دن آئے گا تو تمہاری آنکھ کے پردے کھول دیے جائیں گے، تیری بینائی تیز ہو جائے گی اور تو محاسبہ اعمال کی تمام منازل اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے گا۔ اس دن تجھے اس کی صداقت

پر یقین آ جائے گا مگر تو اپنے لیے کچھ نہیں کر سکے گا۔

دو ساتھی فرشتے

ارشاد ہوتا ہے وَقَالَ قَرِيْنُهٗ اور کہے گا انسان کا ساتھی فرشتہ جو اس کے اعمال کی حفاظت پر مامور ہے هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ یہی وہ چیز ہے جو میرے پاس تیار رکھی تھی۔ گویا فرشتہ انسان کا اعمال نامہ پیش کر دے گا۔ اسی اعمال نامے کے متعلق سورۃ بنی اسرائیل میں اللہ کا فرمان ہے وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا (آیت۔۱۳) ہم نے ہر انسان کا اعمال نامہ اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے اور قیامت کے دن اُسے نکال کر دکھا دیں گے اور وہ اُسے کھلا ہوا دیکھے گا۔ نیز سورۃ کہف میں انسان کی اُس وقت کی کیفیت یہ بیان کی ہے کہ اپنے اعمال نامہ کو دیکھ کر حیران ہو کر رہ جائے گا اور کہے گا۔ مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا (آیت۔ ۴۹) یہ کیسی کتاب ہے کہ نہ چھوٹی کسی بات کو چھوڑتی ہے اور نہ بڑی کو مگر سب کو لکھ رکھا ہے، چنانچہ اُس وقت انسان اپنے کسی قول و فعل کا انکار نہیں کر سکے گا۔

ہر انسان کے ساتھ اللہ نے اس کے دو ساتھی مقرر کر رکھے ہیں۔ ایک فرشتہ ہے جو انسان کو نیکی کی تلقین کرتا ہے اور دوسرا شیطان ہے جو اُس کو برائی کی تلقین کرتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے اِنَّ لِلْمَلَكِ لَمَّةً بِابْنِ اٰدَمَ بیشک فرشتہ انسان کے لیے نیکی کی تلقین کرتا ہے۔ جب انسان کے دل میں نیکی کا جذبہ پیدا ہو تو اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اسے اللہ کی جانب سے نیکی کی تلقین کی ہے۔ اسی طرح انسان کا دوسرا ساتھی شیطان ہے جس کے متعلق سورۃ الزخرف میں گزر چکا ہے وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ (آیت۔۳۶) اور جو کوئی خدا تعالیٰ کی یاد سے آنکھیں بند کر لیتا ہے، ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں، جو اس کا ساتھی بن جاتا ہے چنانچہ

یہ شیطان ہمیشہ برائی کی طرف دعوت دیتا رہتا ہے، لہٰذا جس وقت انسان کے دل میں برائی کا خیال پیدا ہو تو اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ شیطان نے برائی کی طرف مائل کیا ہے۔ شیطان کی یہ تلقین ہمیشہ تکذیبِ حق اور شر و معصیت کے لیے ہوتی ہے جب کہ فرشتے کی تلقین حق کی تصدیق ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ پچھلی آیت میں جن دو فرشتوں کا ذکر ہو چکا ہے، وہ اِن ساتھیوں کے علاوہ ہیں اور اُن کا کام صرف یہ ہے کہ ان میں سے ایک نیکی کے اقوال و افعال نوٹ کرتا رہتا ہے اور دوسرا برائی کی باتیں درج کرتا جاتا ہے۔

بہرحال جب انسان کا اعمال نامہ خدا کی بارگاہ میں پیش ہوگا تو اس میں درج بُرے اعمال کی وجہ سے حکم ہوگا اَلْقِيَا فِي جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيدٍ ڈال دو جہنم میں ہر ناشکر گذار اور عنادی کو۔ یہاں پہ اَلْقِيَا تثنیہ کا صیغہ استعمال ہوا ہے یعنی دو شخصوں کو حکم ہوگا کہ اِن لوگوں کو جہنم میں ڈال دو۔ اِن دو شخصوں سے مراد وہی دو فرشتے ہیں جن کا ذکر گذشتہ آیت میں ہو چکا ہے کہ اُن میں سے ایک انسان کو ہانک کر عدالت میں لیجائے گا اور دوسرا بطور گواہ اس کا اعمال نامہ پیش کرے گا۔

بعض فرماتے ہیں کہ اَلْقِيَا کا صیغہ دو کے لیے نہیں بلکہ محض تاکید کے لیے آیا ہے کہ ہر ایسے شخص کو جہنم میں ڈال دو جو ناشکر گذار اور عنادی ہے۔ سب سے بڑی ناشکر گذاری تو کفر، شرک، بد عقیدگی، مشرکیہ رسومات اور بدعات ہیں جن کو اختیار کرنے سے خدا تعالیٰ کے انعامات کی ناقدری ہوتی ہے انسان کو ہر چیز تو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے مگر یہ انسان ہے جو اسے دوسروں کے ساتھ منسوب کر کے بد عقیدگی کا اظہار کرتا ہے۔ اور پھر جب انبیاء اور مبلغین کے سمجھانے کے باوجود اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہتا ہے تو یہی اس کی ضد اور عناد ہے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ ہر ناشکر گذار اور عنادی کو جہنم میں ڈال دو۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيبٍ کہ نیکی سے

کاموں سے روکنے والے ہوتے ہیں۔ نہ خود کوئی نیکی کا کام کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو کرنے دیتے ہیں۔ یہ لوگ مُعۡتَدٍ یعنی حد سے بڑھنے والے ہیں۔ اللہ نے انہیں مہلت دے رکھی ہے مگر انہوں نے اسی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر رکھا ہے اس کے علاوہ یہ لوگ مُّرِيۡبٍ یعنی شک میں بھی پڑے ہوئے ہیں۔ انہیں اللہ اور اس کے رسولوں کے احکام اور جزائے عمل کی منزل کا یقین نہیں آتا اور یہ عمر بھر اسی شک و تردد میں پڑے رہتے ہیں کہ یہ جنت دوزخ سب فرضی کہانیاں ہیں جب انسان مر کر مٹی میں مل جائے گا تو پھر کون اُسے دوبارہ زندہ کر کے حساب کتاب لے گا۔ فرمایا وہ اسی شک میں مبتلا رہتے ہیں حتیٰ کہ موت آ کر ان کا کام تمام کر دیتی ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے سزا کے مستحق بن جاتے ہیں۔

مشرک کی سزا

آگے اللہ نے مشرک آدمی کی سزا کا ذکر فرمایا ہے اَلَّذِیۡ جَعَلَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ جس شخص نے اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی معبود بنا رکھا ہے، اُن کی عبادت کرتا ہے یا اُن کو خدا کی کسی صفت میں شریک کرتا ہے اس کی نذر و نیاز دیتا ہے یا اُس کو مافوق الاسباب مدد کے لیے پکارتا ہے اُس کو مدبر اور متصرف تسلیم کرتا ہے۔ اُس کے معبود کبھی فرشتے ہوتے ہیں اور کبھی جنات، کبھی زندہ انسان ہوتے ہیں۔ اور کبھی اہلِ قبور۔ بہر حال جس نے بھی اللہ کے سوا دوسروں کو معبود بنا رکھا ہے فرمایا فَاَلۡقِیٰهُ فِی الۡعَذَابِ الشَّدِیۡدِ ایسے شخص کو سخت ترین عذاب میں ڈال دو۔ فرمایا یہ شخص تو کہتا ہے کہ مرنے کے بعد کون زندہ ہو گا مگر ہم نے بتلا دیا تھا کہ ہم مٹی میں ملے ہوئے تمہارے جسم کے ذرے ذرے کو اکٹھا کر کے تمہیں دوبارہ کھڑا کر لیں گے، ہم تو انسان کی نیت، ارادے اور مخفی چیزوں کو بھی جانتے ہیں، ہمیں یہ بھی علم ہے کہ انسانی جسم کا کون سا جزو کس مٹی میں ملا ہوا ہے لہٰذا ہم انہیں جمع کرنے پر بھی قادر ہیں۔ چنانچہ قیامت والے دن ایسا ہی ہو گا اور پھر ہر ناشکر گزار، عنادی، نیکی سے روکنے والے، زیادتی کرنے والے، متردد اور مشرک کے لیے جہنم رسیدگی کا حکم ہو جائے گا، جس میں اُسے

سخت عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

شیطان کا انکار

پہلے عرض کیا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ اُس کا ایک ساتھی شیطان ہے جو اُس کو بُرائی کی تلقین کرتا رہتا ہے جب کسی مجرم کا اعمال نامہ پیش ہوگا اور اُسے جہنم کا حکم ہوگا تو وہ شخص بارگاہِ رب العزت میں عرض کرے گا ، مولا کریم ! میں اپنی گمراہی کا خود ذمہ دار نہیں ہوں بلکہ میرا یہ شیطان مجھے ہمیشہ بہکاتا رہا ، اور مجھے برائی کی تلقین کرتا رہا جس کی وجہ سے میں تیرے راستے سے ہٹ گیا۔ لہذا آج میری بجائے اس شیطان کو سزا دی جائے جس کی وجہ سے میں اس نتیجے کو پہنچا ہوں مگر قَالَ قَرِيْنُهٗ انسان کا شیطان ساتھی عرض کرے گا رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ میں نے تو اُس شخص کو سرکشی پر نہیں ڈالا تھا وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ بلکہ یہ تو خود ہی گمراہی میں دور پڑا ہوا تھا۔ اس قسم کا مضمون سورۃ ابراہیم میں بھی موجود ہے وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ ..... (آیت ۲۲) جب حساب کتاب کا کام مکمل ہو جائے گا۔ تو شیطان کہے گا کہ تمھارے ساتھ خدا کا وعدہ تو سچا تھا ، اور میرا وعدہ تم سے جھوٹا تھا۔ میرا تم پر کوئی زور تو نہیں تھا۔ ہاں ! میں نے تمھیں گمراہی کی طرف بلایا تو تم نے میری بات کو بلا دلیل مان لیا لہذا آج مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔ نہ میں تمھاری فریاد رسی کر سکتا ہوں ، اور نہ تم میری ، میں اس بات کا انکار کرتا ہوں کہ پہلے تم مجھے شریک بناتے تھے ، بیشک آج ظلم کرنے والوں کے لیے دردناک عذاب ہے ، اس کے بعد اللہ کا فیصلہ یہی ہوگا کہ آج گمراہ کرنے والے اور گمراہ ہونے والے سب کے سب مبتلائے عذاب ہوں گے۔

حقیقت بھی یہی ہے ، ایک طرف اللہ کے نبی ابراہیم علیہ السلام ، نوح علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام وغیرہم اور سب سے بڑھ کر نبی آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے جو لوگوں کو نیکی کی طرف دعوت دیتے رہے مگر لوگوں کو اُن کی باتوں پر تو یقین نہ آیا ، اور شیطان نے برائی کی بات کی تو اس پر یقین کر لیا چنانچہ

اسی جرم کی پاداش میں گمراہ ہونے والے جہنم رسید ہوں گے۔ دوسری آیات میں آتا ہے کہ جب یہ لوگ اعتراض کریں گے کہ ہمیں تو ان لوگوں نے گمراہ کیا جن کے ہم تابع تھے تو اللہ فرمائے گا کہ میں نے ہدایت کی تمام چیزیں تمہارے سامنے رکھ دی تھیں تمہیں انسان بنایا، عقل و شعور دیا۔ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ (المائدہ-۱۹) تمہارے پاس بشارت دینے والے اور ڈرانے والے بھی آئے مگر تم نے شیطان کی بات کو قبول کیا۔ لہٰذا تم لازماً سزا کے مستحق ہو۔

خدا تعالیٰ کا اٹل فیصلہ

جب انسان اور شیطان خدا تعالیٰ کے سامنے ایک دوسرے پر الزام تراشی کریں گے۔ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ تو اللہ فرمائے گا اب میرے پاس مت جھگڑا کرو وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ میں نے تو تمہیں دنیا میں ہی وعید سنا دی تھی۔ تمہیں ہر نیک و بد سے آگاہ کر دیا تھا مگر تم نے اس وقت کچھ پرواہ نہ کی اور کفر، شرک اور معصیت کے راستے پر چلتے رہے۔ اب تمہیں اپنی کارگزاری کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ فرمایا، یاد رکھو! مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ میرے ہاں بات تبدیل نہیں ہوتی یعنی میرا فیصلہ اٹل ہوتا ہے کفر اور شرک کرنے والوں کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ اور جو لوگ سچے دل سے ایمان لائے۔ وہ ضرور خدا کی رحمت کے مقام میں پہنچیں گے۔

اللہ نے ایک دوسری بات یہ بھی فرما دی وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ اور نہیں ہوں میں بندوں پر زیادتی کرنے والا۔ مطلب یہ ہے کہ میرا ہر فیصلہ حق پر مبنی ہوتا ہے۔ مجرموں کو سزا دے کر میں نے کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ یہ سب کچھ انہی کا کیا دھرا ہے جو ان کے سامنے آ رہا ہے۔ نہ تو کسی کو ناکردہ گناہ کی سزا ملے گی، اور نہ کسی کی نیکی کو ضائع کیا جائے گا بلکہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اور کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اے اولادِ آدم! یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جنہیں میں نے گن کر محفوظ رکھا ہوا ہے۔ یہ سب تمہارے سامنے ہیں۔ اگر ان میں کوئی نیکی پاؤ تو اللہ تعالیٰ کی تعریف کرو۔

اور اس کا شکریہ ادا کرو، اور اگر اس میں کوئی برائی نظر آئے تو اس کے لیے اپنے آپ کو ملامت کرو۔ یہ تمہاری اپنی کارگزاری ہے۔ جو تم نے اپنی نیت اور ارادے سے انجام دی۔

يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُولُ هَلْ مِن مَّزِيدٍ ﴿۳۰﴾ وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ ﴿۳۱﴾ هَٰذَا مَا تُوعَدُونَ لِكُلِّ أَوَّابٍ حَفِيظٍ ﴿۳۲﴾ مَّنْ خَشِيَ الرَّحْمَٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ ﴿۳۳﴾ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ ۖ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُودِ ﴿۳۴﴾ لَهُم مَّا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ ﴿۳۵﴾ وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّن قَرْنٍ هُمْ أَشَدُّ مِنْهُم بَطْشًا فَنَقَّبُوا فِي الْبِلَادِ هَلْ مِن مَّحِيصٍ ﴿۳۶﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ ﴿۳۷﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِن لُّغُوبٍ ﴿۳۸﴾

ترجمہ: جس دن ہم دوزخ سے کہیں گے، کیا تو بھر چکی ہے، تو وہ کہے گی کہ کچھ اور بھی ہے ﴿۳۰﴾ اور قریب کر دیا جائے گا جنت کو متقیوں کیلئے وہ اُن سے کچھ دُور نہیں ہو گی ﴿۳۱﴾ یہ وہ چیز ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا ہر ایک رجوع رکھنے اور حفاظت کرنے والے کے لیے ﴿۳۲﴾ جو ڈر

گیا رحمان سے بغیر دیکھے، اور لایا وہ رجوع کرنے والا دل ﴿۳۳﴾ (حکم ہو گا) داخل ہو جاؤ اس میں سلامتی کے ساتھ، یہ ہے دن ہمیشہ رہنے کا ﴿۳۴﴾ ان کے لیے ہو گا جو وہ چاہیں گے اس میں، اور ہمارے پاس اور بھی زیادہ ہے ﴿۳۵﴾ اور بہت سی ہلاک کیں ہم نے اس سے پہلے جماعتیں جو ان سے زیادہ گرفت والی تھیں۔ پس وہ کرید کرنے لگے شہروں میں، کیا ہے کہیں بھاگنے کی جگہ ﴿۳۶﴾ بیشک اس میں البتہ یاددہانی ہے اس شخص کے لیے جس کے اندر دل ہے یا اس نے کان لگائے ہیں اور پورا دل لگا کر سنتا ہے ﴿۳۷﴾ اور البتہ تحقیق ہم نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دن کے وقفے میں، اور نہیں پہنچی ہمیں کوئی تھکاوٹ ﴿۳۸﴾

ربطِ آیات

اللہ تعالیٰ نے قیامت کے منکرین کا رد کیا اور اس کے اثبات میں عقلی اور نقلی دلائل پیش کیے۔ پھر مختلف اقوام کا اجمالی حال اور ان کو ملنے والی سزا کا ذکر کیا۔ پھر انسان کے حالات کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کو بیان فرمایا۔ انسانوں کے اعمال کی حفاظت اور ان کی بارگاہ الٰہی میں پیشی کا حال ذکر کیا۔ مجرموں کے جہنم میں داخلے اور ان کی آپس میں الزام تراشیوں کا ذکر کیا۔ اللہ فرمائے گا میرے پاس مت جھگڑا کرو۔ میں نے تمھیں دنیا میں ہر نیک و بد سے آگاہ کر دیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ تمھیں اپنے عقیدے اور عمل کا بھگتان کرنا ہو گا۔

ہَلْ مِنْ مَّزِیْدٍ

جب دوزخی اپنے اپنے ٹھکانے میں پہنچ جائیں گے تو دوزخ کے حالات کو اللہ نے اس طرح بیان فرمایا ہے یَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ

جس دن ہم جہنم سے کہیں گے، کیا تو بھر گئی ہے ؟ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ تو وہ کہے گی، کچھ مزید بھی چاہیئے۔ وسیع و عریض دوزخ کا پیٹ نہیں بھرا ہوگا۔ اور وہ جوش مارتی ہوئی مطالبہ کریگی کہ اس میں کچھ مزید لوگ ڈالے جائیں۔ بخاری، مسند احمد اور ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ جہنم برابر یہ مطالبہ دہراتی رہے گی کیونکہ اس میں ابھی بہت سی جگہ خالی ہوگی۔ پھر اللہ تعالیٰ اُس میں اپنا قدم رکھیں گے تو جہنم پکار اٹھے گی۔ قط قط یعنی بس بس، اب بس پُر ہوگئی۔ یہ حدیث اگرچہ صحیح ہے لیکن اس عمل کو متشابہات میں شمار کیا جاتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے قدم رکھنے کو انسان کے قدم رکھنے پر محمول نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو جسم اور جہت سے پاک ہے اور اس کا اپنا ارشاد ہے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (الشوریٰ۔ ۱۱) اُس جیسی کوئی چیز نہیں ہے جس کے ساتھ اُس کی مثال بیان کی جا سکے۔ لہٰذا ہمیں یہی اعتقاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ اپنا قدم دوزخ میں ڈالیں گے مگر اس کی کیفیت ہمارے ادراک سے باہر ہے۔ جیسا بھی اُس کی شان کے لائق ہوگا وہ اپنا قدم رکھیں گے۔ اسی طرح اللہ کی پنڈلی، چہرے اور عرش پر مستوی ہونے کا ذکر بھی آتا ہے مگر ہم اس کی کیفیت کو نہیں جان سکتے۔ ہمیں ان اشیاء پر ایمان ہی لانا چاہیئے۔ کہ یہ بالکل درست ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حکمت اور فلسفے کے مطابق اس کو اس طرح سمجھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کوئی خاص قسم کی تجلی جہنم پر ڈالے گا۔ جسے قدم رکھنے سے تعبیر کیا گیا ہے جہنم پُر ہو جائے گی اور وہ مزید مطالبہ نہیں کرے گی۔ یہ تو جہنم کا حال بیان کیا گیا ہے، البتہ جنت کے بارے میں مسند احمد کی روایت میں آتا ہے کہ جب تمام جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے تو کچھ جگہ پھر بھی خالی ہوگی۔ پھر کچھ عرصہ تک توقف ہوگا۔ اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ جنت کو پُر کرنے کے لیئے کسی اور مخلوق کو پیدا کر کے اس میں داخل کر دے گا۔

جنت کی قربت

اس کے بعد جنت کے متعلق ارشاد ہوتا ہے وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ

لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ اور جنت کو متقیوں کے قریب کر دیا جائے گا اور وہ ان سے کچھ دور نہیں ہو گی۔ جنت کی قربت کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی صورت کی مثال سورۂ ابراہیم میں موجود ہے یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ حساب کتاب کی منزل کے لیے یہ زمین تبدیل کر دی جائے گی اور اس کی جگہ دوسری زمین قائم کی جائے گی۔ پھر اگر کسی شخص کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی کے لیے موجودہ زمین کے کسی حصے کی ضرورت پڑے گی تو اس کو بھی حاضر کر دیا جائے گا۔ اس طرح یہ زمین بھی قابلِ انتقال بن جائے گی۔ اسی طرح جن متقیوں کے لیے جنت کا فیصلہ ہو گا ، جنت کو ان کے قریب کر دیا جائے گا۔ یا دوسری صورت میں یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جنتیوں کو جنت کے قریب لے جایا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا۔ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ یہ وہ وعدہ ہے جو ہر رجوع رکھنے والے اور حفاظت کرنے والے کے لیے کیا جاتا تھا۔ اَوَّابٍ کا معنیٰ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع رکھنے والا یعنی نیکی کرنے والا ہے اور نیکی کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (النحل - ۹۰) بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اور پھر حکم دینے کے بعد اُسے یونہی نہیں چھوڑ دیتا بلکہ اس کا وعدہ ہے وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (آل عمران - ۱۳۴) اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اسی طرح حَفِيْظٍ سے مراد خدا تعالیٰ کی حدود کی حفاظت کرنے والا ہے۔ اللہ نے سورۂ توبہ میں ایمان والوں کی ایک صفت یہ بھی بیان کی ہے وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ (آیت - ۱۱۲) کہ اللہ کی حدوں کی حفاظت کرنے والے ہوتے ہیں، یعنی تمام فرائض و واجبات کو ادا کرتے ہیں، پاکیزہ اخلاق اور صحیح عقیدہ رکھتے ہیں۔ کفر، شرک اور معصیت سے بچتے ہیں۔ عدل و انصاف کی منزل کو طے کرتے ہیں۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے تقویٰ یعنی حدود اللہ کی حفاظت کی تعریف غنیۃ الطالبین میں یہی بیان کی ہے کہ متقی وہی شخص ہو گا جو عدل و

انصاف پر قائم ہوگا۔ غرضیکہ جنت ہر رجوع کرنے والے اور حفاظت کرنے والے شخص کے قریب کر دی جائے گی۔

اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ جنت اُس شخص کے بھی قریب کر دی جائے گی مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ جو بغیر دیکھے اللہ تعالیٰ سے ڈر گیا۔ اُس نے کتاب الٰہی کو پڑھا، اللہ کے احکام پر غور و فکر کیا۔ اپنی فطرت سلیمہ اور عقل کو بروئے کار لایا، خدا تعالیٰ کی شریعت اور احکام کو سچا سمجھ کر اُس پر عمل پیرا ہوگیا، تو وہ گویا بن دیکھے خدائے رحمان کے عذاب سے ڈر گیا اور اس نے نیکی کا راستہ اختیار کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی تعریف ہی یہ بیان کی ہے وَيُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ انہوں نے نہ خدا کو دیکھا ہے، نہ نزول وحی کا مشاہدہ کیا ہے انہوں نے جنت اور دوزخ کو کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی انہیں فرشتے نظر آتے ہیں وہ ان تمام چیزوں پر اللہ کی کتاب پڑھ کر، نبی کے بتلانے پر اور اہل حق کی تبلیغ کی وجہ سے ایمان لائے ہیں اور یہی بن دیکھے ایمان ہے اور ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا کہ جنت ان کے قریب کر دی جائے گی، نیز فرمایا کہ جنت اُس شخص کے بھی قریب کر دی جائیگی وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ جو اللہ کی طرف رجوع رکھنے والا دل لے کر حاضر ہوا۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع رکھنے والا وہی شخص ہوگا جو بغیر دیکھے اُس پر ایمان لے آیا اور پھر اُس کے احکام کی خلاف ورزی سے ڈرتا رہا اور نیکی کی طرف راغب رہا۔

جنت میں داخلہ

بہرحال جنت مذکورہ لوگوں کے قریب کر دی جائیگی تو اُن کو حکم ہوگا۔ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اس میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ یہاں تمہیں ہر قسم کی سلامتی اور امن نصیب ہوگا۔ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ یہ ہمیشگی کا دن ہے اب تم اس جنت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہو گے اور یہاں سے نکالے نہیں جاؤ گے۔ شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں کہ اس دن ملنے والی نعمتیں دائمی ہوں گی اس سے پہلے تو کسی بات پر ٹھہراؤ نہیں تھا یعنی انسان کو ملنے والی مرغات میں کمی بیشی

ہوتی رہتی تھی مگر جنت میں پہنچ جانے کے بعد وہاں کی نعمتوں مثلاً صحت، شباب اور ہر قسم کی دیگر نعمتوں میں کبھی کمی نہیں آئے گی۔

فرمایا لَهُمْ مَّا يَشَآءُونَ فِيهَا اس جنت میں وہ جو چاہیں گے انہیں حاصل ہوگا۔ وہاں ان کی من مانی مرادیں پوری ہوں گی۔ وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ اور ہمارے پاس ان کے لیے مزید بھی ہے۔ یعنی ان کی اپنی خواہشات کے علاوہ خود اللہ تعالیٰ اپنی مرضی سے بھی ان کو عطا فرمائے گا۔ مزید سے ایک تو یہ مراد ہو سکتی ہے کہ وہاں ہر چیز با افراط ہوگی اور اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ اور بعض اس کو سورۃ یونس کی آیت ۲۶ کے تناظر میں دیکھتے ہیں جہاں فرمایا لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ کہ جن لوگوں نے دنیا میں رہ کر نیکی کے کام انجام دیے انہیں ان کی نیکی کا پورا پورا بدلہ ملنے کے علاوہ کچھ مزید بھی ملے گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ فرمائے گا اے جنتیو! میں نے تمہیں تمام نعمتیں عطا کر دی ہیں، کیا کچھ مزید بھی دوں؟ جنتی حیران ہو کر عرض کریں گے، پروردگار! تو نے ہمیں تمام نعمتوں سے نوازا ہے۔ اب مزید کیا ہو سکتا ہے؟ اس وقت اللہ تعالیٰ حجاب اٹھا کر اپنی تجلیات سے دیدار نصیب فرمائیں گے، یہی زیادتی ہوگی جو تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہوگی، جو سرور اہل جنت کو دیدار الٰہی سے حاصل ہوگا۔ وہ کسی دوسری نعمت میں نہیں ہوگا بہرحال خدا تعالیٰ کا یہ دیدار عام ایمان والوں کو ہفتہ میں ایک دن نصیب ہوگا اور مقربین الٰہی صبح شام اس نعمت سے مستفید ہوں گے۔

منکرین کے لیے تنبیہ

آگے اللہ تعالیٰ نے قیامت کے منکرین کو تنبیہ فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّن قَرْنٍ ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کیا هُمْ أَشَدُّ مِنْهُم بَطْشًا جو ان کے والوں سے زیادہ گرفت والے تھے پہلی قومیں مالی اور جسمانی ہر دو لحاظ سے عربوں پر فوقیت رکھتی تھیں۔ سورۃ سبا میں اللہ نے فرمایا وَمَا بَلَغُوا مِعْشَارَ مَا آتَيْنَاهُمْ (آیت ۔ ۴۵) ان مکے والوں کو تو ہم نے ان کا عشر عشیر بھی عطا نہیں کیا۔ جب وہ ہماری گرفت سے

نہ بچ سکے تو ان کی کیا حیثیت ہے جو یہ اتنا غرور و تکبر کر رہے ہیں۔ ان اقوام سے عاد، ثمود، فرعونی، کلدانی اور آشوری وغیرہ مراد ہیں جن کو اللہ نے بہت کچھ دیا۔ مگر وہ نافرمانی کی پاداش میں صفحہ ہستی سے نابود کر دیے گئے۔ فرمایا ان کی حالت یہ تھی فَنَقَّبُوْا فِی الْبِلَادِ کہ وہ شہروں کو کرید نے لگے تھے یعنی مختلف شہروں میں وہ خوب عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بعض فرماتے ہیں کہ نقب سے مراد سفر کرنا ہے یعنی وہ دنیاوی مفاد کے لیے دور و نزدیک سفر کرتے تھے۔ آج کل تو سفر کی تیز ترین سواریاں میسر ہیں اور لوگ خوب سفر کرتے ہیں مگر اس زمانے میں بھی وسائل کے مطابق یہ لوگ بڑے بڑے تجارتی اور سیاحتی سفر کرتے تھے مگر جب ہماری گرفت آئی تو فرمایا هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ کیا تھی ان کے لیے کوئی جائے پناہ؟ مطلب یہ کہ جب ان پر مصیبت آئی تو پھر کوئی ان کو بچانے والا نہیں تھا اور وہ سب ہلاک ہو گئے۔

غور و فکر کا مقام

اس سورۃ مبارکہ میں بیان کردہ تمام باتوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ بے شک اس میں دہانی یعنی غور و فکر کا مقام ہے اس شخص کے لیے جس کے سینے میں دل ہے۔ قلب کا اطلاق عقل پر بھی ہوتا ہے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ قلب اور عقل مشترک چیزیں ہیں۔ اور اس میں دماغ بھی شامل ہوتا ہے۔ اللہ نے سوچ اور غور و فکر کا مادہ دماغ میں رکھا ہے اور عمل کا مادہ قلب کے ساتھ وابستہ ہے اور اس طرح یہ دونوں آپس میں ملے جلے ہیں نہ تو عقل یا دماغ بغیر قلب کے چل سکتا ہے اور نہ قلب بغیر عقل کے کام کر سکتا ہے تمام جذبات محبت و نفرت اور عقیدہ و عزم کا تعلق قلب کے ساتھ ہے کیونکہ یہ مرکز اخلاق ہے۔ اگر قلب بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے اور اگر قلب درست ہو تو سارا جسم درست رہتا ہے۔ بہرحال فرمایا کہ یہ نصیحت ہے مگر اس شخص کے لیے جو دل و دماغ کو بروئے کار لا کر صحیح سوچتا ہے۔

فرمایا کہ قرآن پاک یا اس شخص کے لیے نصیحت ہے اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ جو کان لگا کر اور دل کو حاضر کر کے بات کو سنتا ہے۔ بات کو سمجھنے کے

دو ہی طریقے ہیں، یا تو انسان دوسرے کی بات کو غور سے سنے یا پھر عقل کو بروئے کار
لاکر بات کو سمجھنے کی کوشش کرے اور جب کوئی چیز اچھی طرح ذہن نشین ہو
جائے تو پھر اس کے مطابق عمل بھی کرے۔ جو شخص نہ تو دل و جان سے بات پر
غور و فکر کرتا ہے اور نہ کسی بات کو کان لگا کر سنتا ہے، اس کے لیے وبال جان
کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

خدا تعالیٰ تھکاوٹ سے پاک ہے

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کی تخلیق کا ذکر کر کے اپنی قدرت
کا اظہار فرمایا ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ
اَيَّامٍ اور البتہ تحقیق ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دن
کے وقفے میں پیدا کیا۔ اس تخلیق کا ذکر قرآن پاک میں بہت سی جگہوں پر آیا ہے۔ مگر
اللہ نے یہاں پر جن چھ دنوں کا ذکر فرمایا ہے اس سے چوبیس گھنٹے کا یہ دن مراد نہیں
جو نظام شمسی کا پیدا کردہ ہے بلکہ اللہ کے دن کی مقدار کے متعلق سورۃ الم السجدۃ
میں ہے۔ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کے ہر کام کی تدبیر کرتا ہے، پھر وہ اس کی طرف
صعود کرے گا۔ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ
ایک روز جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ایک ہزار برس ہوگی۔ اسی طرح
سورۃ المعارج میں ارشاد فرمایا کہ کافروں پر بطور عذاب آنے والا ہے جس کی طرف
فرشتے اور جبرئیل امین عروج کریں گے فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ
اَلْفَ سَنَةٍ (آیت - ۴) ایک دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر
ہے۔ حدیث شریف میں بھی آتا ہے کہ قیامت کا دن پچاس ہزار سال کا ہوگا۔ چھ
دن سے کتنا عرصہ مراد ہوگا۔ جس میں اللہ نے زمین و آسمان اور ان کے درمیان
کی چیزوں کو پیدا فرمایا۔ وہ تو تمام کائنات کو آناً فاناً پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔
لیکن کسی مصلحت کی خاطر اس نے چھ دن کے وقفہ میں کائنات کو تخلیق کیا۔ بہرحال
فرمایا کہ ہم نے انہیں چھ دن میں پیدا فرمایا وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ بلکہ ہمیں
ایسا کرنے کی وجہ سے کوئی تھکاوٹ محسوس نہیں ہوئی، کوئی کام کرکے تھک

جانا تو مخلوق کا خاصہ ہے۔ انسان ہو یا جانور کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد آرام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جب آدمی سو جاتا ہے تو اس کے توی پھر سے بحال ہو کر دوبارہ کام کاج کے قابل ہو جاتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ تو ان چیزوں سے پاک ہے۔ اس کا واضح فرمان ہے لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (البقرۃ۔ ۲۵۵) اسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ ہی نیند، لہٰذا اس کے تھک جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس ضمن میں بائیبل کی روایت ناقابل قبول ہے کہ اللہ نے آسمان اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا اور پھر ساتویں دن آرام کیا۔ خدا تعالیٰ کے بارے میں یہ غلط تصور ہے۔ خدا تعالیٰ تو قادر مطلق ہے، وہ قوت کا سرچشمہ ہے، لہٰذا اُسے تھکاوٹ ہونے یا اُس کو آرام کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں کوئی تھکاوٹ، کوئی نیند اور کوئی اونگھ نہیں، وہ ضعف اور عجز سے پاک ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا یہی فرمان برحق ہے کہ آسمان اور زمین کے درمیان کی چیزوں کو چھ دن کے وقفہ میں پیدا کرنے کے بعد اُسے تھکاوٹ محسوس نہیں ہوئی۔

فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴿۳۹﴾ وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿۴۰﴾ وَاسْتَمِعْ یَوْمَ یُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّکَانٍ قَرِیْبٍ ﴿۴۱﴾ یَّوْمَ یَسْمَعُوْنَ الصَّیْحَةَ بِالْحَقِّ ذٰلِکَ یَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴿۴۲﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْیٖ وَنُمِیْتُ وَاِلَیْنَا الْمَصِیْرُ ﴿۴۳﴾ یَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ذٰلِکَ حَشْرٌ عَلَیْنَا یَسِیْرٌ ﴿۴۴﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَقُوْلُوْنَ وَمَآ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَکِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ یَّخَافُ وَعِیْدِ ﴿۴۵﴾

ترجمہ: پس آپ صبر کریں (اے پیغمبر!) اُن باتوں پر جو یہ لوگ کہتے ہیں۔ اور آپ تسبیح بیان کریں اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ سورج کے طلوع سے پہلے اور غروب سے پہلے ﴿۳۹﴾ اور کچھ رات کے وقت، آپ اس کی تسبیح بیان کریں اور سجدوں کے پیچھے بھی ﴿۴۰﴾ اور کان لگا کر سنیں جس دن پکارے گا پکارنے والا قریب سے ﴿۴۱﴾ جس دن سنیں گے یہ لوگ چیخ کو صحیح طریقے پر۔ یہ ہوگا دن نکلنے کا ﴿۴۲﴾ بیشک ہم ہی زندہ کرتے ہیں، اور ہم ہی موت طاری کرتے ہیں، اور ہماری طرف

ہی لوٹ کر آنا ہے (۴۳) جس دن شق ہو جائے گی زمین
اُن سے وہ دوڑتے ہوئے اس سے باہر آئیں گے۔ یہ
اکٹھا کرنا ہم پر آسان ہے (۴۴) ہم خوب جانتے ہیں
اُن باتوں کو جو یہ لوگ کہتے ہیں، اور نہیں آپ اِن
پر کوئی جبار۔ پس آپ نصیحت کریں قرآن کے ساتھ
اس شخص کو جو خوف کھاتا ہے میری وعید سے (۴۵)

ربطِ آیات

اللہ نے اس سورۃ مبارکہ میں وقوعِ قیامت کے بعض دلائل بیان کیے اور اس کے منکرین کا رد کیا۔ پھر قیامت کی مختلف کیفیات اور مجرموں کا انجام ذکر کیا۔ بعض سابقہ اقوام کی نافرمانی اور اُن کی ہلاکت کا تذکرہ کیا۔ پھر ارض وسماء کی تخلیق اور خدا تعالیٰ کی قدرتِ تامہ اور اس کی بے نیازی کا بیان ہوا۔ اب آخر میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام اور آپ کے پیروکاروں کے لیے تسلی کا مضمون ذکر کیا ہے۔ کفار ومشرکین اہلِ ایمان پر طرح طرح کے الزامات لگاتے تھے اور ان کے لیے توہین آمیز الفاظ استعمال کرتے تھے۔ مسلمانوں کو ذہنی اور جسمانی تکالیف پہنچاتے تھے اس کے علاوہ یہود و نصاریٰ اور منافقین کی ریشہ دوانیاں بھی اپنے عروج پر تھیں تو اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین فرمائی اور تسبیح و تحمید بیان کرنے کا حکم دیا۔ ساتھ ساتھ بعث بعد الموت کا بھی کچھ حال بیان فرمایا ہے۔

صبر کی تلقین

ارشاد ہوتا ہے فَاصْبِرْ عَلٰی مَا يَقُوْلُوْنَ پس آپ صبر کریں اُن باتوں پر جو یہ لوگ کہتے ہیں۔ اِن لوگوں کی طرف سے توحید و رسالت، وقوعِ قیامت اور بعث بعد الموت کے انکار سے آپ دل برداشتہ نہ ہوں۔ اور صبر و استقامت کا دامن تھامے رکھیں کیونکہ ایک وقت آنے والا ہے جب آپ کی تمام تکالیف دُور ہو جائیں گی اور آپ ان پر غالب آجائیں گے۔
مکی زندگی میں نبوت کے پانچ سات سال گزر چکے تھے جب یہ سورۃ مبارکہ

نازل ہوئی مشرکین مکہ حضور علیہ السلام اور آپ کے ماننے والوں کو ظلم و جور کا نشانہ بنا رہے تھے۔ ان حالات میں اہلِ ایمان کا دل برداشتہ ہو جانا فطری امر تھا مگر اللہ تعالیٰ نے صبر کی تلقین کی صبر بہت بڑی حقیقت ہے۔ دینِ ابراہیمی اور ہمارے دین کا بھی یہ ایک اہم اصول ہے۔ دیگر بڑے بڑے اصولوں میں خدا کی وحدانیت پر ایمان، اللہ کا ذکر اس کا شکر، شعائر اللہ کی تعظیم اور نماز وغیرہ شامل ہیں۔ صبر مختلف مواقع پر کیا جاتا ہے مثلاً صبر کے بغیر خدا تعالیٰ کی اطاعت بھی نہیں ہو سکتی۔ نظم و نسق کے قیام کے لیے صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے جذبات پر قابو پاسکنے کے لیے صبر لازم ہے مشکلات اور مصائب کی آمد پر جزع فزع کی بجائے صبر کرنا ضروری ہے۔ تمام تکالیف پر صبر کے ذریعے ہی قابو پایا جا سکتا ہے۔ سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (آیت۔۱۵۳) اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ساتھ مدد لو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

نماز اور تسبیح و تحمید

صبر کے بعد اللہ نے دوسری بات یہ فرمائی ہے وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ آپ اپنے پروردگار کی تسبیح بیان کریں تعریف کے ساتھ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ طلوعِ شمس سے پہلے اور غروبِ آفتاب سے پہلے اس سے مراد فجر اور عصر کی نمازیں ہیں جن کو بڑی اہمیت حاصل ہے ابتداء میں یہ دو نمازیں ہی فرض تھیں، بعد میں معراج کے موقع پر پانچ نمازیں فرض ہو گئیں۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ فجر اور عصر کی نمازیں ضرور ادا کیا کرو کیونکہ ان نمازوں کی پابندی سے دیدارِ الٰہی نصیب ہونے کی بڑی امید ہے۔ وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ اور رات تہجد کے وقت بھی آپ اس کی تسبیح بیان کریں وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ اور سجدوں کے پیچھے بھی۔

نماز میں چونکہ تسبیح و تحمید دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں، اس لیے مفسرین نے ان اوقات سے مختلف نمازیں ہی مراد لی ہیں۔ تسبیح سے متعلق مفسرین کے

دو دانوال ہیں۔ یا تو اس سے نماز کے بعد کی جانے والی تسبیحات مراد ہیں جیسے حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ ہر فرض نماز کے بعد سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر، لا الٰہ الا اللہ کا ورد کیا کرو۔ یا پھر اس سے نوافل مراد ہو سکتے ہیں جو فرائض کے بعد عام طور پہ ادا کیے جاتے ہیں۔

بہر حال اللہ نے پریشانی کے حل کیلئے دو چیزیں بتلائی ہیں، ایک صبر اور دوسری تسبیح و تحمید۔ اس سلسلے میں حضور علیہ السلام کی مسنون دعا بھی ہے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ مِنَ الْیَقِیْنِ مَا تُهَوِّنُ بِهٖ عَلَیْنَا مَصَائِبَ الدُّنْیَا اے اللہ میں یقین میں سے اتنا حصہ مانگتا ہوں جس کی وجہ سے تو دنیا کی مصیبتوں کو کم کر دے۔ خدا تعالیٰ کی ذات و صفات پر جس قدر یقین پختہ ہو گا۔ اسی قدر اس بندے کا تعلق اللہ کے ساتھ درست ہو گا اور اسے مصائب کم نظر آئیں گے۔ جن لوگوں کا تعلق باللہ درست نہیں ہوتا وہ تکلیف پر جزع فزع ہی کرتے رہتے ہیں۔

وقوع قیامت اور حشر و نشر

آگے اللہ نے قیامت کا کچھ حال بیان فرمایا ہے وَاسْتَمِعْ خوب کان لگا کر سنیں اور یہ بات دوسروں کو بھی بتلا دیں۔ یَوْمَ یُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ جس دن پکارنے والا پکارے گا قریب جگہ سے۔ یہ وقوع قیامت کا ذکر ہو رہا ہے۔ قیامت کا آغاز پہلے صور پھونکنے سے ہو گا جب کہ ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ جیسے اللہ کا فرمان ہے كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (الرحمٰن ۲۶-۲۷) ہر چیز ختم ہو جائے گی۔ اور صرف تیرے پروردگار کی ذات ہی باقی رہیگی جو جلال اور بزرگی والی ہے۔ پہلے صور کے بعد کچھ وقفہ ہو گا اور پھر دوسرا صور پھونکا جائے گا۔ اس پر تمام لوگ اپنی قبروں سے یا جہاں کہیں بھی ہوں گے وہاں سے باہر نکل آئیں گے۔ ہر شخص ایک بلانے والے کی آواز کو سنے گا جو اسے قریب سے آتی ہوئی محسوس ہو گی۔ حکم ہو گا، اکٹھے ہو جاؤ، نکل آؤ۔ یہ تمہارے پروردگار کا حکم ہے، چنانچہ سب لوگ

زندہ ہو کر اُس آواز کی طرف چل پڑیں گے۔ الغرض! اللہ نے فرمایا یہ وہ دن ہوگا۔ یَوْمَ یَسْمَعُوْنَ الصَّیْحَۃَ بِالْحَقِّ جس دن یہ لوگ ایک چیخ کو صحیح طریقے سے سنیں گے۔ ذٰلِكَ یَوْمُ الْخُرُوْجِ اور قبروں سے نکلنے کا بھی دن ہوگا۔ پھر سب لوگ حشر کے میدان میں جمع ہوں گے اور حساب کتاب کی منزل آئے گی۔

فرمایا یاد رکھو! اِنَّا نَحْنُ نُحْیٖ وَ نُمِیْتُ بیشک ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی موت دیتے ہیں وَاِلَیْنَا الْمَصِیْرُ اور سب نے ہماری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے۔ فرمایا یہ اس دن کی بات ہے۔ یَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا جس دن زمین پھٹ جائے گی اور جلدی سے یہ دوڑتے ہوئے اس سے باہر آئیں گے۔ یعنی جب قبریں پھٹ جائیں گی تو لوگ وہاں سے نکل کر دوڑتے ہوئے آنے والی آواز کی طرف چلیں گے۔ سورۃ المعارج میں فرمایا یَوْمَ یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ (آیت-۴۳) جس دن یہ لوگ اپنی قبروں سے جلدی سے نکلیں گے جیسے تیر اپنے نشانے کی طرف جاتا ہے، اس طرح سب لوگ حشر کے میدان میں جمع ہو جائیں گے۔ اللہ نے فرمایا ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَیْنَا یَسِیْرٌ اس طرح انسانوں کا دوبارہ اکٹھا کر لینا ہمارے لیے بالکل آسان ہے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اللہ نے فرمایا ہم جانتے ہیں کہ انسانی جسم کا کون سا حصہ زمین کے کس حصے میں موجود ہے، ہم وہاں سے ذرے ذرے کو اکٹھا کر کے انسانی صورت میں دوبارہ کھڑا کر دیں گے، اور ایسا کرنا ہمارے لیے کچھ دشوار نہیں اس کے بعد حساب کتاب ہوگا۔ اور پھر جزا یا سزا کے فیصلے ہوں گے۔

قیامت والے دن زمین کے پھٹنے سے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے اَنَا اَوَّلُ مَنْ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ عَنْهُ کہ اُس دن سب سے پہلے میری قبر کی زمین پھٹے گی اور میں اپنی قبر سے نکلوں گا۔ اور پھر اُسی وقت اُكْسٰى حُلَّةً مِّنَ الْجَنَّةِ مجھے جنت کا لباس پہنا دیا جائے گا۔ جب کہ باقی تمام لوگ برہنہ ہوں گے

پھر جب حشر کے میدان میں سب لوگ اکٹھے ہوں گے تو سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا۔

تسلی کا مضمون

آگے حضور علیہ السلام اور آپ کے پیروکاروں کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ یہ کافر اور مشرک جو باتیں کرتے ہیں ہم انہیں خوب جانتے ہیں۔ ہم ان کے اقوال و افعال اور ان کے ارادے اور نیت سے بھی واقف ہیں آپ کی ہمیشہ یہی خواہش ہوتی ہے کہ کسی طرح یہ لوگ ایمان لے آئیں، مگر یاد رکھیں وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ آپ ان پر کوئی جابر یا داروغہ تو نہیں ہیں کہ ان کو زبردستی منوالیں گے۔ آپ کا کام تو پیغام حق پہنچا دینا ہے۔ جیسے فرمایا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (الرعد۔۴۰) بیشک احکام کو پہنچا دینا آپ کا کام ہے اور پھر حساب لینا ہمارے ذمے ہے۔ قیامت کو آپ سے نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لائے بلکہ یہ تو ان سے پوچھا جائے گا کہ تم نے ایمان کو کیوں قبول نہ کیا۔ اللہ نے یہ فیصلہ کن بات فرما دی ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ۔۲۵۶) دین میں جبر نہیں ہے کہ کسی کو زبردستی اسلام میں داخل کر لیا جائے۔ یہ تو شرح صدر کا معاملہ ہے، اگر کسی کی سمجھ میں دین کی حقانیت آجاتی ہے تو وہ اپنی مرضی سے اسلام قبول کرے گا، ورنہ کسی پر جبر نہیں ہوگا۔ سورۃ یونس میں اللہ نے حضور علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا ہے اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (آیت۔۹۹) کیا آپ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کریں گے؟ نہیں آپ کا یہ کام نہیں ہے۔ آپ نصیحت کر دیں، اللہ کا پیغام پہنچا دیں۔ اگر کوئی قبول کر لیتا ہے تو اس کا اپنا فائدہ ہوگا، اور اگر نہیں کرتا تو پھر آنا تو میرے پاس ہی ہے میں خود اس سے نپٹ لوں گا۔ لہٰذا آپ کا فرض یہ ہے فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ آپ قرآن کے ذریعے لوگوں کو نصیحت کر دیں، خدا کا قرآن پڑھ کر سنا دیں اور فیصلہ ان کی صوابدید پر چھوڑ دیں کیونکہ وہ اپنے نفع نقصان کے خود ذمہ دار ہیں۔

البتہ بات یہ ہے کہ نصیحت وہی شخص پکڑے گا مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ

جو میری وعید سے خوف کھاتا ہے۔ جو شخص اس بات سے ڈر گیا کہ اللہ تعالیٰ کفر اور شرک کرنے والوں کو معاف نہیں کرے گا۔ اس کے لیے آپ کی نصیحت ضرور کارگر ہوگی اور وہ ایمان قبول کرے گا اور جس میں یہ خوف ہی نہیں ہوگا۔ وہ آپ کی بات سے متاثر نہیں ہوگا۔ آپ اسکو اُس کے حال پر چھوڑ دیں۔ بہر حال فرمایا کہ آپ کا فریضہ یہ ہے کہ آپ نصیحت کر دیں اور اللہ کے احکام کی یاد دہانی کرا دیں، پھر خوف خدا رکھنے والا شخص ایمان کو قبول کرے گا انبیاء کے علاوہ جو شخص حضور علیہ السلام کی نیابت کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ وعظ و تبلیغ کا کام کر رہا ہے دین کی دعوت پیش کر رہا ہے، اس کا بھی یہی فرض ہے کہ وہ قرآن کے ذریعے لوگوں کو نصیحت کرتا ہے اور اللہ اور اُس کے رسول کے احکام پہنچاتا ہے۔ اُس کا فرض ادا ہو جائے گا، آگے ماننا یا نہ ماننا مخاطبین کا کام ہے، وہ اپنے کردار کے خود ذمہ دار ہیں۔ فرمایا آپ دشمنوں کی شرارتوں کے مقابلے میں صبر سے کام لیں، خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کریں اور نماز اور دیگر عبادات میں مصروف رہیں اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہوگا۔

سُورَةُ الذّٰرِيٰت
(مکّی)

الذّٰریٰت ۵۱ — خم ۲۶
آیت ۱ تا ۶ — درس اول ۱

سُوْرَةُ الذّٰرِيٰتِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سِتُّوْنَ اٰيَةً وَّثَلٰثُ رُكُوْعَاتٍ
سورۃ الذّٰریٰت مکی ہے، اور یہ ساٹھ آیتیں ہیں اور تین رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ﴿۱﴾ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ﴿۲﴾ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ﴿۳﴾ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ﴿۴﴾ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ﴿۵﴾ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ﴿۶﴾

ترجمہ:- قسم ہے ہواؤں کی جو بکھیرتی ہیں اڑا کر ﴿۱﴾ پس اٹھانے والی بوجھ کو ﴿۲﴾ پس چلنے والی نرمی سے ﴿۳﴾ پھر تقسیم کرنے والی حکم سے ﴿۴﴾ بیشک تم سے جو وعدہ کیا جاتا ہے، البتہ وہ سچا ہے ﴿۵﴾ اور بیشک جزائے عمل البتہ ضرور واقع ہونے والی ہے ﴿۶﴾

نام اور کوائف

اس سورۃ کا نام سورۃ الذّٰریٰت ہے جو اس کے پہلے لفظ سے ماخوذ ہے یہ سورۃ مکی دور میں سورۃ احقاف کے بعد نازل ہوئی۔ اس کی ساٹھ آیتیں اور تین رکوع ہیں۔ یہ سورۃ مبارکہ ۳۶۰ الفاظ اور ۱۲۸۷ حروف پر مشتمل ہے۔

سابقہ سورۃ کے ساتھ ربط

گزشتہ سورۃ قٓ میں اللہ تعالیٰ نے وقوع قیامت کے بعض دلائل بیان فرمائے تھے کہ منکرین قیامت کی بات درست نہیں ہے انہیں بعث بعد الموت

پر اظہار تعجب نہیں کرنا چاہیے ۔ اللہ نے واضح کیا کہ جب انسانی اجسام مرنے کے بعد مٹی میں رل مل جاتے ہیں تو پھر بھی وہ ضائع نہیں ہوتے بلکہ اللہ کے علم میں ہوتا ہے کہ کس انسانی جسم کا کون کون سا حصہ مٹی نے کم کیا ہے اور وہ کہاں پر موجود ہے اللہ تعالیٰ جب چاہے گا ۔ وہ انسانی جسم کے ذرات کو زمین سے واپس لے کر اکٹھا کر دے گا اور اس طرح انسان کے جسم کو دوبارہ کھڑا کر کے اس سے حساب کتاب لے لیگا ۔ پھر اللہ نے ارض و سماء سے تعلق رکھنے والے بعض مشاہدات کا ذکر بھی کیا کہ جن کو دیکھ کر وقوع قیامت سمجھ میں آسکتی ہے ۔ آخر میں زمین کے پھٹ کر دہاں سے اجسام انسانی کے دوبارہ نکلنے کا ذکر کیا اور اس طرح وقوع قیامت پہ دلیل قائم کی ۔ ان دلائل کے بعد اب اس سورۃ مبارکہ میں اللہ نے وقوع قیامت کے یقینی ہونے کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ جزائے عمل ضرور واقع ہو کر رہے گی ۔ یہی اس کا پہلی سورۃ کے ساتھ ربط ہے ۔

مضامین سورۃ

اس سورۃ مبارکہ میں وہ تمام مرکزی اصول بیان کیے گئے ہیں ۔ جن پر ایمان کی عمارت استوار ہوتی ہے ۔ اولین اصول توحید خداوندی ہے جس کے متعلق اللہ نے اس سورۃ کے آخر میں فرمایا کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ وہ مجھے پہچان سکیں اور میری عبادت کریں ۔ درمیان میں اللہ نے بعض سرکش اقوام کا ذکر کیا ہے ۔ جنہوں نے سرکشی اختیار کی اور پھر عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے ۔ بنیادی عقائد میں سے وقوع قیامت پہ نہایت باریک دلائل ذکر کیے گئے ہیں ۔ اس کے علاوہ توحید ، رسالت ، جزائے عمل اور نصیحت کی باتیں مذکور ہیں ۔ اللہ کے فرمانبردار بندوں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی بیوی کا تذکرہ ہے اور حضرت لوط علیہ السلام کی پاکیزگی کو بیان کیا گیا ہے ۔ ساتھ ساتھ نافرمان لوگوں یعنی قوم فرعون ، قوم لوط ، قوم نوح اور عاد اور ثمود اقوام کا ذکر ہے اللہ نے ان کی ہلاکت کا تذکرہ کر کے انہیں آئندہ آنے والے لوگوں کے لیے باعث عبرت بنایا ہے اور نصیحت کی ہے کہ وقوع قیامت پر یقین لا کر آخرت کی

تیاری کرنی چاہیئے۔

قسم کا بیان

اس سورۃ کی ابتداء اللہ تعالیٰ نے ہواؤں کی قسم اٹھا کر ایک حقیقت کو واضح کیا ہے۔ انسان کے لیے تو حکم یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نام اور اس کی صفت کے علاوہ کسی چیز کی قسم نہ کھائے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان جس چیز کی قسم کھاتا ہے وہ اس کو اپنے حق میں بطور گواہ پیش کرتا ہے۔ جب کسی معاملہ میں بظاہر گواہ موجود نہ ہوں تو پھر اللہ تعالیٰ کی اس ذات والاصفات کو گواہ بنایا جاتا ہے۔ جو علیم کل اور قادر مطلق ہے۔ قسم اٹھانے والا جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے اور وہ میرے حق کو بھی جانتا ہے۔ نیز اگر میں یہ قسم جھوٹی اٹھا رہا ہوں تو وہ قادر مطلق ہے مجھے سزا بھی دے سکتا ہے۔ اس کے برخلاف جب اللہ تعالیٰ خود کسی چیز کی قسم اٹھاتا ہے تو وہ اس چیز کو بطور دلیل پیش کرتا ہے۔ یہاں پر بھی اللہ نے جن ہواؤں یا دیگر چیزوں کی قسم اٹھائی ہے اس سے وقوع قیامت پر دلائل قائم کرنا مقصود ہے۔

الذّٰریٰت کی تشریح

ارشاد ہوتا ہے وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا قسم ہے اڑا کر بکھیرنے والی ہواؤں کی فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا پھر وہ اٹھانے والی ہیں بوجھ کو۔ فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا پس وہ چلنے والی ہیں نرمی سے۔ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا پھر تقسیم کرنے والی ہیں حکم سے۔ مفسرین کرام نے ان چار جملوں کی تفسیر دو طریقوں سے کی ہے۔ بعض تو ان چاروں آیتوں کو ہواؤں پر محمول کر کے ان کی مختلف کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔ یعنی اصل چیز تو الذّٰریٰت یعنی ہوائیں ہیں جن کی پہلی کیفیت ہے ذَرْوًا یعنی جب یہ چلتی ہیں تو گرد و غبار کو اڑاتی ہیں۔ ان ہواؤں کی دوسری صفت حٰمِلٰتِ وِقْرًا ہے یعنی یہ بادلوں کے بوجھ کو اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں اور پھر جہاں اللہ کا منشا ہوتا ہے وہاں بارش ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ان ہواؤں کی تیسری صفت جٰرِیٰتِ یُسْرًا ہے یعنی بعض اوقات یہ نہایت نرمی کے ساتھ چلتی ہیں اور لوگوں کو نہایت خوشگوار محسوس ہوتی ہیں، حالانکہ بعض اوقات یہ تند ہو کر عذاب

کا باعث بھی بن جاتی ہیں۔ اور ہواؤں کی چوتھی حالت فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ہے یعنی ہوائیں اللہ کے حکم سے بادلوں کو مختلف خطوں میں تقسیم کر دیتی ہیں جن سے بارش کی تقسیم ہو کر رزق کی تقسیم کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر یہ معنیٰ کیا جائے تو چاروں باتوں کا تعلق ہواؤں ہی سے ہے۔

البتہ بعض مفسرین نے ان چاروں آیات کا مصداق الگ الگ بتایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اَلذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا سے تو وہی ہوائیں مراد ہیں کہ جب یہ تیز چلتی ہیں تو گرد و غبار کو اڑاتی ہیں۔ اور حٰمِلٰتِ وِقْرًا سے پانی کا بوجھ اٹھانے والے بادل مراد ہیں۔ اس سے حاملہ عورتیں بھی مراد ہو سکتی ہیں جو دورانِ حمل بچوں کا بوجھ پیٹ میں اٹھائے پھرتی ہیں اور بعض اس سے کشتیاں بھی مراد لیتے ہیں جو ایک جگہ کا بوجھ دوسری جگہ منتقل کر دیتی ہیں۔ جٰرِیٰتِ یُسْرًا سے آسانی سے چلنے والی کشتیاں بھی مراد ہو سکتی ہیں اور بعض نے اس سے ستارے مراد لیے ہیں جو اپنی اپنی منزلوں کی طرف آسانی کے ساتھ رواں دواں رہتے ہیں اور پھر مُقَسِّمٰتِ اَمْرًا سے خدا کے فرشتے مراد ہو سکتے ہیں جو کہ اللہ کے حکم سے بارش اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی روزی کو بھی تقسیم کرنے پر مامور ہیں۔ بہرحال ان چاروں جملوں سے ایک ہی چیز مراد لی جائے یا زیادہ، اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء کا ذکر کر کے ان کو وقوعِ قیامت پر بطورِ دلیل پیش کیا ہے۔

امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ اس سے وہ اسباب بھی مراد ہو سکتے ہیں جن کو خدا تعالیٰ کے حکم سے کائنات کی مختلف چیزوں میں دخل حاصل ہے۔ مثلاً بادل جو پھل، پھول، اناج، سبزیاں، چارہ وغیرہ پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ جب بادل پانی کو اٹھا کر لے جاتے ہیں تو بارش کا ذریعہ بنتے ہیں۔ زید ابن عمرو ابن نفیل کا یہ مشہور شعر ہے۔

اَسْلَمْتُ نَفْسِیْ لِمَنْ اَسْلَمَتْ لَہٗ
اَلْمُزْنُ تَحْمِلُ عَذْبًا زُلَالًا

میری جان اس ذات کی مطیع ہے کہ جس کے سفید بادل بھی مطیع ہیں جو میٹھے پانی کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ سفید بادلوں میں لطیف پانی ہوتا ہے جو میٹھا اور خوشگوار ہوتا ہے اور جو انسانوں کے حلق میں آسانی سے اتر جاتا ہے۔

امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ مُقَسِّمٰتِ سے فرشتے بھی مراد ہو سکتے ہیں جو خدا تعالیٰ کے حکم سے رزق اور بارش کو تقسیم کرتے ہیں حتیٰ کہ جو بچہ ابھی ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے اس کی روزی وہیں اُسے پہنچتی ہے۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جب بچے کا حمل قرار پاتا ہے تو فرشتے اللہ تعالیٰ سے پوچھتے ہیں کہ اس کی روزی کتنی ہوگی جو کہ درج کر لی جاتی ہے۔ اور پھر عملاً بھی اُس کو اتنی روزی ملتی رہتی ہے۔ غرضیکہ اس سے تقسیم کنندگان فرشتے بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

مفسّرِ قرآن حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس مقام پہ مذکورہ چیزوں میں سے بعض کا تعلق آسمان سے، بعض کا زمین سے اور بعض کا کائنات جو (فضا) سے ہے۔ فرشتوں کا تعلق عالمِ سماویات سے ہے جب کہ ہواؤں اور کشتیوں کا تعلق زمین سے ہے اور بادلوں کا تعلق فضا سے ہے، جو زمین اور آسمان کے درمیان فضا میں چلتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں زمینی چیزوں میں سے بعض مبصرات ہیں جو نظر آتی ہیں جیسے کشتیاں اور بعض چیزیں نظر نہیں آتیں۔ جیسے لطیف ہوائیں مگر وہ اپنا اپنا کام برابر کر رہی ہیں ان تمام چیزوں کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ تامہ کا اظہار فرمایا ہے ارضیات، سماویات یا جویات سے متعلق جو بھی چیزیں ہیں سب کا متصرف خدا تعالیٰ ہے۔

وقوعِ قیامت اور جزائے عمل

قسم کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جوابِ قسم کے طور پر فرمایا ہے اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ بیشک تم سے جو وعدہ کیا جاتا ہے، وہ البتہ سچا ہے۔ یہ وعدہ وقوعِ قیامت، بعث بعد الموت اور جزائے عمل کا وعدہ ہے جو اللہ نے انسانوں کے ساتھ کر رکھا ہے اور جسے وہ ضرور پورا کرے گا۔ سورۃ الانبیاء میں بھی اللہ کا فرمان ہے کہ جس طرح ہم نے کائنات کو پہلی مرتبہ پیدا کیا، اسی طرح دوبارہ بھی پیدا کریں گے۔ وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ (آیت ۱۰۴) یہ وعدہ ہم پہ لازم ہے اور ہم ضرور ایسا کرنے والے ہیں۔ بہر حال فرمایا کہ تمہارے ساتھ

جو وعدہ کیا جاتا ہے وہ سچا ہے وَاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ اور بیشک جزائے عمل البتہ ضرور واقع ہونے والی ہے۔ اللہ نے ہواؤں، کشتیوں، بادلوں اور فرشتوں کو دلیل بنا کر فرمایا کہ قیامت لازماً واقع ہوگی، حساب کتاب ہوگا، لوگ دوبارہ زندہ ہوں گے اور پھر جزا و سزا کے فیصلے ہوں گے۔

اب بات اس طرح سمجھائی گئی ہے کہ دنیا میں پیش آنے والے واقعات یا تو شاہد ہیں آتے ہیں یا پھر لوگوں کے علم میں آتے ہیں۔ ان میں سے ہر چیز کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے اور کوئی چیز اللہ نے بیکار محض پیدا نہیں کی۔ اسی طرح ہواؤں کا بھی ایک مقصد ہے۔ ان کے ذریعے بادِ نسیم چلتی ہے، آندھیاں اور طوفان آتے ہیں گرد و غبار اڑتا ہے، بادل گرتے ہیں، بارش ہوتی ہے اور کشتیاں چلتی ہیں۔ غرضیکہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی بے مقصد نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر اتنی بڑی کائنات ارض و سما کس طرح بے مقصد ہو سکتی ہے؟ اسی طرح جن اور انسان اللہ کی بہت بڑی مخلوق ہیں بھلا ان کی تخلیق فضول تو نہیں بلکہ ان کی بھی کوئی غرض و غایت ہے۔ ان کے اعمال کا نتیجہ لازماً نکلنے والا ہے۔ اسی لیے اللہ نے قسم اٹھا کر کہا ہے کہ اے لوگو! تم سے جو وعدہ کیا گیا ہے اس کی مذکورہ تمام چیزیں شاہد ہیں اور یہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔

فرمایا انسانوں اور جنات کے علاوہ اللہ نے حیوانات، نباتات اور جمادات کو بھی بے مقصد پیدا نہیں کیا، دریا، سمندر اور پہاڑ بھی بے غرض نہیں ہیں۔ درندے پرندے، کیڑے مکوڑوں کی بھی کوئی غرض ہے۔ جب ہر چیز بامقصد ہے تو پھر انسان کیسے بے مقصد ہو سکتا ہے؟ اسی لیے فرمایا کہ جزائے عمل ضرور واقع ہونے والی ہے۔ دین کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا معنی ملت، انصاف، اطاعت اور جزائے عمل بھی ہوتا ہے اور یہاں جزائے عمل ہی مراد ہے۔ ہم ہر نماز میں پڑھتے ہیں مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اللہ تعالیٰ یوم جزا کا مالک ہے۔ مطلب یہی ہے کہ کسی فرد کو جزائے عمل سے مفر نہیں۔ اسے ایک دن ضرور اللہ کی عدالت میں پیش ہو کر اپنی کارکردگی کا حساب دینا ہے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۝۷ اِنَّكُمْ لَفِىْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝۸ يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ۝۹ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۝۱۰ الَّذِيْنَ هُمْ فِىْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ۝۱۱ يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ۝۱۲ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ۝۱۳ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ۭ هٰذَا الَّذِىْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝۱۴ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِىْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝۱۵ اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ۝۱۶ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝۱۷ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝۱۸

ترجمہ :- قسم ہے جالی دار آسمان کی ۝۷ بیشک تم البتہ ایک مختلف بات میں پڑے ہوئے ہو ۝۸ اس سے باز رکھا جاتا ہے وہ جو پھیر دیا گیا ۝۹ ہلاک کیے گئے اٹکل دوڑانے والے ۝۱۰ وہ جو غفلت میں بھول رہے ہیں ۝۱۱ پوچھتے ہیں کب ہو گا انصاف کا دن ۝۱۲ جس دن کہ وہ آگ پر گرم کیے جائیں گے ۝۱۳ (اور کہا جائیگا) چکھو اپنی شرارت کا مزا۔ یہ وہ چیز ہے جس کے بارے میں تم جلدی کرتے تھے ۝۱۴ بیشک متقی لوگ جنتوں میں ہوں گے اور چشموں میں ۝۱۵ لیتے والے ہوں گے

جو کچھ دے گا اُن کو اُن کا پروردگار۔ اور بیشک تھے وہ اس سے پہلے نیکی کے کام کرنے والے (۱۶) وہ رات کو تھوڑا سوتے تھے (۱۷) اور سحریوں کے وقت وہ اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے تھے (۱۸)

جالی دار آسمان

سورۃ کے ابتدائی چار جملوں میں اللہ تعالیٰ نے ہواؤں کا ذکر کیا۔ اور اُن سے وقوعِ قیامت اور جزائے عمل پر دلیل قائم کی۔ اب اسی سلسلے میں آسمان کا ذکر فرمایا ہے وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ قسم ہے جالی دار آسمان کی۔ حبک کے کئی معنی آتے ہیں۔ مثلاً مضبوط کر دینا، گرہ لگانا، جوڑ دینا اور جالی دار ہونا جیسا ہیں تار تار نظر آئیں۔ رات کے وقت چونکہ آسمان بالکل صاف نظر نہیں آتا بلکہ ستارے کی موجودگی کی وجہ سے جالی دار نظر آتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ستاروں کا جال بچھا ہوا ہے، لہٰذا اس کا معنیٰ خوبصورت ستاروں سے پُر رونق آسمان کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ جالیوں سے وہ کہکشاں مراد ہیں جو باریک باریک ستاروں کے ملنے سے سڑک سی بنی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ اس مقام پر جالی دار آسمان سے مراد بادل ہیں۔ سردی کے موسم میں جب بادل چھا جاتے ہیں اور اگر ان میں کچھ شگاف بھی ہو تو وہ جالی دار معلوم ہوتے ہیں۔ چونکہ سما کا اطلاق چھت اور بادل پر بھی ہوتا ہے، اس لیے بعض نے یہ مراد لیا ہے۔ بہرحال حبک کا مصداق یہ تینوں چیزیں بن سکتی ہیں یعنی بارونق ستارے، کہکشاں یا بادل۔ ان ساری چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا پتہ چلتا ہے جس سے اللہ کی وحدانیت سمجھ میں آتی ہے، بشرطیکہ انسان اس میں غور و فکر کرے

اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جس طرح دن کے بعد اچانک رات آجاتی ہے اور ستاروں سے مزین جالی دار آسمان نظر آنے لگتا ہے۔ اسی طرح قیامت بھی اچانک ہی آجائے گی۔ جیسا کہ سورۃ الاعراف میں اللہ کا فرمان ہے لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً (آیت۔ ۱۸۷) کہ یہ تو اچانک ہی وارد ہو جائے گی جبکہ

کسی کو اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوگا۔

وقوع قیامت میں اختلاف

آگے اسی ضمن میں فرمایا اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ بے شک تم ایک مختلف بات میں پڑے ہوئے ہو۔ اس اختلاف سے مراد بھی قیامت کا اختلاف ہے جس کے وقوع کے متعلق لوگوں میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ اس بات کی وضاحت اللہ نے سورۃ النبا کے آغاز میں بھی کردی ہے عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ یہ لوگ کس چیز کے متعلق پوچھتے ہیں کسی بڑی خبر کے متعلق، جس میں یہ اختلاف کرتے ہیں؟ اگلی سورۃ میں پیغمبر علیہ السلام کی نبوت و رسالت سے متعلق بھی مختلف باتوں کا ذکر آرہا ہے۔ حضور علیہ السلام کو کوئی شاعر کہتا، کوئی کاہن، کوئی جادوگر اور کوئی دیوانہ۔ لہٰذا یہ اختلاف وقوع قیامت اور جزائے عمل کے متعلق بھی ہوسکتا ہے اور نبوت و رسالت کے متعلق بھی۔ تو فرمایا کہ تم ایک مختلف بات میں پڑے ہوئے ہو يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ جزائے عمل یا رسالت پر ایمان لانے سے وہ شخص باز رکھا جاتا ہے جو پھیر دیا گیا۔ یعنی جس کی عقل ہی ٹھکانے نہیں ہے ان حقائق سے وہی شخص انکار کرے گا جو بصیرت اور فہم سے خالی ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی حکمت کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ کبھی ان چیزوں کا انکار نہیں کرسکتا۔

پھر فرمایا قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ تباہ و برباد ہوئے اٹکل چلانے والے۔ دین اور اس کے قطعی اصولوں میں اٹکل پچو باتیں کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں تو تصدیق کرنے اور ایمان لانے کا حکم ہے۔ جنہوں نے محض گمان اور اٹکل سے بات کی وہ ہمیشہ ہلاک ہوئے۔ اور یہ وہی لوگ ہیں اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ جو غفلت میں بھولے ہوئے ہیں، دنیا کے مزے اڑا رہے ہیں۔ مگر جزائے عمل کے معاملے میں بالکل غفلت کا شکار ہو چکے ہیں۔ اللہ نے سورۃ الانبیاء کے آغاز میں فرمایا ہے اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ لوگوں کے حساب کا وقت تو قریب آچکا ہے۔ مگر یہ لوگ

غفلت میں مبتلا اُس سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ ہر شخص کی زندگی تو محدود ہے۔ مگر اُسے اُس کی اگلی زندگی کا کچھ خیال ہی نہیں آ رہا ہے کہ اس کے لیے کیا تیاری کرنا ہے؟

فرمایا اس معاملہ میں لوگوں کی بے حسی ملاحظہ فرمائیں يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ تمسخر کی بنا پر پوچھتے ہیں کہ انصاف کا دن کب آئے گا! کہتے ہیں کہ قیامت برپا ہوگی۔ پھر سب لوگ زندہ ہو کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوں گے۔ حساب کتاب کی منزل پیش آئے گی اور پھر جزائے عمل کے فیصلے ہوں گے۔ بھلا بتلاؤ تو وہ وقت کب آئے گا۔ سورۃ الملک میں اللہ نے منکرین کی یہی بات اس طرح نقل کی ہے وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (آیت ۲۵) اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو بتلاؤ وہ وعدہ کب پورا ہوگا۔ اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا کہ انصاف کا دن وہ ہوگا يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ جس دن یہ لوگ آگ پر تپائے جائیں گے۔ فتنہ کا لغوی معنی آزمائش اور ابتلا ہوتا ہے، تاہم یہاں مراد یہ ہے کہ جس طرح سونے کو کٹھالی میں ڈال کر پگھلایا جاتا ہے اسی طرح ان ناہنجاروں کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا۔ اور پھر ان سے کہا جائے گا۔ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ آج اپنی شرارت کا مزا چکھو۔ تم دنیا میں کہتے تھے کہ جس عذاب کی وعید سناتے ہو وہ آ کیوں نہیں جاتا۔ تو یہ دیکھ لو هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ یہی وہ سزا ہے جس کے متعلق تم جلدی کیا کرتے تھے۔ اگلی سورۃ میں آ رہا ہے کہ ان لوگوں سے کہا جائے گا کہ اپنے عقائد و اعمال کے بدلے میں جہنم میں داخل ہو جاؤ فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ (الطور۔۱۶) اب صبر کرو یا بے صبری کا اظہار کرو تمہارے لیے برابر ہے۔ آج تمہیں تمہاری کارکردگی کا بدلہ مل رہا ہے۔ بہرحال اس سارے مضمون سے باور یہ کرانا مقصود ہے کہ وقوع قیامت اور جزائے عمل برحق ہے اور ایسا ضرور ہو کر رہے گا۔ اس معاملہ میں غور و فکر کی آج ضرورت ہے، وگرنہ جب پانی سر سے گزر گیا تو پھر پچھتانا کچھ کام نہیں آ سکے گا۔

متقین کے لیے انعامات

اللہ تعالیٰ کا یہ دستور ہے کہ ترہیب کے ساتھ ترغیب کا ذکر بھی اکثر آتا ہے۔ چنانچہ منکرین کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں اور ان کو ملنے والے بعض انعامات کا ذکر بھی کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ بے شک متقی لوگ جنتوں اور چشموں میں ہوں گے۔ بنیادی طور پر متقی وہ شخص ہوتا ہے جو کفر، شرک، نفاق، ارتداد اور معصیت سے بچتا ہو۔ حدودِ شرع کا خیال رکھتا ہو اور اس کے دل میں خوفِ خدا جاگزیں ہو۔ ایسے لوگ اللہ کی رحمت کے مقام جنت میں داخل ہوں گے۔ جہاں انہیں ہر قسم کی نعمتیں میسر ہوں گی، آرام و آسائش کی تمام سہولتیں حاصل ہوں گی، خوبصورت اور دل خوش کن باغات ہوں گے جن میں پانی کی نہریں اور چشمے بہتے ہوں گے اٰخِذِیْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ وہ ہر چیز اور نعمت کو حاصل کرنے والے ہوں گے جو ان کو ان کا پروردگار عطا کرے گا۔ وہ لوگ خدا کی عطا کردہ نعمتوں کو خوشی سے قبول کریں گے کیونکہ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِیْنَ اس سے پہلے یعنی دنیا کی زندگی میں وہ نیکی کے کام انجام دینے والے تھے۔ انہی نیکیوں کا پھل آج ان کو مل رہا ہے اور وہ ان سے مستفید ہو رہے ہیں۔

متقین کی صفات

آگے اللہ نے ان متقیوں کی بعض صفات کا ذکر بھی کیا ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں كَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَهْجَعُوْنَ جو رات کے وقت بہت کم ہی سوتے تھے بلکہ رات کا بیشتر حصہ بیدار رہ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزار دیتے تھے۔ وہ نمازیں پڑھتے تھے اور تسبیح و تحمید کے کلمات زبان پر لاتے تھے ساری رات جاگنا تو ویسے بھی مناسب نہیں کیونکہ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ انسان کے لیے سونا بھی ضروری ہے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ ساری رات عبادت کیا کرتے تھے مگر آپ نے یہ کہہ کر منع فرما دیا کہ تم اس عمل کو نبھا نہیں سکو گے کیونکہ تم پر تمہارے جسم کا بھی حق ہے، بیوی اور مہمان کا حق بھی ہے تمہیں آرام کی بھی ضرورت ہے مسلسل عبادت سے جسم کمزور ہو جائے گا، آنکھیں اندر

کو دھنس جائیں گی اور پھر تم حقوق العباد ادا نہیں کر سکو گے، لہٰذا عبادت بھی کرو اور ساتھ ساتھ آرام بھی کرو۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ المزمل میں بھی فرمایا ہے کہ اے پیغمبر علیہ السلام قُمِ الَّیۡلَ اِلَّا قَلِیۡلًا (آیت۔۲) رات کا تھوڑا حصہ قیام کرو، یعنی نصف رات ایک تہائی یا اس سے بھی کم وقت میں عبادت کیا کرو اور باقی وقت آرام کیا کرو۔ بہرحال یہاں پہ اللہ نے نیکی کرنے والوں کی یہ صفت بیان فرمائی ہے کہ وہ سوتے کم اور عبادت زیادہ کیا کرتے تھے۔

وَبِالۡاَسۡحَارِ هُمۡ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ اور وہ سحریوں کے وقت اپنے پروردگار سے استغفار کرتے تھے۔ وہ اللہ سے اپنی لغزشوں کی معافی طلب کیا کرتے تھے اور ساتھ یہ بھی کہتے تھے کہ پروردگار! ہم سے حق عبادت ادا نہیں ہو سکا۔ پھر وہ لوگ اس عبادت و ریاضت پر مغرور نہیں ہوتے تھے بلکہ نہایت عاجزی کا اظہار کرتے تھے۔ ان کے پیش نظر ہمیشہ یہ بات رہتی تھی کہ خدا تعالیٰ کی عبادت کا حق کوئی بھی ادا نہیں کر سکتا۔

سحری کے استغفار کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ یہ دعا کی قبولیت کا خاص وقت ہوتا ہے، اس وقت خدا کی خصوصی تجلیات اور رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ صحیحین کی روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے، اور ارشاد فرماتا ہے مَنۡ یَّدۡعُوۡنِیۡ فَاَسۡتَجِیۡبَ لَهٗ مَنۡ یَّسۡاَلُنِیۡ فَاُعۡطِیَهٗ مَنۡ یَّسۡتَغۡفِرُنِیۡ فَاَغۡفِرَ لَهٗ کون ہے جو مجھ سے دعا کرے اور میں اس کی دعا قبول کروں۔ کون ہے جو مجھ سے سوال کرے اور میں اس کو عطا کروں، اور کون ہے جو مجھ سے مغفرت طلب کرے تو میں اس کو معاف کر دوں۔ فرمایا یہ آوازیں برابر آتی رہتی ہیں یہاں تک کہ طلوع فجر ہو جاتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے متقی بندے سحریوں کے وقت اپنے پروردگار سے استغفار کرتے ہیں۔

وَفِيٓ أَمۡوَٰلِهِمۡ حَقّٞ لِّلسَّآئِلِ وَٱلۡمَحۡرُومِ ﴿١٩﴾ وَفِي ٱلۡأَرۡضِ ءَايَٰتٞ لِّلۡمُوقِنِينَ ﴿٢٠﴾ وَفِيٓ أَنفُسِكُمۡۚ أَفَلَا تُبۡصِرُونَ ﴿٢١﴾ وَفِي ٱلسَّمَآءِ رِزۡقُكُمۡ وَمَا تُوعَدُونَ ﴿٢٢﴾ فَوَرَبِّ ٱلسَّمَآءِ وَٱلۡأَرۡضِ إِنَّهُۥ لَحَقّٞ مِّثۡلَ مَآ أَنَّكُمۡ تَنطِقُونَ ﴿٢٣﴾ ع ۲۳ / ۱۸

ترجمہ :- اور اُن کے مالوں میں حق ہے مانگنے والے اور محروم کے لیے (۱۹) اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لیے (۲۰) اور تمہارے نفسوں میں بھی (نشانیاں ہیں) کیا تم سوچتے نہیں (۲۱) اور آسمان میں ہے تمہاری روزی اور وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے (۲۲) پس قسم ہے آسمانوں اور زمین کے پروردگار کی بیشک یہ بات حق ہے اسی طرح جس طرح تم گفتگو کرتے ہو (۲۳)

ربطِ آیات

پہلے منکرین قیامت کا رد اور اُن کی سزا کا بیان ہوا۔ پھر ان کے بالمقابل متقی اور ایمان دار لوگوں کا حال اللہ نے ذکر کیا کہ وہ باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ پروردگار کی نعمتیں حاصل کر کے نہایت خوش ہوں گے کیونکہ وہ دنیا کی زندگی میں نیکیاں کماتے رہے۔ رات کے وقت اللہ کے حضور مناجات کرتے تھے اور اس کی عبادت اور ذکر میں بہت سا وقت صرف کرتے تھے۔ مزید براں وہ سحری کے وقت اٹھ کر اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے تھے۔ گویا راتوں کا قیام اور سحریوں کا استغفار اُن کا معمول تھا۔

انسان کے مالی حقوق

اب آج کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے انہی متقیوں کے متعلق فرمایا کہ وہ

اس دُنیا کی زندگی میں اپنے مالی حقوق بھی دیانتداری کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے
وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ اور ان کے اموال میں سائل اور
محروم کے لیے حق ہے۔ اللہ نے نیکی کرنے والوں کی یہ بھی ایک صفت بیان کی ہے
کہ وہ اللہ کی عطا کردہ روزی میں سے مانگنے والوں اور محروم اشخاص کا حق پورے
طریقے سے ادا کرتے ہیں۔

اس حق سے متعلق مفسرین کرام کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض نے اسے فرض حق
یعنی زکوٰۃ پر محمول کرتے ہیں۔ جو کہ ہر صاحب نصاب پر بقدر نصاب فرض ہے
زکوٰۃ تو ہر حال میں بلاشبہ فرض ہے اور اس کی فرضیت کا واضح اعلان قرآن میں
بار بار ہوا ہے۔ تاہم اس مقام پر جس حق کا تذکرہ ہے وہ زکوٰۃ کے علاوہ حق ہے
جیسا کہ حضرت فاطمہ بنت قیس کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے
اِنَّ فِي الْمَالِ حَقًّا سِوَى الزَّكٰوةِ یعنی مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے
اسی طرح سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۷ میں ہے کہ نیکی کا کام یہ ہے کہ مال کے ساتھ
محبت رکھنے کے باوجود اپنے رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں اور مسافروں کو
دیا جائے وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ
وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّاۗىِٕلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ اس میں مانگنے والوں
اور قیدیوں کا بھی حق آ گیا (جیسا کہ سورۃ دھر میں ہے مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا
وَّاَسِيْرًا) بہر حال یہ انفاق زکوٰۃ کے علاوہ ہے کیونکہ زکوٰۃ کا حکم تو اگلے حصہ
آیت میں ہے وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ یعنی ایسے لوگ نماز قائم
کرتے ہیں اور زکوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں۔

امام ابوبکر جصاص لکھتے ہیں کہ اس امر پر سلف کا اتفاق ہے کہ مال میں زکوٰۃ
کے علاوہ بھی کچھ واجبات ہیں۔ مثلاً اگر والدین محتاج ہوں اور اولاد صاحب مال
ہے تو اولاد پر والدین کا خرچہ اٹھانا واجب ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد فرماتے
ہیں کہ کسی مالدار آدمی کے اقربا اگر محتاج ہیں اور ان کے پاس کوئی ذریعہ معاش

نہیں ہے تو ان کا خرچہ بھی واجب ہوگا۔ اپنے عزیز واقرباء کے علاوہ بھی کوئی مسلمان
مجبور ہو جاتا ہے تو مالدار آدمی کے ذمے واجب ہے کہ اس کی حاجت برآری کرے
اسی طرح دوران سفر اگر کوئی مسلمان مال ضائع کر بیٹھا ہے، سواری گم ہوگئی ہے۔
کوئی حادثہ پیش آگیا ہے یا راستہ منقطع ہو گیا ہے تو اس کا خرچہ برداشت کرنا بھی
دوسرے مسلمانوں پر لازم آتا ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جانوروں کے مالکان سے فرمایا کہ ان کے
حقوق ادا کیا کرو۔ جانوروں کا ایک حق تو اللہ نے ان کی گردنوں میں رکھا ہوا ہے
یعنی زکوٰۃ۔ جب جانور نصاب کو پہنچ جائیں تو ہر سال ان کی زکوٰۃ ادا کرو۔ اور دوسرا
حق یہ ہے کہ جب تم اونٹنیوں کو پانی پلانے کے لیے گھاٹ پر لے جاؤ۔ تو ان
کا دودھ دوہ کر محتاجوں کو بھی دو۔ اگر رستے میں کوئی مسافر بغیر سواری کے جا رہا ہے
تو اس کو سواری مہیا کرو۔ اس قسم کے حقوق وہ ہیں جو زکوٰۃ کے علاوہ ہیں۔ تو
فرمایا جو مسلمان خدا کی وحدانیت اور قیامت پر صحیح یقین رکھتے ہیں وہ مالی حقوق
بھی ادا کرتے ہیں۔

سائل اور محروم

یہاں پر اللہ نے دو قسم کے مستحقین کا ذکر فرمایا ہے یعنی سائل اور محروم۔
سائل تو وہ ہے جو محتاج ہے اور از خود دوسروں سے سوال کرتا ہے کہ اس کی مدد
کی جائے۔ البتہ محروم کی تعریف میں مفسرین کا قدرے اختلاف ہے بعض کہتے
ہیں کہ محروم وہ شخص ہے جو خود سوال نہیں کرتا حالانکہ اس کے پاس کچھ نہیں مگر
عزت نفس کی خاطر کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرتا۔ متعفف اور پاکدامن
ہے اور بعض فرماتے ہیں کہ محروم سے مراد وہ شخص ہے جو پہلے خود بھی مالدار تھا۔
مگر حوادثات زمانہ نے اسے محروم کر دیا۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ اگر
کسی کو کوئی حادثہ پیش آگیا، تاوان پڑ گیا، کوئی اور افتاد پڑ گئی تو وہ مستحق ہے
اس کی زکوٰۃ فنڈ سے بھی مدد کی جا سکتی ہے۔ ایسا شخص بھی محروم یا مستحق کے
زمرے میں آتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور مستحق گروہ بھی ہے۔ یلفقہ [illegible]

الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (البقرۃ ۲۷۳) جو اللہ کی راہ میں رُکے بیٹھے ہیں اور کسی طرف جانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ان میں وہ دینی طالب علم آتے ہیں جو تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے کوئی دیگر کام کاج نہیں کر سکتے۔ ان کے لباس، خوراک اور دیگر تعلیمی اخراجات کی ضرورت ہوتی ہے، ان کا پورا کرنا بھی صاحب مال حضرات پر واجب ہے۔ نیز جہاد میں جانے والے نادار لوگ جو اسلحہ اور زادِ راہ کا انتظام نہیں کر سکتے، اُن کی مالی اعانت بھی مالدار لوگوں پر واجب ہے

بعض لوگوں کا حق تو اللہ نے زکوٰۃ و صدقات کے فنڈ سے مقرر کر دیا ہے اور بعض وراثت میں حصہ دار بن جاتے ہیں، البتہ کچھ جاندار مخلوق ایسی بھی ہے جن پر خرچ لازم ہے۔ مثلاً حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے فِیْ کُلِّ ذَا کَبِدٍ رَطْبَۃٍ صَدَقَۃٌ ہر زندہ جگر رکھنے والی چیز پر صدقہ ہوتا ہے۔ اس سے مراد جانور ہیں۔ اُن کی خوراک کا انتظام کرنے والے لوگ صدقہ کا ثواب پاتے ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک بدکار عورت نے پیاسے کتے کو پانی پلایا تو اللہ نے اس کے بدلے میں اُس فاحشہ کو جنت میں داخل فرما دیا۔ غرضیکہ اس قسم کے جاندار بھی محرومین میں شامل ہیں۔ اور صاحب حیثیت لوگوں کے مالوں میں ان کا بھی حق ہے بہر حال فرمایا کہ ان کے مالوں میں حق ہے محتاجوں کے لیے جو سوال کرتے ہیں

اور ناداروں کے لیے جو سوال سے بچتے ہیں یا

جن کا کوئی حق مقرر نہیں ہے۔ یہ ان کے لیے ہے۔ جو قیامت پر ایمان رکھتے ہیں، یہ بات اللہ نے اُن متقیوں کی صفت کے طور پر بیان فرمائی ہے جو جنت میں جا کر اللہ تعالیٰ کے انعامات حاصل کرنے والے ہیں، اور وہ اس سے پہلے دنیا میں نیکی کے کام کرتے رہے۔

زمینی نشانات قدرت

سورۃ کے آغاز میں اللہ نے وقوع قیامت سے متعلق آسمانی نشانات کا ذکر کیا تھا۔ اب اسی سلسلے میں بعض زمینی نشانات کی بات ہو رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ اور زمین میں بھی نشانیاں ہیں یقین رکھنے

والوں کے لیے زمین میں پائی جاتے والی چیزیں انسان ، حیوان ، چرند ، پرند ، دریا ، سمندر ، پہاڑ ، جنگل ، صحرا اور لاتعداد قسم کے کیڑے مکوڑے ہیں ۔ اس کے علاوہ سمندری مخلوق کا شمار ہی نہیں کیا جا سکتا ۔ اگر انسان ان چیزوں میں غور و فکر کرے تو اللہ کی قدرت تامہ اور وقوع قیامت کا مسئلہ آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے ۔ فرمایا وَفِيٓ أَنفُسِكُمْ ، خود تمہارے اپنے نفسوں کے اندر بھی بہت سی نشانیاں ہیں ۔ انسان کی تخلیق کے مختلف مراحل پر غور کیا جائے اور پھر اس کی پوری زندگی کا احاطہ ہو ، اس کے جسم کے ایک ایک عضو اور اس کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے تو ان میں انسان کے لیے قدرت کے بہت سے دلائل مضمر ہیں ۔ فرمایا أَفَلَا تُبْصِرُونَ کیا تم اس معاملہ میں غور و فکر نہیں کرتے ؟ غرضیکہ آفاقی نشانیوں کے بعد انسانی نفس کے نشانات کا ذکر بھی ہو گیا ۔ انسان کی روح ، نفس ناطقہ اور اس سے وابستہ تمام اندرونی قوتیں بجائے خود اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں مگر یہ اس شخص کی سمجھ میں آتی ہیں جو ان میں غور و فکر کر کے ان کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے ۔

رزق عالم بالا سے

پھر آگے فرمایا وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ اور تمہاری روزی آسمان میں ہے وَمَا تُوعَدُونَ اور وہ کچھ بھی وہیں ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے ظاہری اسباب میں آسمان کی طرف سے بارش ہوتی ہے تو مردہ زمین کو نئی زندگی ملتی ہے ۔ اس میں قوت روئیدگی پیدا ہوتی ہے لوگ اس سے فائدہ اٹھا کر کاشت کرتے ہیں ۔ جس کے نتیجے میں پھل ، غلہ اور سبزیاں پیدا ہوتی ہیں ۔ جو انسانوں اور دیگر جانداروں کی خوراک بنتے ہیں ۔ اس کے علاوہ رزق کا تعلق آسمان کے ساتھ ہونے کا یہ مطلب بھی ہے کہ ہر چیز کا حکم تو آسمان یعنی عالم بالا سے ہی آتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہو تو بادل اٹھتے ہیں ، بارش ہوتی ہے اور پھر روزی کے ذرائع پیدا ہوتے ہیں ۔ تو جب تک اوپر سے حکم نہ آئے ، تمام اسباب دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں ہوائیں ، بارشیں ، دریا اور سمندر طوفان بن کر نقصان کا باعث بن جاتے ہیں ۔ لہٰذا روزی کا تعلق بہر حال عالم بالا سے ہے اس کے علاوہ ہر آنے والی چیز خواہ موت

ہو یا حیات، خوشی ہو یا غمی سب کا فیصلہ اُوپر ہی ہوتا ہے۔ اللہ کا ہر حکم "حظیرۃ القدس" میں اترتا ہے، پھر ملاء اعلیٰ کی جماعت کے سامنے اس کا ذکر ہوتا ہے اور پھر وہاں سے عالم سفلی میں اُس پر عملدرآمد ہوتا ہے۔

جزائے عمل برحق ہے

ارشاد ہوتا ہے فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ پس قسم ہے پروردگار کی جو آسمان و زمین کا پروردگار ہے إِنَّهُ لَحَقٌّ بے شک جزائے عمل برحق ہے یعنی انصاف کی بات یقیناً واقع ہونے والی ہے۔ ابتداء میں اللہ نے ہواؤں کو دلیل بنا کر وقوع قیامت اور جزائے عمل کے برحق ہونے سے آگاہ کیا۔ جب کائنات کی کوئی چیز بھی فضول نہیں ہے تو پھر کائنات کا یہ پورا سلسلہ کیسے بے مقصد ہو سکتا ہے۔ اس کا بھی انجام ہے۔ حدیث جبرئیلؑ میں آتا ہے کہ جبریل علیہ السلام نے ایمان، اسلام اور احسان کے متعلق حضور علیہ السلام سے سوال کرنے کے بعد پوچھا تھا مَتَى السَّاعَةُ یعنی قیامت کب آئے گی۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس پوری کائنات کی انتہا کب ہوگی۔ جس چیز کا آغاز ہے اُس کا انجام بھی ہے اور جو چیز موجود ہے اُس نے ختم بھی ہونا ہے۔ اسی طرح جو انسان پیدا ہوا ہے، اُسے مرنا بھی ہے اور اس کا نتیجہ بھی ظاہر ہونا ہے اور یہی جزائے عمل کی منزل ہے۔ اسی لیے اللہ نے آسمانوں اور زمین کی قسم اٹھا کر فرمایا کہ جزائے عمل برحق ہے۔

ایک عجیب واقعہ

صاحب مدارک، صاحب کشاف اور تفسیر مظہری والے حضرات نے ایک عجیب واقعہ نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ فقہ و حدیث کے امام اسماعیلؒ ہارون الرشید عباسی کے زمانے میں ہوئے ہیں۔ بڑے عالم فاضل اور نیک سیرت انسان تھے۔ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ کسی دوسرے شہر جانے کے لیے بصرہ کی جامع مسجد سے نکلا۔ راستے میں ایک دیہاتی اونٹ سوار سے ملاقات ہوئی۔ علیک سلیک کے بعد اُس نے پوچھا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ میں نے کہا کہ اُس جگہ سے جہاں کلام پاک پڑھا جاتا ہے یعنی جامع مسجد سے۔ وہ شخص کہنے لگا کہ قرآن کا کچھ حصہ

مجھے بھی سناؤ، تو میں نے یہی سورۃ الذّٰریٰت سنانی شروع کی۔ پھر جب میں اس مقام پر پہنچا وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ تو وہ شخص کہنے لگا۔ رک جاؤ۔ اس پر ان آیات کا عجیب اثر ہوا۔ کہنے لگا کہ روزی کا حکم تو اوپر سے آتا ہے، پھر میں کس تکلف میں پڑا ہوا ہوں۔ اس نے اپنی سواری کے اونٹ کو وہیں نحر کر دیا۔ اور مسافروں کو کھلا دیا۔ جو سامان پاس تھا، وہ بھی تقسیم کر دیا۔

امام اسماعیلؒ کہتے ہیں کہ میں اس شخص کے توکل سے بڑا حیران ہوا۔ پھر ایسا اتفاق ہوا کہ حج کے موقع پر میں طواف کر رہا تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ کوئی کمزوری آواز والا آدمی شریک ہو رہا ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہی بدو نظر آیا۔ وہ پھر کہنے لگا کہ تمہیں مجید قرآن یاد ہے؟ میں نے پھر یہ آیت سنائی فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ تو وہ شخص کہنے لگا کہ عجیب لوگ ہیں جنہوں نے ربِ جلیل کو قسم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ وہ شخص اس آیت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اپنے الفاظ کو بار بار دہراتا رہا حتیٰ کہ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

گفتگو بطور دلیل

فرمایا اس پروردگار کی قسم ہے جو آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے کہ وقوعِ قیامت اور جزائے عمل برحق ہے مِثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنْطِقُونَ بالکل اسی طرح جس طرح تم گفتگو کرتے ہو۔ یہ انسان کا خاصہ ہے کہ اللہ نے اسے قوتِ گویائی بخشی ہے جو انسانوں کے ساتھ لازم ہے اور جس پر کوئی بھی شک و شبہ کا اظہار نہیں کرتا تو فرمایا، جس طرح تمہارا آپس میں بات چیت کرنا بالکل حقیقت ہے اسی طرح وقوعِ قیامت کے متعلق بھی کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہونا چاہیئے۔

مفسرین کرام نے یہاں ایک نکتہ بیان کیا ہے کہ انسان بولنے کے علاوہ دیکھتا بھی ہے سنتا بھی ہے، کھاتا، پیتا، چلتا پھرتا اور کاروبار کرتا ہے، مگر کیا وجہ ہے کہ اللہ نے صرف بولنے کو قیامت کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے؟ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی دیگر حرکات و سکنات کی نسبت اس کا نطق (بولنا) اس کے حالات کے قریب ترین ہے۔ نطق قوتِ فکریہ سے

اٹھتا ہے۔ یعنی پہلے انسان کسی چیز میں غور و فکر کرتا ہے، پھر اس کے نتیجے میں وہ بولتا ہے یونانی فلسفے میں انسان کو حیوان ناطق کہا گیا ہے یعنی بولنے والا جاندار۔ مطلب یہ ہے کہ گفتگو کرنا بہت بڑی حقیقت ہے اور اسی وجہ سے اللہ نے نطقِ انسانی کو دلیل بنایا ہے۔

امام شاہ ولی اللہؒ کی حکمت میں انسان کی تعریف اس طرح کی گئی ہے مَن یَتَفَکَّرُ وَیَصْنَعُ بِالْآلَاتِ یعنی انسان اس ہستی کو کہتے ہیں جو غور و فکر کرتا ہے اور آلات کے ذریعے کام کرتا ہے۔ اگر وہ خاکی ہے تو انسان ہے اگر ناری ہے تو جن ہے بہرحال غور و فکر کے نتیجے میں جو چیز انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ اس کا اظہار نطق کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ ایک شاعر نے بھی اپنے کلام میں نطق کی اہمیت کو اس طرح اجاگر کیا ہے کہ وہ اپنے محبوب کی بستی کے کھنڈرات سے گزرتا ہے تو کہتا ہے ؎

هَلْ بِالدِّيَارِ أَنْ تُجِيْبَ صَمَمُ
لَوْ كَانَ حَيًّا نَاطِقًا كَلَّمُ

یہ بہرے گونگے کھنڈرات کیا بات کریں گے، اگر وہ گفتگو کرنے والا زندہ ہوتا تو کلام بھی کرتا۔ بہرحال گفتگو کرنا انسان کا خاصہ ہے جس کا ذکر اللہ نے خاص طور پہ اس جگہ کیا ہے۔

انسان کے گفتگو کرنے میں وقوعِ قیامت اور بعث بعد الموت کی دلیل اس طرح بھی ملتی ہے کہ اللہ نے انسان کو قوتِ گویائی بخشی ہے۔ وہ حروف کو جوڑ کر کلمات بناتا ہے، پھر جو چیز اس کے ذہن میں آتی ہے اس کو ظاہر کرتا ہے انسان ایک دفعہ گفتگو کر کے عاجز نہیں آجاتا بلکہ اس عمل کو بار بار دہراتا رہتا ہے، اور اس طرح گفتگو کا تعلق متکلم کے ساتھ مستحکم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات کو اس طرح بنایا کہ ہر انسان کو ایک ایک کر کے پیدا فرمایا، تو جس طرح کلام متکلم کی طرف راجع (رجوع کرنے والی) ہوتی ہے اسی طرح اللہ کی پیدا کردہ مخلوق خود اسی کی طرف راجع ہوتی ہے، جیسے سورۃ البقرہ میں فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ

کا کیسے انکار کرتے ہو جب کہ تم مردہ تھے۔ اس نے تمھیں زندگی بخشی، وہ پھر تمھیں موت دے گا اور پھر زندہ کرے گا ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (آیت ۲۸) پھر تم نے اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ مقصد یہ کہ یہ سب چیزیں پلٹ کر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف آئیں گی، تو جس طرح اللہ نے انسان کو پہلی دفعہ پیدا کیا، وہ اُسے لوٹانے پر بھی قادر ہے۔ جس طرح ایک انسان بار بار کلام کرنے سے عاجز نہیں آتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ انسان کو دوبارہ پیدا کرنے سے بھی عاجز نہیں ہے۔ اور حشر کا عمل ضرور واقع ہوگی بہر حال اللہ نے تخلیق کو وقوع قیامت کی دلیل بنایا ہے کہ یہ چیز انسان کے حالات کے قریب ترین ہے۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۴﴾ اِذْ
دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۲۵﴾
فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ﴿۲۶﴾ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ
قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا
لَا تَخَفْ ؕ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۲۸﴾ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ
فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ﴿۲۹﴾
قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۰﴾
قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ
اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً
مِّنْ طِيْنٍ ﴿۳۳﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۴﴾
فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَمَا وَجَدْنَا
فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَتَرَكْنَا فِيْهَآ
اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۳۷﴾

ترجمہ :- کیا پہنچی ہے آپ تک بات ابراہیم علیہ السلام
کے معزز مہمانوں کی (۲۴) جب کہ وہ اُن کے پاس آئے
اور انہوں نے سلام کیا۔ ابراہیم علیہ السلام نے سلام کا

جواب دیا (اور کہا) یہ لوگ کچھ اوپرے معلوم ہوتے ہیں (۲۵) پھر نظر بچا کر اپنے گھر والوں کے پاس گئے (پس لائے وہ ایک بچھڑا موٹا ہوا (۲۶) پس قریب کیا اس کو ان کی طرف اور کہا تم کھاتے کیوں نہیں ؟ (۲۷) پس محسوس کیا ابراہیم علیہ السلام نے ان سے کچھ خوف ، تو وہ کہنے لگے خوف نہ کھاؤ ۔ اور بشارت دی انہوں نے ابراہیم علیہ السلام کو ایک علم والے لڑکے کی (۲۸) پھر متوجہ ہوئی آپ کی بیوی شور کرتی ہوئی ۔ اس نے اپنے ماتھے کو پیٹا اور کہنے لگی بڑھیا ہے بانجھ (۲۹) تو وہ (فرشتے) کہنے لگے کہ اسی طرح فرمایا ہے تیرے پروردگار نے ۔ بیشک وہ حکمت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے (۳۰) کہا (ابراہیم علیہ السلام نے) پس کیا کام ہے تمہارا اے بھیجے ہوئے لوگو (۳۱) کہا انہوں نے کہ ہم بھیجے گئے ہیں ایک مجرم قوم کی طرف (۳۲) تاکہ ہم چھوڑیں ان پر پتھر مٹی کے (۳۳) نشان لگائے ہوئے تیرے پروردگار کی طرف سے اسراف کرنے والوں کے لیے (۳۴) پس نکالا ہم نے ان کو جو تھے اس بستی میں ایمان والوں میں سے (۳۵) پس نہ پایا ہم نے ان میں سوائے ایک گھرانے مسلمانوں کے (۳۶) اور چھوڑی اس میں ہم نے نشانی ان لوگوں کے لیے جو دردناک عذاب سے خوف کھاتے ہیں (۳۷)

ربطِ آیات

اس سورۃ کا مرکزی مضمون وقوعِ قیامت اور جزائے عمل ہی ہے جس کو مختلف عنوانات کے تحت بیان کیا جا رہا ہے ۔ اللہ نے چار قسمیں اٹھا کر فرمایا اِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ (آیت ۔ ۶) جزائے عمل ضرور واقع ہونے والی ہے ۔ اللہ نے منکرین قیامت کا

رد کیا اور اُن کو ملنے والی سزا کا ذکر کیا۔ اس کے بالمقابل متقی لوگوں کو ملنے والی نعمتوں کا تذکرہ کیا۔ اس کے بعد اللہ نے دنیا میں نیکی کمانے والوں کی صفات بیان فرمائیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے سامنے عجز و نیازمندی اور مناجات کرتے ہیں، اور سحری کے وقت اپنی لغزشوں کی معافی مانگتے ہیں۔ اُن کے مالوں میں محتاجوں اور محروموں کا حق ہوتا ہے جس کو وہ ادا کرتے ہیں۔ پھر اللہ نے وقوعِ قیامت کے بارے میں فرمایا کہ زمین میں قدرتِ خداوندی کی بے شمار نشانیاں ہیں جن میں غور کرکے وقوعِ قیامت کا مسئلہ سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ خود انسان کے اپنے نفس میں بھی بہت سی نشانیاں رکھی ہیں۔ روزی اور ہر موعود چیز کا حکم آسمان کی طرف سے آتا ہے پھر فرمایا کہ ارض و سما کے پروردگار کی قسم جزائے عمل برحق ہے اور یہ ضرور واقع ہوگا، اور اس کی حقیقت بالکل اسی طرح شک و شبہ سے پاک ہے جس طرح تمہارا گفتگو کرنا امرِ واقع ہے۔

جزائے عمل کے اولیٰ نمونے

اب اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بعض سابقہ انبیاء اور اُن کی اقوام کے حالات اور اُن کو ملنے والی سزا کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ وقوعِ قیامت، جزائے عمل، توحید و رسالت کا انکار کرنے والوں کے لیے اللہ نے اسی دنیا میں جزائے عمل کا ایک ادنیٰ نمونہ پیش کر دیا ہے۔ جو خدا تعالیٰ دنیا میں کسی بھی نافرمان کو سزا دے سکتا ہے وہ آخرت میں بھی اُن کی کارکردگی کا بدلہ دینے پر قادر ہے۔ اس سلسلہ میں اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فضیلت بیان کی ہے اور اُن کے پاس آنے والے مہمان فرشتوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے برگزیدہ بندے کے لیے بیٹے کی خوشخبری لائے جب کہ لوط علیہ السلام کی نابکار قوم کے لیے تباہی کا سامان لے کر آئے۔ گزشتہ آیات میں بھی ایسے ہی دو گروہوں کا ذکر ہو چکا ہے، ایک وہ نافرمان گروہ جنہیں آگ میں تپایا جائے گا۔ جب کہ متقین کا گروہ جنتوں اور چشموں میں ہوگا جہاں انہیں ہر طرح کی نعمتیں میسر ہوں گی۔ بہر حال اللہ نے نافرمانوں کی سزا کا ذکر کرکے سمجھا دیا ہے

کہ ان چھوٹے چھوٹے نمونوں کو ذہن میں رکھ کر آخرت کی بڑی سزا کو بھی قیاس کر لو۔

ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ

سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر خیر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ھَلْ أَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ کیا آپ تک ابراہیم علیہ السلام کے معزز مہمانوں کی بات پہنچی ہے؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خطاب کر کے واقعہ کی تفصیلات بتانا مقصود ہے۔ یہاں پر معزز مہمانوں سے مراد وہ فرشتے ہیں جو آپ کے پاس آئے تھے۔ اللہ نے اپنی اس پاک مخلوق کو عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ کہا ہے کہ یہ اس کے باعزت بندے ہیں۔ تمام فرشتے خواہ وہ ملاءِ اعلیٰ کے ہوں یا ملاءِ سافل کے، سب عزت والے ہیں۔ وہ ہر وقت اپنے پروردگار کی عبادت اور ذکر میں مصروف رہتے ہیں۔ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (النحل ۵۰) اور اللہ کے ہر حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔

تفسیری روایات کے مطابق ان فرشتوں کی تعداد تین، نو یا بارہ تھی جو ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے۔ یہ نوخیز لڑکوں کی انسانی شکل میں تھے جن کے نام جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل علیہم السلام ہیں۔ فرمایا کیا آپ تک ابراہیم علیہ السلام کے معزز مہمانوں کی بات نہیں پہنچی اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ جب وہ آپ کے پاس آئے فَقَالُوْا سَلٰمًا تو ابراہیم علیہ السلام کو سلام کیا۔ یہ واقعہ سورۃ ہود، سورۃ الحجر، سورۃ العنکبوت اور سورۃ القمر میں بھی مذکور ہے۔ اس مقام پر ابراہیم علیہ السلام کی اعلیٰ قدر کا ذکر مقصود ہے۔ نیز ان پر ہونے والے بعض انعامات کا تذکرہ ہے اور آگے اصل بات جرم کی طرف ہی آرہی ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے مہمان نوازی

فرمایا، فرشتوں نے ابراہیم علیہ السلام کو سلام کیا قَالَ سَلٰمٌ آپ نے سلام کا جواب دیا یعنی وعلیکم السلام کہا، اور ساتھ ہی خیال آیا قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ یہ کچھ اوپرے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جانی پہچانی شکلوں میں نہیں تھے اس لیے آپ نے دل میں کہا کہ یہ تو کوئی اجنبی اور غیر مانوس شکلیں ہیں۔ بہرحال آپ نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا، انہیں اچھی جگہ خاطر مدارت سے بٹھایا اور اس کے بعد

فَرَاغَ إِلَىٰ أَهْلِهِ نظر بچا کر اپنے گھر والوں کے پاس گئے یعنی اندرون خانہ حضرت سارہؓ کے پاس پہنچے تاکہ مہمانوں کی تواضع کا بندوبست کر سکیں اُس وقت مہمانوں کے کھانے کے لیے فَجَاءَ بِعِجْلٍ سَمِينٍ مہمانوں کے پاس ایک موٹا تازہ تلا ہوا بچھڑا لے کر آگئے۔ ظاہر ہے کہ گھر میں وہی بچھڑا موجود ہوگا، جسے آپ نے ذبح کیا، اور پھر اس کا گوشت بھون کر لے آئے فَقَرَّبَهُ إِلَيْهِمْ اور مہمانوں کے سامنے رکھ دیا، مگر مہمانوں کے ہاتھ کھانے تک نہیں پہنچ رہے تھے تو قَالَ أَلَا تَأْكُلُونَ کہنے لگے، تم کھاتے کیوں نہیں؟

اس واقعہ سے یہ تعلیم بھی ملتی ہے کہ علمِ غیب خاصہ خداوندی ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے مہمانوں کو انسان سمجھ کر اُن کی خاطر مدارت کرنا چاہی، ان کے لیے کھانا پیش کیا مگر اُس وقت آپ نہیں جانتے تھے کہ یہ فرشتے ہیں اور یہ انسانی کھانا نہیں کھاتے۔ اسی وجہ سے آپ کو تشویش ہوئی اور اُن سے فرمایا کہ تم کھاتے کیوں نہیں؟

مہمان نوازی کے آداب

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے فَرَاغَ کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی ابراہیم علیہ السلام مہمانوں سے نظر بچا کر گھر گئے تاکہ اُن کے لیے کھانے کا بندوبست کر سکیں۔ مفسرین کرام اس سے یہ مسئلہ اخذ کرتے ہیں کہ مہمانوں کو محسوس نہیں ہونے دینا چاہیئے کہ میزبان اُن کی خدمت کے لیے کیا بندوبست کر رہا ہے۔ کیونکہ بعض مہمان بڑے حساس ہوتے ہیں اور میزبان کے تکلف میں پڑنے سے وہ خود تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ اسی لیے ابراہیم علیہ السلام مہمانوں کو احساس دلائے بغیر جو کچھ گھر میں میسر تھا اُن کے سامنے پیش کر دیا۔

مہمان نوازی دین اسلام کا ایک اہم اصول ہے اور ابراہیم علیہ السلام اس کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان مبارک بھی ہے مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اُسے اپنے مہمان کی عزت کرنی چاہیئے۔ اسی

مہمان سے مراد محض جان پہچان والا مہمان مراد نہیں بلکہ اجنبی مہمان کی خاطر مدارت اور عزت افزائی بھی ضروری ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ مہمان کو ایک دن اور رات حسب حیثیت پر تکلف کھانا کھلانا چاہیئے۔ تین دن تک مہمان نوازی ہوتی ہے اور اس کے بعد یہ خدمت صدقہ میں داخل ہے۔

یہ تو عام مہمانی کا اصول ہے۔ اور اگر اپنا کوئی عزیز رشتہ دار یا خاص مہمان ہو تو وہ زیادہ عرصہ بھی ٹھہر سکتے ہیں۔ اُدھر حضور علیہ السلام نے مہمانوں کو بھی نصیحت کی ہے کہ کسی کے پاس اتنا زیادہ نہ ٹھہرو کہ میزبان حرج محسوس کرنے لگے۔ اس کی حیثیت کا خیال رکھو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ معاشی لحاظ سے کمزور ہو اور تم اس پر بوجھ بن سکتے ہو۔

ابراہیم علیہ السلام کو تشویش اور بشارت

بہر حال جب ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کے مہمانوں کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھ سکتے ہیں تو انہیں تشویش ہوئی کہ کیا بات ہے! اس زمانے میں یہ عام دستور تھا کہ جس کو نقصان پہنچانا مقصود ہوتا تھا اس کا کھانا نہیں کھایا جاتا تھا کہ یہ نمک حرامی میں شمار ہوتا تھا۔ ابراہیم علیہ السلام کے لیے یہی بات باعث تشویش تھی کہ یہ مہمان کہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچائیں گے۔ چونکہ آپ کو حقیقت حال کا ابھی علم نہیں تھا۔ اس لیے آپ کو تشویش ہوئی تھی اور اسی لیے آپ نے مہمانوں سے پوچھا کہ تم کھانا کیوں نہیں کھاتے۔

مہمانوں کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر فَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً ابراہیم علیہ السلام نے ان سے خوف محسوس کیا۔ جب فرشتوں نے آپ کو اس حالت میں دیکھا قَالُوا لَا تَخَفْ تو کہنے لگے ڈرو مت۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، دیکھو میں جبرائیل ہوں، یہ میکائیل ہیں اور یہ اسرافیل علیہم السلام ہیں، لہٰذا ہم یہ کھانا نہیں کھاتے اس کے ساتھ ہی فرشتوں نے ایک اور بات بھی کی وَبَشَّرُوهُ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ انہوں نے ابراہیم علیہ السلام کو ایک علم والے لڑکے کی بشارت بھی سنادی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں صاحب علم بیٹا عطا کرے گا۔ اس بیٹے سے مراد حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں جو حضرت سارہؓ کے بطن سے تولد ہوئے۔ اس سے چودہ سال قبل حضرت اسماعیل علیہ السلام

کی ولادت حضرت ہاجرہؓ کے بطن سے ہوئی تھی۔ جن کے لیے اللہ نے غُلٰمٍ حَلِیْمٍ (الصّٰفّٰت - ۱۰۱) یعنی بردبار بچے کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

بہر حال ابراہیم علیہ السلام کے لیے بیٹے کی بشارت تو ایک ضمنی بات تھی۔ اصل کام جس کے لیے فرشتے آئے وہ اور تھا یعنی وہ لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب لے کر آئے تھے۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ ایک طرف تو ایک پوری قوم کی تباہی کا وقت آچکا تھا اور دوسری طرف ایک بیٹے کی بشارت دی جا رہی ہے جس کے متعلق بائیبل کا بیان ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو اللہ نے فرمایا تھا۔ اے ابراہیم! یہ لوگ تجھے دنیا سے ختم کرنا چاہتے ہیں مگر میں تیری اولاد کو ریت کے ذروں کی طرح دنیا میں پھیلاؤں گا۔ چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں۔ دنیا کی اکثر آبادی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہے۔

حضرت سارہؓ کی حیرانگی

جب اللہ کے فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی خوشخبری دے رہے تھے تو اس وقت آپ کی زوجہ محترمہ حضرت سارہؓ کی عمر اسّی یا نوّے سال کی ہو چکی تھی۔ جب انہوں نے یہ خوشخبری سنی فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِیْ صَرَّةٍ پھر متوجہ ہوئی آپ کی بیوی شور مچاتی ہوئی یعنی بولتی ہوئی آئی۔ دراصل وہ اس بات سے سخت حیرت زدہ ہوئی تھیں فَصَكَّتْ وَجْهَهَا پس انہوں نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔ حیرانگی کے عالم میں چہرے پر ہاتھ مار کر یہ مہمان کیا بات کر رہے ہیں؟ وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ حالانکہ میں تو بوڑھی ہو چکی ہوں اور پہلے بھی بانجھ ہوں، بھلا میں کیسے بچہ جن سکوں گی؟ سورۃ ہود میں آپ کے یہ الفاظ بھی آتے ہیں۔ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ (آیت ۷۲) کہنے لگی ہائے افسوس! کیا اب میں بچہ جنوں گی حالانکہ میں بوڑھی ہو چکی ہوں اور میرا خاوند بھی بوڑھا ہو گیا ہے۔ بہر حال اس حیرانگی کے اظہار پر قَالُوْا كَذٰلِكِ فرشتے کہنے لگے کہ ایسا ہی ہو گا قَالَ رَبُّكِ تیرے پروردگار نے یونہی فرمایا ہے۔ اس میں حیرانگی کی کوئی بات نہیں کیونکہ جب پروردگار نے یہ فیصلہ کیا ہے اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ بے شک وہ حکمتوں والا اور سب

کچھ جاننے والا ہے۔ اس فیصلے میں اُس کی کمالِ حکمت کارفرما ہے کہ وہ اس بیٹے کے ذریعے کیا کام لینا چاہتا ہے۔ اس کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں لہٰذا وہ ہر چیز میں تصرف اور تدبیر اپنے علم اور ارادے کے مطابق کرتا ہے۔

تفسیری روایات میں آتا ہے کہ پہلے تو فرشتے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے تھے۔ پھر جب انہوں نے ابراہیم علیہ السلام کو خوفزدہ محسوس کر کے اپنی حیثیت کو واضح کر دیا تو اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اُس بھنے ہوئے گوشت کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اللہ تعالیٰ نے اس بچھڑے کو دوبارہ زندگی بخش دی۔ اور وہ دوڑ کر اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔ اسی دوران حضرت سارہؑ نے اوپر چھت کی طرف نظر اُٹھائی، جہاں بوسیدہ اور گلی سڑی لکڑیاں پڑی ہوئی تھیں، تو انہوں نے دیکھا کہ وہ بوسیدہ لکڑیاں آناً فاناً سرسبز ہوگئی ہیں اور ان میں پتے نکل آئے ہیں اور اس طرح وہ دوبارہ درخت کی صورت میں سامنے آگئیں۔ ان دو واقعات سے حضرت سارہؓ کو یقین ہوگیا کہ جو پروردگار بھنے ہوئے بچھڑے کو دوبارہ زندگی دے سکتا ہے، اور جو خشک لکڑیوں کو ہرے بھرے درخت میں تبدیل کر سکتا ہے، وہ مجھ جیسی بوڑھی اور بانجھ عورت کو اولاد بھی دے سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی فرشتوں نے حضرت سارہؓ سے کہا قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ (هود۔ ۷۳) کیا تم خدا کی قدرت سے تعجب کرتی ہو، اے اہل بیت! تم پر خدا کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں۔

قومِ لوط کے لیے عذاب

جب ابراہیم علیہ السلام کو حقیقتِ حال کا علم ہوگیا اور بشارت والی بات بھی مکمل ہو کر آپ کی تسلی ہوگئی تو فرشتوں سے کہنے لگے قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ اے اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتو! تمہارے آنے کی اصل غرض کیا ہے؟ بشارت والی ضمنی بات تو ہوگئی، اب آگے تمہارا کیا پروگرام ہے۔ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ کہنے لگے ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ تاکہ ہم ان پر مٹی کے پتھر برسائیں

اس سے مراد کھنگر ہیں۔ جو مٹی سے بنا کر آگ میں پکا لیے جاتے ہیں۔ اور یہ ایسے پتھر ہیں۔ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِينَ جن پر تیرے پروردگار کے ہاں نشان لگے ہوئے ہیں اسراف کرنے والوں کے لیے۔ مطلب یہ کہ قوم لوط کے لوگ اپنے جرائم میں حد سے بڑھ گئے ہیں ان کی تباہی کا وقت آچکا ہے۔ اب ہر پتھر اس نافرمان پر پڑ کر اسے ہلاک کر دے گا۔ جس کا نام اس پر لکھا ہوا ہے۔

یہ مجرم لوگ شرق اردن میں علاقہ سدوم کے باشندے تھے ان کے چند بڑے بڑے شہر تھے جن کی آبادی چار لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ کچھ دیہات بھی تھے بڑا سرسبز علاقہ تھا۔ تجارت اور زراعت دونوں عروج پر تھیں۔ بڑے خوشحال لوگ تھے مگر ہم جنسی جیسی قبیح بیماری میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اس قوم سے پہلے اس بیماری کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ گویا یہی اس کے موجد تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام تیس چالیس سال تک لوگوں کو تبلیغ کرتے رہے اور ان کو برے انجام سے ڈراتے دھمکاتے رہے مگر انہوں نے کچھ پروا نہ کی، الٹا کہنے لگے أَخْرِجُوهُم مِّن قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ (الاعراف۔ ۸۲) کہ ان کو اپنی بستی سے نکال دو، یہ بڑے پاکباز بنے پھرتے ہیں۔ اور ہمیں ناپاک کہتے ہیں۔ حضرت لوط علیہ السلام نے قوم سے یہی کہا تھا قَالَ إِنِّي لِعَمَلِكُم مِّنَ الْقَالِينَ (الشعراء۔ ۱۶۸) میں تو تمہارے اس کام سے سخت بیزار ہوں۔ تم بڑا ذلیل کام کرتے ہو۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے انہیں سنگساری کی سخت ترین سزا دی۔ اللہ نے زمین کو بھی تہ و بالا کر دیا۔ اور اوپر سے پتھروں کی بارش کی جس سے ساری قوم ہلاک ہو گئی۔

فعل لواطت کی حیثیت کے متعلق ائمہ کرام کا قدرے اختلاف ہے۔ بعض اسے زنا کے برابر قرار دیتے ہیں اور اس پر بھی حد زنا جاری کرنے کا فتویٰ دیتے ہیں۔ تاہم امام ابو حنیفہؒ اور بعض دیگر ائمہ اسے زنا میں تو شمار نہیں کرتے البتہ اس جرم پر سخت ترین تعزیر لگانے کا حکم دیتے ہیں۔ جو قید و بند کی سے یا سزائے موت تک بھی ہو سکتی ہے۔

اہل ایمان کا اخراج

فرمایا نافرمان لوگ تو سارے کے سارے تباہ ہو گئے۔ فَأَخْرَجْنَا مَنْ

كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ البتہ ہم نے اہلِ ایمان لوگوں کو اس بستی سے نکال لیا اور اس طرح وہ عذابِ الٰہی سے بچ گئے۔ اللہ نے فرمایا کہ ساری بستی میں فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ پس نہ پایا ہم نے وہاں کوئی بھی اہلِ ایمان سوائے ایک مسلمان گھرانے کے۔ ظاہر ہے کہ وہ گھرانہ صرف لوط علیہ السلام کا تھا جو اللہ کی گرفت سے بچ گئے۔ آپ کے ساتھ آپ کی بچیاں تھیں۔ بیوی بھی کافرہ تھی اور وہ بھی باقی قوم کے ساتھ ہی ہلاک ہو گئی۔ فرمایا وَتَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِّلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ اس سارے واقعہ میں ہم نے ایک نشانی چھوڑی ہے مگر ان لوگوں کیلئے جو دردناک عذاب سے خوف کھاتے ہیں۔ یہ نشانی وہی کھنڈر ہیں جو عرصہ دراز تک موقع پر پڑے رہے۔ وہاں سے گزرنے والے اپنی آنکھوں سے اس تباہ حال بستی کو دیکھتے تھے اور اس سے عبرت حاصل کرتے تھے۔ یہ اتنا سخت عذاب تھا کہ نہ صرف ہنستی بستی آبادیاں کھنڈرات کا ڈھیر بن گئیں۔ بلکہ سمندر کا پانی بھی زہریلا ہو گیا جسے اب بحرِ میت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اب اس سمندر میں کوئی آبی جانور مینڈک مچھلی وغیرہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اللہ نے اسی دنیا میں جزائے عمل کا ایک ادنیٰ سا نمونہ پیش کیا ہے اور پھر قیامت کے بڑے حادثے کا حال بھی بتلا دیا ہے۔

درس پنجم ۵ — آیت ۳۸ تا ۴۶

وَفِي مُوسَىٰ إِذْ أَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ ﴿٣٨﴾ فَتَوَلَّىٰ بِرُكْنِهِ وَقَالَ سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ ﴿٣٩﴾ فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيمٌ ﴿٤٠﴾ وَفِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ ﴿٤١﴾ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ أَتَتْ عَلَيْهِ إِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيمِ ﴿٤٢﴾ وَفِي ثَمُودَ إِذْ قِيلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوا حَتَّىٰ حِينٍ ﴿٤٣﴾ فَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ﴿٤٤﴾ فَمَا اسْتَطَاعُوا مِنْ قِيَامٍ وَمَا كَانُوا مُنْتَصِرِينَ ﴿٤٥﴾ وَقَوْمَ نُوحٍ مِنْ قَبْلُ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ ﴿٤٦﴾

ع ۲ / ۲۳

ترجمہ:۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں بھی نشانی ہے، جب کہ ہم نے بھیجا ان کو فرعون کی طرف کھلی سند دے کر (۳۸) پس روگردانی کی (فرعون نے) اپنی قوت کے ساتھ اور کہنے لگا یہ جادوگر ہے یا دیوانہ ہے (۳۹) پس پکڑا ہم نے اس کو اور اس کے لشکر کو، پھر پھینک دیا ہم نے ان کو دریا میں، اور اس کی حالت قابلِ ملامت تھی (۴۰) اور قوم عاد میں بھی نشانی ہے،

جب کہ ہم نے بھیجی اُن کے اوپر ہوا جو خیر سے خالی تھی (۴۱) نہیں چھوڑتی تھی وہ کسی چیز کو جس پہ وہ چلتی تھی مگر کر دیتی تھی اُس کو چورا چورا (۴۲) اور قوم ثمود میں بھی نشانی ہے، جبکہ کہا گیا اُن کے لیے کہ فائدہ اٹھا لو ایک وقت تک (۴۳) پس سرکشی کی انہوں نے اپنے پروردگار کے حکم کے سامنے پس پکڑا اُن کو ایک کڑک نے ، اور وہ دیکھ رہے تھے (۴۴) پس نہ طاقت رکھی انہوں نے کھڑے ہونے کی اور نہیں تھے وہ بدلہ لینے والے (۴۵) اور اسی طرح ہم نے ہلاک کیا قوم نوح کو اس سے پہلے ۔ بیشک تھے وہ ایک نافرمان قوم (۴۶)

ربط آیات

گزشتہ درس میں حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی تباہی کا حال ذکر ہوا پوری قوم میں ایک گھرانے کے سوا کوئی بھی خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے والا نہیں تھا ۔ یہ واقعہ دراصل جزائے عمل کی حقانیت کے سلسلے میں ہی پیش کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے اسی دنیا میں بعض اقوام کو اُن کے بُرے انجام سے دوچار کر کے بتلا دیا کہ وہ آخرت میں بحیثیت مجموعی بھی ہر فرد کو اس کی کارکردگی کا بدلہ دینے پہ قادر ہے ۔ گزشتہ آیات میں فرمانبرداروں کے نمونہ کے طور پر اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ فرمایا اور ساتھ ساتھ نافرمان اقوام کے پانچ واقعات بطور تمثیل بیان کیے ہیں یہ مقصد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ مجرموں کو سزا دیے بغیر نہیں چھوڑتا ۔ گزشتہ درس میں گزر چکا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں سے پوچھا کہ تمہارے آنے کا مقصد کیا ہے، تو انہوں نے کہا کہ ہم لوط علیہ السلام کی مجرم قوم کو سزا دینے کے لیے آئے ہیں ۔ چنانچہ لوط علیہ السلام کے ایماندار گھرانے کو بستی سے نکال کر پوری بستی کو الٹ دیا گیا اور اوپر سے پتھروں کی بارش بھی ہوئی جس کی وجہ سے پوری قوم سے ایک

فرد بھی زندہ نہ بچا بلکہ سب کے سب ہلاک ہو گئے۔

فرعونیوں کی ہلاکت

اب آج کی ابتدائی آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعہ کو بھی بطور نشانی پیش کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَفِي مُوسَىٰ اور موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں بھی نشانی موجود ہے۔ اس میں غور و فکر کرنے سے وقوع قیامت اور جزائے عمل کی بات سمجھ میں آسکتی ہے۔ فرمایا إِذْ أَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ جب کہ بھیجا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف کھلی سند کے ساتھ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو واضح تعلیم، واضح معجزات اور دلائل و براہین عطا فرمائے موسیٰ علیہ السلام کی نو واضح نشانیوں میں سے عصا اور ید بیضا خاص اہمیت کی حامل تھیں جب موسیٰ علیہ السلام یہ معجزات لے کر فرعون کے پاس گئے فَتَوَلَّىٰ بِرُكْنِهِ تو اس نے اپنی پوری قوت کے ساتھ آپ کی دعوت سے روگردانی کی۔ رکن کا معنی پہلو اور طاقت دونوں آتے ہیں اور اس مقام پر دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔ اگر رکن کا معنی پہلو کیا جائے تو مطلب ہوگا کہ فرعون نے آپ کی دعوت سے پہلو تہی کی یعنی اس سے بچنے کی کوشش کی۔ اور اگر اس کا معنی قوت لیا جائے تو یہ بھی درست ہے کہ اس نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ دعوت توحید کا انکار کیا۔ رکن بمعنی طاقت حضرت لوط علیہ السلام کے واقعہ میں بھی استعمال ہوا ہے۔ قَالَ لَوْ أَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةً أَوْ آوِي إِلَىٰ رُكْنٍ شَدِيدٍ (ھود-۸۰) لوط علیہ السلام نے نا ہنجار قوم سے کہا کاش میرے پاس طاقت ہوتی یا وہ طاقت ہستی ہوتی جس پر بھروسہ کیا جا سکتا۔ اور ظاہر ہے طاقتور ترین ہستی خدا کی ذات ہی ہو سکتی ہے بہر حال فرعون نے ساز و سامان اپنے امراء اور لشکر کی قوت کے بل بوتے پر موسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت اور آپ کے پیغام کا انکار کیا۔ وَقَالَ سٰحِرٌ اور کہنے لگا کہ یہ شخص تو جادوگر ہے اور اپنے دعویٰ نبوت میں سچا نہیں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر ان پر ایمان لانے کی بجائے انہیں جادو کا کرشمہ کہہ کر ٹال دیا۔ بعض دوسری سورتوں میں موجود ہے کہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے خود نشانیاں طلب کی

نفیں۔ سورۃ الشعراء میں موجود ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوت توحید دی تو وہ کہنے لگا اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تمہیں قید میں ڈال دوں گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا خواہ میں تمہارے پاس کوئی واضح چیز لے آؤں؟ قَالَ فَأْتِ بِهِ إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ (آیت۔ ۳۱) تو فرعون کہنے لگا لے آؤ اگر تم سچے ہو۔ مگر جب آپ نے واضح نشانیاں پیش کر دیں تو کہنے لگا کہ یہ تو جادوگر ہے أَوْ مَجْنُونٌ یا یہ دیوانہ ہے جو ہمارے نظم و نسق کو خراب کرنا چاہتا ہے۔ ہمارے آباؤ و اجداد کے رسم و رواج اور دین کو بدل کر ہمارے معاشرے میں خرابی پیدا کرنا چاہتا ہے

اس مقام پر اللہ نے نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ جب فرعون اور اس کی قوم نے موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو قبول کرنے کی بجائے آپ کو ختم ہی کر دینا چاہا۔ اور آپ کے سخت دشمن بن گئے فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ تو ہم نے پکڑ لیا فرعون کو بھی اور اس کے لشکر کو بھی فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ اور ہم نے انہیں دریا میں پھینک دیا اس حالت میں وَهُوَ مُلِيمٌ کہ وہ قابلِ ملامت تھا۔ اللہ نے قیامت تک کے لیے فرعون پر لعنت مسلط کر دی ہے۔ اب ہر شخص اس پر لعنت کرتا ہے۔ اور قیامت والے دن بھی فرعون مع اپنی قوم لعنت ہی کا شکار رہے گا اللہ تعالیٰ نے فرعون سمیت پورے لشکر کو بحرِ قلزم میں غرق کر دیا اور فرعون کی لاش کو عبرت کے لیے باقی رکھا جو آج بھی لوگوں کے لیے باعثِ عبرت بنی ہوئی ہے، جو بھی اس کو دیکھتا ہے اس پر لعنت ہی بھیجتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ قرآن پاک میں چھیالیس مرتبہ سے زیادہ بیان ہوا ہے۔ اس کے علاوہ یہ واقعہ بائبل میں بھی مذکور ہے اور تاریخ کے اوراق میں بھی محفوظ ہے۔ اس واقعہ کا ذکر اللہ تعالیٰ نے جزائے عمل ہی کے سلسلہ میں کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو خدا کسی نافرمان کو اس دنیا میں سزا دے سکتا ہے وہ آخرت میں بھی جزائے عمل پر قادر ہے۔

قومِ عاد کا حال

اس کے بعد اللہ نے قومِ عاد کا حال بیان کیا ہے وَفِي عَادٍ اور قومِ عاد میں بھی نشانی ہے۔ یہ بھی بڑے طاقتور اور جبار لوگ تھے۔ اقتدار کے مالک تھے،

ان کے پاس بے شمار وسائل تھے اور بڑے خوشحال تھے۔ تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام تقریباً چار سو سال تک اس قوم کو وعظ و نصیحت کرتے رہے مگر جیسا کہ امام جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی تاریخ کی کتاب میں لکھا ہے، ان میں سے بہت کم لوگ ایمان لائے، پھر جب ان کی نافرمانی حد سے تجاوز کر گئی تو اللہ کا غضب جوش میں آگیا اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ جب کہ ہم نے ان پر بانجھ ہوا بھیجی یعنی ایسی ہوا جو خیر و برکت سے خالی تھی۔ اس ہوا کے متعلق سورۃ الحاقہ میں آتا ہے سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ (آیت ۷) خدا تعالیٰ نے اس کو ان لوگوں پر سات رات اور آٹھ دن تک مسلسل چلایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيمِ کہ وہ جس چیز پر چلتی تھی اس کو چورا چورا کر کے چھوڑتی تھی۔ رمیم بوسیدہ ہڈیاں یا خشک گھاس یا لکڑی وغیرہ کو بھی کہا جاتا ہے جو ذرا سا چھیڑنے سے ریزہ ریزہ ہو جائے۔ تو یہ ہوا اتنی تند تھی کہ جس چیز کو لگتی تھی اُسے تہس نہس کر دیتی تھی۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قوم عاد کو اس تند ہوا کے ذریعے ہلاک کیا، اور فرمایا کہ اس میں بھی جزائے عمل کی نشانی ہے۔

ہواؤں کے اثرات

اس سورۃ کی ابتداء اللہ تعالیٰ نے ہواؤں کی قسم اٹھا کر کی تھی وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا قسم ہے بکھیرنے والی ہواؤں کی جو گرد و غبار کو اڑاتی ہیں۔ یہ ہوا ہی ہے جو مختلف حالتوں میں روزمرہ مشاہدے میں آتی ہے۔ جب یہ تیز ہوتی ہے تو آندھی بن جاتی ہے گرم ہو تو لُو۔ اور جب ٹھنڈی ہو تو ہر چیز کو یخ بستہ کرتی چلی جاتی ہے۔ پھر یہی ہوا، جب نرمی اور آہستگی سے چلتی ہے تو بادِ نسیم بن کر انسانوں، جانوروں اور نباتات کے لیے خوش کن بن جاتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ نے میری مدد مشرقی ہوا صبا کے ساتھ فرمائی، جنگ احزاب کے موقع پر جب کفار نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا تھا اور مدینے کے مسلمان سخت آزمائش میں مبتلا ہو گئے تھے اُس وقت اللہ

نے مشرق کی طرف سے ٹھنڈی ہوا چلائی جس سے دشمن کے خیمے اکھڑ گئے اور وہ جم نہ سکے اور بالآخر اُن کو محاصرہ چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ اللہ نے فرمایا کہ اس موقع پر اہلِ ایمان کی تقویت کے لیے فرشتے بھی موجود تھے اور اُدھر ہوا بھی اپنا کام کر رہی تھی۔ گویا اللہ نے مشرقی ہوا کے ذریعے حضور علیہ السلام کی مدد فرمائی۔ اس کے برخلاف قومِ عاد پر اللہ نے مغرب سے گرم ہوا (دبور) مسلط کی جس نے اُن کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا۔

وفدِ عاد کا تذکرہ

ترمذی شریف کی روایت میں یہ تفصیل موجود ہے کہ علاقہ سبا کے رہنے والے قبیلہ ربیعہ کے ایک صحابی حارث ابن یزیدؓ مدینہ طیبہ آئے۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ جب میں یہاں پہنچا تو اُس وقت مسجد نبوی لوگوں سے بھری ہوئی تھی، جھنڈے جھول رہے تھے اور حضرت بلالؓ تلوار لٹکائے حضور علیہ السلام کے سامنے حاضر تھے میں نے پوچھا کہ سب لوگوں کے جمع ہونے کی کیا وجہ ہے تو لوگوں نے مجھے بتلایا کہ حضور علیہ السلام حضرت عمرو ابن العاصؓ کی قیادت میں ایک لشکر جہاد پر روانہ کر رہے ہیں جس کی وجہ سے سب لوگ جمع ہیں۔ حضرت حارثؓ کا بیان ہے کہ پھر میرا ذکر حضور علیہ السلام کی خدمت میں بایں الفاظ کیا گیا کہ عاد کی سرزمین سے ایک وفد آیا ہے۔ جب میں نے اپنا تعارف اس طریقے سے سنا تو فوراً کہا۔ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِثْلَ وَافِدِ عَادٍ پناہ بخدا کہ میں وفدِ عاد کی طرح بن جاؤں۔ حضور علیہ السلام نے دریافت فرمایا کہ کیوں بھائی اس وفد میں کیا خرابی کی بات تھی جو تجھے ناپسند ہے تو میں نے عرض کیا حضور! یہ ہزاروں سال پرانا واقعہ ہے مگر زبانِ زدِ عام ہونے کی وجہ سے مشہور ہے جس کا ذکر تفسیری روایات میں بھی ملتا ہے۔ ایک دفعہ قومِ عاد پر سخت قحط پڑا، تین سال تک بارش کا ایک قطرہ نہ گرا جس کی وجہ سے انسان اور جانور ہلاک ہونے لگے۔ اس زمانے میں خانہ کعبہ کی عمارت تو گر چکی تھی، صرف ایک ٹیلہ سا باقی تھا مگر پھر بھی وہاں آ کر لوگ دعائیں کیا کرتے تھے کیونکہ یہ خطہ ہمیشہ سے متبرک رہا ہے۔ قحط سالی سے تنگ قومِ عاد نے اپنے ایک سردار کی قیادت میں ایک وفد مکہ بھیجا تا کہ وہاں جا کر دعا کریں۔ تا کہ

اللہ تعالیٰ قحط سالی کو دور فرمائے ۔ یہ وفد مکہ کے قریب ایک شخص بکر ابن معاویہ کے پاس مہمان ٹھہرا۔ میزبان نے بڑی عزت و تکریم سے وفد کو اپنے ہاں ٹھہرایا اور ان کی خوب خاطر مدارت کی ۔ اچھا کھانا کھلاتا رہا ، شراب کے جام چلتے رہے ، گانے بجانے والی لونڈیاں دل بہلاتی رہیں ۔ حتیٰ کہ اسی عیش و آرام میں ایک ماہ گزر گیا اور وفد جس کام یعنی دعا کے لیے آیا تھا وہ موخر ہو گیا ۔ پھر وہ وفد وہاں سے نکل کر مکہ کی پہاڑیوں جبال مہرہ پہنچا اور دعا کی کہ پروردگار ! میں کسی بیمار کی شفایابی کی درخواست لے کر نہیں آیا ، اور نہ ہی میں کسی قیدی کی رہائی کے لیے حاضر ہوا ہوں ۔ میری درخواست یہ ہے کہ جس طرح تو پہلے ہماری قوم کو سیراب کرتا تھا ، ـــــــــــ اب بھی سیراب فرما یعنی بارش نازل فرما کر قحط سالی دور کر دے ۔ اور ساتھ یہ بھی کہا کہ جس شخص کے پاس میں مہمان ٹھہرا ہوں اس کو سیراب فرما ۔

قوم عاد کی تباہی

اس وقت آسمان پر تین قسم کے بادل نمودار ہوئے یعنی سفید ، سرخ اور سیاہ ۔ ان بادلوں سے آواز آئی اختر یعنی ان میں سے جو تمہیں پسند ہے اس کو اختیار کر لو ۔ وفد کے سردار نے سیاہ بادل کو پسند کیا کیونکہ عام طور پر کالی گھٹا بارش لاتی ہے ۔ وفد اور قوم کے لوگ خوش ہو گئے کہ کالی گھٹا چھائی ہے ۔ اب بارش ہو گی اور سارا علاقہ جل تھل ہو جائے گا ۔ سورۃ الاحقاف میں ہے ۔ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا (آیت - ۲۴) کہ وہ کہنے لگے کہ یہ تو بادل ہے جو ہم پر بارش برسائے گا ۔ مگر اللہ نے فرمایا بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ بلکہ یہ تو وہ چیز ہے جس کے لیے تم جلدی کر رہے تھے ۔ یعنی یہ تو خدا تعالیٰ کی طرف سے تم پر ہوا کی صورت میں عذاب آ رہا ہے ۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ یہ ہوا کوئی بہت زیادہ نہیں تھی ، بلکہ صرف انگوٹھی کے حلقے جتنے حصے سے چھوڑی گئی تھی جو سات رات اور آٹھ دن تک متواتر چلتی رہی ۔ یہ ہوا جس چیز پر چلتی تھی اسے چورا چورا کر کے رکھ

دیتی تھی۔ پوری قوم میں سے سوائے ایماندار آدمیوں کے کوئی بھی زندہ نہ بچا۔ اس ہوا نے عادیوں کو زمین سے اٹھا اٹھا کر پٹخ دیا اور پھر ان کی لاشیں زمین پر اس طرح پڑی تھیں كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (الحاقة - ۷) گویا کہ کھجوروں کے بڑے بڑے تنے ہوں۔

قوم ثمود کی تباہی

آگے اللہ نے قوم ثمود کا نمونہ بھی پیش کیا ہے وَفِي ثَمُودَ اور قوم ثمود میں بھی جزائے عمل کی نشانی موجود ہے۔ یہ بڑے متمدن اصناع اور کاریگر لوگ تھے۔ پہاڑوں کو تراش کر نقش و نگار والی عالیشان عمارتیں بناتے تھے۔ ان کی تعمیر کردہ میدانی علاقوں کی عمارات بھی قابل دید تھیں۔ اس قوم نے اپنے نبی صالح علیہ السلام کو جھٹلایا اور قیامت اور جزائے عمل کا انکار کیا۔ بالآخر ان سے کہا گیا إِذْ قِيلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوا حَتَّىٰ حِينٍ چند دن کے لیے فائدہ اٹھا لو۔ فَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ مگر انہوں نے اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی اختیار کی فَأَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ پس ان کو ایک کڑک (چیخ) نے پکڑ لیا۔ وَهُمْ يَنْظُرُونَ اور وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر ان کی حالت یہ ہو گئی فَمَا اسْتَطَاعُوا مِنْ قِيَامٍ ان میں کھڑے ہونے کی طاقت نہ رہی۔ سورۃ الاعراف میں ہے فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَاثِمِينَ (آیت - ۷۸) وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے تھے۔ وَمَا كَانُوا مُنْتَصِرِينَ اور وہ کسی سے بدلہ لینے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھے۔ وہ اللہ کی گرفت میں آ چکے تھے، بھلا بدلہ کس سے لیتے؟ قوم عاد کا حال یہ تھا کہ اللہ نے فرمایا وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ (الشعراء - ۱۳۰) جب تم خود کسی کو پکڑتے ہو تو سخت ظالمانہ طریقے سے گرفت کرتے ہو مگر جب یہ قوم ثمود گرفت میں آئی تو نہ کھڑے ہونے کی طاقت باقی رہی اور نہ کسی سے بدلہ لے سکے، ان کی تمام غلط کاریاں ختم ہو کر رہ گئیں۔

قوم نوح کی غرقابی

اس کے بعد اللہ نے پانچواں نمونہ قوم نوح کا بیان فرمایا ہے وَقَوْمَ نُوحٍ مِنْ قَبْلُ اس سے پہلے یعنی قوم عاد و ثمود سے پہلے قوم نوح کا واقعہ بھی قابل غور

ہے۔ اس کو بھی اللہ نے جزائے عمل کے نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی لمبے عرصے تک تبلیغ اور قوم کا انکار قرآن میں متعدد سورتوں میں مذکور ہے بلکہ حضرت نوح علیہ السلام کے نام سے ایک مستقل سورۃ نوح بھی ہے آپ ساڑھے نو سو سال تک قوم کو اللہ کا پیغام پہنچاتے رہے مگر نتیجہ کیا نکلا مَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ (ھود۔ ۴۰) بہت ہی کم لوگ ایمان لائے یعنی اسی کے قریب افراد جو آپ کے ساتھ کشتی میں سوار ہو گئے۔ باقی ساری قوم اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ نافرمان ہی رہی۔ سورۃ الاعراف میں اسے قَوْمًا عَمِيْنَ (آیت۔ ۶۴) اندھی قوم کہا گیا ہے۔ اللہ نے اس قوم کو بھی طوفان میں غرق کر دیا۔ فرمایا جس طرح ہم نے مختلف قوموں کو دنیا میں سزا دی اسی طرح پوری نسلِ انسانی کا بھی محاسبہ ہوگا اور جزائے عمل واقع ہو کر رہے گی۔

درس ششم ۶ — آیت ۴۷ تا ۵۵

وَالسَّمَاۤءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَفِرُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾ وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۱﴾ كَذٰلِكَ مَاۤ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۵۲﴾ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَاۤ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ﴿۵۴﴾ وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾

ترجمہ :- اور آسمان کو بنایا ہے ہم نے قوت کے ساتھ اور بیشک ہم سب قدرت رکھنے والے ہیں ﴿۴۷﴾ اور زمین کو بچھایا ہے ہم نے پس کیا ہی خوب بچھانے والے ہیں ہم ﴿۴۸﴾ اور ہر چیز سے پیدا کیا ہم نے جوڑا تاکہ تم نصیحت حاصل کرو ﴿۴۹﴾ پس بھاگو اللہ کی طرف۔ بیشک میں تمہارے لیے اس کی طرف سے کھول کر ڈر سنانے والا ہوں ﴿۵۰﴾ اور نہ ٹھہراؤ اللہ کے ساتھ اور معبود۔ بیشک میں تمہارے لیے اُس کی جانب سے کھول کر ڈر سنانے والا ہوں ﴿۵۱﴾ اسی طرح نہیں آیا اُن لوگوں کے پاس جو ان سے پہلے گزرے ہیں، کوئی رسول، مگر کہا انہوں نے کہ یہ جادوگر

ہے یا دیوانہ ہے ﴿۵۲﴾ کیا وہ وصیت کر گئے ہیں اس بات کی ؟ بلکہ یہ لوگ ہیں سرکشی کرنے والے ﴿۵۳﴾ پس آپ منہ پھیر لیں ان کی طرف سے ۔ پس نہیں آپ پر کوئی ملامت ﴿۵۴﴾ اور آپ نصیحت کریں ۔ پس بے شک نصیحت فائدہ کرتی ہے ایمان والوں کے لیے ﴿۵۵﴾

ربطِ آیات

وقوعِ قیامت اور جزائے عمل کے سلسلہ میں اللہ نے مجرموں کی سزایابی کے کئی واقعات بیان فرمائے اور یاد دلایا کہ اہلِ ایمان کے لیے یہ نشانیاں ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں نافرمانوں کو سزا دی اس طرح وہ آخرت میں بھی گرفت کرنے پر قادر ہے ۔ جو لوگ خدا تعالیٰ کی طرف سے عذاب الیم سے خوف کھاتے ہیں ۔ وہ ایمان لانے اور نیکی کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔

آسمان کی تخلیق

مسئلہ جزائے عمل کی وضاحت کے بعد اب اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کا ذکر کیا ہے جو اس کی وحدانیت پر دلیل عقلی ہے ارشاد ہوتا ہے وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ اور ہم نے آسمان کو قوت کے ساتھ پیدا کیا ۔ اتنے لمبے چوڑے اور وسیع آسمان کی تخلیق اور وہ بھی بغیر ستونوں کے ، قدرت کاملہ کی بہت بڑی دلیل ہے ۔ اید کا معنی ہاتھ ہیں جو انسانی قدرت کا مظہر ہوتے ہیں اور اس سے مراد قوت ہے ۔ جیسا کہ سورۃ صٓ میں اللہ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا ہے وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ (آیت ۔ ۱۷) ہمارے بندے داؤد علیہ السلام کا تذکرہ کریں ۔ جو کہ ہاتھوں والے یعنی قوت والے تھے ۔ بہر حال اید سے مراد قوت یا طاقت ہے جس کے ذریعے اللہ نے آسمان کو پیدا فرمایا ۔ اس تذکرے سے مراد یہ ہے کہ جو خدا تعالیٰ آسمان جیسی وسیع و عریض چیز کو پیدا کرنے پر قادر ہے ، وہ کسی انسان مجرم کو گرفت کرنے پر کیوں قادر نہیں جب کہ انسان کی حیثیت ہی آسمان کے مقابلے میں کیا ہے ؟

مگر اس کا حال یہ ہے کہ یہ غرور و تکبر کی بنا پر اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے ۔ اور وقوعِ قیامت اور جزائے عمل کا انکار کر دیتا ہے ۔ فرمایا آسمان کی تخلیق کوئی بڑی بات

نہیں ہے وَاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ہم ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں، ہم اس سے بھی بڑی چیزیں پیدا کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

زمین کا فرش

پھر فرمایا وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا دیکھو! ہم نے زمین کو کس طرح سے بچھا دیا ہے فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ پس ہم بہت ہی خوب زمین کو بچھانے والے ہیں اللہ تعالیٰ نے زمین کی ہیئت اس طرح کی بنائی ہے کہ یہ انسان اور دیگر جانداروں کی تمام ضروریات پوری کرتی ہے تمام جانداروں کی خوراک زمین سے ہی پیدا ہوتی ہے اس کی سطح ایسی نرم ہے کہ اس میں آسانی کے ساتھ کاشتکاری ہو سکتی ہے جس سے پھل پھول اور اناج پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ زمین زیادہ سخت ہوتی تو کھیتی باڑی نہ ہو سکتی اور اگر زیادہ نرم ہوتی تو اس پر چلنا مشکل ہو جاتا۔ غرضیکہ اللہ نے اس کو زمینی مخلوق کی مصلحت کے عین مطابق بنایا ہے۔

اس مقام پر زمین کی جس خاص خوبی کا ذکر کیا گیا ہے وہ فَرَشْنٰهَا سے ظاہر ہے یعنی اس کی سطح ہموار ہے جس کی وجہ سے لوگ اس پر آسانی سے چلتے پھرتے، کاروبار کرتے، عمارات تعمیر کرتے اور اسی پر سوتے ہیں۔ اگر یہ ہموار نہ ہوتی تو اس پر کاروبارِ حیات کو جاری رکھنا مشکل ہو جاتا۔ اگرچہ یہ زمین ہمیں بظاہر مسطح نظر آتی ہے مگر جدید سائنسی تحقیق کے مطابق زمین چپٹی نہیں بلکہ گیند کی طرح گول ہے۔ اور شمالی اور جنوبی قطبین کے قریب پچکی ہوئی ہے۔ تاہم اپنی وسعت کی وجہ سے یہ گول کی بجائے چپٹی محسوس ہوتی ہے۔ آج کل سائنسدان خلائی سفر پر جا رہے ہیں۔ فضا سے لی گئی زمین کی تصویر میں زمین بالکل گیند کی طرح گول نظر آتی ہے جس طرح ہمیں زمین سے چاند اور سورج گول دکھائی دیتے ہیں، اسی طرح خلا سے زمین بھی گول ہی نظر آتی ہے۔ بہر حال فرمایا کہ ہم نے زمین کو بچھا دیا اور ہم اس کو خوب بچھانے والے ہیں

ہر چیز کا جوڑا

آگے اللہ نے اپنی ایک اور قدرت کا تذکرہ فرمایا ہے وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ اور ہم نے ہر چیز سے جوڑا پیدا کیا ہے۔ انسانوں اور دیگر جاندار مخلوق میں تو ہم ہر جنس کے جوڑے جوڑے کا مشاہدہ کر رہے ہیں، تاہم سائنسدان

بتلاتے ہیں کہ چھوٹے سے چھوٹے کیڑے مکوڑے سے لیکر سمندر کی بڑی سے بڑی مخلوق تک ہر چیز کو اللہ نے جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے۔ حتیٰ کہ علم نباتات والوں کی تحقیق یہ ہے کہ اللہ نے تمام نباتات کو بھی جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے۔ نر و مادہ کے جوڑے سے ہی آگے حیوانات یا نباتات کی نسل چلتی ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ زوجین سے مراد متضاد چیزیں ہیں یعنی ہر وہ چیز زوجین کہلا سکتی ہے جو اپنا مدمقابل رکھتی ہے۔ مثلاً نور و ظلمت یا لیل و نہار آپس میں متضاد ہیں اور جوڑا جوڑا ہیں۔ اسی طرح خشکی اور تری، ارض و سما، میدان اور پہاڑ، شجر و بحر زوجین میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ صفات میں سعادت اور شقاوت، کفر اور ایمان بھی زوجین ہیں۔ گرمی اور سردی، حلم اور قہر، بہادری اور بزدلی، بخل اور سخاوت، حق اور باطل، میٹھا اور کڑوا، صحت اور بیماری، غنیٰ اور فقر، ضحک اور بکا، فرحت اور غم، موت اور حیات، دنیا اور عقبیٰ وغیرہ سب زوجین میں شمار ہوتی ہیں۔ اگر انسان ان چیزوں میں غور و فکر کریں تو اللہ کی قدرت اور اُس کی وحدانیت سمجھ میں آسکتی ہے لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

دعوت الی التوحید

اس سورۃ میں دین کے بنیادی عقائد قرآن کریم کی حقانیت، توحید، رسالت، اور وقوعِ قیامت کا ذکر بھی آرہا ہے۔ چنانچہ یہاں پر دعوت الی التوحید کے ضمن میں ارشاد فرمایا ہے فَفِرُّوا إِلَى اللَّهِ پس اللہ تعالیٰ کی طرف دوڑو۔ مراد یہ ہے کہ ہر طرف سے کٹ کر صرف اللہ کی طرف رجوع کرو۔ اُسی کی عبادت کرو اور اُسی کے ساتھ اپنا تعلق درست کرو۔ حُنَفَاءَ لِلَّهِ غَيْرَ مُشْرِكِينَ بِهِ (الحج ۳۱) حنیف بن جاؤ اور مشرک نہ بنو۔ کفر، شرک اور معصیت کو چھوڑ دو۔ اور ساتھ اپنے پیغمبر کی زبان سے یہ بھی کہلوایا إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ مُبِينٌ میں تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھول کر ڈر سنانے والا ہوں۔ میں خدا کا رسول ہوں اور مجھے انذار کا حکم دیا گیا ہے۔ جو لوگ خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا انکار کرتے ہیں کفر اور شرک کا راستہ اختیار کرتے ہیں، میں اُن کو اُن کے برے انجام سے آگاہ

کر رہا ہوں۔

اللہ کا نبی تاکیداً فرماتا ہے وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود نہ ٹھہراؤ، کسی کو حاجت روا اور مشکل کشا نہ سمجھو کسی کی نذر و نیاز نہ دو۔ اللہ کے سوا نہ کوئی خالق ہے نہ مالک، نہ قادر مطلق ہے اور نہ علیم کل وہی متصرف اور مدبر ہے، وہی قدرت تامہ کا مالک ہے اور مستحق عبادت ہے، لہٰذا اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور دوبارہ سن لو اِنِّیْ لَکُمْ مِّنْہُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ بے شک میں تمہارے پاس اللہ کی طرف سے کھول کر ڈر سنانے کے لیے آیا ہوں، میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ اگر خدا تعالیٰ کی وحدانیت کے خلاف چلو گے تو انجام بہت بُرا ہو گا۔

انکارِ رسالت

اگلی آیت میں اللہ نے منکرین رسالت کا تذکرہ فرمایا ہے کَذٰلِکَ مَآ اَتَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اسی طریقے سے نہیں آیا ان سے پہلے لوگوں کے پاس کوئی رسول اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ مگر انہوں نے یہی کہا کہ یہ شخص جادوگر ہے یا دیوانہ ہے۔ فرمایا یہ صرف مکے اور عرب کے مشرکین کی بات نہیں بلکہ جس قوم میں بھی اللہ کا کوئی رسول آیا انہوں نے انکار ہی کیا۔ انہوں نے اللہ کے نبی کی بات پر کبھی غور ہی نہ کیا اور جب انہوں نے اللہ کا پیغام سنایا تو بڑے حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ فرمایا اَتَوَاصَوْا بِہٖ کیا تمہیں پہلے لوگ وصیت کر گئے تھے کہ ان کی طرح تم بھی اللہ کے رسولوں کا انکار کر دینا، اور کیا تم انہی کی وصیت پر عمل کر رہے ہو؟ جب قوم نوح کا بوڑھا آدمی قریب المرگ ہوتا تو وہ دوسروں کو وصیت کر جاتا کہ دیکھنا کہیں نوح علیہ السلام کی بات کو نہ مان لینا ورنہ وہ تمہیں تمہارے اباؤ اجداد کے دین سے پھیر دے گا۔ فرمایا حقیقت یہ ہے بَلْ ھُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ کہ وہ سرکش لوگ تھے جو توحید و رسالت کا انکار کرتے تھے۔ یہ ان کی سرکشی کا نتیجہ تھا کہ اللہ کے نبی کو ساحر اور مجنون کا خطاب دے دیا، العیاذ باللہ۔

تسلی کا مضمون

آگے اللہ نے اپنے پیغمبر کو تسلی دلائی ہے فَتَوَلَّ عَنْھُمْ آپ ایسے

منکرین توحید و رسالت سے منہ پھیر لیں۔ اُن کی طرف زیادہ توجہ نہ دیں فَمَا أَنتَ بِمَلُومٍ آپ پر کچھ ملامت نہیں۔ اگر یہ لوگ فتنہ پردازی کرتے ہیں، افترا باندھتے ہیں، اکڑ دکھاتے ہیں تو آپ اپنا فریضہ ادا کرتے ہوئے سمجھا دیں اور اس کے بعد ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ آپ اس بات کے ذمہ دار نہیں ہیں کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لائے۔ آپ کا فرض یہ ہے بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ (المائدہ - ٦٧) جو کچھ آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے۔ اس کو ان لوگوں تک پہنچا دیں، اس کے بعد ماننا یا نہ ماننا ان کی ذمہ داری ہے اور قیامت والے دن انہی سے سوال ہوگا کہ میرے پیغام کے ساتھ تم نے کیا سلوک کیا آپ اپنا فریضہ ادا کر دیں اور بس۔

اور ساتھ یہ بھی فرمایا وَذَكِّرْ آپ ان کو نصیحت کر دیں فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ بے شک یہ نصیحت ایمانداروں کو ضرور فائدہ دے گی۔ البتہ سرکش اور شرارتی لوگ اس نصیحت سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ جب آپ ان لوگوں کے سامنے اللہ کی نعمتوں کا تذکرہ کریں گے ثواب و عقاب کی بات پیش کریں گے۔ شیطان کے ورغلانے کی بات کریں گے تو انہیں غور و فکر کا موقع ملیگا، پھر جن کے دل میں ایمان کا جذبہ موجود ہوگا وہ اس سے مستفید ہو کر راہ راست پر آجائیں گے، اور جو ایمان سے یکسر خالی ہوں گے۔ ان پر آپ کی نصیحت کا کچھ اثر نہیں ہوگا۔

اسی نصیحت ہی کے ضمن میں ایک عرب شاعر دنیا کی بے ثباتی اور انسان کی بے بسی کے متعلق کہتا ہے۔

سہ
كُلُّ ابْنِ أُنْثَىٰ وَإِنْ طَالَتْ سَلَامَتُهُ
لَابُدَّ يَوْمًا عَلَىٰ آلَةٍ حَدْبَاءَ مَحْمُولُ

حوا کا بیٹا کتنی بھی صحت و سلامتی میں ہو مگر ایک دن اُسے ٹیڑھے آلے یعنی جنازے کی چارپائی پر سوار ہونا ہی پڑے گا۔

ے لَيْتَ شِعْرِي وَهَمُّ الْعَيْشِ يَنْصِبُهُ
وَلَيْسَ لَهُ فِي الْعَيْشِ تَحْذِيْرِيْ

کاش کہ مجھے معلوم ہو کہ انسان کو موت کی فکر کس قدر غم میں ڈالتی ہے مگر انسان کو زندگی میں موت سے بچانے والی کوئی چیز نہیں ہے۔

علامہ اقبال ؒ نے بھی کہا ہے۔

ے آیا ہے تو جہاں میں مثال شرار دیکھنا
دم دے نہ جائے ہستی ناپائیدار دیکھنا

ہماری مثال تو چنگاری جیسی ہے جو ابھی سلگ رہی ہے مگر عنقریب بجھ جائیگی اور ظاہر ہے کہ موت لازماً آنے والی ہے جس سے کسی طرح بھی مفر نہیں مقصد یہ ہے کہ دنیا کی ناپائیداری کی اس طرح کی باتیں نصیحت کا درجہ رکھتی ہیں، پھر قیامت کی ہولناکیوں اور جزائے عمل کی منزل کا تذکرہ بھی انسان کے لیے باعث نصیحت ہو سکتا ہے۔ اس قسم کی باتیں ایمان والوں کیلئے یقیناً مفید ہوں گی، ان تمام چیزوں کا تذکرہ قرآن پاک میں موجود ہے، لہذا ان باتوں کی نصیحت کرتے رہیں۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴿٥٦﴾ مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعِمُونِ ﴿٥٧﴾ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ﴿٥٨﴾ فَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذَنُوبًا مِثْلَ ذَنُوبِ أَصْحَابِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُونِ ﴿٥٩﴾ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ يَوْمِهِمُ الَّذِي يُوعَدُونَ ﴿٦٠﴾

ترجمہ :- اور نہیں پیدا کیا میں نے جنوں اور انسانوں کو مگر اس لیے تاکہ وہ میری عبادت کریں (۵۶) میں نہیں چاہتا اُن سے روزی ، اور میں نہیں چاہتا کہ وہ مجھے کھلائیں (۵۷) بیشک اللہ تعالیٰ ہی روزی دینے والا ہے مضبوط طاقت کا مالک (۵۸) بیشک ان لوگوں کے لیے جنہوں نے ظلم کیا ہے ڈول بھر چکا ہے جیسا کہ اُن کے ساتھیوں کا ، پس یہ جلدی نہ کریں (۵۹) پس تباہی ہے اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے کفر کیا ، اس دن جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا ہے (۶۰)

ربطِ آیات

اس سورۃ مبارکہ میں زیادہ تر منکرینِ قیامت کا رد ہوا ہے ، اور اب آخر میں اللہ نے اس کی طرف رجوع کرنے اور اپنی توحید کا مسئلہ بیان فرمایا ہے ۔ گذشتہ درس میں منکرینِ رسالت کا تذکرہ کیا اور اللہ کے نبی کو ساحر اور مجنون کہنے والوں کی مذمت بیان کی ۔ پھر آخر میں اپنے نبی کو تسلی دی اور ساتھ ساتھ لوگوں کو نصیحت کرنے کا حکم دیا ۔ اللہ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ آپ اپنا

کام کرتے چلے جائیں تو آپ کی نصیحت سے اہل ایمان ہی فائدہ اٹھا سکیں گے۔

مقصد تخلیق جن و انس

آج کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کی تخلیق کی غرض و غایت بیان فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ میں نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ بعض مفسرین اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ وہ مجھے پہچان لیں یا میری توحید کو مان لیں۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ لفظ عبادت تو عام ہے، اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے یہاں کون سی عبادت کے لیے جنوں اور انسانوں کی تخلیق فرمائی ہے؟ آپ فرماتے ہیں کہ اس عبادت میں دو چیزیں شامل ہیں یعنی اَلتَّعْظِيمُ لِاَمْرِ اللهِ (اللہ کے حکم کی تعظیم کرنا) وَالشَّفَقَةُ عَلٰى خَلْقِ اللهِ (اور مخلوق خدا پر شفقت و مہربانی کرنا) مقصد یہ ہے کہ عبادت کی یہ دو قسمیں تو عام جنوں اور انسان کے لیے مشترک ہیں مگر باقی عبادات ہر دو انواع اپنی اپنی شرائع کے مطابق کرنے کے پابند ہیں۔

چار ضروری خصلتیں

حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے سلسلے میں چار خصلتیں تمام سابقہ امتوں اور ہماری امت میں بھی برابر ضروری ہیں فرماتے ہیں کہ پہلی خصلت طہارت ہے۔ انسان کا جسم اور لباس بھی پاک ہو اور اس کی روح اور عقیدہ بھی پاک ہو۔ طہارت کے خلاف ہر چیز نجاست ہے۔ خواہ وہ ظاہری نجاست ہو یا اعتقاد، اخلاق اور عمل کی نجاست ہو۔ انسان کو ہر حالت میں ظاہری باطنی طہارت کا خیال رکھنا چاہیے۔ اور کفر، شرک، نفاق اور بد عقیدگی سے بچنا چاہیے کہ طہارت کا یہی تقاضا ہے۔

فرماتے ہیں کہ دوسری ضروری خصلت اخبات یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرنا ہے۔ انسان کو غرور و تکبر سے بچنا چاہیے کیونکہ یہ بہت بری خصلت ہے۔ اس کی بجائے انسان کو عجز و انکساری کا پیکر ہونا چاہیے۔ تیسری چیز سماحت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کی خسیس چیزوں سے بچ جائے اور اچھی باتوں کو اختیار کرے۔ اسی

کا دوسرا نام تقویٰ ہے۔ تمام امم میں چوتھی مشترک چیز عدالت ہے۔ انسان کو اپنے بیگانے ہر ایک کے حق میں انصاف کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔ اللہ کا فرمان ہے کہ عدل کرو کیونکہ یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے عدل کے بالمقابل ظلم و جور ہے جو کسی صورت میں بھی قابلِ قبول نہیں۔

صحت عبادت کے لیے لازمہ

عبادت ایک عام چیز ہے جسے دہریوں کے سوا تمام اہل مذاہب ادا کرتے ہیں۔ یہود، نصاریٰ، ہنود، مشرک، مجوسی اور بدھ مت والے سارے ہی اپنے اپنے طریقہ پر خدا کی عبادت کرتے ہیں، مگر صحیح عبادت کے لیے خدا تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کی صحیح پہچان ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر عبادت کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ صحت عبادت کے لیے خدا تعالیٰ کی تنزیہہ کا اقرار بھی ضروری ہے، یعنی انسان اس اعتقاد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے کہ وہ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے اور تمام خوبیوں کا مالک ہے، انسان کے قلب و ذہن میں یہ بات بھی راسخ ہونی چاہیئے کہ وہ جس ذات کی عبادت کر رہا ہے اُسے تمام اسباب پر کنٹرول حاصل ہے۔ وہ نافع اور ضار ہے، قادر مطلق اور علیم کل ہے۔ بہر حال اس عقیدے کے تحت جو انتہائی درجے کی تعظیم ہو گی وہی صحیح عبادت ہو گی۔ خواہ وہ قیام کی صورت میں ہو، رکوع یا سجدہ ہو یا نذر و نیاز کی صورت میں ہو، غرضیکہ عبادت کی مختلف شکلیں ہیں اور یہ اُس وقت تک ٹھکانے نہیں لگ سکتی جب تک خدا تعالیٰ کی صحیح پہچان نہ ہو۔

مسئلہ عبادت کا فائدہ

اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا تاکیداً حکم دیا ہے۔ کیا خدا کی عبادت بجا لانے میں اس کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے؟ فرمایا مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ میں اپنی عبادت کروا کے اپنے بندوں سے کوئی روزی تو طلب نہیں کرتا۔ دنیا کا یہ دستور تو ہے کہ آقا اپنے غلام یا نوکروں کی کمائی کھاتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ تو ان چیزوں سے پاک ہے اسی لیے اُس نے تاکیداً واضح کر دیا ہے وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ میں نہیں چاہتا کہ یہ لوگ مجھے کھلائیں۔ اللہ تعالیٰ تو کھانے پینے سے پاک ہے، وہ تو خود اپنی مخلوق کو روزی پہنچاتا ہے، اُس کو رزق کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے! فرمایا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ

ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ بیشک روزی رساں تو وہی ہے ۔ وہ تو خود ساری مخلوق کا رازق ہے اور مضبوط طاقت کا مالک ہے ۔ اللہ تعالیٰ کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے ۔ اُسے نہ کسی کی عبادت کی ضرورت ہے ، نہ خدمت کی بلکہ عبادت کرنے میں خود بندے کا اپنا ہی فائدہ ہے ۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ جب تک انسان اور جن صحیح طریقے پر خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے رہیں گے ان کا ملکی مزاج درست رہے گا اور وہ ترقی کی منازل طے کرتے چلے جائیں گے ۔ حتیٰ کہ اللہ کا حکم ہوگا فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ (الفجر - ۲۹) میرے بندوں میں یعنی حظیرۃ القدس میں داخل ہو جاؤ ۔ مطلب یہ کہ عبادت کرنے میں خود انسان ہی کا فائدہ ہے ۔ شاہ صاحبؒ وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مزاج کی درستگی کا مطلب یہ ہے کہ جو خوراک اللہ نے کسی جاندار کے لیے فطری طور پر مقدر کی ہے ، اُسے استعمال کر کے اُس کا مزاج درست رہے گا ۔ اور اگر وہ غیر فطری خوراک کھانے لگے تو اس کا مزاج بگڑ جائے گا ۔ اونٹ ، گائے ، بھیڑ ، بکری وغیرہ جب تک گھاس سبزہ وغیرہ کھاتے رہیں گے ان کا مزاج صحیح رہے گا ۔ اور اگر یہ گوشت کھانا شروع کر دیں تو مزاج خراب ہو جائے گا ۔ اسی طرح اگر گوشت خور درندے گھاس کھانے لگیں تو اُن کا مزاج بگڑ جائے گا ۔ اس کلیہ کے مطابق جب تک جن اور انسان خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے رہیں گے ، اُن میں پاکیزہ اخلاق پیدا ہوں گے اور وہ ترقی کی منازل طے کرتے چلے جائیں گے ۔ برخلاف اس کے اگر وہ عبادت الٰہی کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے تو تنزل کے گڑھے میں جا گریں گے ۔ بہر حال عبادت کرنے کا فائدہ خود انسان کو ہے ۔

ترمذی اور ابن ماجہ شریف کی روایت میں حضور علیہ السلام کا یہ فرمان موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو خطاب کر کے فرماتے ہیں يَا ابْنَ اٰدَمَ تَفَرَّغْ لِعِبَادَتِيْ أَمْلَأْ صَدْرَكَ بِالْغِنٰى وَإِلَّا تَفْعَلْ أَمْلَأْ صَدْرَكَ شُغْلًا اے آدم کے بیٹے اپنے آپ کو میری عبادت کے لیے فارغ کر دے تو میں تیرے سینے کو

غنیٰ سے بھر دوں گا اور اگر ایسا نہیں کرو گے تو تمہارے سینے بیہودہ چیزوں سے بھر دوں گا
اور تمہارا فقر بھی دُور نہیں ہو گا۔

رزق کی ذمہ داری

امام احمدؒ نے اپنی مسند میں دو صحابہ حبّاؓ اور سوّاؓ کا ذکر کیا ہے۔ یہ دونوں حضرات
جب حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس وقت آپ اپنے ہاتھ سے کسی
چیز کو ٹھیک کر رہے تھے مگر وہ درست ہونے میں نہیں آ رہی تھی اور اس کے لیے
آپ کافی مشقت برداشت کر رہے تھے۔ حضور علیہ السلام اس کام سے فارغ ہو کر
ہماری طرف متوجہ ہوئے، ہمارے لیے دُعا فرمائی اور ساتھ یہ بھی فرمایا لَا تَايْئَسَا
مِنْ رِّزْقِ اللّٰہِ تم دونوں اللہ تعالیٰ کی روزی سے کبھی ناامید نہ ہونا کیونکہ رزق کا
سلسلہ اللہ نے اپنے تصرف میں رکھا ہے اور اس کو کسی مخلوق کے سپرد نہیں کیا فرمایا
اِنَّ الْاِنْسَانَ تَلِدُ اُمُّہٗ اَحْمَرَ انسان کی ماں اُسے سُرخ لوتھڑے کی شکل
میں جنم دیتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اُس کو روزی بہم پہنچاتا ہے اور اس کی تمام ضروریات
پوری کرتا ہے، لہٰذا رزق سے کبھی مایوس نہ ہونا، خدا کی عبادت کرتے رہنا اور اسی
کی ذات پر بھروسہ رکھنا۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اس زمانے میں حکومتوں نے اپنے آپ کو
رزاق کا درجہ دے دیا ہے۔ سرکاری سطح پر ہمیشہ پراپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ وسائل
رزق کی کمی کے پیش نظر آبادی کو بڑھنے سے روکو۔ خود تو صاحبانِ اقتدار حکومتی
خزانے سے عیش و عشرت کر رہے ہوتے ہیں اور دوسروں کے سامنے وسائل کی کمی
کا رونا رو کر انہیں آبادی میں اضافے سے روکتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو شرائع الٰہیہ کو
بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کا منشا تو یہ ہے کہ جائز ذرائع سے مال
حاصل کرو، اور صحیح طریقے پر تقسیم کرو، مگر یہاں تو نہ حصول صحیح ہے اور نہ اخراجات
مناسب ہیں، ہر جگہ افراط و تفریط کا دور دورہ ہے، بھلا ایسے میں دنیا کی معاشی
اور معاشرتی حالت کیسے سدھر سکتی ہے؟ حضور علیہ السلام کا یہ بھی فرمان ہے اَجْمِلُوْا
فِی الطَّلَبِ اچھے طریقے سے کماؤ، جائز پیشہ اختیار کرو اور ناجائز ذرائع سے

کوئی چیز حاصل نہ کرو۔ اگر تمھاری آمدنی جائز ہوگی تو تمھارے اخراجات بھی درست ہوں گے۔ اگر کمائی حرام ہے تو پھر "مال حرام بود بجائے حرام رفت" والا معاملہ ہی ہوگا۔

امام ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ پہلی آسمانی کتابوں میں یہ چیز لکھی ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خطاب کر کے فرمایا "یَا ابْنَ آدَمَ خَلَقْتُکَ لِعِبَادَتِیْ فَلَا تَلْعَبْ" اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ لہٰذا محض کھیل کود میں ہی مشغول نہ ہو جانا۔ تم اپنے مقصد کو پہچانو، تمھاری روزی کا کفیل میں ہوں اور کسی نہ کسی طریقے سے تمھیں ضرور روزی پہنچاؤں گا۔ زیادہ سے زیادہ کمانے کے لیے اپنے آپ کو مشقت میں نہ ڈالو۔ فرمایا اگر مجھے تلاش کرو گے تو پالو گے۔ میری عبادت کرو گے تو میری خوشنودی حاصل ہوگی، اور اگر میری مخلوق کی خدمت کرو گے تو میری رضا کو پالو گے۔ اگر تم نے مجھے پالیا تو گویا ہر چیز کو پالیا۔ اور اگر مجھے نہ پا سکے تو تمھارے ہاتھ سے ہر چیز نکل گئی۔ پھر تم ایسی حالت میں ہو گے کہ تمھارے نزدیک میری ہستی سب سے زیادہ اچھی ہوگی لیکن تمھیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

عبادت سے اعراض کیوں

اللہ نے تو جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے مگر اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے منشا کے مطابق یہ مخلوق اس کی عبادت کیوں نہیں کرتی؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حکم دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک حکم تکوینی ہے جس کے سامنے ساری مخلوق مجبور ہے اور اُسے تسلیم کرتی ہے۔ چاند، سورج، ارض و سما، شجر و حجر سب اللہ کے حکم تکوینی کے پابند ہیں اور ہر حالت میں اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اللہ کی مقرر کردہ ڈیوٹی سے سرمو بھی انحراف نہیں کرتا، بلکہ ہر کوئی اپنے اپنے کام پر لگا ہوا ہے۔ حکم کی دوسری قسم تشریعی ہے۔ اس حکم کی تعمیل مخلوق اپنی نیت اور ارادے سے کرتی ہے، مثلاً ایمان لانا، عبادت کرنا، حلت و حرمت کا خیال رکھنا وغیرہ تشریعی احکام ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے کسی کو مجبور نہیں کیا۔ اگر حکم کی تعمیل کرے گا تو انعام پائے گا، وگرنہ سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا جنوں اور انسانوں کے لیے تشریعی حکم ہے، لہٰذا

بعض اُن میں سے اس حکم کی تعمیل کرتے ہیں جب کہ اکثر اس سے اعراض ہی کرتے ہیں۔
بعض فرماتے ہیں لِیَعْبُدُوْنِ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تمام جنوں اور
انسانوں میں عبادت کرنے کی صلاحیت رکھ دی ہے، اب یہ اُن کی مرضی ہے کہ
وہ اس صلاحیت سے فائدہ اٹھا کر نفع کا سودا کرتے ہیں۔ یا اس صلاحیت کو
ضائع کر کے خسارے میں پڑ جاتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا فرمان بھی ہے کُلُّ مَوْلُوْدٍ
یُوْلَدُ عَلٰی فِطْرَۃٍ ہر نومولود اپنی فطرت سلیمہ پر ہی پیدا ہوتا ہے، مگر بعد میں ماحول
کے اثرات اُسے یہودی بنا دیتے ہیں یا نصرانی وہ مجوسیت کا شکار ہو جاتا ہے، یا
کفر و شرک میں پھنس جاتا ہے تاہم ہر جن و انس کی فطرت کا یہی تقاضا ہے کہ وہ
اپنے خالق و مالک کی عبادت بجا لائیں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی ہے فَاِنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا بے شک
اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے ظلم کیا۔ ظاہر ہے کہ ظلم میں سرفہرست، کفر، شرک
انکار قیامت، معاصی، حقوق اللہ اور حقوق العباد کا اتلاف، تعدی اور زیادتی وغیرہ
آتے ہیں مگر عقیدے کا ظلم ان سب سے بڑھا ہوا ہے۔ اللہ نے فرمایا اِنَّ الشِّرْکَ
لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (لقمٰن-١٣) بے شک سب سے بڑا ظلم اشراک باللہ ہے نیز فرمایا
وَالْکٰفِرُوْنَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (البقرہ-٢٥٤) کفر کرنے والے ہی ظالم ہیں
تو فرمایا جن لوگوں نے ظلم کا ارتکاب کیا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِھِمْ ان کے
ڈول اُن کے ساتھیوں کے ڈولوں کی طرح ہیں۔ جب کوئی ڈول پانی میں ڈالا جاتا ہے
اور وہ پانی سے بھر جاتا ہے تو پھر اوپر نہیں تیرتا بلکہ ڈوب جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ ان
کی طرح ان کے پرانے ساتھیوں کو بھی پورا پورا موقع دیا گیا مگر وہ کفر، شرک اور معاصی
سے باز نہ آئے جس کی وجہ سے اُن کے ڈول بھر گئے اور پھر ڈوب گئے۔ اب ان
کا بھی یہی حال ہے، معاصی کی وجہ سے ان کے ڈول بھی ڈوب رہے ہیں مگر یہ ٹس
سے مس ہونے کے لیے تیار نہیں، لہٰذا ان کا حشر بھی پہلے لوگوں سے مختلف نہیں
ہوگا۔ ان کو عطا کی گئی مہلت قریب الاختتام ہے، جس کے بعد یہ ہمیشہ کے لیے

ناکام ہو جائیں گے۔ فرمایا فَلَا يَسْتَعْجِلُونِ اب یہ جلدی نہ کریں کہ قیامت اور عذاب جلدی آجائے بلکہ یہ وقت عنقریب پورا ہونے والا ہے۔ جب ان کو ان کے کیے کا بدلہ مل جائے گا۔

کفار کے لیے بربادی

سورۃ کی ابتداء اللہ نے ہواؤں کے ذکر سے کی تھی کہ اس نے کس طرح بعض اقوام کو ہواؤں کے ذریعے ہلاک کیا اور ساتھ ساتھ یاد دلایا وَإِنَّ الدِّينَ لَوَاقِعٌ (آیت ۶) کہ بدلے کا دن لازماً واقع ہونے والا ہے۔ اب آخر میں وہی بات دہرائی جا رہی ہے فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِن يَوْمِهِمُ الَّذِي يُوعَدُونَ پس تباہی ہے کفر کرنے والوں کے لیے اس دن سے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ان کو آخرت کے دن سے ڈرایا جاتا تھا کہ اس کے لیے تیاری کر لو، کفر، شرک اور معاصی کو ترک کر کے اللہ کی وحدانیت پر ایمان لے آؤ۔ مگر وہ جزائے عمل کی بات کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم نے آج تک کسی کو دوبارہ زندہ ہوتے نہیں دیکھا بھلا ہم وقوع قیامت اور جزائے عمل کو کیسے تسلیم کر لیں۔ اللہ نے فرمایا کہ ان لوگوں کے انکار کی وجہ سے وعدے کے اس دن ان کے لیے تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

سُوْرَةُ الطُّوْرِ
(مکیۃ)

سُوْرَةُ الطُّوْرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعٌ وَّاَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۃ طور مکی ہے ، اور یہ انچاس آیتیں اور دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے

وَالطُّوْرِ ۝۱ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝۲ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۝۳ وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ۝۴ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۝۵ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۝۶ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝۷ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝۸ يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۝۹ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۝۱۰ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۱۱ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ۝۱۲ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ۝۱۳ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۝۱۴ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۝۱۵ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۶

ترجمہ :۔ قسم ہے طور کی ۝۱ اور قسم ہے لکھی ہوئی

کتاب کی ② کشادہ ورق میں ③ اور قسم ہے آباد گھر کی ④ اور قسم ہے بلند چھت کی ⑤ اور قسم ہے گرم کیے ہوئے دریا کی ⑥ بیشک تیرے پروردگار کا عذاب البتہ ضرور واقع ہونے والا ہے ⑦ نہیں اُس کو کوئی ہٹانے والا ⑧ جس دن کپکپائے گا آسمان زور سے کپکپانا ⑨ اور چلیں گے پہاڑ چلنا ⑩ پس ہلاکت ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے ⑪ وہ جو غلط باتوں میں کھیل رہے ہیں ⑫ جس دن ان کو دھکیلا جائیگا جہنم کی آگ کی طرف دھکیلا جانا ⑬ (اور کہا جائے گا) یہ ہے وہ آگ، جس کو تم جھٹلاتے تھے ⑭ پس کیا یہ جادو ہے یا تم دیکھتے نہیں ⑮ داخل ہو جاؤ اس میں۔ صبر کرو یا نہ صبر کرو، برابر ہے تم پر۔ بیشک تم کو بدلہ دیا جائے گا اُس کام کا جو کچھ تم کیا کرتے تھے ⑯

نام اور کوائف

اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ الطور ہے، جو کہ اس کے پہلے لفظ سے ماخوذ ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں سورۃ السجدۃ کے بعد نازل ہوئی۔ مکی سورتوں کا یہ سلسلہ سورۃ الواقعہ تک چلے گا۔ اس سورۃ کی انچاس آیتیں اور دو رکوع ہیں، اور یہ سورۃ مبارکہ ۳۱۲ الفاظ اور ۱۵۰۰ حروف پر مشتمل ہے۔

مضامین سورۃ

گذشتہ سورۃ کی طرح اس سورۃ میں بھی زیادہ تر جزائے عمل ہی کا ذکر ہے، البتہ پہلی سورۃ کی نسبت اس سورۃ میں کچھ زیادہ تفصیلات آگئی ہیں۔ پچھلی سورۃ میں جواب قسم تھا اِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ یعنی جزائے عمل ضرور واقع ہونے والی ہے، اور اس سورۃ میں مختلف چیزوں کی قسم اٹھانے کے بعد فرمایا ہے اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ بے شک تیرے پروردگار کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے۔ جسے کوئی

چیز ٹال نہیں سکتی ۔

دیگر مکی سورتوں کی طرح اس سورۃ مبارکہ میں بھی زیادہ تر اسلام کے بنیادی عقائد ہی کا ذکر ہے۔ قرآن کے وحی الٰہی ہونے، توحید و رسالت کی گواہی، قیامت اور جزائے اعمال کا وقوع اس سورۃ کے مضامین میں شامل ہیں۔ انذار و تبشیر کا پہلو بھی نمایاں ہے عذاب کی بعض تفصیلات اور اہل ایمان کو ملنے والے انعامات کا ذکر ہے۔ مشرکین کی طرف سے انکار قیامت سے متعلق بعض ممکنہ وجوہات کا تذکرہ کر کے ان کو جزائے عمل پر ایمان لانے کی ترغیب دی گئی ہے ۔

قسم کھائیں
(۱) طور

سورۃ کا آغاز مختلف قسموں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے والطور کی قسم ہے طور کی عربی زبان میں طور سرسبز پہاڑ کو کہا جاتا ہے۔ تاہم یہاں پر طور پر ال لاکر اس کو خاص بنا دیا گیا ہے اور اس سے مراد وہ سرسبز پہاڑ ہے جو سرزمین مدین میں ہے اور جس پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا تھا اور تورات عطا فرمائی تھی۔ یہ بڑا متبرک پہاڑ ہے جس پر اللہ نے اپنی تجلی ڈالی تھی۔ اللہ نے اس پہاڑ کی قسم اٹھا کر مجرمین کے لیے عذاب واقع ہونے کی تصدیق فرمائی ہے سورۃ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى (آیت۔ ۱۵) قیامت یقیناً آنے والی ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ اس کے وقت کو پوشیدہ رکھوں تاکہ ہر شخص کو اس کی کوشش کا بدلہ مل سکے۔ ظاہر ہے کہ اس دنیا میں کی گئی ہر کوشش، محنت اور عمل و اعتقاد کا نتیجہ قیامت کو ہی ظاہر ہوگا۔ اللہ نے اس بات کو نہ صرف قرآن میں بار بار دہرایا ہے بلکہ تورات میں لکھا ہے کہ قیامت اور جزائے عمل کا واقع ہونا یقینی امر ہے ۔

الطور کے ذکر کے ساتھ اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ مجرموں کو دنیا میں ہی سزا میں مبتلا کر دیتا ہے۔ بنی اسرائیل نے خود موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا تھا کہ ان کو کوئی ایسی کتاب ملنی چاہیئے۔ جس کے مطابق وہ اپنی زندگیاں گذار سکیں۔ موسیٰ علیہ السلام قوم کا یہ مطالبہ لے کر طور پر گئے

چالیس دن کا اعتکاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے تورات جیسی عظیم الشان کتاب عطا فرمائی۔ مگر جب آپ اسے لا کر قوم کے سامنے پیش کیا، تو لوگ اس سے انکاری ہو گئے۔ اللہ نے انکی اس بدتمیزی کا سخت نوٹس لیا اور فرمایا وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ (البقرہ۔۹۳) ہم نے تمہیں ڈرانے کے لیے کوہ طور اٹھا کر تمہارے سر پر کھڑا کر دیا، اور حکم دیا کہ ہماری عطا کردہ کتاب کو مضبوطی سے پکڑ لو، اور اس کو سنو، مگر تمہارے آباؤ اجداد نے کہا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ہم نے سن لیا مگر مانیں گے نہیں۔ پھر جب انہوں نے کوہ طور کو اپنے سروں پر معلق دیکھا تو ڈر گئے۔ اپنی غلطی کا اعتراف کیا، توبہ کی اور کتاب پر عمل کرنے کا پختہ عہد کیا۔ بہر حال طور کی تاریخ میں سزا کا عنصر بھی موجود ہے۔ سرسید جیسے بعض لوگوں نے بنی اسرائیل کے سروں پر کوہ طور کے معلق ہونے کا انکار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فی الواقعہ طور پہاڑ کو اکھاڑ کر نہیں لٹکایا گیا تھا بلکہ بنی اسرائیل کو پہاڑ کے دامن میں لا کر کھڑا کر دیا گیا جسے وَرَفَعْنَا کا نام دیا گیا ہے یعنی ہم نے تمہارے اوپر طور کو بلند کر دیا۔ یہ نظریہ درست نہیں ہے۔ سورۃ الاعراف میں وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ (آیت۔۱۷۱) کے الفاظ ہیں یعنی ہم نے ان کے اوپر پہاڑ کو اکھاڑ کر رکھ دیا تھا۔

(۲) کتاب مسطور

اللہ نے دوسری قسم کے طور پر فرمایا وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ اور قسم ہے لکھی ہوئی کتاب کی۔ اس کتاب سے تورات بھی مراد ہو سکتی ہے، قرآن بھی اور لوح محفوظ بھی۔ قرآن پاک اور تورات دونوں آسمانی کتابوں میں جزائے عمل کے مسئلہ کو کھول کر بیان کر دیا گیا ہے اور لوح محفوظ میں تو بہر حال ہر چیز اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔ تو فرمایا اس لکھی ہوئی کتاب کی قسم فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ جو کہ کشادہ ورق میں ہے۔ رق دراصل جھلی کو کہتے ہیں۔ آج کل تو کاغذ کی صنعت بہت ترقی کر گئی ہے، پرانے زمانے میں کتابیں، پتھروں، پتوں، چمڑے یا جھلی پر ہی لکھی جاتی تھیں۔ کتاب تورات اللہ نے سلوں پر لکھی لکھائی نازل فرمائی تھی۔ جب کہ قرآن پاک، پتھروں، ہڈیوں اور چمڑے وغیرہ پر لکھا جاتا تھا، نزول قرآن کے زمانے میں یمن اور شام میں دستی طور پر کاغذ

تیار ہونے لگا تھا مگر اس کی فراوانی بہت بعد میں جا کر ہوئی۔

(۳) بیت المعمور

فرمایا وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ اور قسم ہے آباد گھر کی۔ آباد گھر سے مراد بیت اللہ شریف بھی ہو سکتا ہے اور بیت المقدس بھی۔ یہ دونوں ارضی گھر ہیں اور لوگوں کی آمد و رفت کی وجہ سے ہر وقت آباد رہتے ہیں۔ البتہ بیت المعمور ساتویں آسمان پر فرشتوں کا قبلہ ہے۔ جس کا فرشتے طواف کرتے ہیں۔ ہر فرشتے کو طواف کا ایک ہی موقع ملتا ہے، دوبارہ نہیں۔ بیت المعمور بیت اللہ کی سیدھ میں بالکل اوپر ہے۔ معراج والی حدیث میں اس کا بھی ذکر ملتا ہے کہ جب حضور علیہ السلام سدرۃ المنتہیٰ کے مقام پر پہنچے تو وہاں بیت المعمور بھی دیکھا۔ یہاں یہ نقطہ بھی غور طلب ہے کہ جب فرشتوں جیسی پاک مخلوق بھی خدا کی عبادت کی پابند ہے تو انسانوں کو تو بطریق اولیٰ اس کا اہتمام کرنا چاہیئے اور جزائے عمل کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

بیت المعمور سے مراد خانہ کعبہ ہو، بیت المقدس ہو یا خود بیت المعمور ہو، جزائے عمل کا مسئلہ سب سے واضح ہوتا ہے۔ خانہ کعبہ اور بیت المقدس میں لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے جمع ہوتے ہیں تاکہ وہ اپنے پروردگار کو راضی کر لیں اور ان کے لیے جزائے عمل کے وقت آسانی پیدا ہو جائے۔ کعبۃ اللہ کی تاریخ کے ساتھ مجرموں کی سزا کا پہلو بھی وابستہ ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ (الفیل-۱) کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ ابرہہ یمن سے ہاتھیوں کا لشکر لے کر خانہ کعبہ کو گرانے کے لیے آیا تھا مگر اللہ نے چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ذریعے اس کے لشکر میں تباہی مچا دی۔ اس طرح گویا ان کو دنیا میں ہی فعلِ بد کی سزا مل گئی۔

(۴) سقفِ مرفوع

فرمایا وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ اور قسم ہے بلند چھت کی۔ بلند چھت سے آسمان بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔ البتہ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے بیت المقدس کی چھت مراد ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلند کی تھی۔ جہاں تک آسمان کی بلندی کا تعلق ہے تو یہ بھی درست ہے کیونکہ ہر چیز کا حکم تو آسمانوں کی طرف سے

ہی آتا ہے اور پھر اُس حکم کی تعمیل یا عدم تعمیل سے جزائے عمل کا پہلو نکلتا ہے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا نزول بھی آسمان کی طرف سے ہوتا ہے اور عذاب الٰہی بھی اُدھر ہی سے آتا ہے۔ قوم لوط، قوم شعیب، قوم عاد اور قوم ثمود پر اللہ نے اُوپر ہی سے عذاب مسلط کیا۔ اگرچہ اس کا تعلق فضا سے بھی ہے تاہم اس کا زیادہ تر تعلق اُوپر ہی سے ہے۔

(۵) بحر مسجور

پھر فرمایا وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ اور قسم ہے گرم کیے ہوئے دریا کی۔ جب قیامت برپا ہوگی تو سخت حرارت کی وجہ سے سمندروں اور دریاؤں کا پانی بھاپ بن کر اُڑ جائیگا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بحر مسجور کا معنی رُکا ہوا پانی کرتے ہیں۔ اس سے مجرموں کو سزا دینے کی طرف اشارہ ہے جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر بحر قلزم کے کنارے پہنچے تو اللہ نے پانی کو روک کر درمیان میں بارہ راستے بنا دیے تھے جن پر چل کر بنی اسرائیل سمندر سے پار چلے گئے۔ پھر جب انہی راستوں پر فرعونی لشکر نے گزرنے کی کوشش کی تو اللہ نے پانی کو چلا دیا اور اس طرح سارے فرعونی پانی میں غرق ہو گئے قوم نوح کو بھی اللہ نے پانی میں غرق کیا۔ بہرحال بحر مسجور سے نافرمانوں کی سزا یابی کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے۔

وقوع عذاب

ان پانچ چیزوں کی قسم کھانے یعنی ان کو گواہ بنانے کے بعد اللہ نے فرمایا اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ بیشک تیرے پروردگار کا عذاب واقع ہونے والا ہے، اور یہ ایسا عذاب ہوگا مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ کہ اسے روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ مطلب یہ کہ جزائے عمل ضرور واقع ہوگی اور اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ٹھہر سکے گی۔

فرمایا یہ عذاب اُس دن واقع ہوگا يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا جس دن کہ آسمان لرز جائے گا لرزنا۔ قیامت والے دن زمین کے علاوہ آسمان بھی ٹوٹ پھوٹ جائے گا جیسے فرمایا وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا (النبا - ۱۹) آسمان کو کھول دیا جائے گا۔ تو اس میں دروازے دروازے ہو جائیں گے وَتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا اور پہاڑ چلنے لگیں گے حتیٰ کہ فرمایا وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ

الْمَنْفُوْشِ (القارعۃ - ۵) پہاڑ دھنی ہوئی رنگین اون کی طرح منتشر ہو جائیں گے۔
یہ جزائے عمل کا دن ہوگا۔ اسی لیے فرمایا فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ اس
دن جھٹلانے والوں کے لیے تباہی اور بربادی ہے یہ ان مجرموں کا ذکر ہو رہا ہے
جنھوں نے دنیا میں توحید کو تسلیم نہ کیا، رسالت اور جزائے عمل کا انکار کر دیا، قرآن کو
وحی الٰہی نہ مانا، لہٰذا یہ ان کی ہلاکت کا دن ہوگا۔ یہ وہ لوگ ہیں اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ
خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ جو غلط باتوں میں ہی کھیل رہے ہیں، ساری زندگی کھیل کود
میں گزار دی اور آخرت کی کچھ فکر نہ کی بلکہ بعث بعد الموت اور جزائے عمل کو قصے
کہانیاں کہہ کر رد کرتے رہے۔

فرمایا يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا جس دن کہ یہ
دھکیلے جائیں گے جہنم کی آگ کی طرف دھکیلا جانا۔ اور ان سے کہا جائے گا۔ هٰذِهِ
النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ یہی وہ آگ ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے
تھے آج اس کی ذلت کو برداشت کرو۔ نیز ان سے یہ بھی کہا جائے گا کہ تم دنیا
کی زندگی میں اللہ کے نبیوں کو جادوگر کہتے تھے اور معجزات کو جادو سے تعبیر کرتے
تھے۔ اسی بنا پر ان کا انکار کر دیتے تھے۔ اب بتلاؤ اَفَسِحْرٌ هٰذَا کیا یہ جادو ہے
اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ یا تمھیں نظر ہی نہیں آ رہا ہے۔ بتلاؤ یہ وقوع قیامت
اور جزائے عمل برحق ہے یا نہیں؟ آج تمھیں یہ سب کچھ نظر آ رہا ہے یا نہیں؟
اللہ فرمائے گا اِصْلَوْهَا اب اس دوزخ میں داخل ہو جاؤ۔ اس کے
بغیر چارہ نہیں فَاصْبِرُوْا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا اب اس عذاب پر صبر کرو یا بے صبری
کا مظاہرہ کرو۔ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ تمہارے لیے برابر ہے تمہیں ہر حالت
میں اس سزا کا مزہ چکھنا ہے۔ تم اس سے بچ نہیں سکتے۔ تمھارے ساتھ یہ کوئی
زیادتی کا سلوک نہیں ہو رہا ہے بلکہ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔
یہ تمھیں انہی چیزوں کا بدلہ دیا جا رہا ہے جو کچھ تم دنیا میں عمل کرتے رہے۔ یہ تمھاری اپنی ہی
کمائی ہے، اس کا بھگتان کرو۔

اللہ تعالیٰ نے جزائے عمل کا مسئلہ سمجھایا ہے۔ یہاں تک انذار کا پہلو غالب تھا تاکہ لوگ ڈر جائیں اور اس عذاب سے بچ جائیں۔ اگلی آیات میں تبشیر کا ذکر آرہا ہے جسے تفصیل کے ساتھ بیان فرمادیا گیا ہے۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَعِيمٍ ﴿١٧﴾ فَاكِهِينَ بِمَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ وَوَقَاهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ﴿١٨﴾ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٩﴾ مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ سُرُرٍ مَصْفُوفَةٍ ۖ وَزَوَّجْنَاهُمْ بِحُورٍ عِينٍ ﴿٢٠﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ ۚ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ ﴿٢١﴾ وَأَمْدَدْنَاهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَلَحْمٍ مِمَّا يَشْتَهُونَ ﴿٢٢﴾ يَتَنَازَعُونَ فِيهَا كَأْسًا لَا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ ﴿٢٣﴾ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَكْنُونٌ ﴿٢٤﴾ وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿٢٥﴾ قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ ﴿٢٦﴾ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا وَوَقَانَا عَذَابَ السَّمُومِ ﴿٢٧﴾ إِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوهُ ۖ إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ ﴿٢٨﴾

ع ۴۸ / ۳

ترجمہ: بے شک متقی لوگ باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے (۱۷)

خوش ہونیوالے ہونگے اس چیز کے ساتھ جو دی اُن کو اُن
کے پروردگار نے اور بچایا ان کو اُن کے پروردگار نے دوزخ کے عذاب
سے (۱۸) (اُن سے کہا جائے گا) کھاؤ اور پیو خوشگوار اُس
کے بدلے میں جو کام تم کیا کرتے تھے (۱۹) وہ تکیہ
لگائے ہوئے ہوں گے صف بہ صف بچھائے ہوئے
تختوں پر، اور ہم بیاہ دیں گے اُن کے ساتھ بڑی
بڑی آنکھوں والی خوبصورت عورتیں (۲۰) اور وہ لوگ جو ایمان
لائے اور اُن کی پیروی کی اُن کی اولادوں نے ایمان
کے ساتھ ملا دیں گے ہم ان کے ساتھ اُن کی اولادوں
کو، اور نہیں کریں گے ہم ان کے لیے اُن کے
اعمال میں سے کچھ کم۔ ہر آدمی پھنسا ہوا ہے اپنی کمائی
میں (۲۱) اور ہم مدد پہنچائیں گے اُن کو پھلوں اور گوشت
سے جو وہ چاہیں گے (۲۲) وہ ایک دوسرے کو دیں
گے اُس میں سے پیالہ جس میں نہ لغو ہو گا اور نہ کوئی
گناہ (۲۳) اور پھریں گے اُن کے سامنے بچے گویا کہ وہ
غلاف میں محفوظ موتی ہیں (۲۴) اور متوجہ ہوں گے اُن
میں سے بعض بعض کیطرف، ایک دوسرے سے پوچھیں گے (۲۵) کہیں گے بیشک
تھے ہم اس سے پہلے اپنے گھروں میں ڈرنے والے (۲۶)
پس احسان کیا اللہ نے ہم پر، اور بچایا ہمیں لُو کے
عذاب سے (۲۷) بے شک ہم تھے اِس سے پہلے اُسی
کو پکارتے۔ بیشک وہ نیک سلوک کرنے والا اور بے حد
مہربان ہے (۲۸)

ربطِ آیات

گذشتہ درس میں اللہ نے چند چیزوں کی قسم اٹھا کر یعنی ان کو بطور شاہد پیش کر کے جزائے عمل کی بات سمجھائی۔ پھر مکذبین کا حال بیان فرمایا کہ وہ جزائے عمل والے دن سخت پریشانی کے عالم میں ہوں گے۔ اُن کو دھکیل کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا اور ساتھ یہ بھی کہا جائے گا کہ جس چیز کو تم سحر سے تعبیر کرتے تھے، بتلاؤ کیا یہ سحر ہے یا حقیقت؟ آج دیکھ لو قیامت برپا ہو کر جزائے عمل کی منزل آ چکی ہے، یہ وہی چیز ہے جس کو تم جھٹلاتے تھے، اور اللہ کی وحدانیت، رسول کی رسالت اور قرآن کریم کی حقانیت پر ایمان نہیں لاتے تھے۔ اب تمھیں صبر یا بے صبری کے ساتھ یہیں رہنا ہوگا، ایسے لوگوں کے لیے اُس دن تباہی و بربادی ہوگی۔

متقین کے لیے انعامات

مکذبین کو انذار کرنے کے بعد اب اللہ نے متقین کے لیے انعامات کا تذکرہ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ کا یہ دستور ہے کہ جہاں ترہیب کی بات کی جاتی ہے، وہاں ترغیب کا پہلو بھی اجاگر کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ بے شک متقی لوگ باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے۔ اتقا کا معنی بچنا ہوتا ہے یعنی انسان، کفر، شرک، نفاق اور بدعقیدگی سے بچ جائے، ظلم و جور کی بجائے عدل و انصاف پر کاربند ہو جائے تو وہ متقی کہلائے گا۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے متقین کی یہی تعریف کی ہے کہ ایسے اشخاص جو اولاً کفر، شرک اور نفاق سے بچتے ہیں اور پھر دوسرے نمبر پر معاصی سے بچتے ہیں، اور اعلیٰ درجے کے متقین کی صفت یہ ہے کہ وہ ایمان میں خلل ڈالنے والی معمولی معمولی باتوں سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ شریعت کی حدود کی حفاظت کرتے ہیں، خود کو دوسروں سے کمتر سمجھتے ہیں، غرور و تکبر سے پرہیز کرتے ہیں، اور عاجزی اختیار کرتے ہیں۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بنے۔ ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا کہ اُن کے لیے خدا تعالیٰ کے ہاں باغات ہوں گے، انہیں وہاں ہر قسم کا آرام اور راحت نصیب ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کے اس انعام پر وہ لوگ فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ

خوش ہوتے ملنے ہوں گے۔ اس چیز پر جو اللہ انہیں عطا کرے گا، یعنی جنت کے انعام و اکرام پاکر خوش ہو جائیں گے۔ فکاہت کا معنی خوش طبعی بھی ہوتا ہے، یعنی جنتی لوگ آپس میں دل لگی کی باتیں بھی کریں گے۔ اس کے علاوہ فاکہہ پھل کو بھی کہتے ہیں، گویا وہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ پھل کھائیں گے۔ اور وہ اس بات پر بھی خوش ہوں گے وَوَقٰهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ کہ اللہ نے اُن کو دوزخ کے عذاب سے بچا لیا ہے اور وہ کامیاب ہو گئے ہیں۔ جنت میں داخل کرنے کے بعد اُن سے کہا جائے گا كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ کھاؤ اور پیو خوشگوار اُن اعمال کے بدلے میں جو تم دنیا کی زندگی میں کیا کرتے تھے۔ جنت میں خورد و نوش کی ہر قسم کی نعمتیں میسر ہوں گی جو رنگ ذائقے اور بو میں ایک سے ایک بڑھ کر ہوں گی۔ اور پھر وہ خوشگوار بھی ہوں گی یعنی اُن کے کھانے سے کسی قسم کی تکلیف یا بدہضمی وغیرہ نہیں ہوگی، اور جنتی خوشگوار اور خوش و خرم زندگی گزاریں گے جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔ فرمایا اُن کے عیش و آرام کا یہ عالم ہوگا مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ وہ ایسے تختوں پر تکیہ لگا کر بیٹھیں گے جو قرینے کے ساتھ صف بہ صف بچھائے گئے ہوں گے، جنتی لوگ ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوں گے اور کسی ایک کی دوسرے کی طرف پشت نہیں ہوگی۔

حوروں سے نکاح

اس کے بعد ایک اور نعمت کا اللہ نے ذکر فرمایا ہے وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ اور ہم اُن کا گوری چٹی بڑی بڑی آنکھوں والی خوبصورت عورتوں سے نکاح کر دیں گے۔ عین کا معنی بڑی آنکھ والی ہوتا ہے اور حور سفیدی کا معنی دیتا ہے عام طور پر لوگ سفید رنگ والی عورت کو پسند کرتے ہیں، البتہ بعض گندمی رنگ بھی پسند کرتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے جنت میں ایک گندمی رنگ نوجوان عورت کو دیکھا۔ میں نے پوچھا کہ عرب کے لوگ تو عموماً گوری رنگ کی عورتوں کو پسند کرتے ہیں مگر یہ گندمی رنگ والی ہے۔ فرماتے ہیں کہ مجھے بتایا گیا کہ اللہ نے اس عورت کو حضرت جعفر طیارؓ کے لیے مخصوص فرمایا ہے جو حضرت علیؓ کے

بڑے بھائی تھے اور جنگ موتہ میں شہید ہوئے تھے۔ دورانِ جنگ آپ کے دونوں بازو کٹ گئے تھے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے اُن کو جنت میں فرشتوں کے ساتھ پرواز کرتے ہوئے دیکھا۔ اللہ نے آپ کو دو بازوؤں کی جگہ دو پر عنایت فرما دیے تھے۔ بہرحال اللہ نے اُن کے لیے یہ گندمی رنگ حور کو پیدا فرمایا ہے۔ ممکن ہے حضرت جعفرؓ اسی رنگ کو پسند کرتے ہوں، اور اللہ نے ویسے رنگ کی حور ہی مخصوص کر دی ہو۔ حوریں جنت کی مخلوق ہیں اور یہ اس دُنیا کی نوعِ انسانی کی عورتوں کے علاوہ ہوں گی، ان کا نکاح اہلِ جنت کے ساتھ ہوگا۔ سورۃ البقرہ میں بھی ان عورتوں کا ذکر ہے وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ اہلِ جنت کے لیے جنت میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ اُن کے اجسام اور اخلاق بالکل پاک ہوں گے اور وہ ظاہری اور باطنی ہر قسم کی نجاست سے پاک ہوں گی۔ کوئی جسمانی بیماری نہیں ہو گی، بول چال شائستہ اور نہایت با اخلاق اور شکر گزار ہوں گی۔

اس زمانے میں بعض لوگوں نے قرآنی اصطلاحات کو غلط معانی پہنانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً غلام احمد پرویز حُوْرٌ عِیْنٌ کا معنیٰ پاکیزہ فکر کرتا ہے اُس نے ایسا کر کے اس جنتی مخلوق کا انکار ہی کر دیا ہے۔ اُس نے اسنٰد کا معنیٰ قانون کیا ہے اور علماء سے مراد سائنسدان لیے ہیں۔ اسی طرح اہلِ زادونٹ) کا معنیٰ بادل کیا ہے۔ اس ضمن میں مودودی صاحب نے بھی غلطی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حورِ عین سے غیر مسلموں کی ایسی لڑکیاں ہیں جو ابھی سنِ بلوغت کو نہیں پہنچیں یہ بھی درست نہیں کیونکہ سلف میں سے کسی نے بھی یہ معنیٰ نہیں کیا۔ حقیقت بہرحال یہی ہے کہ حوریں جنت کی مخلوق ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کسی پاکیزہ مادے سے پیدا کرے گا اور یہ جنتیوں کو علیٰ قدر المراتب کم و بیش ملیں گی۔ اِن کے نکاح کا مطلب یہ نہیں جیسا کہ یہاں دنیا میں میاں بیوی ایجاب و قبول کرتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہر جنتی کے لیے اس کی بیوی مقرر فرما دے گا۔ کسی ایجاب و قبول کی ضرورت نہیں ہوگی۔

مومنوں کی اولاد

دنیا میں ہر شخص کو اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے اور وہ ہر وقت اس کی بہتری

چاہتا ہے ۔ یہ خواہش جنت میں جا کر بھی قائم رہے گی، چنانچہ اُن کی خوشنودی کی خاطر اللہ نے فرمایا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْھُمْ ذُرِّیَّتُھُمْ بِاِیْمَانٍ اور وہ لوگ جو ایمان لائے، اور اُن کی اولادوں نے ایمان کے ساتھ اُن کا اتباع کیا۔ اَلْحَقْنَا بِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ تو ہم اُن کی اولادوں کو بھی اہلِ ایمان کے ساتھ ملا دیں گے ۔ خواہ اولاد کا درجہ والدین سے کم ہی کیوں نہ ہو یہ ان کے لیے خصوصی رعایت ہوگی کہ اگر مومن اعلیٰ درجہ کا ہے اور اس کی اولاد کم درجہ میں ہے تو اس کو بھی اعلیٰ درجہ میں جگہ دے دی جائیگی تاکہ مومن کو ذہنی سکون حاصل ہو۔ مومنوں کی اولادوں کا مومنوں کے ساتھ ملنے کا یہی مطلب ہے ۔

یہ تو بالغ اولادوں کا مسئلہ بیان ہو گیا، البتہ نابالغ اولاد والدین ہی کے تابع شمار ہوتی ہے ۔ جو حکم والدین کے لیے ہوا وہی اولاد کے لیے ہوتا ہے ۔ ہاں اگر والدین میں ایک مومن اور دوسرا کافر ہو تو نابالغ بچے کا شمار مومن کے ساتھ ہوگا، دنیا میں بھی یہی دستور ہے خَیْرُ الْاَبَوَیْنِ دِیْنًا بچہ اس کے تابع ہوگا جس کا دین بہتر ہے ۔ اسی لیے فوت شدہ نابالغ بچوں کو کفن دیا جاتا ہے ۔ اور اُن کا جنازہ پڑھا جاتا ہے ۔ حالانکہ وہ غیر مکلف ہوتے ہیں ۔ مگر والدین کے اتباع کی بناء پر اُن کے ساتھ بھی والدین والا سلوک ہی کیا جاتا ہے ۔

فرمایا ہم ملا دیں گے مومنوں کی اولادوں کو اُن کے ساتھ وَمَآ اَلَتْنٰھُمْ مِّنْ عَمَلِھِمْ مِّنْ شَیْءٍ اور اُن مومنوں کے اعمال میں سے کوئی کمی نہیں کریں گے ۔ مطلب یہ کہ مومنوں کے اجر و ثواب میں سے کم کر کے اُن کے بچوں کو نہیں نوازا جائے گا۔ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت ہوگی کہ کم درجے والی اولاد کو بھی زیادہ دے کہ اُن کے والدین کے ساتھ شامل کر دیا جائے گا ۔

حضور علیہ السلام سے عرض کیا گیا کہ حضور! جنگ کے دوران ہمارا ارادہ تو کسی بالغ اور قابلِ جنگ کافر کو قتل کرنے کا ہوتا ہے مگر بعض اوقات ہماری تلوار کی زد میں آ کر عورت یا بچہ بلا ارادہ قتل ہو جاتا ہے، تو کیا اس کا وبال ہم پر ہوگا ؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا ھُمْ مِّنْ اٰبَآئِھِمْ اس حکم میں وہ

اپنے والدین کے تابع ہوں گے، یعنی دنیا میں ایسا بچہ تو کافر والدین کے تابع ہوگا مگر آخرت میں نہیں کیونکہ وہ تو گنہگار نہیں ہوتا۔ لہٰذا والدین کے کفر کی وجہ سے ان کے بچوں کو آخرت میں سزا نہیں ملے گی۔ دنیا میں والدین کے تابع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر بچے کے ذمے قصاص یا دیت لازم آئے تو اس کے ذمہ دار والدین ہوں گے۔ فرمایا كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ ہر شخص اپنے اعمال میں رہن رکھا ہوا ہے۔ وہ اپنے اعمال میں اس قدر پھنسا ہوا ہے کہ ان سے نکل نہیں سکے گا بلکہ ان کا بھگتان کرنا ہی پڑے گا۔

اہلِ جنت کا خورد و نوش

جنت والوں کے کھانے پینے کے انعامات کے متعلق فرمایا وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ اور ہم ان کو پھلوں کی مدد پہنچاتے رہیں گے۔ کسی پھل کے ختم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ دوسرے موسم تک انتظار کرنا پڑے، بلکہ ہر قسم کے پھل ہر وقت موجود رہیں گے۔ جونہی کوئی جنتی کسی درخت سے پھل اتار کر کھائے گا اس کی جگہ فوراً ہی دوسرا پھل آجائے گا۔ ان پھلوں کے علاوہ فرمایا وَلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ اور اہلِ جنت کو من پسند گوشت بھی مہیا کیا جائے گا۔ سورۃ واقعہ میں فرمایا وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ (آیت۔ ۲۱) ان کے لیے پرندوں کا گوشت ہوگا۔ جیسا کہ وہ چاہیں گے۔ ظاہر ہے کہ پرندوں کا گوشت زیادہ لذیذ اور پسندیدہ ہوتا ہے لہٰذا اس مقام پر پرندوں کے گوشت کا ذکر کیا ہے مطلب یہی ہے کہ یہ من پسند نعمت بھی اہلِ جنت کو میسر ہوگی۔

پھر فرمایا يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا اہلِ جنت، جنت میں ایک دوسرے کو پیالے پیش کریں گے، وہاں پر شرابِ طہور کے دور چلیں گے اور جنتی لوگ بخوشی ایک دوسرے کو پیش کریں گے۔ تنازعہ کا معنی چھینا جھپٹی اور دل لگی کرنا بھی آتا ہے۔ جنتی لوگ خوشی اور مسرت کا اظہار کریں گے۔ اور شراب کے یہ پیالے ایسے ہوں گے لَا لَغْوٌ فِيْهَا کہ ان میں کوئی بیہودہ چیز نہیں ہوگی جس سے طبیعت میں متلی پیدا ہو یا پیٹ میں کوئی تکلیف پیدا ہوجائے یا دردِ سر شروع ہو

جائے بلکہ یہ تو نہایت ہی خوشگوار جام ہوں گے جو ایک دوسرے کو پلائے جائیں گے وَلَا تَاْثِيْمٌ اور نہ ہی ان میں کوئی گناہ کی بات ہوگی۔ انسان دنیا میں شراب نوشی کر کے کئی دوسرے گناہوں میں بھی ملوث ہو جاتے ہیں۔ گالی گلوچ اور دنگا فساد تک نوبت پہنچتی ہے، بدکاری کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں مگر جنت کی شراب طہور ایسی تمام چیزوں سے پاک ہوگی اور اس کے نوش کرنے سے نہ کوئی جسمانی تکلیف ہوگی اور نہ آدمی کسی گناہ میں ملوث ہوگا۔

اہل جنت کے لیے غلمان

حوروں کے علاوہ اللہ نے اہل جنت کے لیے ایک اور نعمت کا ذکر بھی فرمایا ہے وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ اُن کے آس پاس چھوٹے بچے گھومیں پھریں گے جن سے اہل جنت کی خوشیوں میں دوچند اضافہ ہو جائے گا۔ یہ ایسے خوبصورت اور پیارے بچے ہوں گے كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ گویا کہ وہ غلاف میں محفوظ کیے ہوئے موتی ہوں۔ یہ ایسے صاف شفاف اور گرد و غبار سے پاک ہوں گے گویا کہ انہیں غلافوں میں بند کر کے رکھا گیا ہو۔ جس طرح حور جنت کی مخلوق ہے، اسی طرح غلمان بھی خالص جنتی مخلوق ہے جسے اللہ تعالیٰ اہل جنت کی خدمت کے لیے پیدا فرمائے گا۔

اعتراف حقیقت

آگے اللہ نے جنتیوں کے کچھ مزید حالات بیان فرمائے ہیں وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر پوچھیں گے قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ اور کہیں گے کہ اس سے پہلے ہم دنیا میں اپنے گھروں میں، اس بات سے ڈرتے تھے کہ پتہ نہیں آگے چل کر کیا معاملہ پیش آنے والا ہے، ہمیں ہر وقت آخرت کی فکر لگی رہتی تھی کہ وہاں ناکام نہ ہو جائیں۔ دراصل یہی فکر تھی جو اہل جنت کو جنت میں لانے کا سبب بنی۔ اسی فکر کی بنا پر وہ اپنے آپ کو معصیت اور نافرمانی سے بچاتے رہے، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہے حتیٰ کہ اللہ کی رحمت سے اس مقام تک پہنچ گئے۔ پھر کہیں گے فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا اللہ تعالیٰ نے ہم پر بڑا احسان فرمایا وَوَقٰىنَا عَذَابَ

السّمُومِ اور ہمیں لو کے عذاب سے بچا لیا۔ مطلب یہ کہ جنتی لوگ جنت میں پہنچ کر کسی اپنی کارکردگی پر فخر کرنے کی بجائے اللہ کا احسان مانیں گے کہ اس نے ہمیں عذاب سے بچا کر رحمت کے مقام میں پہنچا دیا۔

پھر کہیں گے اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ اس سے پہلے یعنی دنیا کی زندگی میں ہم اسی پروردگار کو پکارا کرتے تھے یعنی ہر مشکل میں اسی کی اعانت طلب کرتے تھے، اپنی حاجات اسی کے سامنے پیش کرتے تھے، اور اسی کی تسبیح و تحمید میں مصروف رہتے تھے۔ اپنی تمام مناجات اسی کے روبرو پیش کرتے تھے، اسی کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھتے تھے، لہٰذا اس نے ہم پر یہ بڑا ہی احسان فرمایا۔ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِیْمُ بے شک وہ بڑا نیک سلوک کرنے والا اور بے حد مہربان ہے۔ بَرٌّ اللہ کے اسمائے پاک میں سے ایک نام یہی ہے جو کہ برّ کے مادہ سے ہے جس کا معنی نیکی ہوتا ہے، وہ رحیم بھی ہے۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحیم کا مناسبہ آخرت میں ہوگا۔ جو خالص ایمانداروں کے لیے ہوگی، جب کہ اس کی صفت رحمان کا فیضان اہل ایمان اور اغیار سب کے لیے عام ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی کا فیض ہوگا کہ اہل جنت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آرام و راحت میسر آجائے گی۔

درس سوم ۳ آیت ۲۹ تا ۴۲

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ﴿۲۹﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴿۳۰﴾ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ﴿۳۱﴾ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿۳۲﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿۳۴﴾ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾ اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۳۹﴾ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۰﴾ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۱﴾ اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ۚ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ﴿۴۲﴾

ترجمہ :- پس آپ نصیحت کریں (اے پیغمبر) پس نہیں آپ اپنے رب کے فضل سے کاہن اور نہ دیوانے ﴿۲۹﴾

کیا کہتے ہیں یہ لوگ کہ یہ شاعر ہے ؟ ہم انتظار کرتے ہیں اس کے ساتھ زمانے کی گردش کا (۳۰) آپ کہہ دیجئے (اے پیغمبر!) تم انتظار کرو، بیشک میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں (۳۱) کیا ان کو ان کی عقلیں یہ حکم دیتی ہیں یا یہ لوگ سرکشی کرنے والے ہیں؟ (۳۲) کیا کہتے ہیں یہ کہ یہ شخص قرآن کو گھڑ لایا ہے! نہیں بلکہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے (۳۳) پس لائیں کوئی بات اس جیسی اگر یہ سچے ہیں (۳۴) کیا یہ پیدا کیے گئے ہیں بغیر کسی چیز کے ! یا یہ خود پیدا کرنے والے ہیں (۳۵) کیا انہوں نے پیدا کیا ہے آسمانوں کو اور زمین کو ؟ بلکہ یہ یقین نہیں رکھتے (۳۶) کیا ان کے پاس تیرے پروردگار کے خزانے ہیں ؟ یا یہ لوگ مسلط ہیں (۳۷) کیا ان کے لیے کوئی سیڑھی ہے کہ اس پر چڑھ کر سنتے ہیں ؟ پس لائے ان میں سے سننے والا کوئی کھلی سند (۳۸) کیا اُس (پروردگار) کے لیے بیٹیاں ہیں اور تمہارے لیے بیٹے ؟ (۳۹) یا آپ ان سے مانگتے ہیں کوئی بدلہ، پس وہ تاوان کی وجہ سے بوجھل ہو رہے ہیں (۴۰) کیا ان کے پاس کوئی غیب ہے ؟ پس وہ اس کو لکھتے ہیں (۴۱) کیا ارادہ کرتے ہیں یہ داؤ پیچ کا ! پس وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا وہی داؤ پیچ کا شکار ہوں گے (۴۲)

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے قیامت، رسالت اور توحید کے منکرین کا رد کیا اور اُن کا انجام بھی بیان فرمایا۔ اس کے ساتھ ساتھ متقیوں کا انجام اور اُن کو ملنے والے انعام واکرام کا تذکرہ کیا۔ ان کو اللہ تعالیٰ کے ہاں بلند مقام اور عزت و

شرف حاصل ہوگا۔ اب اس درس میں اللہ نے منکرین کی ذہنیت اور ان کے مختلف نظریات کی تردید فرمائی ہے۔ ابتدا میں رسالت کا ذکر ہے اور آگے توحید اور جزائے عمل کی بات ہے۔ ضمناً قرآن حکیم کی حقانیت اور صداقت کا بیان بھی ہے

کہانت اور دیوانگی کی نفی

اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا فَذَكِّرْ پس آپ لوگوں کو نصیحت کر دیں، ان کو سمجھا دیں یا یاد دہانی کرا دیں۔ مطلب یہ کہ آپ ان کو احکام الٰہی سے آگاہ کرتے رہیں فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ آپ اپنے پروردگار کے فضل سے کاہن نہیں ہیں۔ کاہن وہ لوگ ہوتے ہیں جو سادہ لوح لوگوں کو غیب کی خبریں بتا کر اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔ ابن خلدون کہتے ہیں کہ یہ کاہن کبھی تو طبعی چیزوں کے ذریعے کچھ باتیں معلوم کر لیتے ہیں، کبھی جنات کے ذریعے اور کچھ ستاروں کے ذریعہ سے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے کہانت کے متعلق فرمایا کہ شیاطین اور جنات اوپر آسمان کی طرف جاتے ہیں تو فرشتوں کی بعض باتیں سننے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرشتے ان کو مار کر بھگاتے ہیں۔ ان پر شہاب پڑتے ہیں تو ان میں سے کوئی زخمی ہو جاتے ہیں، کوئی ہلاک ہو جاتے ہیں اور کوئی بھاگ کر زمین کی طرف آ جاتے ہیں۔ پھر جو کوئی ان میں سے فرشتوں کی کوئی بات سن پاتے ہیں وہ آکر اپنے کاہنوں کو بتلاتے ہیں جو ان میں سو جھوٹ ملا کر آگے لوگوں کو بتا دیتے ہیں۔ اس طرح کاہنوں کی ایک آدھ بات درست بھی نکلتی ہے جس کی وجہ سے لوگ ان کے پاس آتے رہتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ جو شخص کاہن کے پاس گیا اور اس نے اس کی بات کی تصدیق کی تو اس نے گویا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت کا انکار کیا۔ اگر وہ شخص یقین کر لے کہ کاہن واقعی سچ کہتا ہے تو وہ کافر ہو جائے گا۔ اور اگر اس کو سچا نہیں سمجھتا مگر پھر بھی اس کے پاس جاتا ہے تو یہ بھی سخت ناجائز اور حرام ہے یہ کاہن یا جوتشی کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض رمل کے ذریعے خبریں معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بعض جوتش اور نجوم کے ذریعے، جو کہ بہرحال غلط ہے۔

نزولِ قرآن کے زمانے میں شعر و شاعری کی طرح کہانت کا بھی بڑا زور تھا۔ کاہن لوگ مسجع عبارتیں بولا کرتے تھے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک عورت نے دوسری عورت سے لڑائی جھگڑا کیا۔ جس کی وجہ سے اس کے پیٹ کا حمل گر گیا اور بچہ ضائع ہو گیا۔ حضور علیہ السلام کے پاس یہ مقدمہ پیش ہوا تو آپ علیہ السلام نے غُرّہ یعنی پانچ صد درہم یا ایک خچر یا ایک غلام یا لونڈی اس بچے کی دیت مقرر فرمائی تو متعلقہ شخص نے مسجع عبارت بولنی شروع کر دی کہ حضرت! نہ اس بچے نے کھایا نہ پیا اور نہ کوئی آواز نکالی، ہم تو ایسے خون کو رائیگاں سمجھتے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ یہ شخص کاہنوں جیسی مسجع باتیں کرتا ہے۔ میں تو اللہ اور اس کی شریعت کا حکم بتا رہا ہوں اور یہ آگے سے کاہنوں والی عبارت بول رہا ہے۔

ہر زمانے کی اپنی اپنی بات اور اپنا اپنا رواج ہوتا ہے فرعون کے زمانے میں سحر کا بڑا چرچا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں علمِ نجوم کی بڑی مشہوری تھی، یہ لوگ بادشاہوں کی مجلسوں میں بطور مشیر بیٹھتے تھے اور حکومتی معاملات میں ان کا بڑا عمل دخل ہوتا تھا۔ جس طرح آج کے زمانے میں ڈاکٹر اور انجنیئر وغیرہ فنی ماہرین سمجھے جاتے ہیں۔ ماہرینِ اقتصادیات کی بڑی قدر و قیمت ہے۔ اخبار نویس، ایڈیٹر، کالم نگار وغیرہ زندگی کے اہم کردار سمجھے جاتے ہیں، اسی طرح پرانے زمانے میں کاہنوں، نجومیوں اور جوتشیوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ بہرحال اللہ نے ان چیزوں کی تردید فرمائی ہے اور کہا ہے کہ اے پیغمبر! آپ نہ تو کاہن ہیں وَلَا مَجْنُوْنٍ اور نہ ہی آپ (نعوذ باللہ) دیوانے ہیں۔ سورۃ القلم میں ہے مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (آیت۔ ۲) آپ اپنے رب کی مہربانی سے دیوانے نہیں ہیں، بلکہ آپ کے لیے تو بے انتہا اجر ہے اور آپ اخلاقِ عالیہ کے مالک ہیں، یہ لوگ آپ کو دیوانہ کہہ کر خود اپنی دیوانگی کا اظہار کرتے ہیں آپ تو علم و حکمت کی باتیں کرتے ہیں، جن میں انسانیت کی فلاح کا پیغام ہے۔ بھلا یہ کوئی دیوانوں والی باتیں ہیں؟ پھر فرمایا اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ (نعوذ باللہ) شاعر

شاعری کی تردید

ہیں؟ اور ساتھ یہ بھی گمان کرتے ہیں نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ہم اس کے ساتھ زمانے کی گردش کا انتظار کرتے ہیں۔ ایسا کہنے سے مشرکین کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ شاعر ہر زمانے میں ہوتے رہتے ہیں جو اپنا وقت گزار جاتے ہیں۔ ان کی زندگی میں لوگ اُن کی واہ واہ کرتے ہیں۔ پھر زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ لوگوں کے دلوں سے محو ہو جاتے ہیں۔ اُن کا زعم باطل تھا کہ نبوت کا یہ دعویدار محض شاعر ہے جو زمانے کے ساتھ خود ہی ختم ہو جائے گا لہٰذا ہمیں اس کے پیچھے پڑنے کی بجائے اس کے از خود خاتمے کا انتظار کرنا چاہیئے۔

اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا قُلْ تَرَبَّصُوْا اے پیغمبر! آپ ان لوگوں سے کہہ دیں کہ بیشک تم انتظار کرو۔ فَاِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِیْنَ بیشک میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں۔ گویا تم میرے بارے میں انتظار کرو اور میں تمہارے متعلق انتظار کرتا ہوں۔ عنقریب پتہ چل جائے گا کہ کون کامیاب ہوتا ہے اور کون ناکام ہوتا ہے؟ کس کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور کس کا لایا ہوا دین قائم و دائم رہتا ہے؟ پھر فرمایا ذرا غور تو کرو، کیا اللہ کا نبی کوئی شاعرانہ تخیل پیش کر رہا ہے؟ شاعر لوگ تو کسی کی مدح کر کے اور کسی کی قدح کر کے لوگوں سے مال وصول کرتے ہیں، اُن سے داد حاصل کرتے ہیں مگر آپ تو وحی الٰہی کی بات کرتے ہیں اور ان لوگوں سے تبلیغ حق کا کوئی معاوضہ تو طلب نہیں کرتے بلکہ اللہ کے ہر نبی نے یہی کہا وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الشعراء - ۱۲۷) کہ میں تم سے کوئی اجرت طلب نہیں کرتا بلکہ میرا اجر تو تمام جہانوں کے پروردگار کے ذمے ہے بہرحال اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کے شاعر ہونے کی بھی تردید کر دی۔

پھر فرمایا اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ کیا ان لوگوں کی عقلیں ان کو اس قسم کا حکم دیتی ہیں کہ تم پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایسی باتیں منسوب کرو؟ مطلب یہ کہ ان لوگوں کی یہ باتیں تو عقل کے بھی خلاف ہیں۔ اللہ کا نبی تو مخلوق

میں سب سے زیادہ عقلمند ہوتا ہے۔ اُس کی گفتگو، اُس کا اخلاق اور اُس کا کردار سب
معیاری ہوتے ہیں۔ وہ تو دوسرے لوگوں کے لیے بہترین نمونہ ہوتا ہے مگر یہ لوگ
ایسی گھٹیا باتیں کرتے ہیں۔ کیا یہ لوگ عقل سے عاری ہو چکے ہیں جو نبی اور شاعر کے
کلام میں تمیز ہی نہیں کر سکتے۔ فرمایا اصل بات یہ ہے اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ
کہ یہ لوگ سرکش ہو چکے ہیں اور اس سرکشی کی بنا پر پیغمبر علیہ السلام کو کبھی کاہن کہتے ہیں
کبھی دیوانہ اور کبھی شاعر، حقیقت میں ان کی اپنی عقلوں کا جنازہ نکل چکا ہے۔

قرآن کے متعلق بدگمانی

پھر فرمایا کہ ان کے انکار کی ایک وجہ قرآن پاک سے متعلق بدگمانی بھی ہو سکتی
ہے۔ چنانچہ استفہامیہ انداز میں فرمایا اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ نبی
قرآن خود گھڑ کر لے آیا ہے؟ اور خود ساختہ کلام کو وحی الٰہی سے تعبیر کرتا ہے۔ فرمایا
یہ چیز بھی خلاف واقعہ ہے۔ اگر قرآن پاک کو انسانی کلام سمجھتے ہو تو کسی شاعر، دانشور
یا خطیب کا اس جیسا کلام پیش کرو تاکہ پتہ چل جائے کہ انسان بھی ایسا جامع اور
مانع کلام پیش کر سکتے ہیں۔ ادھر قرآن پاک نے خود چیلنج کر دیا ہے وَاِنْ كُنْتُمْ
فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ
(البقرة - ۲۳) اگر تمہیں اپنے بندے پر نازل کردہ کلام میں کوئی شک ہے تو پھر
اس جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لے آؤ، پتہ چل جائے گا کہ یہ خدا کا کلام ہے یا کسی
انسان کا ہے۔ فرمایا حقیقت یہ ہے بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ کہ یہ لوگ ایمان نہیں
لاتے۔ یہاں بھی فرمایا کہ اگر یہ اسے انسانی کلام سمجھتے ہیں فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ
مِّثْلِهٖ تو اس جیسی ایک بات ہی بنا کر لے آئیں۔ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ
اگر یہ واقعی سچے ہیں۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود قرآن
پاک کے اس چیلنج کو آج تک کوئی بھی قبول نہیں کر سکا۔

خالق اور مخلوق

اگلی آیت میں اللہ نے منکرین کی طرف سے ایک اور ممکنہ وجہ کا تذکرہ
کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَیْءٍ کیا یہ لوگ بغیر کسی چیز
کے پیدا کیے گئے ہیں۔ اس لیے قرآن، رسالت اور معاد کا انکار کرتے ہیں یا خود ہی

نے غیر شیٔ کا معنی یہ کیا ہے کہ کیا یہ بغیر خالق کے خود بخود ہی پیدا ہو گئے ہیں؟ کیا یہ والدین کے توسط سے پیدا نہیں ہوئے؟ کیا یہ پتھر اور دھات کی طرح بے جان چیزیں ہیں جن کی پیدائش کے لیے سلسلہ تناسل کی ضرورت نہیں؟ غیر شیٔ کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ کیا یہ لوگ بے مقصد پیدا کیے گئے ہیں؟ کیا ان کی زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان تو یہ ہے اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی (القیمۃ - ۳۶) کیا انسان گمان کرتا ہے کہ اسے بیکار چھوڑ دیا جائیگا۔ اس کی زندگی کی کوئی غرض وغایت نہیں؟ اللہ نے اس کو بیکار محض اور فضول نہیں پیدا کیا بلکہ اس کو عقل وشعور دے کر بھیجا ہے۔ اس کے لیے ہدایت کے تمام سامان مہیا کیے ہیں اور پھر اسے مکلف یعنی قانون کا پابند بنایا ہے اور اسی چیز پر اس کا محاسبہ بھی ہوگا اور جزا یا سزا کا فیصلہ بھی ہوگا۔

فرمایا کیا یہ لوگ اپنے آپ کو اس لیے غیر مسئول سمجھتے ہیں کہ ان کا پیدا کرنے والا کوئی نہیں یا یہ بیکار محض پیدا کیے گئے ہیں اَمْ ھُمُ الْخٰلِقُوْنَ یا وہ خود پیدا کرنے والے ہیں۔ العیاذ باللہ۔ آخر وہ کون سی چیز ہے جو انہیں وقوع قیامت اور محاسبہ اعمال پر ایمان سے روکتی ہے اور جس کے لیے یہ تیاری نہیں کرتے خالقیت کا مسئلہ تو ایسا ہے کہ دہریوں کی ایک قلیل جماعت کے علاوہ ہر مذہب وملّت کے داعی حتیٰ کہ مشرکوں کے تمام طبقات بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہر چیز کا خالق اللہ ہی ہے۔ فرمایا کیا بحیثیت خالق اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ آخر کچھ تو بتلائیں کہ انہوں نے کیا چیز پیدا کی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ خالق بھی نہیں ہیں بلکہ صرف الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں بَلْ لَّا یُوْقِنُوْنَ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ پیغمبر خدا کی بات پر یقین ہی نہیں رکھتے۔ وحی الٰہی اور محاسبہ اعمال پر بے یقینی کی وجہ سے یہ ایسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں اگر ان میں ذرا بھی شعور ہوتا۔ تو یہ انکار نہ کرتے۔

رحمت کے خزانے

فرمایا ان کے انکار کی ایک یہ وجہ بھی ان کے زعم میں ہو سکتی ہے اَمْ عِنْدَھُمْ

خَزَآئِنُ رَبِّكَ ۔ یا ان کے پاس تیرے پروردگار کے خزانے ہیں لہٰذا وہ اپنے معاملات میں خود کفیل ہیں اور اپنی ضروریات کی تمام چیزیں اُن خزانوں سے نکال لیتے ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ان کو نہ کسی ہدایت کی ضرورت ہے ، نہ قرآن کی نہ توحید کی اور نہ رسالت کی ۔ کیا ان کے پاس خزانے ہیں ؟ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ یا یہ دوسروں پر مسلط ہیں یعنی یہ لوگوں پر داروغہ مقرر ہیں کہ اُن کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتے ہیں اور خود کسی اصول یا قانون کے پابند نہیں بلکہ ہر معاملہ میں خود مختار ہیں ۔ فرمایا اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ یا پھر ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس کے ذریعے یہ عالم بالا پر چڑھ جاتے ہیں اور اوپر کی باتیں سن کر آتے ہیں اور پھر انہیں نافذ کرتے ہیں ۔ فرمایا اگر ایسی کوئی بات ہے فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ تو پھر بات سننے والا اس کے لیے کوئی کھلی سند لے کر آئے اور پیش کرے تاکہ پتہ چلے کہ واقعی یہ شخص عالم بالا سے براہِ راست حکم لے آیا ہے اور اب اسے وحی الٰہی ، رسالت یا قرآن کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور یہ بھی کہ اب یہ شخص محاسبہ اعمال سے مستغنی ہو چکا ہے ۔ فرمایا حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ بالکل تہی دامن ہیں ۔ انہیں میں کوئی چیز بھی ان کے پاس نہیں ، بلکہ یہ محض ضد ، عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہر چیز کا انکار کیے جا رہے ہیں ۔

انکار کی دیگر وجوہات

آگے اللہ نے مشرکین کی ایک اور حماقت کا ذکر کیا ہے وہ خود تو لڑکی کی پیدائش پر چیں بجبیں ہوتے تھے بلکہ بعض اُسے زندہ درگور کر دیتے تھے مگر فرشتوں کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں تسلیم کرتے ہیں ۔ اس بات کا شکوہ اللہ نے قرآن کی مختلف سورتوں میں کیا ہے ۔ یہاں بھی فرمایا اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ کیا اس پروردگار کیلئے بیٹیاں ہیں اور تمہارے لیے بیٹے ؟ تم نے یہ کیسی بھونڈی تقسیم کر رکھی ہے کہ جس صنف کو اپنے لیے پسند نہیں کرتے اُسے اللہ تعالیٰ کے ساتھ منسوب کرتے ہو ۔ حالانکہ پروردگار عالم تو ان چیزوں سے پاک ہے ۔ تو بھلا کیا تم اس وجہ سے توحید ، رسالت ، وحی الٰہی اور معاد کا انکار کرتے ہو ؟ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا

یا آپ ان سے کوئی معاوضہ طلب کرتے ہیں جس کی وجہ سے یہ لوگ آپ کی بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ فَهُم مِّن مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُونَ اور وہ اس تاوان کی وجہ سے بوجھل ہو رہے ہیں۔ وہ کوئی بہت بڑا حق تبلیغ ادا کرنے کی وجہ سے مرے جاتے ہیں، لہٰذا وہ آپ کی بات نہیں مانتے کہ اگر ان کو سچا تسلیم کر لیا تو پھر اتنا معاوضہ دینا پڑے گا۔ یہ بات بھی نہیں ہے بلکہ اللہ کا کوئی بھی رسول مخلوق سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا۔ وہ تو اللہ کے حکم سے اللہ کا پیغام پہنچاتا ہے اور اس کا معاوضہ بھی اسی مالک الملک سے طلب کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ کے ہر نبی نے اپنی امت پر پورے طریقے سے واضح کر دیا وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ (الشعراء - ۱۸۰) کہ میں تم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا کیونکہ میرا بدلہ تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور وہی مجھے عطا کرے گا۔ تم پر اس معاملہ میں کوئی مالی پریشانی نہیں ہونی چاہئیے۔

فرمایا انکار کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے أَمْ عِندَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ کہ یا ان کے پاس غیب کی کوئی خبر ہے جسے وہ لکھ لیتے ہیں اور پھر ہر چیز سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ فرمایا ایسی بات بھی نہیں ہے کہ ان کو غیب سے کوئی علیحدہ ہدایت ملتی ہو یا ان پر وحی نازل ہوتی ہو۔ اگر کوئی ایسی چیز ان کے پاس ہے تو پیش کریں۔

فرمایا أَمْ يُرِيدُونَ كَيْدًا یا یہ کوئی داؤ پیچ کھیلنا چاہتے ہیں، کسی مخفی تدبیر کے ذریعے کوئی سکیم لڑانا چاہتے ہیں فرمایا ان کو اچھے طریقے سے جان لینا چاہئیے فَالَّذِينَ كَفَرُوا هُمُ الْمَكِيدُونَ کہ کافر لوگ جو اس قسم کی تدبیریں کرتے ہیں جو مکر و فریب بناتے ہیں، یہ خود ہی ان تدبیر کا شکار ہو جائیں گے اور اپنے پھیلائے ہوئے جال میں خود ہی پھنس جائیں گے۔ اللہ کا فرمان ہے وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ (فاطر - ۴۳) جو شخص کسی دوسرے کے بارے میں بُری تدبیر سوچتا ہے وہ خود اسی پر پڑتی ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان مبارک بھی ہے مَنْ حَفَرَ

لِاَخِیۡہِ بِئۡرًا وَقَعَ فِیۡہِ جس نے اپنے بھائی کے لیے گڑھا کھودا، وہ خود ہی اُس میں گرتا ہے۔ فارسی کا مقولہ بھی ہے "چاہ کن را چاہ درپیش" جو شخص دوسرے کے لیے کنواں کھودتا ہے، وہ خود اُس میں جا گرتا ہے۔

الغرض! فرمایا کہ جو لوگ غلط تدبیریں سوچتے ہیں، وہ خود مغلوب ہو جائیں گے اللہ کے مقابلے میں اُن کی کوئی سازش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ بنی اسرائیل کی سازشوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا وَمَکَرُوۡا وَمَکَرَ اللّٰہُ ؕ وَاللّٰہُ خَیۡرُ الۡمٰکِرِیۡنَ (آل عمران-۵۴) انہوں نے بھی داؤ پیچ چلایا اور ہم نے تدبیر کی، بہترین تدبیر کرنے والی تو اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ اُس کے مقابلے میں کوئی کامیاب نہیں ہو سکتا ہے۔ منکرین کے انکار کی بعض حکمت وجوہات کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ نے فرمایا کہ کیا یہ لوگ کوئی داؤ پیچ کھیلنا چاہتے ہیں۔ ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اپنے کسی بھی داؤ پیچ کا یہ خود ہی شکار بن جائیں گے اور اللہ اس کے دین، اس کے پیغمبر اور اہلِ ایمان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔

قال فما خطبکم ۲۷ — الطّور ۵۲

درس چہارم ۴ — آیت ۴۳ تا ۴۹

اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۴۳﴾ وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاۗءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ﴿۴۴﴾ فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ﴿۴۵﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْــــًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۴۸﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿۴۹﴾

ع ۲ / ۲۱ / ۴

ترجمہ :- کیا ان کے لیے اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ ہے ؟ پاک ہے اللہ تعالیٰ کی ذات ان چیزوں سے جن کو یہ لوگ اس کا شریک بناتے ہیں ﴿۴۳﴾ اور اگر یہ دیکھیں کوئی ٹکڑا آسمان کی طرف سے گرتا ہوا تو کہیں گے کہ یہ بادل ہے تہ بہ تہ جما ہوا ﴿۴۴﴾ پس ان کو چھوڑ دیں یہاں تک کہ یہ ملیں اپنے اُس دن سے جس دن ان پر کڑک پڑے گی ﴿۴۵﴾ جس دن نہیں بچائے گی ان کو ان کی تدبیر کچھ بھی ، اور نہ ان کی مدد کی جائے گی ﴿۴۶﴾ اور بیشک وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا ، ان کے لیے عذاب ہے

اس سے ڈرے لیکن اکثر ان میں سے نہیں جانتے (۴۷) اور آپ صبر کریں اپنے پروردگار کے حکم کے سامنے، بے شک آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اور آپ تسبیح بیان کریں اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ جس وقت آپ اٹھتے ہیں (۴۸) اور رات کے وقت اس کی تسبیح بیان کریں، اور ستاروں کے پیچھے (۴۹)

ربط آیات

پہلے رسالت کے متعلق بیان ہو چکا ہے کہ مشرک اور کافر لوگ اللہ کے نبی کو کبھی کاہن کہتے کبھی شاعر اور کبھی العیاذ باللہ دیوانہ کہتے۔ اللہ نے ان کے اس غلط نظریے کی تردید کی اور فرمایا کہ یہ لوگ خود بے عقل لوگ ہیں جو حق و باطل میں تمیز ہی نہیں کرتے۔ کفار قرآن کو وحی الٰہی بھی تسلیم نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ تو اس مدعی نبوت کا خود ساختہ کلام ہے۔ اللہ نے چیلنج کیا کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو تم بھی ایسا کلام پیش کر کے دکھاؤ۔ پھر ان لوگوں کے انکار کی بعض ممکنہ وجوہات کا تذکرہ فرمایا کہ کیا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کا کوئی خالق نہیں ہے، یا ان کی تخلیق بے مقصد ہے یا ان کے پاس خزانے ہیں جن کی وجہ سے انہیں کوئی دوسری بات سننے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ فرمایا، یا یہ اقتدار کے مالک ہیں یا سیڑھی لگا کر عالم بالا کی باتیں سنتے ہیں جس کی وجہ سے یہ اللہ کی طرف سے آمدہ ہدایت سے بے نیاز ہیں۔ فرمایا اگر ان کے پاس ایسی چیز ہے تو وہ پیش کریں تاکہ پتہ چل جائے کہ انہیں عقیدہ وحدانیت اور نبی کی راہنمائی کی ضرورت نہیں ہے اور یہ ہر معاملہ میں خود کفیل ہیں۔ پھر فرمایا کہ کیا یہ لوگ اس وجہ سے انکار کرتے ہیں کہ اللہ کا نبی ان سے کوئی معاوضہ طلب کرتا ہے۔ یا ان کے پاس غیب ہے جس کو یہ لکھ کر رکھ لیتے ہیں اور یہ ان کی کفالت کرتا ہے یا یہ کوئی انوکھی تدبیر کرتے ہیں مگر انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ خود ہی ایسی تدبیر یا داؤ پیچ میں مبتلا ہو کر ختم ہو جائیں گے

توحید کا بیان

آج کا درس توحید کے بیان سے شروع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شرک

کی تردید فرمائی ہے۔ اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ کیا ان منکرین کے لیے اللہ کے
سوا کوئی اور معبود ہے جس کی وجہ سے یہ اپنے خالق اور مالک کو پہچاننے سے
انکار کر رہے ہیں؟ کون ہے جو ان کی مشکلات میں مشکل کشائی اور حاجات میں
حاجت روائی کرتا ہے؟ اگر یہ اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت نہیں کرتے تو پھر
اور کس کی عبادت کریں گے؟ حقیقت یہ
ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی معبود حقیقی ہے اس کے علاوہ کوئی بھی مصیبت میں کام آنے
والا نہیں ہے، کوئی خالق، مدبر اور متصرف نہیں، کوئی روزی رساں اور نفع
نقصان کا مالک نہیں، پھر یہ لوگ اپنے پروردگار کا کس طرح انکار کرتے ہیں۔
اس کی وحدانیت پر کیوں ایمان نہیں لاتے؟ فرمایا حقیقت یہ ہے سُبْحٰنَ
اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ اللہ تعالیٰ کی ذات تو ان تمام چیزوں سے پاک اور منزہ
ہے جن کو یہ لوگ اپنے زعم باطل کے مطابق اس کا شریک بناتے ہیں اور ان سے
مدد طلب کرتے ہیں۔ اللہ نے ایسی تمام شرکیہ باتوں کی تردید فرمادی ہے۔

منکرین کی ہٹ دھرمی

پھر اللہ نے ان لوگوں کی بدبختی کی مثال بیان فرمائی کہ ان کی بداعمالیوں کی
بدولت اگر ان پر عذاب بھی آجائے تو اس کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں
ہوں گے۔ چنانچہ فرمایا وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا اور اگر یہ
لوگ آسمان کی طرف سے گرتا ہوا کوئی ٹکڑا بھی دیکھ لیں تو اس سے خوف کھانے
کی بجائے يَقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ کہیں گے کہ یہ تو کوئی بادل کا منجمد ٹکڑا ہے
یعنی بادلوں میں برف جم گئی ہے اور وہ اولوں کی صورت میں آرہا ہے۔ اللہ نے
ان کی بے خوفی کا تذکرہ فرمایا ہے ورنہ جب اللہ کا عذاب آجاتا ہے تو پھر وہ
رکتا نہیں بلکہ نافرمان قوم کو تہس نہس کر کے چھوڑتا ہے۔ اللہ نے نافرمان قوموں کی
کئی مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ جن میں قوم نوح، قوم لوط، قوم ہود، قوم شعیب وغیرہ
ہیں۔ ان پر اللہ کا عذاب آیا اور وہ صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ گئیں
اللہ نے سورۃ بنی اسرائیل میں مشرکین کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ایک طرف تو وہ

معجزات طلب کرتے تھے اور دوسری طرف اپنے منہ سے عذاب کا مطالبہ کرتے تھے اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا (آیت۔ ۹۲) یا ہم پر کوئی آسمان کا ٹکڑا ہی گرا دے تاکہ ہمیں پتہ چل جائے کہ جس عذاب سے تو ہمیں ڈراتا ہے۔ وہ واقعی آسکتا ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ از حد متعصب اور عناوی ہیں، اگر ان پر آسمان کا کوئی ٹکڑا بھی گرا دیا جائے تو پھر بھی یہ نہیں مانیں گے بلکہ اپنی ضد پر اڑے رہیں گے اور کہیں گے کہ یہ عذاب نہیں بلکہ برف باری ہو رہی ہے۔

اللہ نے فرمایا فَذَرْهُمْ آپ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور ان کی طرف زیادہ توجہ نہ دیں۔ یہ حد سے بڑھے ہوئے لوگ ہیں جو کسی عقلی اور نقلی دلیل کو ماننے کے لیے تیار نہیں حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ یہاں تک کہ یہ جا ملیں اپنے اُس دن سے جس میں ان پر کڑک پڑے گی۔ صعق کا معنی بجلی کا کڑک کے ساتھ گرنا ہے اور اس سے مراد قیامت کا دن ہے جب کہ صور پھونکا جائے گا اور ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ یہ بجلی اسرائیلیوں پر بھی پڑی تھی، کہنے لگے اے موسیٰ علیہ السلام! ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ اللہ نے فرمایا تمہاری اس گستاخی پر فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (البقرہ۔ ۵۵) تمہیں کڑک نے پکڑ لیا اور تم دیکھ رہے تھے۔ بہر حال اس کڑک سے دنیا کا عذاب بھی ہو سکتا ہے اور قیامت کی بیہوشی بھی مراد ہو سکتی ہے۔ فرمایا آپ ان سے درگزر کریں اس وقت تک جب یہ خود اپنی شامتِ اعمال میں گرفتار ہو جائیں گے۔

فرمایا وہ دن ایسا ہو گا يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا جس دن اس کے داؤ پیچ کچھ بھی کام نہیں آسکیں گے، اور ان کی تمام تدابیر دھری کی دھری رہ جائیں گی وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ اور نہ ہی وہ مدد کیے جائیں گے، گویا نہ تو وہ بذاتِ خود عذابِ الٰہی سے بچ سکیں گے اور نہ ہی انہیں کوئی بیرونی امداد پہنچ سکے گی۔ اس دنیا میں تو مصیبت کے وقت لوگ اپنے خاندان، قبیلے

برادری اور یاروں دوستوں کی مدد حاصل کر لیتے ہیں۔ وکلاء کی قانونی امداد حاصل کرتے ہیں اور رشوت و سفارش کے ذریعے کام نکالنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس دن کسی قسم کی کوئی مدد نہیں پہنچے گی اور کفار و مشرکین بے یار و مددگار اپنے کیے پر پچھتا رہے ہوں گے۔

فرمایا وَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا اور بیشک جن لوگوں نے ظلم کا شیوہ اختیار کیا اور سب سے بڑا ظلم کفر اور شرک ہے۔ اُن کے لیے فرمایا عَذَابًا دُونَ ذَٰلِكَ اس سے ورے (پہلے) بھی ایک عذاب ہے۔ آخرت کا عذاب تو وقوع قیامت کے بعد ہو گا، لیکن اس سے پہلے اس دُنیا میں بھی اللہ مختلف قسم کے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہ عذاب کبھی اہلِ ایمان کے ہاتھوں شکست کی صورت میں آتا ہے جیسا کہ غزوہ بدر میں ہوا اور کبھی قحط سالی کے ذریعے نافرمان قوم کو جھنجھوڑا جاتا ہے، کبھی دشمن غلبہ حاصل کر کے غلامی میں مبتلا کر دیتا ہے اور کبھی کوئی آسمانی یا زمینی آفت نازل ہو جاتی ہے۔ دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی سزائیں اللہ تعالیٰ تنبیہ کے طور پر دیتا ہے لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں، سابقہ گناہوں سے تائب ہو کر اللہ کی وحدانیت، رسالت، قرآن کی حقانیت اور جزائے عمل پر ایمان لے آئیں۔ لیکن وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ لیکن اکثر ان میں سے نہیں جانتے۔

صبر کی تلقین

اب اگلی آیت میں اللہ نے مشرکین کی ایذا رسانیوں کے مقابلے میں بعض چیزیں بطور علاج تجویز کی ہیں اور حضور علیہ السلام اور آپ کے پیروکاروں کو ان پر عملدرآمد کی نصیحت کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ آپ اپنے پروردگار کے حکم کے سامنے صبر کریں۔ مکذبین کی ضد اور عناد پہ دل برداشتہ نہ ہوں بلکہ ان تکالیف کو صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کریں۔ خدا تعالیٰ کی توحید، اس کا ذکر، شکر اور نماز کی طرح صبر بھی ایک بہت بڑا اصول ہے جسے اختیار کرنے کا بار بار حکم دیا گیا ہے۔ آپ اپنے رب کے حکم کے سامنے صبر

کریں، اور یقین جانیں فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا آپ کے تمام حالات ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں، ہم آپ کی کسی تکلیف سے غافل نہیں ہیں، مشرکین کی فریب کاری، عیاری اور مکاری سے خوب واقف ہیں، لہٰذا آپ بے حوصلہ نہ ہوں، اللہ تعالیٰ عنقریب ان کو مغلوب کر دے گا۔ ایسے ہی موقع پر صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی بھی تکلیف پر جزع و فزع نہ کریں بلکہ صبر کا دامن تھامے رکھیں نہ صرف آنے والی تکلیف پر صبر کریں بلکہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کے ہر کام پر صبر کا مظاہرہ کریں، اور اگر نفسانی خواہشات پیدا ہوں تو ان کو دبانے کی کوشش کریں۔

تسبیح و تحمید

فرمایا دوسرا علاج یہ ہے وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ آپ اپنے پروردگار کی تسبیح بیان کریں اس کی تعریف کے ساتھ حِیْنَ تَقُوْمُ جب کہ آپ کھڑے ہوتے ہیں۔ کھڑا ہونے سے مجلس سے کھڑا ہونا بھی مراد ہو سکتا ہے اور نماز کے لیے قیام کرنا بھی۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام ہر مجلس کی ابتدا اور انتہا میں اللہ تعالیٰ کا ذکر فرماتے۔ حضور علیہ السلام کا یہ فرمان بھی ہے کہ جو مسلمان کسی مجلس میں بیٹھ کر اللہ کا ذکر نہیں کرتا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اللہ کے نبی پر درود نہیں بھیجتا، وہ مجلس اس کے لیے تِرَةٌ یعنی نقصان کا باعث ہوتی ہے۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر مجلس میں اللہ کا ذکر کرتے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص کسی مجلس سے اٹھتے وقت یوں کہے سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ تو یہ کلمہ اس کی مجلس کی تمام کوتاہیوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض فرماتے ہیں کہ سو کر اٹھنے کے بعد بھی اللہ کا ذکر کرنا چاہیئے اور نماز کے لیے قیام کی ابتدا بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید سے ہی ہوتی ہے سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ ...... الخ لہٰذا یہ معنی بھی درست ہے۔

پھر فرمایا وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ اور رات کے وقت بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید بیان کریں۔ اس سے تہجد کی نماز بھی مراد لی جا سکتی ہے جو سو کر اٹھنے کے بعد ادا کی جاتی ہے ——— بعض مفسرین نے لیے مغرب

اور عشاء کی نمازوں پر محمول کیا ہے کیونکہ یہ بھی رات کے وقت ادا کی جاتی ہیں۔ ان اوقات میں بھی اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرنی چاہیئے۔ پھر فرمایا وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ اور ستاروں کے پشت پھیر کر چلے جانے کے بعد بھی اللہ کا ذکر کریں۔ بعض مفسرین اس سے نماز فجر مراد لیتے ہیں کیونکہ اس وقت ستاروں کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔ گویا وہ جا رہے ہوتے ہیں۔ بعض نے اس سے فجر کی دو سنتیں مراد لی ہیں کہ اُس وقت اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید بیان کرنی چاہیئے۔ ان دو سنتوں کی بڑی تاکید آئی ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان مبارک ہے رَكْعَتَا الْفَجْرِ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا فجر کی یہ دو رکعتیں دنیا اور اس کی ہر چیز سے زیادہ بہتر ہیں۔ لہٰذا ان کو خاص اہتمام کے ساتھ ادا کرنا چاہیئے۔

اس تسبیح و تحمید سے وہ ذکر بھی مراد لیا جا سکتا ہے جو ہر نماز سے پہلے یا بعد میں سنن، نوافل یا تسبیح و تہلیل کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ یہ سب چیزیں اس ضمن میں آ جاتی ہیں۔ بہرحال اللہ نے اپنے نبی اور اس کے پیروکاروں کو پیش آمدہ پریشانیوں کا حل صبر اور تسبیح و تحمید کی صورت میں تجویز فرمایا ہے۔ ذکرِ الٰہی سے دلجمعی حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد بڑھتا ہے اور اس کے ساتھ بندے کا تعلق درست رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جس قدر تعلق قائم رہے گا۔ اُسی قدر تکلیف کم محسوس ہوگی۔

سورة النجم
(مكية)

درس اول ۱ آیت ۱ تا ۱۲

سُوْرَۃُ النَّجْمِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ اِثْنَتَانِ وَسِتُّوْنَ اٰیَۃً وَّثَلٰثُ رُکُوْعَاتٍ

سورۃ نجم مکی ہے، اور باسٹھ آیتیں ہیں اور تین رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے

وَالنَّجْمِ اِذَا ھَوٰی ① مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی ② وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ③ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ④ عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی ⑤ ذُوْ مِرَّۃٍ فَاسْتَوٰی ⑥ وَھُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی ⑦ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ⑧ فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی ⑨ فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی ⑩ مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی ⑪ اَفَتُمٰرُوْنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰی ⑫

ترجمہ :- قسم ہے ستارے کی جب کہ وہ گر گیا ① نہیں بہکا تمھارا صاحب (ساتھی)، اور نہ وہ بے راہ ہوا ② اور نہیں بولتا وہ نفس کی خواہش سے ③ نہیں ہے وہ مگر وحی جو اس کی طرف بھیجی جاتی ہے ④ اس کو سکھایا ہے سخت قوتوں والے نے ⑤ جو طاقت والا ہے۔ پھر وہ سیدھا ہوا ⑥ اور وہ بلند کنارے پر تھا ⑦ پھر وہ قریب ہوا

اور نیچے لٹک گیا ⑧ پس تھا وہ مقدار دو کمان کے یا اس
سے بھی زیادہ قریب ⑨ پس وحی کی (پروردگار نے)
اپنے بندے کی طرف جو وحی کی ⑩ نہیں جھٹلایا دل نے
اس چیز کو جس کو دیکھا ⑪ کیا تم جھگڑا کرتے ہو اس
کے ساتھ اس چیز پر جو اس نے دیکھی ہے ⑫

نام اور کوائف

اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ النجم ہے جو اس کی پہلی آیت کے پہلے لفظ سے
ماخوذ ہے۔ سورۃ الحجرات سے لے کر سورۃ الواقعہ تک تمام مکی سورتیں ہیں۔ چنانچہ
یہ سورۃ بھی مکی دور میں نازل ہوئی۔ اس سورۃ مبارکہ کی باسٹھ ۶۲ آیات اور تین رکوع
ہیں اور یہ سورۃ تین سو الفاظ اور چودہ سو حروف پر مشتمل ہے۔ یہ سورۃ سورۃ اخلاص
سے پہلے نازل ہوئی۔

مضامین سورۃ

اس سورۃ کے مضامین بھی زیادہ تر وہی ہیں جو سابقہ سورۃ الطور کے ہیں۔
دیگر مکی سورتوں کی طرح اس میں بھی اسلام کے بنیادی عقائد توحید، رسالت، معاد اور
قرآن کی حقانیت ہی کا تذکرہ ہے، تاہم رسالت کا پہلو غالب ہے۔ ساتھ ساتھ
جزائے عمل کا مسئلہ بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ اس سورۃ مبارکہ میں مشرکین کے بعض معبودان
باطلہ کا نام لے کر ان کا رد کیا گیا ہے۔ لات، منات اور عزیٰ کے نام پر جو بت
بنائے گئے، اللہ نے ان کی نفی فرمائی ہے۔ اور جو لوگ شعریٰ ستارے کی پرستش
کرتے تھے ان کا بھی تعاقب کیا گیا ہے۔ نبوت و رسالت کے سلسلے میں ابراہیم علیہ السلام
کا ذکر ہے اور عبرت کے طور پر بعض سابقہ نافرمان قوموں کا ذکر بھی ہے۔ اس
سورۃ میں واقعہ معراج کی طرف بھی مختصر اشارہ ہے اور عالم بالا کے ایک حصے
سے متعلق بھی ذکر موجود ہے۔

اولین سجدہ تلاوت

قرآن پاک میں کل چودہ سجدہ ہائے تلاوت آتے ہیں جن میں سے تین سجدے
اس ساتویں منزل میں ہیں اور اس سورۃ میں آمدہ سجدہ ان میں سے ایک ہے تاہم
اس سجدہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ سب سے پہلی سورۃ ہے جس میں سجدہ تلاوت

آیا ہے۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد اور نسائی میں عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے، کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک موقع پر کسی ایسی مجلس میں تشریف فرما تھے۔ جہاں مسلمانوں کے علاوہ کافر اور مشرک بھی موجود تھے۔ آپ نے اس مجلس میں اس سورۃ مبارکہ کی تلاوت فرمائی اور پھر آخر میں جب سجدہ کی آیت تلاوت کی تو وہیں سجدہ کیا۔ آپ کی اقتداء میں مسلمانوں نے بھی سجدہ کیا اور وہاں پر موجود مشرک بھی سجدہ کرنے پر مجبور ہو گئے اور آپ کے ساتھ انہوں نے بھی سجدہ کیا۔ صرف ایک بوڑھا کافر امیہ ابن خلف ایسا تھا جو سجدے میں شریک نہ ہوا۔ اس نے سجدہ کرنے کی بجائے زمین سے تھوڑی سی مٹی لے کر اپنی پیشانی پر لگا لی اور کہنے لگا کہ میرے لیے یہی کافی ہے۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ میں نے اس کافر کو بدر کے موقع پر قتل کیا ہوا دیکھا۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ آیت سجدہ تلاوت کرنے پر حضور علیہ السلام نے تو اللہ کے حکم سے سجدہ کیا اور مسلمان آپ کے اتباع میں سجدہ ریز ہو گئے، البتہ کفار کا سجدہ ریز ہو جانا اس وجہ سے تھا کہ اس وقت خدا تعالیٰ کی قہری تجلیات کا نزول ہو رہا تھا اور وہ ایسا کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

ستارے کی قسم

گذشتہ سورۃ کی طرح اس سورۃ مبارکہ کی ابتداء بھی قسم سے کی گئی ہے وَالنَّجۡمِ اِذَا هَوٰىۙ قسم ہے ستارے کی جب کہ وہ گر گیا۔ عربی زبان میں نجم ستارے کو بھی کہتے ہیں اور زمین پر پھیلی ہوئی چھوٹی بوٹیوں اور پودوں کو بھی نجم کہا جاتا ہے۔ اس کی مثال سورۃ الرحمٰن میں موجود ہے جہاں فرمایا وَّالنَّجۡمُ وَالشَّجَرُ يَسۡجُدٰنِ (آیت ۶) اور بوٹیاں اور درخت بھی اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ تاہم اس مقام پر نجم سے مراد ستارہ ہی ہے۔ اس ستارے سے متعلق مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض لوگ اسے زہرہ ستارے پر محمول کرتے ہیں جو زیادہ چمکدار ہوتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے ثریا ستارہ مراد ہے جو مشرقی جانب گچھے کی شکل میں نظر آتا ہے۔ بعض اس سے کہکشاں مراد لیتے ہیں جو چھوٹے چھوٹے ستاروں سے مل کر مستطیل سی بنی ہوئی ہوتی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے استاد حضرت عطاؒ کے قول کے مطابق یہاں نجم سے مراد قرآن کریم اور اُس کی آیات ہیں۔ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے ۲۳ سال کے عرصہ میں نجماً نجماً یعنی تھوڑا تھوڑا کر کے نازل فرمایا، لہٰذا قرآن بھی مراد ہو سکتا ہے۔ امام جعفر صادقؒ سے منقول ہے کہ اس مقام پر نجم سے مراد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ مبارکہ ہے۔ اور آپ کے نیچے اُترنے کا اشارہ شبِ معراج میں عالمِ بالا اور حظیرۃ القدس سے نیچے اُترنے کی طرف ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ نجم سے مراد مطلقاً مومن کی ذات ہے کہ جب وہ مرنے کے بعد قبر میں اُترتا ہے تو وہ روشن ستارے کی مانند ہوتا ہے بہرحال یہ مختلف اقوال ہیں مگر زیادہ تر نجم کا اطلاق ثریا ستارے پر کیا جاتا ہے۔ اور ہوٰی سے مراد گر جانا یا اُتر جانا یعنی غروب ہو جانا ہے قسم ہے ستارے کی جب وہ غروب ہو جائے۔

آفتابِ ختمِ نبوۃ

ستارے سے مراد سابقہ انبیاء بھی ہو سکتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ایک لاکھ سے زیادہ کی تعداد میں بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا۔ یہ انبیاء کرام اپنے اپنے دور میں فریضۂ نبوت و رسالت ادا کرتے رہے۔ یہ اپنے اپنے وقت میں روشنی کے ستارے تھے جن سے لوگ ہدایت پاتے تھے۔ پھر جب وہ اپنا اپنا دَور ختم کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے، روشنی کے یہ مینار غروب ہو گئے تو لوگ اُن کی تربیت سے بھی محروم ہو گئے۔ ہماری اس کائنات میں جاری نظامِ شمسی کا بھی یہ اصول ہے کہ رات بھر ستارے چمکتے رہتے ہیں، پھر جب طلوعِ فجر پر آفتاب کی روشنی پھیلنے لگتی ہے تو یہ ستارے ماند پڑ جاتے ہیں یہ ستارے کہیں غائب نہیں ہو جاتے بلکہ اُن کی روشنی آفتاب کی تیز تر روشنی کے سامنے نابود ہو جاتی ہے جسے ہم ستاروں کے ڈوب جانے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی طرح جب سلسلہ نبوت کی آخری کڑی کے طور پر حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا آفتابِ نبوت طلوع ہوا تو باقی انبیاء کی ساری روشنیاں ماند پڑ گئیں اور ہدایت کا سارا نظام اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفےٰ

صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ ہدایت کے تمام سابقہ ذرائع ختم ہو کر صرف یہی ایک ذریعہ باقی رہ گیا ہے جس سے قیامت تک لوگ ہدایت حاصل کرتے رہیں گے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے کہ دنیا کا ہر شخص خواہ وہ یہودی ہے، نصرانی ہے، مجوسی ہے یا کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہے جب وہ سن لے کہ حضور خاتم النبیین علیہ السلام دنیا میں تشریف لا چکے ہیں اور انہوں نے ہدایت کا پروگرام دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے اور اس کے باوجود وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتا تو ایسا شخص دَخَلَ النَّارَ جہنم میں داخل ہوگا۔

حضورؐ کی صداقت کی گواہی

گذشتہ دو سورتوں یعنی سورۃ الذّٰریٰت اور سورۃ الطور میں اللہ نے مختلف چیزوں کی قسم اٹھانے کے بعد وقوعِ قیامت اور جزائے عمل کی تصدیق فرمائی تھی۔ اب اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ستارے کی قسم اٹھا کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت کی صداقت کی گواہی دی ہے۔ جوابِ قسم ہے مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى آپ کا صاحب، رفیق اور ساتھی یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو بھکے اور نہ بے راہ ہوئے۔ مشرکین مکہ آپ کی رسالت کا انکار کرتے تھے پچھلی سورۃ میں گذر چکا ہے کہ وہ لوگ آپ کو کبھی کاہن کہتے، کبھی مجنون اور کبھی شاعر مگر اللہ نے ان سب باتوں کی تردید کی۔ وہ لوگ آپ کو بھکا ہوا اور بے راہ بھی کہتے تھے مگر اللہ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تمہارے ساتھی نہ تو بہکے ہیں اور نہ ہی بے راہ ہوئے ہیں، بلکہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور اس کا پیغام تمہیں سناتے ہیں۔ آپ کی باتیں نہایت معنی خیز اور علم و حکمت پر مبنی ہیں لہٰذا تمہیں آپ کی رسالت کا انکار کرنے کی بجائے آپ پر ایمان لے آنا چاہیئے کہ اسی میں تمہاری فلاح ہے۔

ضَلَّ اس شخص کے متعلق کہا جاتا ہے جس کو ہدایت ملی ہی نہ ہو اور وہ بھٹک جائے۔ اور غَوٰى کا معنی یہ ہے کہ ہدایت تو واضح ہو چکی ہے مگر کوئی شخص از خود

غلط راستے پر جا رہا ہے۔ اللہ نے یہود و نصاریٰ کے متعلق فرمایا کہ ان میں سے بعض بہک گئے ہیں کیونکہ ان کو صحیح راستہ میسر ہی نہیں آیا اور بعض مغضوب علیہ ہیں جن کو صحیح راستہ تو مل گیا ہے مگر وہ جان بوجھ کر ٹیڑھا چل رہے ہیں۔ اللہ نے یہاں پر حضور علیہ السلام کے متعلق فرمایا ہے کہ نہ تو آپ بہکے اور نہ بے راہ ہوئے۔ نیز فرمایا کہ تم بلا وجہ وحی الٰہی کا انکار کر رہے ہو، حقیقت یہ ہے وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اللہ کا نبی اپنے نفس کی خواہش سے نہیں بولتا۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى مگر وہ تو وحی ہوتی ہے جو اس کی طرف بھیجی جاتی ہے۔ اللہ کا نبی تمہیں اللہ کا کلام پیش کرتا ہے جو اسے بذریعہ وحی وصول ہوتا ہے۔ مگر کس قدر بدنصیبی کی بات ہے کہ تم اسے خود ساختہ کلام کہہ کر رد کر دیتے ہو۔

حضور علیہ السلام کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی ہر بات وحی الٰہی ہوتی ہے خواہ وہ وحی جلی ہو یا وحی خفی۔ حضرت عبداللہ بن عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ میں حضور علیہ السلام کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی ہر بات لکھ لیا کرتا تھا مگر بعض لوگوں نے مجھے ایسا کرنے سے منع کیا۔ اُن کا استدلال یہ تھا کہ حضور علیہ السلام بھی آخر انسان ہیں اور انسان سے خطا بھی سرزد ہو جاتی ہے۔ حضور علیہ السلام کبھی غصے کی حالت میں بھی ہوتے ہیں، کبھی کسی پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں، لہٰذا آپ کی ہر بات لکھنا درست نہیں۔ کہتے ہیں کہ اس پر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات لکھنے سے رُک گیا، پھر میں نے اس کا تذکرہ خود حضور علیہ السلام کے پاس کیا تو آپ نے فرمایا اُكْتُبْ فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَا خَرَجَ مِنِّيْ اِلَّا الْحَقُّ لکھ لیا کرو، اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے میری زبان سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔

ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کبھی کبھی مزاح بھی فرماتے تھے ایسے ہی ایک موقع پر صحابہؓ نے عرض کیا حضور! اِنَّكَ تُدَاعِبُنَا وَاَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ آپ ہمارے ساتھ مزاح بھی فرماتے ہیں حالانکہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ میں جو کہتا ہوں وہ حق ہی ہوتا ہے۔ ایسے مزا

میں بھی کوئی نہ کوئی حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے۔ میری زبان سے غصہ کی حالت میں بھی کوئی لغو بات نہیں نکلتی۔ بہر حال فرمایا کہ اللہ کا رسول اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کرتا بلکہ وہ جو کچھ بھی پیش کرتا ہے، وہ وحی ہوتی ہے جو اس کی طرف بھیجی جاتی ہے

جبرئیل علیہ السلام کا تعارف

آگے وحی الٰہی لانے والے فرشتے جبرئیل علیہ السلام کے متعلق فرمایا عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى اللہ کے نبی کو سکھلانے والا یعنی وحی لانے والا زبردست قوتوں کا مالک ہے ذُوْ مِرَّةٍ وہ بڑے زور والا ہے اور اللہ کا نبی اس کو پہچانتا ہے کہ یہ جبرئیل علیہ السلام ہے جو اللہ کی طرف سے وحی لانے پر مامور ہے۔ لہٰذا وہ جو کچھ بھی لاتا ہے۔ وہ شک و شبہ سے پاک اور بالکل برحق بات ہوتی ہے۔

جبرئیل علیہ السلام عام طور پر انسانی شکل میں وحی لے کر حضور علیہ السلام کے پاس آتے تھے مگر آپ نے جبرئیل کو دو دفعہ ان کی اصل شکل میں بھی دیکھا ہے۔ پہلی رویت کے متعلق فرمایا فَاسْتَوٰى پھر وہ سیدھا ہوا۔ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى اور وہ بلند کنارے پر تھا۔ یہ ابتدائے نبوت کے زمانہ کا ذکر ہے۔ آپ نے دیکھا کہ جبرئیل علیہ السلام کرسی پر بیٹھے ہیں اور آپ کے جسم سے زمین و آسمان کی ساری فضا پُر ہے۔ آپ پر دہشت طاری ہو گئی، جسم کپکپا رہا تھا آپ اسی حالت میں گھر تشریف لے آئے۔ بہر حال جبرئیل علیہ السلام کو اصلی شکل میں دیکھنا حضور علیہ السلام کی خصوصیت ہے، کسی اور نبی نے ان کو اصل حالت میں نہیں دیکھا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جبرئیل علیہ السلام کو دوسری مرتبہ معراج کے موقع پر اصلی شکل میں دیکھا تھا، جس کا ذکر اگلے درس میں آرہا ہے۔ بہر حال فرمایا ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى پھر وہ قریب ہوا، اور نیچے آگیا۔ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى پس وہ دو کمان کے برابر یا اس سے بھی قریب ہوا اور اس حالت میں فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى اللہ نے اپنے بندے کی طرف وحی کی، جو وحی نازل کی۔ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى جس چیز کو دیکھا۔ اس کو دل نے جھٹلایا نہیں، یعنی آپ نے جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا، اس میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا اللہ تعالیٰ

جو کچھ دکھانا چاہتا تھا، آپ نے وہ چیز ٹھیک طریقے سے مشاہدہ کر لی۔ اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں تھا۔

فرمایا اَفَتُمٰرُوْنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰی کیا تم پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ اس چیز میں جھگڑا کرتے ہو جو انہوں نے دیکھی ہے؟ نہیں بلکہ جو کچھ آپ نے دیکھا وہ برحق تھا اور اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہ تھی۔ اس مقام پر مفسرین کرام وضاحت کرتے ہیں کہ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی میں اَوْ شک کے لیے نہیں آیا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نوعیت کے اعتبار سے آپ علیہ السلام نے دو کمانوں سے بھی زیادہ قریب سے جبریل علیہ السلام کو اُس کی اصلی شکل میں دیکھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہی بیان ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس آیت میں آمدہ الفاظ عَلٰی مَا یَرٰی سے عالم بالا کے مشاہدات مراد ہیں اور اس سلسلے میں رویت الٰہی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ تاہم اس بارے میں محدثین کا اختلاف ہے۔ البتہ اکثریت کا خیال یہ ہے کہ معراج کے واقعہ میں حضور علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی رویت بھی نصیب ہوئی تھی اور اس کا ذکر احادیث میں موجود ہے۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿۱۳﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿۱۴﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴿۱۵﴾ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿۱۷﴾ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿۱۸﴾

ترجمہ:- اور البتہ تحقیق پیغمبر نے دیکھا ہے اُس (فرشتے) کو دوسری مرتبہ نیچے اترتے ہوئے ﴿۱۳﴾ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ﴿۱۴﴾ اسی کے پاس جنت الماویٰ ہے ﴿۱۵﴾ جب کہ ڈھانپ لیا بیری کے درخت کو اُس چیز نے جس نے ڈھانپ لیا ﴿۱۶﴾ نہیں بہکی نگاہ اور نہ حد سے آگے بڑھی ﴿۱۷﴾ البتہ تحقیق دیکھیں اُس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں ﴿۱۸﴾

ربط آیات

اس سورۃ مبارکہ میں زیادہ تر رسالت کا ذکر ہے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی تعریف بیان فرمائی۔ پہلے انبیاء کے ادوار کے بعد جب آخری نبی کا دور آیا تو لوگوں نے اُن کو تسلیم نہ کیا۔ بلکہ طرح طرح کے اعتراضات کیے کسی نے کاہن کہا، کسی نے دیوانہ اور کسی نے شاعر مگر اللہ نے سب کی تردید کی اور فرمایا تمہارے صاحب نہ تو بہکے ہیں اور نہ بے راہ ہوئے ہیں۔ وہ اپنی خواہش سے بات نہیں کرتے بلکہ اُن کا پیش کردہ کلام اللہ کی وحی ہوتی ہے۔ اس وحی کو لانے والا جبرائیل علیہ السلام بڑی قوتوں والا فرشتہ ہے۔ اللہ کے پیغمبر اُس کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ آغازِ نبوت میں جب وہ پہلی دفعہ نمودار ہوا تو وہ سیدھا بیٹھ

گیا اور وہ افق کے بلند کنارے پر تھا اور زمین اور آسمان کے درمیان کی فضا آپ کے جسم سے پُر تھی۔ اس طرح اللہ نے حضور علیہ السلام کو جبریل کی اصل شکل میں پہچان کرائی۔

رویت جبریل ثانیہ

اب آج کے درس میں جبریل علیہ السلام کی دوسری رویت کا ذکر ہے۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ حضور علیہ السلام نے دو دفعہ جبریل علیہ السلام کو اُن کی اصل شکل میں دیکھا، پہلی دفعہ آغاز نبوت میں اور دوسری دفعہ معراج کے موقع پر تو اس دوسری رویت کے متعلق فرمایا وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی البتہ تحقیق آپ نے جبریل کو دوسری دفعہ دیکھا نیچے اترتے ہوئے عِنْدَ سِدْرَۃِ الْمُنْتَہٰی سدرۃ المنتہیٰ کے پاس عِنْدَھَا جَنَّۃُ الْمَاْوٰی اُس کے پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے سدرۃ المنتہیٰ کے مقام پر جبریل کو اصلی شکل میں دیکھا اور اس کے چھ سو پَر تھے۔ مجھے اس کو پہچاننے میں کسی قسم کا تردد نہیں ہوا۔ پھر سدرۃ المنتہیٰ کے متعلق فرمایا کہ جنت الماویٰ کے پاس ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جنت ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے اس کے تمام طبقات درجہ بدرجہ اُوپر کی طرف جاتے ہیں، اور آخر میں جنت الفردوس ہے جس پر عرش الٰہی کا سایہ پڑتا ہے۔

سدرۃ المنتہیٰ کی کیفیت

سدرۃ المنتہیٰ کا محل وقوع بیان کرنے کے بعد فرمایا اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی جب کہ ڈھانپ لیا سدرہ کو اُس چیز نے جس نے اُس کو ڈھانپ لیا جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام معراج پر تشریف لے گئے تو اس وقت سدرہ پر خاص قسم کے انوار و تجلیات وارد ہو رہے تھے اور اُس درخت کے پتوں پر سنہری پروانے چمک رہے تھے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مخلوق میں سے کوئی بھی اُس کے حسن و جمال کی تعریف بیان نہیں کر سکتا جو اس وقت سدرہ پر طاری تھا اللہ نے یہ ساری کیفیت اپنے پیغمبر کو دکھا دی اور یہ مشاہدہ ایسا واضح تھا کہ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی نہ تو نگاہ اِدھر اُدھر ہوئی اور نہ ہی حد سے بڑھی، بلکہ آپ نے نہایت اطمینان کے ساتھ یہ پوری کیفیت مشاہدہ کی۔ اسی لیے فرمایا لَقَدْ رَاٰی

مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی البتہ تحقیق آپ نے اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

سدرہ بیری کے درخت کو کہتے ہیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس درخت کی جڑ چھٹے آسمان پر ہے جب کہ اس کی بلندی ساتویں آسمان سے آگے نکلی ہوئی ہے۔ یہ کوئی عجیب قسم کا درخت ہے جسے نوع انسانی کے ساتھ خاص نسبت ہے۔ اس درخت کے ہر پتے پر اللہ کے فرشتے تسبیح کر رہے تھے اور سنہری پروانے جگمگا رہے تھے۔ اس درخت کو سدرۃ المنتہیٰ اس لیے کہتے ہیں کہ اسے اوپر اور نیچے کے درمیان ایک سنگم کی حیثیت حاصل ہے۔ اس سے آگے کی کیفیت کو کوئی نہیں جانتا اوپر سے جو حکم آتا ہے وہ یہیں رہ جاتا ہے اور نیچے کسی دوسری کیفیت کے ساتھ وارد ہوتا ہے اسی طرح نیچے سے جو چیز اوپر کی طرف جاتی ہے وہ بھی اسی درخت پر آکر ختم ہو جاتی ہے۔ گویا یہ درخت عالمِ خلق اور عالمِ امر کے درمیان ایک واسطہ ہے یا یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ درخت عالمِ وجوب اور عالمِ امکان کا سنگم ہے۔ اس کو انسانی نوع کے ساتھ خاص تعلق ہے۔ اسی واسطے حدیث میں آتا ہے کہ میّت کو غسل دینے کے لیے پانی میں بیری کے پتے ڈال لیا کرو۔ اس کا ظاہری سبب تو یہی ہے کہ ان پتوں میں میل کچیل صاف کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ تاہم اس میں کوئی دیگر مصلحت بھی ضرور کارفرما ہے جو اس درخت کی انسان کے ساتھ نسبت کو ظاہر کرتی ہے۔ حضور علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے اس بیری کا پھل بڑے بڑے مٹکوں جتنا دیکھا جو ہجر کے مقام پر ہوتے ہیں جن میں چھ یا بارہ من پانی یا کھجوریں ذخیرہ کی جا سکتی ہیں اور اس بیری کے پتے ہاتھی کے کانوں جتنے بڑے تھے۔

چار نہریں

حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ معراج کے موقع پر میں نے اس درخت کی جڑ میں چار نہریں دیکھیں جن میں سے دو نہریں باطنی ہیں اور دو ظاہری۔ فرماتے ہیں کہ میں نے جبرئیلؑ سے پوچھا کہ یہ کیسی نہریں ہیں تو اس نے بتایا کہ باطنی نہریں کوثر اور سلسبیل ہیں جن کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے۔ قیامت والے دن اسی کوثر کا

پانی پیمانوں کے ذریعے حوضِ کوثر میں ڈالا جائے گا جو حضور علیہ السلام اپنے امتیوں کو پلائیں گے۔ فرمایا ظاہری نہریں دریائے نیل اور فرات ہیں۔ اگرچہ انسانی فہم میں یہ بات نہیں آسکتی مگر حقیقت یہی ہے کہ نیل بھی بڑی بابرکت نہر ہے جو چار ہزار میل لمبی ہے یہ افریقہ کے پہاڑوں سے نکل کر صحراؤں کو عبور کرتی ہوئی اور مصر کو سیراب کرتی ہوئی بحرِ قلزم میں جا گرتی ہے۔ اس کا تعلق کسی نہ کسی طریقے سے سدرۃ المنتہیٰ کے ساتھ بھی ہے۔ اس قسم کا مشاہدہ ہم دیگر ذرائع سے بھی کرتے ہیں۔ مثلاً سمندر میں پیدا ہونے والے مدوجزر کا تعلق چاند کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہر ماہ جوں جوں چاند بڑھتا ہے سمندر میں مد آتا رہتا ہے پھر جب چاند گھٹنے لگتا ہے تو سمندر میں جزر آجاتا ہے۔ جس طرح ہم سمندر کے ساتھ چاند کے ربط کو صحیح طور پر نہیں جانتے۔ اسی طرح نیل اور فرات کا جو تعلق سدرۃ المنتہیٰ کے ساتھ ہے، وہ بھی ہمارے فہم سے بالا ہے۔

رویتِ الٰہی

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى کا تعلق رویتِ جبرائیل سے ہے جن کو حضور علیہ السلام نے دوسری مرتبہ معراج کے موقع پر دیکھا۔ تاہم مفسرین کرام اس آیت سے رویتِ باری تعالیٰ کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ چنانچہ امام حسن بصریؒ کہتے ہیں لَقَدْ رَاٰى مُحَمَّدٌ رَبَّهٗ مَرَّتَيْنِ یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پروردگار کو دو دفعہ دیکھا۔ ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ ایک دفعہ آنکھ سے دیکھا اور ایک دفعہ دل سے۔ طبرانی اور مسلم شریف کی روایت میں بھی ایسے ہی الفاظ آتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ البتہ حضرت عائشہ صدیقہؓ اس کی سختی سے انکار کرتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی رویتِ الٰہی کے خلاف ہیں۔ حضرت مسروقؒ جو حضرت عائشہ صدیقہؓ کے عزیز اور شاگرد ہیں، انہوں نے آپ سے پوچھا کہ آپ رویت کا انکار کس بنا پر کرتی ہیں، تو انہوں نے فرمایا کہ اللہ کا فرمان ہے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (الانعام-١٠٣) آنکھیں تو اللہ تعالیٰ کو نہیں پاسکتیں، البتہ وہ آنکھوں کو پاتا ہے۔

غور کیا جائے تو حضرت عائشہؓ کی اس دلیل کو دعوے کے ساتھ پوری مطابقت

نہیں ہے کیونکہ اس آیت میں ادراک کی نفی ہے نہ کہ رویت کی۔ ادراک کا معنی کسی چیز کا مکمل طور پر احاطہ ہوتا ہے اور یہ واقعی خدا تعالیٰ کی ذات یا اُس کی کسی صفت کا ممکن نہیں۔ وہ تو غیر محدود ذات ہے۔ لہٰذا اس کا مکمل احاطہ نہ دنیا میں ہو سکتا ہے اور نہ آخرت میں۔ البتہ محض رویت کا مسئلہ دوسرا ہے۔ جس کے لیے شواہد موجود ہیں۔ جہاں تک آخرت کا تعلق ہے تو اس ضمن میں حضرت عائشہ صدیقہ رض اور حضرت عبداللہ بن مسعود رض بھی یہی اعتقاد رکھتے ہیں کہ قیامت کو تمام اہل ایمان کو اللہ کا دیدار نصیب ہوگا۔ اس کے برخلاف گمراہ فرقے شیعہ، معتزلہ اور خارجی وغیرہ رویت الٰہی کے کلیتہً منکر ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ رویت تو کسی جہت میں ہو سکتی ہے، اور خدا کی جہت کو تسلیم کرنا اس کی تنزیہہ کے خلاف ہے۔ ایسا ماننے سے خدا تعالیٰ محدود ہو جائے گا۔ حالانکہ وہ ذات غیر محدود ہے۔ تاہم تمام اہل سنت والجماعت اس بات کے قائل ہیں کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا۔ مگر بِغَیْرِ کَیْفٍ یعنی بغیر کیفیت کے۔ مطلب یہ کہ یہ رویت رنگ، شکل و صورت یا جہت کے بغیر ہوگی۔ گویا یہ رویت ایسی کیفیت میں ہوگی جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا یہ فرمان بھی ہے اِنَّکُمْ لَنْ تَرَوْا رَبَّکُمْ حَتّٰی تَمُوْتُوْا تم مرنے سے پہلے اپنے پروردگار کو نہیں دیکھ سکتے یعنی یہ دیدار اس وقت ہوگا جب لوگ مر کر اگلے جہان میں پہنچ جائیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی کوہ طور پر اللہ تعالیٰ سے رویت کی درخواست کی تھی تو جواب آیا تھا۔ لَنْ تَرٰنِیْ (الاعراف - ۱۴۳) یعنی تم مجھے دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ پھر جب اللہ نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اور موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو کر گر پڑے۔ مطلب یہ ہے کہ اس عالم ناسوتی میں تو رویت الٰہی ممکن نہیں مگر حضور علیہ السلام کو رویت نصیب ہوئی تھی وہ دوسرے جہان میں حظیرۃ القدس میں ہوئی تھی۔ لہٰذا اس رویت میں کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔

امام شاہ ولی اللہ رح بھی فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے سر کی آنکھوں سے

اپنے پروردگار کو دیکھا۔ امام احمدؒ بھی ایسی ہی رویت کے قائل ہیں۔ کسی نے آپ کے سامنے ذکر کیا کہ ام المومنین عائشہ صدیقہؓ تو اس رویت کا انکار کرتی ہیں تو آپ نے فرمایا کہ ان کی بات کا جواب میں حضور علیہ السلام کی بات سے دیتا ہوں کہ آپ سے یہ قول صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے رَاَیْتُ رَبِّیْ عَزَّوَجَلَّ کہ میں نے اپنے پروردگار عزوجل کو دیکھا ہے، اور یہ حدیث حضرت عائشہؓ کے قول سے زیادہ قوی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ تم کو اس بات پہ تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خلت ابراہیم علیہ السلام کے لیے رکھی ہے، کلام موسیٰ علیہ السلام کے لیے اور رویت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے، حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا رَاَیْتُ نُوْرًا یعنی میں نے نور الٰہی کو دیکھا۔ اور دوسری روایت میں ہے فَسَجَدْتُ لَہٗ پھر میں سجدہ ریز ہو گیا۔

امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ رویت سے مراد مکمل احاطہ نہیں کیونکہ یہ تو ہر دو جہانوں میں کہیں بھی ممکن نہیں، البتہ آخرت میں یہ رویت اللہ تعالیٰ کی تجلیات کے ظہور سے ہو گی۔ یہ تجلیات بہت سی اقسام سے ہیں جن میں ذاتی بھی ہیں اور صفاتی بھی۔ خدا کی ذاتی تجلیات صرف انسانوں کے لیے مخصوص ہیں اور فرشتے ان سے مستفید نہیں ہو سکتے، چنانچہ آخرت میں بعض لوگوں کو سال کے بعد رویت نصیب ہوا کرے گی، اور مقربین کو یہ رویت صبح و شام نصیب ہو گی جس کا ذکر قرآن حکیم میں موجود ہے گویا اللہ تعالیٰ کے دیگر انعامات کے علاوہ خدا تعالیٰ کی رویت ایک خصوصی انعام ہو گا۔

رویت عینی اور قلبی

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ دو مرتبہ رویت کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ایک دفعہ اللہ تعالیٰ کو آنکھ سے دیکھا اور دوسری مرتبہ دل سے۔ معتزلہ تو دل سے دیکھنے کے قائل نہیں اور وہ اسے محض علم پہ محمول کرتے ہیں حالانکہ علم تو حضور علیہ السلام کو کامل طریقے سے ہر وقت ہی حاصل تھا۔ لہٰذا اس میں تردد کی گنجائش

ہی نہیں۔ البتہ دل کا ذکر شق قلب والی حدیث میں ملتا ہے کہ جب جبرئیل علیہ السلام نے آپ کا قلب مبارک شق کیا تو کہا قَلْبٌ وَكِيعٌ فِيهِ أُذُنَانِ سَمِيعَتَانِ وَعَيْنَانِ بَصِيرَتَانِ یہ بڑا مضبوط دل ہے، اس میں دو سننے والے کان اور دیکھنے والی دو آنکھیں ہیں۔ تو گویا دل کی آنکھیں بھی ہیں جن سے حضور علیہ السلام کو رویت الٰہی حاصل ہوئی۔ شاہ رفیع الدینؒ فرماتے ہیں کہ جب تک انسان کی روح کا تعلق جسم کے ساتھ قائم رہتا ہے اُس وقت تک انسان کو علم تو حاصل ہوتا ہے مگر انکشاف تام نہیں ہوتا۔ یہ چیز رویت کی شکل میں دوسرے جہان میں چل کر ہوگی۔

بہرحال رویت آنکھ سے ہو یا قلب سے بات ایک ہی ہے۔ دیکھو! کسی چیز کو دیکھنے کے لیے آنکھ کا صحیح سلامت ہونا، روشنی کا ہونا اور چیز کا آنکھ کے سامنے ہونا ضروری ہے۔ آنکھ کے سامنے والا سیاہ حصہ قرنیہ کہلاتا ہے۔ اللہ نے یہ نہایت ہی شفاف شیشے لگا دیے ہیں جن کے متعلق حکیم بقراط کی ہزاروں سال پہلے کی تحقیق ہے کہ اس قرنیہ کے پیچھے نہایت ہی لطیف چالیس پردے ہیں۔ ان پردوں کے پیچھے آنکھ میں نہایت ہی شفاف رطوبت بھری ہوئی ہے جس کو رطوبت جلیدیہ کہتے ہیں۔ یہی وہ رطوبت ہے کہ جب گدلی ہو جاتی ہے تو نظر آنا بند ہو جاتا ہے اور عام اصطلاح میں کہتے ہیں کہ موتیا اتر آیا ہے۔ اس گدلی رطوبت کو آپریشن کے ذریعے نکال دیا جاتا ہے تو پھر سے نظر آنے لگتا ہے۔ بہرحال جب کسی سامنے والی چیز کا عکس قرنیہ پر پڑتا ہے تو آگے رطوبت جلیدیہ تک پہنچتا ہے۔ پھر وہ اُسے آگے مجمع نور تک بھیج دیتی ہے۔ مجمع نور اُس کو اٹھا کر حس مشترک کے تختے پر منتقل کر دیتی ہے۔ وہاں پر اس عکس کو قوت خیالیہ، قوت وہمیہ، قوت متفکرہ اور نفس ناطقہ اخذ کر کے فیصلہ کرتے ہیں کہ جس چیز کا عکس ان کے پاس پہنچا ہے وہ کیا ہے۔ وہ کوئی درخت ہے، پتھر ہے، عمارت ہے، حیوان ہے یا کوئی اور چیز ہے۔ اور وہ چیز سیاہ ہے یا سفید، خوبصورت ہے یا بدصورت۔ ظاہر ہے کہ جب تک کسی چیز کا عکس آنکھ کے قرنیہ، رطوبت جلیدیہ، مجمع نور

اور حس مشترک تک نہیں پہنچتا، رویت مکمل نہیں ہوتی بلکہ شخص علم ہوتا ہے تو گویا علم اور رویت میں یہ فرق ہے۔ ہاں انسان جب عالم آخرت میں پہنچے گا تو اس کی تمام قوتوں خاص طور پر باطنی قویٰ میں بہت زیادہ لطافت پیدا ہو جائے گی۔ اس طرح قلب میں بھی بہت زیادہ قوت پیدا ہو جائے گی۔ اس وقت ہر چیز کا عکس سب سے پہلے قلب پر پڑے گا جو اس کو نفس ناطقہ کے پاس بھیج دے گا۔ نفس ناطقہ اسے حس مشترک کی طرف منتقل کرے گا اور وہ چیز پلٹ کر رطوبت جلیدیہ تک آ جائے گی اور نظر آنے والی چیز کی اصلیت معلوم ہو جائے گی۔ غرضیکہ کوئی شخص آنکھ کی طرف سے یا قلب کی طرف سے نتیجہ یکساں ہوگا۔ اسی لیے فرمایا کہ حضور علیہ السلام کو رویت الٰہی ایک دفعہ آنکھ سے اور ایک دفعہ قلب سے ہوئی۔ یہ دونوں باتیں درست ہیں اور دونوں کا منشا ایک ہی ہے۔

تدلی کا بیان

گذشتہ درس میں دَنَا فَتَدَلّٰی کا ذکر آیا تھا کہ اللہ کا فرشتہ قریب آیا۔ تدلی کا لغوی معنی لٹکنا ہی ہے مگر شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ تدلی ایک بہت باریک حقیقت بھی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی چار صفات مختصہ میں سے ہے۔ اللہ کی پہلی صفت ابداع ہے یعنی کسی چیز کو بغیر مادے اور نمونے کے پیدا کرنا جیسے اس نے آسمان و زمین کو اپنی صفت ابداع کے ذریعے بغیر مادے کے پیدا کیا۔ پھر دوسری صفت خلق آتی ہے جس کا مطلب ہے کہ ایک مادے سے کوئی دوسری چیز بنا دینا، جیسے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے تخلیق فرمایا۔ پھر آگے تیسری صفت تدبیر ہے یعنی کسی چیز کو بتدریج حد کمال تک پہنچانا کسی چیز میں کمی بیشی یا ترقی و تنزل کرنا۔ اور آخر میں اللہ کی چوتھی صفت تدلی کام کرتی ہے تدلی کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ مادی انسان، انسان اکبر کے نمونے پر بالکل تیار ہو جاتا ہے تو اس کے قلب پر اللہ تعالیٰ کی تجلی اعظم کا عکس پڑنے لگتا ہے اس کے درمیان بہت سی منازل ہیں۔ تاہم یہ آخری منزل ہے جس کو بزرگوں نے دریافت کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جتنی قوتیں بخشی ہیں اُن میں پانچ قویٰ یعنی نفس، قلب، عقل
روح اور سر لطائف ظاہرہ کہلاتے ہیں، جن کو یونانی، رومی اور ہندوستانی فلاسفر اور
حکما بھی تسلیم کرتے ہیں اس کے آگے پانچ باطنی قوتیں ہیں یعنی خفی، اخفیٰ، انانیت کبریٰ
نور القدس اور حجر بحت۔ جب ایک پوشیدہ قوت کا پردہ ہٹتا ہے تو دوسری نظر آ
جاتی ہے اور پھر آخر میں جو چیز ہوتی ہے اس کو حجر بحت کہتے ہیں اور اس پر تجلی اعظم
کا عکس پڑتا ہے اس کو تدلی کہا جاتا ہے۔ تجلی اعظم کی کشش ہمیشہ اوپر کی طرف ہوتی
ہے کیونکہ یہ عالم بالا سے آتی ہے۔ جب انسان کا یہ مادی خول اُتر جائے گا۔ اور
اندر سے اصلی انسان ظاہر ہوگا تو اس کی اوپر کی طرف کشش بہت بڑھ جائے گی۔
اگر انسان نے دنیا میں رہ کر کمائی ٹھیک نہیں کی تو وہ بہت تکلیف اٹھائے گا۔
بہر حال دَنَا فَتَدَلّٰی کا یہ مطلب بھی لیا گیا ہے۔

سابقہ دروس کی بعض تصریحات

گزشتہ درس میں فرشتے کی قربت کے ضمن میں قَابَ قَوْسَيْنِ کا ذکر
بھی ہو چکا ہے یعنی فرشتے اور حضور علیہ السلام کے درمیان دو کمان یا اس سے بھی
کم فاصلہ رہ گیا تھا۔ عربوں میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی دو آدمی آپس میں غیر معمولی
دوستی کرنا چاہتے تھے تو وہ دونوں کمانیں اکٹھی کر کے ایک ہاتھ میں پکڑ لیتے
تھے جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ یہ گہرے دوست بن گئے ہیں۔ اب ان میں سے
کسی ایک کا تیر دوسرے پر نہیں چلے گا تاہم اس مقام پر اس سے قربت ہی مراد ہے
پھر فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى کا تذکرہ بھی آچکا ہے کہ پروردگار
نے وحی نازل کی، جو وحی نازل کی، اس مقام پر کیا کیا چیزیں ظاہر ہوئیں۔ اس کو اللہ
نے اجمال میں رکھا ہے۔ البتہ صحیح احادیث سے تین تحائف کا ذکر ملتا ہے۔ جو
اللہ نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کو عطا فرمائے۔ ان میں پہلا انعام پانچ نمازیں ہیں جو اُمت
محمدیہ پر فرض ہوئیں۔ دوسرا انعام سورۃ بقرہ کی آخری دو آیات اٰمَنَ الرَّسُوْلُ
سے لے کر آخر تک ہے۔ اور تیسرا انعام یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا جو شخص
دنیا میں رہ کر میرے ساتھ شرک نہیں کرے گا۔ اس کی غلطیوں کو

معاف کردیا جائے گا۔ ان کے علاوہ اور بھی نشانیاں ہیں ۔ جن کے متعلق بیان فرمایا کہ آپ نے اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

درس سوم ۳ آیت ۱۹ تا ۲۵

أَفَرَءَيْتُمُ اللَّٰتَ وَالْعُزَّىٰ ﴿١٩﴾ وَمَنَوٰةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ ﴿٢٠﴾ أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنثَىٰ ﴿٢١﴾ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ ﴿٢٢﴾ إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنفُسُ ۖ وَلَقَدْ جَاءَهُم مِّن رَّبِّهِمُ الْهُدَىٰ ﴿٢٣﴾ أَمْ لِلْإِنسَانِ مَا تَمَنَّىٰ ﴿٢٤﴾ فَلِلَّهِ الْآخِرَةُ وَالْأُولَىٰ ﴿٢٥﴾

ترجمہ :- کیا دیکھا ہے تم نے لات اور عزیٰ کو ﴿١٩﴾ اور منات تیسرا جو پیچھے ہے ﴿٢٠﴾ کیا تمہارے لیے بیٹے ہیں ، اور اُس کے لیے بیٹیاں ﴿٢١﴾ یہ تقسیم ہے کھوٹی ﴿٢٢﴾ نہیں ہیں یہ مگر نام جو رکھ لیے ہیں تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے ، نہیں اتاری اللہ نے ان کے بارے میں کوئی سند - نہیں پیروی کرتے یہ لوگ مگر گمان کی اور اُس کی جو نفس خواہش کرتے ہیں - اور البتہ تحقیق ان کے پاس آچکی ہے اِن کے رب کیطرف سے ہدایت ﴿٢٣﴾ کیا انسان کے لیے وہ ہے جو اُس نے خواہش کی - ﴿٢٤﴾ پس اللہ ہی کے لیے ہے آخرت اور پہلی (دنیا کی زندگی) ﴿٢٥﴾

ربط آیات

سورۃ کی ابتدا میں اللہ نے ستارے کی قسم اٹھا کر جواب قسم کے طور پر نبوت و رسالت کا ذکر کیا پیغمبر کی ذات مبارکہ میں شک کرنے والوں کا رد کیا اور فرمایا کہ اللہ کا پیغمبر اپنی خواہش سے نہیں بولتا بلکہ وہ جو کچھ پیش کرتا ہے وہ وحی الٰہی ہوتی ہے۔ پھر اللہ نے وحی لانے والے مقرب فرشتے جبرائیل علیہ السلام کا تعارف بھی کرایا۔ پھر معراج کے واقعہ میں قرب کا تذکرہ کیا جو اللہ کے نبی کو حاصل ہوا۔ آپ کا سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنا جس کے قریب جنت الماویٰ ہے۔ پھر سدرۃ المنتہیٰ کی کیفیت بھی بیان فرمائی اور پھر اللہ کے پیغمبر کو عالم بالا میں ہونے والے مشاہدہ کی تصدیق فرمائی کہ آپ علیہ السلام نے اللہ کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔ نبوت و رسالت ہی کے سلسلے میں اس سے پہلے فرمایا کہ تمہارے صاحب نہ بہکے اور نہ بے راہ ہوئے، بلکہ وہ تو اللہ کی جانب سے وحی پیش کرتے ہیں اور اللہ نے آپ کو بہت ہی بلند مقام عطا فرمایا ہے۔ وحی لانے والا فرشتہ بھی اللہ کے ہاں بہت مقدس اور قوتوں کا مالک ہے۔

بتوں کی پرستش

اب اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کا رد فرمایا ہے جو اللہ مالک الملک اور تمام قوتوں کے سرچشمہ کو چھوڑ کر خود ساختہ بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ آج کے درس میں عربوں کے تین مشہور معبودان باطلہ کا تذکرہ ہے یعنی لات، منات اور عزیٰ جن کی وہ پوجا کرتے تھے اور اُن سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کے طالب ہوتے تھے۔ طائف کے قبیلہ ثقیف والے زیادہ تر لات کی پرستش کرتے تھے، مدینہ کے اوس اور خزرج اور غسانی قبائل منات کے پجاری تھے جب کہ قریش اور بنی کنانہ عزیٰ کو معبود مانتے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے معبود بنا رکھے تھے جو مختلف تصورات پر بنائے گئے تھے۔ کہیں کوئی استھان تھا۔ جہاں پر نذر و نیاز پیش کی جاتی تھی۔ کہیں درختوں کی پوجا ہوتی تھی اور کہیں مختلف شکلوں کے مجسمے بنائے ہوئے تھے۔

ارشاد ہوتا ہے أَفَرَءَيْتُمُ اللَّٰتَ وَالْعُزَّىٰ ۝ وَمَنَوٰةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ کیا تم نے دیکھا ہے لات اور عزیٰ کو، اور تیسرے منات کو جو دوسری طرف ہے؟ مطلب یہ ہے کہ کیا تم نے اُن کو معبود خیال کیا ہے؟ یہ تو بالکل غلط تصور ہے

جس کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ اے پروردگار! وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ (ابراہیم - ۳۵) مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے دور رکھ۔ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ (ابراہیم - ۳۶) یہ بت بہت سی مخلوق کی گمراہی کا باعث بنتے ہیں مشرکین بتوں کی پوجا تو کرتے ہی تھے بعض نے جعلی کعبے بنا رکھے تھے جن کا طواف کرتے تھے۔ تاریخ ابن ہشام میں ہے کہ اس قسم کا ایک کعبہ بنی طی میں تھا۔ جب مکہ فتح ہوا تو حضور علیہ السلام نے حضرت علیؓ کو اس کعبہ کو گرانے پر مامور کیا اسی طرح یمن کے ذی الخلصہ کے مقام پر بھی ایک کعبہ تھا۔ لوگ اس کا بھی طواف کرتے تھے۔ اس کو کعبہ یمانیہ کہا جاتا تھا حضور علیہ السلام نے حضرت جریر ابن عبداللہ بجلی کو ڈیڑھ سو آدمیوں کا ایک دستہ دے کر روانہ فرمایا کہ مجھے راحت پہنچاؤ۔ فرمایا جب میں سنتا ہوں کہ خانہ کعبہ کے مقابلے میں کسی نے مصنوعی کعبہ بنا رکھا ہے تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ حضرت جریرؓ نے جا کر اس کعبہ کو جلا دیا۔

مشرکین عرب کے بت

(۱) لات

لات کا مادہ لوا سے بھی اور لات یلوث اور یلیت سے بھی آتا ہے اگر اس کا لوا کا مادہ ہو تو اس کا معنی جھک جانا ہے یہ معنیٰ بھی درست ہے کیونکہ لوگ اس بت پر اکثر جھکے رہتے تھے کوئی سجدہ کرتا، کوئی اس کو چومتا چاٹتا اور کوئی نذر و نیاز پیش کرتا تھا اور اس سے مرادیں مانگتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اپنے زمانے میں لات ایک اچھا آدمی تھا، بعض کہتے ہیں کہ یہ شخص ستو اور گھی وغیرہ بیچا کرتا تھا، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ حاجیوں کو ستو وغیرہ پلایا کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے اسے بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ اور اسی وجہ سے اس کا نام لات مشہور ہو گیا۔ پھر جب وہ مر گیا تو لوگوں نے اس کا مجسمہ بنا لیا اور اس کی پوجا شروع کر دی۔ اس پر نذرانے پیش ہونے لگے اور اس سے حاجت روائی اور مشکل کشائی ہونے لگی۔

سورۃ نوح میں اللہ نے اس قوم کے پانچ معبودانِ باطلہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ بھی ایسے ہی نیک لوگ تھے یعنی ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر۔ بعض روایات

سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت شیث علیہ السلام کے بیٹے تھے، بڑے پارسا لوگ تھے، مگر اُن کے مرنے کے بعد اُن کی پوجا شروع ہو گئی۔ ود محبت کا دیوتا کہلاتا تھا جیسے ہندوؤں کے ہاں یہ ہاجی مہاراج ہیں۔ یہ انسان کی شکل پہ بنایا ہوا تھا۔ سواع کا بت عورت کی شکل پہ تھا اور اس کو حسن وجمال کی دیوی کہا جاتا تھا۔ ہندوؤں کے ہاں اس قسم کی درگا دیوی ہے۔ ہندوؤں میں مال و دولت کے لیے لکشمی دیوی کی پوجا کی جاتی ہے۔ اور مصائب و آلام سے حفاظت کے لیے کلکتہ کی کالی دیوی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ غرضیکہ اسی طرح عرب کے مشرکوں میں لات کی پوجا ہوتی تھی۔

(۲) عزیٰ

عزیٰ عورت کے نام پہ عزیز یا اعز کی مؤنث بنائی ہوئی تھی۔ اس کے اردگرد درخت تھے جن کے نیچے اس دیوی کی پوجا ہوتی تھی۔ مشرکوں کا عقیدہ تھا کہ اس کی دہلیز میں قَارُوْرَتَانِ ذِیْ لِخَیْرٍ وَ ذِیْ لِشَرِّ الْهَوَانْ دو بوتلیں رکھی ہوئی ہیں۔ ایک خیر کی اور دوسری شر کی۔ لوگ ان بوتلوں سے اپنا اپنا حصہ وصول کرتے تھے اور اس مقصد کے لیے وہاں نذر و نیاز پیش کرتے تھے۔ بعض کو خیر و شر دونوں میں سے حصہ ملتا تھا۔ خیر و شر کا اس قسم کا تصور یونانیوں میں بھی پایا جاتا تھا مگر اللہ نے اس کی تردید فرمائی۔

غزوہ احد میں جب مسلمانوں پر افتاد پڑی تو ابوسفیان نے ہبل کا نعرہ لگایا تھا اُعْلُ هُبَلْ یعنی ہبل کی جے۔ اُس نے حضور علیہ السلام کے جان نثاروں کو آوازیں دیں کہ آج وہ کدھر گئے؟ پھر خود ہی کہنے لگا کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب ختم ہو گئے ہیں۔ ابوسفیان نے اُس دن یہ نعرہ بھی لگایا تھا۔ لَنَا الْعُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ یعنی ہمارا حامی عزیٰ ہے جبکہ تمھارے ہاں کوئی عزیٰ نہیں ہے۔ اس پر حضور علیہ السلام نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ اس کے جواب میں کہو اَللّٰهُ مَوْلٰنَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ یعنی ہمارا کارساز اللہ تعالیٰ ہے مگر تمھارا کوئی آقا نہیں ہے۔ تم شیطان کے پجاری ہو۔ بہر حال فتح مکہ کے بعد حضورؐ نے عزیٰ کے تینوں درخت کٹوا کر اُس کا خاتمہ کر دیا۔

۱۴۔ مناۃ

اس تیسرے بت مناۃ کے متعلق مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ یہ مشلل کے مقام پر ساحلِ سمندر کے قریب رکھا ہوا تھا۔ اس کے پجاری زیادہ تر مدینہ کے لوگ تھے اور یہاں آ کر وہ عجیب و غریب شرکیہ حرکات کرتے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں یہ لوگ اساف اور نائلہ بتوں کے نام پر احرام باندھتے تھے اور ان کے نام کے نعرے مارتے ہوئے صفا و مروہ کا طواف کرتے تھے۔ پھر جب اسلام کا ظہور ہوا اور حج اور عمرہ کے لیے خانہ کعبہ کے طواف کے ساتھ ساتھ صفا و مروہ کی سعی کا حکم ہوا تو انصار نے کچھ حرج محسوس کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم تو ان معبودانِ باطلہ کی وجہ سے صفا مروہ کا طواف کرتے تھے، مگر اب اس کا کیا جواز رہ گیا ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ (البقرہ - ۱۵۸) بیشک صفا اور مروہ تو اللہ کے شعائر ہیں، لہٰذا حج و عمرہ کرنے والے ان کی سعی بھی کریں۔ بتوں والی خرابیاں تو مشرکین نے بعد میں پیدا کی تھیں جن کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں

بہرحال مناۃ کی پوجا عمرو بن لحی کے زور سے شروع ہوئی جو حضور علیہ السلام سے تقریباً پانچ سو سال پہلے گزرا تھا۔ اس سے پہلے حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام سے لے کر ڈیڑھ ہزار سال تک عرب کے سارے لوگ توحید پرست تھے۔ اس کے بعد بت پرستی کا رواج اس قدر پھیل گیا کہ خود خانہ خدا بھی بتوں سے پُر ہو گیا۔ فتح مکہ کے دن حضور علیہ السلام نے خانہ کعبہ کے اندر حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے مجسمے پڑے پائے جن کے ہاتھوں میں جوئے کے تیر پکڑا رکھے تھے۔ آپ نے فرمایا ان مشرکوں پر خدا کی لعنت ہو، اللہ کے نبیوں نے تو کبھی جوا نہیں کھیلا۔ تاہم آپ نے خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کرایا اور پھر اس میں داخل ہوئے۔ جس طرح مشرکوں نے اللہ کے نبیوں کو جوئے جیسی قبیح حرکت میں ملوث کر لیا تھا۔ اسی طرح یہودیوں نے اللہ کے نبیوں پر زنا تک کا الزام لگایا، العیاذ باللہ۔ بائیبل ایسی بے حیائی کی باتوں سے بھری پڑی ہے۔

اولاد کی کھوٹی تقسیم

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے ایک اور نظریہ کا رد کیا ہے جو

وہ اللہ تعالیٰ کی اولاد کے بارے میں کہتے تھے۔ مشرک اپنے لیے تو بیٹوں کو پسند
کرتے تھے۔ اور گھر میں بیٹی کی پیدائش پر اُسے زندہ درگور کرنے سے بھی دریغ نہیں
کرتے تھے مگر فرشتوں کو خدا کے ساتھ بحیثیت بیٹیاں منسوب کرتے تھے۔ اللہ
نے اس بات کا شکوہ کیا ہے اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى کیا تمہارے لیے
بیٹے ہیں، اور اُس (اللہ تعالیٰ) کے لیے بیٹیاں ہیں فرمایا تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ
ضِيْزٰى یہ کتنی کھوٹی اور غلط تقسیم ہے جو تم نے از خود کر رکھی ہے کہ اپنے لیے
بیٹے پسند کرتے ہو اور خدا تعالیٰ کے لیے بیٹیاں منسوب کرتے ہو۔ وہ فرشتوں
کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ تو اولاد سے ہی پاک ہے چہ جائیکہ
اُس کی طرف بیٹیوں کی نسبت کی جائے۔ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ
اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ یہ تو محض نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے خود بخود
رکھ لیے ہیں، ان کے تحت کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جن لوگوں کے تصور پر تم نے
یہ مجسمے بنا رکھے ہیں، اُن کے پاس تو کوئی اختیار ہی نہیں ہے جو تمہاری فریاد رسی
اور داد رسی کر سکیں۔ تم خواہ مخواہ ان پہ جھکتے جاتے ہو، ان کی پوجا پاٹ کرتے ہو اور
ان سے مرادیں مانگتے ہو وہ تو کسی چیز کے مالک ہی نہیں ہیں، تمہاری کیا مدد کریں گے؟
اللہ نے سورۃ النحل میں فرمایا ہے اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ (آیت ۱۷)
بھلا کیا ہر چیز کا خالق اور مالک اُن جیسا ہے جو کچھ پیدا نہیں کر سکتے؟ یہ تو خود اللہ
کے پیدا کردہ ہیں اور اللہ نے انہیں کوئی اختیار بھی نہیں دیا، پھر تم ان کی کیسے پرستش
کرتے ہو، اور یہ کیسے تمہاری مدد کرتے ہیں؟ ان میں سے بعض تو تم نے خود اپنے
ہاتھوں سے تراش رکھے ہیں۔ بھلا ان خود ساختہ معبودوں کو الوہیت کا درجہ
دینے کا کیا جواز ہے؟ فرمایا یہ تو محض نام ہی نام ہیں مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ
سُلْطٰنٍ یعنی اللہ نے تو ان کے حق میں کوئی سند نہیں اتاری جس کی بنا پر تم
ان کے گرویدہ ہو رہے ہو۔ مگر مشرک بھی اپنے عقیدے میں بڑے پختہ تھے۔ وہ
کہتے تھے۔

تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلٰى
اِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى

یہ بہت بڑی ہستیاں ہیں اور ان کی سفارش ضرور کارگر ہو گی کہتے تھے خدا تعالیٰ راضی ہو یا ناراض یہ ہستیاں ہمیں عذابِ الٰہی سے ضرور بچا لیں گی۔ اس طرح وہ لوگ گویا جبری سفارش کے قائل تھے جس کی اللہ نے قرآن میں متعدد بار نفی کی ہے ہر ایرے غیرے، مشرک، منافق کیلئے تو سفارش مفید ثابت نہیں ہو سکتی، بلکہ سفارش تو اس کے حق میں مفید ہو گی جس کا عقیدہ صحیح ہو گا اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے حق میں سفارش کے لیے اجازت بھی دی ہو گی۔

قوم نوح کے پانچ معبودانِ باطلہ کا ذکر میں نے پہلے کیا ہے، اور ان میں سے ود اور سواع کی تاریخی حیثیت بھی عرض کی ہے۔ باقی تین بتوں میں ایک یغوث تھا۔ یہ لفظ غوث کے مادہ سے ہے جس کا معنی فریادرسی ہوتا ہے۔ مشرک لوگ اپنی مشکل کشائی کے لیے اس بت کی پوجا کرتے تھے اور اس پر چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ یہ شیر کی شکل میں بنایا جاتا تھا۔ یعوق انسان کے لیے بمنزلہ مال کے ہے۔ مال و دولت کے حصول کے لیے اس بت کی پوجا ہوتی تھی۔ یعوق کا معنی تکلیف کو دور کرنے والا بھی ہوتا ہے۔ یہ گھوڑے کی شکل میں بنایا جاتا تھا۔ مشرکین کا تصور یہ تھا کہ یہ تیز رفتار ہونے کی وجہ سے پکارنے پر مدد کے لیے جلد پہنچ جاتا ہے۔ پانچواں معبود نسر نامی تھا جو کہ گدھ کی شکل پر بنایا جاتا تھا۔ گدھ بھی بڑا طاقتور اور تیز رفتار پرندہ ہے اور جہاں خوراک نظر آئے فوراً پہنچ جاتا ہے۔ مشرک اس کو بھی مشکل کشائی کے لیے پکارتے تھے۔ ہمارے دور میں لوگ "یا علی مشکل کشا" اور "یا پیر دستگیر مدد" کے نعرے لگاتے ہیں جو کہ قوم نوح کے مشرکوں سے کم نہیں۔ نزولِ قرآن کے زمانہ کے مشرکوں میں بھی ایسے تصورات پائے جاتے تھے اور وہ غیر اللہ سے مافوق الاسباب اعانت طلب کرتے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے پاس کچھ اختیار نہیں۔ فرشتے، نبی، ولی، جن سب اس کے عاجز بندے ہیں۔ اللہ نے کسی کو دنیا

بنایا ہے اور نہ کسی کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے کہ لوگوں کی مشکل کشائی کرے۔ عیسائیوں کا یہ عقیدہ بالکل باطل ہے کہ مسیح علیہ السلام نے جان کا کفارہ پیش کر کے تمام عیسائیوں کو عذابِ الٰہی سے بچا لیا ہے۔ یہ ساری غلط باتیں اور غلط نظریات عربوں میں بھی رائج تھے۔ جن کی اللہ نے تردید فرمائی ہے۔

محض گمان کا اتباع

اللہ نے فرمایا کہ معبودانِ باطلہ کے متعلق تمہارے یہ خود ساختہ نام ہی نام ہیں جن کی صداقت کی کوئی سند نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ یہ لوگ تو محض گمان کا اتباع کر رہے ہیں اور خواہشات نفسانی پر چل رہے ہیں، ورنہ ان معبودانِ باطلہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور نہ ہی ان کو کچھ اختیار حاصل ہے۔ فرمایا حقیقت یہ ہے وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى کہ ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے ہدایت آچکی ہے۔ اللہ کا آخری نبی اور اس کی آخری کتاب آچکی ہے جو منبع رشد و ہدایت ہے ان دو چیزوں کی موجودگی میں ان بتوں کی کیا حیثیت ہے؟ ان کو چاہیئے تھا کہ اس ہدایت کو قبول کر کے دائمی فلاح پاتے مگر وہ اپنے پرانے معبودوں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں اور انہی سے اپنی مشکل کشائی اور حاجت روائی چاہتے ہیں۔ فرمایا اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى کیا یہ ضروری ہے کہ انسان کو وہی کچھ مل جائے جس کی وہ تمنا کرے؟ فرمایا ہرگز نہیں۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ جب کوئی انسان خواہش کرتا ہے تو اس کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ کیا چیز طلب کر رہا ہے اور کیا وہ اس کے حق میں بہتر ہے یا نقصان دہ؟ انسان نہیں جانتا کہ اس کے لیے کون سی خواہش مفید ہے۔ اگر غلط خواہش کرے گا تو ممکن ہے کہ اس کے لیے وہی لکھی جائے۔ اور پھر وہ نقصان میں پڑ جائے۔ اس لیے انسان کو ہمیشہ اچھی چیز کی خواہش کرنی چاہیئے۔ اللہ نے انسان کو مکلف بنایا ہے اور وہ اپنی ہر کارکردگی کا جواب دہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے ذرے ذرے کا حساب لے گا، کیونکہ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى آخرت کا اور اس دنیا کا سارا اختیار بھی اللہ تعالیٰ ہی کے

پاس ہے۔ اُس نے یہ اختیار مخلوق میں سے کسی کو نہیں دیا، لہٰذا انسانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لیے صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کریں۔

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ يَّأْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ﴿۲۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ﴿۲۷﴾ وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ﴿۲۸﴾ فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۲۹﴾ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۙ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ﴿۳۰﴾

ترجمہ :۔ اور بہت سے فرشتے آسمانوں میں ہیں کہ نہیں کام دیتی اُن کی سفارش کچھ بھی مگر بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے اجازت دے اور پسند کرے ﴿۲۶﴾ بیشک وہ لوگ جو نہیں ایمان رکھتے آخرت پر ، البتہ وہ نام رکھتے ہیں فرشتوں کے عورتوں جیسے نام ﴿۲۷﴾ اور نہیں ہے اُن کو اس بات کا کچھ علم ۔ نہیں پیروی کرتے یہ لوگ مگر گمان کی ۔ اور بیشک گمان نہیں کام دیتا حق کے سامنے کچھ بھی ﴿۲۸﴾ پس آپ اعراض کریں اُس سے جس نے منہ موڑ لیا ہے

ہمارے یاد سے۔ اور نہیں ارادہ کیا اس نے مگر دنیا کی زندگی
کا (۲۹) یہی پہنچ ہے ان کے علم کی۔ بیشک تیرا پروردگار
بہتر جانتا ہے اس کو جو گمراہ ہوا اس کے راستے سے
اور وہ بہتر جانتا ہے اس کو جس نے ہدایت پائی (۳۰)

ربط آیات

سورۃ کے ابتدائی حصے میں رسالت کا ذکر ہوا، اور رسالت میں شک و شبہ کرنے والوں کا اللہ نے رد فرمایا۔ وحی الٰہی کے نزول کا ذکر ہوا اور پیغمبر خدا کے بلند مقام پر فائز ہونے کا تذکرہ ہوا۔ معراج کے واقعہ میں حضور علیہ السلام نے قدرت کی بڑی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کیا۔ اس کے بعد اللہ نے مشرکین کے معبودان باطلہ لات، عزیٰ اور منات کی تردید کی۔ فرمایا مشرک لوگ اپنے لیے تو بیٹے پسند کرتے ہیں مگر بیٹیوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں۔ فرمایا یہ کتنی غلط بات ہے کہ جس چیز کو اپنے لیے پسند نہیں کرتے اس کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ یہ لوگ محض گمان اور نفسانی خواہشات پر چلتے ہیں۔ وگرنہ ان کے پاس ہدایت کی کوئی سند موجود نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی اور کتاب کی صورت میں ہدایت آچکی ہے مگر یہ بدبخت اُسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

فرشتوں کی سفارش

گذشتہ درس میں گزر چکا ہے کہ مشرکین عرب نے لات، عزیٰ اور منات جیسے بُت بنا رکھے تھے جن سے حاجت روائی اور مشکل کشائی چاہتے تھے۔ ان کا یہ زعم باطل تھا کہ یہ معبود ہیں اللہ کے ہاں ضرور چھڑا لیں گے خواہ اللہ تعالیٰ راضی ہو یا ناراض۔ اس طرح وہ گویا جبری سفارش کے قائل تھے۔ اب آج کے درس میں اللہ نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ وہ لوگ فرشتوں کو بھی اپنا سفارشی سمجھتے تھے مگر اللہ نے اُن کے اس باطل عقیدہ کی بھی تردید فرمائی ہے ارشاد ہوتا ہے وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِى السَّمٰوٰتِ آسمانوں میں اللہ کے بہت سے فرشتے ہیں۔ بلاشبہ اللہ کے بیشمار فرشتے ہیں جن کے مختلف درجات ہیں۔ بعض ملاء اعلیٰ کے فرشتے ہیں جو بہت بڑا درجہ رکھتے ہیں۔

بعض حاملین عرش ہیں بعض عرش کے گرد طواف کرنے والے ہیں حظیرۃ القدس کے رہنے والے اور علیین کے فرشتے بھی ہیں پھر آسمانوں میں رہنے والے عام فرشتے ہیں، پھر آسمانِ دنیا کے فرشتے، پھر درجہ بدرجہ فضاؤں کے فرشتے اور پھر ملاءِ سافل کے فرشتے ہیں۔ یہ سب اللہ کی معصوم مخلوق ہے اور ہر وقت احکامِ خداوندی کی تعمیل میں مصروف رہتے ہیں۔ ان سب کی ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ ان کی نگاہ ہمیشہ خداوند تعالیٰ کی تجلی اعظم کی طرف لگی رہتی ہے اور وہ ہر وقت خدا تعالیٰ کا ذکر کرتے رہتے ہیں فرمایا اتنی مقرب مخلوق ہونے کے باوجود ان کا حال یہ ہے لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا ان کی سفارش کچھ کام نہیں دیتی إِلَّا مِن بَعْدِ أَن يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَن يَشَاءُ سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ اس سفارش کی اجازت دے جس کے لیے چاہے۔ اور دوسری بات یہ وَيَرْضَىٰ اور اس کو پسند بھی کرے، مطلب یہ کہ کسی شخص کے حق میں سفارش اللہ تعالیٰ کی اجازت اور اس کی رضا کے ساتھ مشروط ہے۔ ادھر قرآن پاک میں موجود ہے وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ (الزمر ۷) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کفر کو بالکل پسند نہیں کرتا اور یہی حال شرک کا بھی ہے جس کو اللہ نے ظلم عظیم سے تعبیر کیا ہے تو اس لحاظ سے سفارش کا حقدار وہ شخص ہوگا جو کفر کی بجائے ایمان رکھتا ہو اور شرک کی بجائے خالص توحید کا عقیدہ رکھتا ہو۔ اگر یہ دو چیزیں موجود ہیں۔ تو پھر اللہ تعالیٰ چھوٹی موٹی کوتاہیوں سے درگذر فرمائے گا، ایسے شخص کے حق میں سفارش کی اجازت بھی دے گا اور پھر اسے قبول بھی فرمالے گا۔ برخلاف اس کے اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ فلاں بزرگ، نبی اولی یا فرشتہ ضرور ہی سفارش کر کے اللہ تعالیٰ کو منوالے گا تو یہ اس کی خام خیالی ہے۔

امام رازیؒ اس کو جبری سفارش سے تعبیر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اللہ کے ہاں ایسی سفارش کی کوئی حیثیت نہیں۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ جو لوگ ایسی سفارش کے قائل ہیں وہ اللہ تعالیٰ کو دنیا کے حکمرانوں پر قیاس کرتے ہیں۔ دنیا کے سلاطین اور امراء کو تو بعض اوقات کسی کی سفارش مجبوراً ماننی پڑتی ہے کیونکہ اگر وہ ایسا نہیں

کرتے تو اُن کے اقتدار کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ مگر خدا تعالیٰ تو قادرِ مطلق ہے۔ اُسے اُس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنے پر کون مجبور کر سکتا ہے؟ یہ جبری سفارش والا عقیدہ بالکل باطل ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ کسی شخص کی سفارش پیش کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پیشگی اجازت ضروری ہے اگر اللہ تعالیٰ کسی کو سفارش کی اجازت ہی نہیں دیں گے تو کون ہے جو اس کے سامنے دم مار سکے؟ اُس کا واضح فرمان ہے مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ (البقرہ - ۲۵۵) کون ہے جو اللہ کی اجازت کے بغیر اُس کے پاس سفارش کر سکے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں۔ کائنات میں افضل ترین ہستی حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ مبارکہ ہے قیامت والے دن جب مخلوق سخت تکلیف میں ہوگی تو اس وقت اس بات کی ضرورت ہوگی کہ اللہ کی کوئی مقرب ہستی اس کے پاس سفارش کرے کہ وہ مخلوق کی تکلیف کے پیشِ نظر حساب کتاب شروع کرے۔ مخلوق اللہ کے برگزیدہ انبیاء کے پاس جائے گی کہ وہ اُن کی درخواست اللہ کی بارگاہ میں پیش کریں مگر کوئی بھی اس کام کی ہمت نہیں پائے گا۔ بالآخر لوگ حضور خاتم النبیین علیہ السلام کے پاس آئیں گے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں خدا تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤں گا اور اُس کی ایسی تعریفیں بیان کروں گا جو اُسی وقت خود اللہ مجھے الہام کرے گا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام دس سال تک سجدہ میں پڑے رہیں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائیں گے یَا مُحَمَّدُ اِرْفَعْ رَاْسَکَ سَلْ تُعْطَ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ اے محمد! سر اٹھائیں، آپ سوال کریں اُسے پورا کیا جائے گا، اور آپ سفارش کریں اُس کو قبول کیا جائے گا۔ غرضیکہ اللہ کی اجازت کے بغیر اُس کا سب سے برگزیدہ اور امام الانبیاء بھی سفارش کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔

اس کے بعد شفاعتِ صغریٰ ہے جو امت کے گنہگاروں کے حق میں ہوگی بعض لوگوں کے حق میں دوزخ واجب ہو چکی ہوگی۔ مگر حضور علیہ السلام کی سفارش

سے اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمائے گا۔ بعض لوگ دوزخ میں پہنچ چکے ہوں گے اور وہ بھی سفارش سے وہاں سے نکل آئیں گے۔ بعض کی سفارش بلندیٔ درجات کے لیے ہوگی، جو قبول کی جائیگی۔ علیٰ ہذالقیاس جب حضور علیہ السلام کو شفاعت کی اجازت مل جائے گی تو پھر باقی انبیاء، شہداء اور صالحین بھی اللہ کی اجازت سے سفارش کریں گے مگر یہ اسی شخص کے حق میں قبول ہوگی وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا (طٰہٰ ۱۰۹) جس کی بات اللہ تعالیٰ کو پسند ہوگی۔ کوئی بھی سفارش کرنے والا کسی کافر اور مشرک کے حق میں سفارش نہیں کرے گا اور نہ ہی ایسی سفارش قبول ہوگی۔

صحیح حدیث میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو اجازت دی کہ وہ ایک دعا جو نسی چاہیں منظور کرالیں۔ سارے نبیوں نے اپنی اپنی ایک ایک دعا دنیا میں ہی قبول کرالی مگر میں نے اس کو قیامت کے دن تک مؤخر کر دیا جسے میں اپنی امت کی بخشش کے لیے استعمال کروں گا۔ فرمایا وَهِيَ نَائِلَةٌ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنْ أُمَّتِيْ لِمَنْ لَّمْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ شَيْئًا اور میری وہ دعا اور سفارش میری امت کے ہر اس شخص کو پہنچے گی جس نے اللہ کے ساتھ شرک نہ کیا ہوگا۔ مشرک، کافر، منافق، مرتد، زندیق اور ملحد حضور علیہ السلام کی شفاعت سے محروم رہیں گے۔ بہرحال فرمایا کہ آسمانوں میں بہت سے فرشتے ہیں جن کی سفارش کارگر نہیں ہوتی مگر اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اس شخص کے حق میں جس پر وہ راضی ہو۔

منکرین قیامت کی محرومی

آگے ارشاد ہوتا ہے إِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى بے شک وہ لوگ جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے وہ فرشتوں کے عورتوں جیسے نام رکھتے ہیں۔ مطلب یہ کہ منکرین قیامت اول فول باتیں کرتے ہیں مثلاً یہ کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور ان کی مائیں جنیاں ہیں۔ گویا انہوں نے اللہ تعالیٰ اور جنوں کے درمیان رشتہ ثابت کیا ہے۔ فرمایا یہ ایسی فضول باتیں کرتے ہیں حالانکہ وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ان کو اس بات

کا کچھ علم نہیں ہے۔ ایسے لوگ حقیقت سے بے بہرہ ہیں اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ یہ تو محض گمان کا اتباع کرتے ہیں۔ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا اور گمان کا خاصہ یہ ہے کہ یہ حق کے مقابلے میں کچھ کارآمد نہیں ہوتا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک بھی ہے۔ اِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ لوگو اپنے آپ کو بدگمانی سے بچاؤ کیونکہ بدگمانی جھوٹی بات ہوتی ہے۔

مطلق گمان تو ناقابلِ اعتبار نہیں ہے کیونکہ عربی زبان میں ظن گمان کے معنی میں بھی آتا ہے اور یقین کے معنی میں بھی جیسے سورۃ البقرہ میں ہے کہ نماز گراں گذرتی ہے سوائے ان لوگوں کے جن کے دل میں خشیت الٰہی ہے اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (آیت ۴۶) اور یہ وہ لوگ ہیں جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار سے ملاقات کرنے والے ہیں، اور انہیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اسی طرح اگر ظن گمان کے معنی میں ہو تو یہ شک و تردد والی بات ہوتی ہے اور ایسے ہی گمان سے منع کیا گیا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ محض گمان حق کے مقابلے میں کچھ مفید نہیں۔ خاص طور پر اعتقادیات کے معاملہ میں تو گمان پر قطعاً اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کے لیے قرآن و سنت سے قطعی دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ البتہ اعمال میں گمانِ غالب پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ کوئی قطعی دلیل موجود نہ ہو۔ چنانچہ قیاس یا اجتہاد یا تقلید ظن پر عمل کرنے کا نام ہے۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ حق ایسی چیز ہے جسے علم کے ساتھ ہی پایا جا سکتا ہے، اور کوئی عقیدہ قطعی دلیل کے بغیر ثابت نہیں ہوتا اور نہ ہی گمان کا معارفِ حقیقیہ میں اعتبار ہوتا ہے۔ گمان کا اعتبار عملیات میں ہوتا ہے لہٰذا وہاں پر ضعیف احادیث پر بھی عمل کر لیا جاتا ہے۔

صرفِ انسانیا طلبی

آگے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو خطاب کر کے فرمایا ہے فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى عَنْ ذِكْرِنَا پس آپ منہ پھیر لیں اس شخص سے جس نے روگردانی کی ہماری یاد سے

وَلَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا اور نہیں ارادہ کیا مگر صرف دنیا کی زندگی کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص صرف دنیا کا طالب ہے اور آخرت کی کچھ فکر نہیں رکھتا، آپ اس کی طرف زیادہ توجہ نہ دیں بلکہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا ذٰلِکَ مَبْلَغُھُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ان لوگوں کا مبلغ علم یہی ہے یعنی ان کے علم کی پہنچ صرف دنیا کے حصول تک ہی محدود ہے اور آخرت کی انہیں کچھ فکر نہیں۔ سورۃ الروم میں ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا۔ یَعْلَمُوْنَ ظَاھِرًا مِّنَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ وَھُمْ عَنِ الْاٰخِرَۃِ ھُمْ غٰفِلُوْنَ (رایت ۔) کہ یہ لوگ دنیا کی ظاہری زندگی کو ہی جانتے ہیں کہ اس کو کیسے حاصل کرنا ہے اور اس سے کیسے فائدہ اٹھانا ہے، یہ لوگ آخرت کی دائمی زندگی سے بالکل غافل ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اِنْ ھِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ (المؤمنون - ۳۷) ہماری یہ دنیا کی زندگی ہی ہے، اسی میں ہم نے مرنا اور اسی میں جینا ہے، اور ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔ مطلب یہی ہے کہ ان کے ہاں آخرت کا کوئی تصور نہیں ہے حدیث شریف میں آتا ہے اَلدُّنْیَا دَارُ مَنْ لَّا دَارَ لَہٗ دنیا اس شخص کا گھر ہے جس کا آخرت میں کوئی گھر نہیں وَمَالُ مَنْ لَّا مَالَ لَہٗ اور دنیا کا مال اس شخص کا مال ہے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں وَیَجْمَعُ مَنْ لَّا عَقْلَ لَہٗ اور اس مال کو وہی جمع کرتا ہے۔ جو عقل سے محروم ہے۔ ترمذی شریف میں حضور علیہ السلام کی یہ دعا بھی منقول ہے اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلِ الدُّنْیَا اَکْبَرَ ھَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا غَایَۃَ رَغْبَتِنَا اے اللہ! صرف دنیا کو ہی ہمارا بڑا مقصود نہ بنا، اور نہ ہمارا مبلغ علم کہ اس کی پہنچ دنیا تک ہی محدود ہو اور ہماری انتہائی غرض بھی دنیا ہی کو نہ بنا۔

فکرِ معاد اور فکرِ معاش

حضرت عاصم بن ابی النجود محدث فرماتے ہیں ھَمَّانِ لَا بُدَّ لِلْمُؤْمِنِ

هَمُّ الْمَعَاشِ وَهَمُّ الْمَعَادِ مومن کے لیے دو قسم کی فکر ضروری ہے۔ یعنی فکر معاش اور فکر معاد۔ گویا ایک مومن شخص کو دنیا کے لوازمات کی بھی فکر ہونی چاہیے اور آخرت کی زندگی کے لیے بھی توشہ تیار کرنا چاہیے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن پاک میں نیک لوگوں کی دعا بھی یہی سکھائی گئی ہے رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً (البقرہ۔۲۰۱)
اے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی بہتری عطا فرما اور آخرت میں بہتری عطا کر۔
مقصد یہ ہے کہ جس طرح آخرت کی فکر ضروری ہے، اسی طرح دنیا کو بھی فراموش کرنے کی اجازت نہیں کیونکہ ایسا کرنا تو رہبانیت ہے جس کی اجازت نہیں دی گئی۔ مگر ساتھ یہ بھی ہے کہ انسان دنیا کو ہی اپنا منتہائے مقصود نہ بنا لے جیسا کہ آج کل ترقی یافتہ ممالک میں ہو رہا ہے۔ ان لوگوں کے پیش نظر صرف فکر معاش ہے ان کی سوچ، تعلیم، فلسفہ، ٹیکنالوجی سب کچھ دنیا کی بہتری کے لیے ہے، اور آخرت کا تصور نہیں ہے۔ ان کی ساری تگ و دو نفسانی خواہشات کے لیے لہو و لعب اور عیش و آرام کیلئے ہے اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ (یوسف ۵۳)
انسان کا نفس تو اسے برائی پر ہی آمادہ کرتا ہے اور یہ لوگ اسی نفس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ بھلا ان کو آخرت کی فکر کیسے ہو سکتی ہے؟ اگر آخرت کی فکر کریں گے تو عیش و عشرت اور دیگر نفسانی خواہشات کو ترک کرنا پڑے گا، مگر یہ اس کام کے لیے تیار نہیں ہیں۔

گمراہی اور ہدایت

فرمایا آپ ایسے لوگوں کی طرف دھیان نہ کریں جو ہماری یاد سے غافل ہیں اور صرف دنیا کی زندگی کے طالب ہیں۔ اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ بے شک تیرا پروردگار خوب جانتا ہے اس شخص کو جو اس کے راستے سے گمراہ ہوا وَھُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اھْتَدٰی اور وہ اس شخص کو بھی اچھی طرح جانتا ہے جس نے ہدایت کا راستہ اختیار کیا۔ اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے اور وہ ہر شخص کو اس کے عقیدے

عمل، کردار اور اخلاق کے مطابق ہی بدلہ دے گا۔ وہ کسی کی نیکی ضائع نہیں کرے گا اور کسی مجرم کو سزا دیے بغیر نہیں چھوڑے گا۔ آپ اطمینان رکھیں اور اپنا کام کرتے جائیں۔

درس پنجم ۵ — آیت ۳۱ تا ۳۲

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ﴿۳۱﴾ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴿۳۲﴾ ع

ترجمہ:۔ اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں ، تاکہ وہ بدلہ دے اُن لوگوں کو جنہوں نے برائی کی ہے اُس کا جو انہوں نے عمل کیا ۔ اور تاکہ بدلہ دے ان لوگوں کو جنہوں نے اچھائی کی ہے بھلائی کے ساتھ ﴿۳۱﴾ وہ لوگ جو بچتے ہیں کبیرے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے مگر کچھ آلودگی ۔ بیشک تیرا پروردگار بہت وسیع مغفرت والا ہے ۔ وہ جانتا ہے تمہارے حالات جب کہ اس نے تم کو پیدا کیا ہے زمین سے اور جب تم بچے تھے ماؤں کے پیٹوں میں ۔ پس نہ اپنا تزکیہ کرو ، وہ بہتر جانتا ہے اس کو جو تقوے والا ہے ﴿۳۲﴾

ربط آیات

سورۃ کے ابتدائی حصے میں زیادہ تر رسالت کا ذکر ہوا ، پھر توحید کا اثبات

اور شرک کا رد ہوا۔ اس کے بعد جزائے عمل کا بیان ہوا۔ اللہ نے نیکی اور برائی کا اصول بیان فرمایا۔ پھر اپنے پیغمبر سے فرمایا کہ جو لوگ خدا کی یاد سے اعراض کرتے ہیں آپ اُن کی طرف زیادہ دھیان نہ کریں کیونکہ اُن لوگوں کا مقصد محض دنیا کی زندگی ہے اور اُن کا مبلغ علم یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ بے راہ اور ہدایت یافتہ لوگوں کو خوب جانتا ہے۔

جزائے عمل

اب ارشاد ہوتا ہے وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں۔ ہر چیز اُسی کی ملکیت اور اُسی کے تصرف میں ہے۔ اُس نے کائنات کا یہ سلسلہ بیکار محض پیدا نہیں کیا بلکہ اسے کمال حکمت کے ساتھ تخلیق کیا ہے اور اس کا ایک مقصد ہے اور وہ یہ کہ اللہ نے انسان کو خود مختار نہیں بنایا بلکہ وہ احکامِ الٰہی کا پابند ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا یہ حق ہے کہ وہ ہر شخص سے باز پرس کرے کہ اُس نے دُنیا کی زندگی اُس کی عبدیت میں گزاری ہے یا وہ شتر بے مہار کی طرح پھرتا رہا۔ یہی محاسبہ اعمال ہے اور اسی پر اللہ تعالیٰ ہر شخص کے حق میں جزا یا سزا کا فیصلہ کرے گا۔ تو اللہ نے ارض و سماء کی تخلیق کا مقصد یہ بیان فرمایا ہے لِيَجْزِيَ الَّذِينَ اَسَاءُوا بِمَا عَمِلُوا تاکہ اللہ تعالیٰ برائی کا ارتکاب کرنے والوں کو اُن کے بُرے اعمال کا بدلہ دے وَيَجْزِيَ الَّذِينَ اَحْسَنُوا بِالْحُسْنَى اور جنہوں نے نیکی کے کام کیے ہیں اُن کو اچھائی کے ساتھ بدلہ دے۔ مطلب یہ کہ اللہ نے کائنات کو بے سود نہیں پیدا کیا بلکہ ہر نیکی اور برائی کا نتیجہ ظاہر ہونے والا ہے۔ سورۃ آلِ عمران میں اللہ نے فرمایا ہے کہ آسمان و زمین کی تخلیق اور دن رات کے ادل بدل میں صاحبِ عقل لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ اور صاحبِ عقل لوگ وہ ہیں جو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے اپنے پروردگار کو یاد کرتے ہیں اور ارض و سماء کی تخلیق میں غور و فکر کرنے کے بعد کہتے ہیں رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (آیت ۱۹۱) پروردگار یہ سب کچھ تو نے بیکار محض پیدا نہیں کیا، بلکہ اس کی کوئی غایت ہے۔ البتہ کافروں کا خیال یہ ہے کہ کائنات کا پورا نظام ایسے ہی چلتا آرہا ہے

اور اسی طرح جذبات ہے گا ۔ اس کا نہ کوئی مقصد ہے اور نہ کوئی نتیجہ برآمد ہونے والا ہے مگر کوئی بھی سلیم الفطرت انسان کارخانہ قدرت کو بے مقصد نہیں کہہ سکتا ۔ انسان غور و فکر کریگا تو اسی نتیجہ پہ پہنچے گا کہ انسان کے اعمال کا بدلہ اُسے ضرور ملیگا اور اسی کو جزائے عمل کہا گیا ہے جس کا ذکر قرآن نے بار بار کیا ہے اور اسی کی تیاری کے لیے انسان کو زندگی کا لائحہ عمل دیا ہے تاکہ وہ نیکی کے کام انجام دے کر آخرت میں اچھا بدلہ پا سکے ، اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ سکے ۔

معافی کا قانون

آگے نیک لوگوں کی ایک خاص صفت بیان کی گئی ہے جس کے نتیجے میں وہ اللہ کے ہاں اچھے بدلے کے حقدار ہوں گے ۔ فرمایا اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ وہ لوگ جو کبیرہ گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں ، سوائے معمولی آلودگی کے ۔ اس کو شریعت کی اصطلاح میں صغائر کہتے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ بڑے بڑے گناہوں سے بچ جاتے ہیں ، البتہ کچھ چھوٹی چھوٹی خطاؤں کی آلودگی رہ جاتی ہے ۔ تو اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ تو تیرا پروردگار بہت وسیع مغفرت کرنے والا ہے ، وہ چھوٹے چھوٹے گناہوں کو خود ہی معاف فرمائے گا ۔ کیونکہ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ وہ تمہارے حالات کو خوب جانتا ہے ۔ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ جب کہ اُس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا ہے ۔ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں بچے کے طور پر پرورش پا رہے تھے ظاہر ہے کہ اولین انسان اور اللہ کے نبی حضرت آدم کی تخلیق اللہ نے مٹی سے فرمائی اور پھر باقی مخلوق کو سلسلہ تناسل کے ذریعے پیدا کیا ۔ ہر انسان کی خوراک اناج ، پھل ، سبزیاں وغیرہ زمین سے پیدا ہوتی ہیں جو انسانوں کی خوراک بنتی ہیں پھر اسی خوراک سے انسان کے اندر مادہ تولید پیدا ہوتا ہے ، اور پھر اسی مادہ تولید سے انسانی نسل آگے بڑھتی ہے ، تو اس لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے ۔ تو اللہ نے فرمایا کہ میں تمہاری پیدائش کے مادہ کو بھی جانتا ہوں اور تمہاری

اس حالت کو بھی جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں پرورش پاتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے خون کو تمھاری خوراک بنایا ہے۔ پھر جب دنیا میں آتے ہو تو اللہ تعالیٰ تمھاری خوراک اور دوسری ضروریات زندگی کا انتظام فرماتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھاری زندگی کا کوئی گوشہ اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں اگر تم بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے بچ جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تمھاری چھوٹی چھوٹی خطائیں معاف فرمائے گا۔ کیونکہ وہ بڑی وسیع مغفرت کا مالک ہے۔ اس ساری یاد دہانی کا مقصد یہی ہے کہ تمھیں تمھارے عقائد و اعمال کا حساب ایک دن چکانا ہے، لہٰذا کبائر اور فحاشی سے بچ کر اللہ کی مغفرت کے حقدار بن جاؤ۔

کبائر سے بچنے والے لوگوں کے صغائر کی معافی کا قانون اللہ نے سورۃ النساء میں بھی بیان فرمایا ہے اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (آیت۔ ۳۱) اگر تم کبائر سے بچتے رہو گے تو ہم تمھاری چھوٹی چھوٹی خطائیں معاف کرتے رہیں گے انسان خطا کا پتلا ہے، اس سے کوئی نہ کوئی غلطی سرزد ہوتی ہی رہتی ہے۔ تو اللہ نے فرمایا کہ بڑے گناہوں سے بچ جانے کی صورت میں چھوٹے گناہوں کو ہم از خود معاف کر دیں گے۔ سورۃ ہود میں ہے اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (آیت۔ ۱۱۴) بے شک انسان کی نیکیاں اس کی برائیوں کو دور کرتی رہتی ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ جب کوئی ایماندار آدمی وضو کے لیے ہاتھ دھوتا ہے تو اس کے ہاتھوں کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ جب منہ دھوتا ہے تو منہ کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور جب پاؤں دھوتا ہے تو پاؤں کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اور پھر جب نماز پڑھتا ہے، نیکی کے دوسرے کام کرتا ہے تو صغائر معاف ہوتے رہتے ہیں حتیٰ کہ آدمی پاک ہو جاتا ہے بشرطیکہ کبائر سے بچتا ہے، اس کے علاوہ معافی کا کوئی قانون نہیں بلکہ گرفت ہوگی۔ اگر کبائر سے نہیں بچا تو صغائر پر گرفت ہونے کا بھی خطرہ ہے اور کبائر کی معافی توبہ سے ہوتی ہے جیسے اللہ

کافرمان ہے۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ (البقرہ۔ ۱۶۰) جو لوگ توبہ کر کے اپنے حالات کو درست کرتے ہیں۔ اور احکام الٰہی کو صاف صاف بیان کر دیتے ہیں تو میں اُن کی توبہ قبول کرتا ہوں یعنی اُن کے گناہ معاف کر دیتا ہوں

کبائر کا تعلق حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کے ساتھ ہے۔ اگر انسان سچے دل سے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ حقوق اللہ سے متعلق گناہ معاف کر دیتا ہے البتہ حقوق العباد سے متعلقہ گناہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک خود صاحب حق معاف نہ کرے۔ یاد رہے کہ کبیرہ گناہ وہ ہے جس پر اللہ نے جہنم کی وعید سنائی ہے، یا جس گناہ پر کوئی حد جاری ہوتی ہے، جیسے شراب نوشی، چوری، ڈاکہ، قتل وغیرہ۔ یا ایسا گناہ بھی کبیرہ کی فہرست میں آتا ہے۔ جس کے مرتکب پر لعنت کی گئی ہے، جیسے فرمایا لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ (آل عمران ۶۱) جس گناہ پر اللہ نے اپنی ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے یا جس پر خدا تعالیٰ کے غضب کی وعید آئی ہے، وہ بھی کبیرہ گناہ شمار ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ صغیرہ گناہ میں وہ شدت نہیں ہوتی جو کبیرہ میں ہوتی ہے، البتہ اس میں خرابی کا کچھ مظنہ ہوتا ہے جس سے آگے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ شاہ صاحبؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ کبیرہ گناہ میں ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اُس کے نتیجے میں سزا آتی ہے اور دوسری طرف اس سے ارتفاقات خراب ہوتے ہیں، دنیا میں اسباب معیشت بگڑ جاتے ہیں، اخلاق خراب ہوتے ہیں اور پورا معاشرہ بگڑ جاتا ہے، اور اس کی وجہ سے نحوست آگے آتی ہے۔ یہ ایسی نحوست ہوتی ہے کہ جس سے انسان اور جانور یکساں طور پر متاثر ہوتے ہیں یہی فساد فی الارض ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (الاعراف۔ ۵۶) زمین کی اصلاح ہو جانے کے بعد اس میں فساد نہ بپا کرو کہ اس سے ہر چیز بگڑ جاتی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ اثم یعنی گناہ کی تعریف یہ ہے کہ یہ دل میں کھٹکتا ہے اور تم نہیں چاہتے کہ لوگ اس پر مطلع ہوں۔ چنانچہ دنیا میں جو اخلاقی بگاڑ پایا جاتا ہے۔ وہ اکثر و بیشتر گناہوں کا نتیجہ ہوتا ہے، لڑائی جھگڑے، خیانت، لوٹ مار، قتل سب گناہوں کا شاخسانہ ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ طہارت ہمارے دین کا بنیادی اصول ہے، اور اس میں ہر قسم کی طہارت داخل ہے۔ انسان کے جسم اور لباس کی طہارت ضروری ہے قلب اور دماغ کی طہارت ضروری ہے خوراک اور مکان کی پاکیزگی کی ضرورت ہے اور اس طرح پورے معاشرے کی طہارت ہونی چاہیئے۔ ہر شہر اور قصبہ کے گلی کوچے اور بازار پاک ہونے چاہئیں، میونسپل کمیٹیاں اور اسمبلیاں پاک ہوں تاکہ وہاں گندے قوانین پاس نہ ہوں، بلکہ شریعت کا پاک قانون جاری ہو۔ جب ہمارے قوانین ہی ناپاک ہیں تو سوسائٹی کیسے پاک ہو سکتی ہے۔ ابھی تک انگریزی قانون تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ رائج ہے، ملازم راشی اور بددیانت ہیں الا ماشاء اللہ۔ تو ایسے میں مکمل طہارت کی کیسے توقع کی جا سکتی ہے؟ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ لوگ کہیں گے فلاں آدمی بڑے ہوشیار، چالاک اور عقلمند ہیں مگر ان کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہوگا۔ بہر حال گناہوں کی معافی توبہ سے ہوتی ہے اور حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ میں دن بھر میں سو سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں، لوگو! تم بھی اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کیا کرو۔

خودستائی کی ممانعت

اللہ تعالیٰ نے انسان کی مٹی سے تخلیق اور ماں کے پیٹ میں پرورش کرنے کا ذکر کر کے فرمایا فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ لوگو! اپنا تزکیہ نہ کیا کرو یعنی اپنی بڑائی آپ نہ بیان کیا کرو۔ حضور علیہ السلام کی خدمت میں ایک بچی کو لایا گیا آپ نے پوچھا۔ اس کا نام کیا ہے؟ بتایا گیا کہ اس کا نام برّہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بڑی نیکی والی بچی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس نام سے خودستائی کا پہلو نکلتا ہے۔ لہٰذا اس کا نام بدل کر زینب رکھ دو۔ تم اپنے منہ میاں مٹھو نہ بنو، اللہ تعالیٰ تمہاری

حالت، صلاحیت اور انجام کو بہتر جانتا ہے۔ حضرت مقدادؓ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا اُحْثُوا التُّرَابَ فِیْ وُجُوْہِ الْمَدَّاحِیْنَ تعریف کرنے والے کے منہ میں مٹی ڈال دو یعنی ان کو ناکام بنا دو۔ ایسی تعریف کو پسند نہیں کیا گیا۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ امیروں، وزیروں اور عہدیداروں کی اُن کے حاشیہ بردار کتنی تعریفیں کرتے ہیں اُن کو سپاس نامے پیش کیے جاتے ہیں جس میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں، آپ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ ہاں اگر کسی میں کوئی خوبی ہے تو اُسے قطعیت کے ساتھ مت بیان کرو بلکہ یوں کہو کہ میں فلاں شخص کے بارے یہ گمان کرتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ ہی اُس کے لیے کفایت کرنے والا ہے۔ فرمایا فَلَا اُزَکِّیْ عَلَی اللّٰہِ اَحَدًا میں اللہ کے سامنے کسی کا تذکیہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اُس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹا دینا چاہیئے کہ ہم تو اچھا گمان کرتے ہیں۔ تاہم اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

ہاں جس کی خوبی کے متعلق قطعی یقین ہو یا جس کی تعریف کا اللہ نے حکم دیا ہے، اُن کی تعریف کی جا سکتی ہے۔ ایسے معاملہ میں بھی مبالغہ آرائی سے منع کیا گیا ہے، صرف حقیقت بیان کرنے کی اجازت ہے۔ خود حضور علیہ السلام نے اپنی ذات کے متعلق فرمایا لَا تُطْرُوْنِیْ کَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ لوگو! میری تعریف میں مبالغہ نہ کرنا جیسا کہ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے متعلق اختیار کیا۔ انہوں نے مسیح علیہ السلام کو الوہیت کا درجہ دے کر خود کافر اور مشرک بن گئے میرے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرنا اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ میں تو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، تم بھی مجھے اللہ کا بندہ اور رسول ہی کہو۔

فرمایا اپنا تزکیہ مت کرو ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی وہ خوب جانتا ہے اُس شخص کو جو تقویٰ کرنے والا ہے۔ اگر اللہ نے کسی اچھے کام کی توفیق دی یا کوئی خوبی رکھ دی ہے تو اُس پر اترانا نہیں چاہیئے۔ کیونکہ آپ کو

پاکباز نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اس نے کوئی اچھا کام کرنے کی توفیق بخشی ہے۔

درس ششم ۶ آیت ۳۳ تا ۴۲

أَفَرَءَيْتَ الَّذِي تَوَلَّىٰ ﴿٣٣﴾ وَأَعْطَىٰ قَلِيلًا وَأَكْدَىٰ ﴿٣٤﴾ أَعِندَهُ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرَىٰ ﴿٣٥﴾ أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَىٰ ﴿٣٦﴾ وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّىٰ ﴿٣٧﴾ أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ﴿٣٨﴾ وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ﴿٣٩﴾ وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ ﴿٤٠﴾ ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَىٰ ﴿٤١﴾ وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنتَهَىٰ ﴿٤٢﴾

ترجمہ:- کیا آپ نے دیکھا ہے اُس شخص کو جس نے منہ پھیر لیا ﴿٣٣﴾ اُس نے تھوڑا سا دیا اور بہت سخت نکلا ﴿٣٤﴾ کیا اُس کے پاس غیب کی خبر ہے، پس وہ دیکھتا ہے ﴿٣٥﴾ کیا اُس کو نہیں پہنچی وہ خبر جو موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں ہے ﴿٣٦﴾ اور ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں ہے جنہوں نے اپنا قول پورا کیا ﴿٣٧﴾ (یہ خبر) کہ نہیں اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ ﴿٣٨﴾ اور یہ کہ نہیں انسان کے لیے مگر وہ جو اُس نے کمایا ﴿٣٩﴾ اور بیشک اُس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی ﴿٤٠﴾ پھر اُس کو بدلہ دیا جائے گا پورا پورا بدلہ ﴿٤١﴾ اور بیشک تیرے پروردگار کی طرف ہی سب کی انتہا ہے ﴿٤٢﴾

ربطِ آیات اس سورۃ مبارکہ میں نبوت و رسالت کا ذکر ہوا۔ پھر شرک کی تردید ہوئی۔

جزائے عمل کا مسئلہ بیان ہوا۔ نیک و بد کے بدلے کا تذکرہ ہوا۔ پھر نیکی والے لوگوں کے اوصاف بیان ہوئے کہ وہ کبائر اور بے حیائی سے بچتے ہیں اور اگر کوئی تھوڑی سی آلودگی رہ جائے یا صغائر سرزد ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنی وسیع مغفرت کی وجہ سے انہیں معاف کر دیتا ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ تمہارے تمام حالات سے باخبر ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ جب تم ماں کے پیٹ میں جنین تھے تو وہ اس وقت کے حالات سے بھی واقف ہے، وہی تمہیں وہاں بھی خوراک پہنچاتا رہا۔ پھر اللہ نے خود پسندی اور خودستائی سے منع فرمایا۔ فرمایا اپنے آپ کو پاکباز نہ بناؤ۔ اللہ تعالیٰ اُس شخص کو خوب جانتا ہے جس نے تقویٰ کی راہ اختیار کی۔

ایمان لانے میں سنگدلی کا مظاہرہ

آج کے درس میں بھی جزائے عمل ہی کے سلسلہ میں اللہ نے مشرکین کا شکوہ بیان کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اَفَرَءَیْتَ الَّذِیْ تَوَلّٰی کیا تم نے اُس شخص کو دیکھا ہے جس نے روگردانی کی ہے یعنی اُس نے نہ تو اپنی اصل میں غور کیا اور نہ خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کی، بلکہ اُس کی توحید کو تسلیم کر لے اور اُس کی یاد سے منہ موڑ لیا۔ اس قسم کے مشرکین ہر دور میں رہے ہیں اور نزولِ قرآن کے زمانے میں مکے میں بھی تھے۔ جب بھی اُن کی توجہ دینِ حق، اللہ کی توحید اور جزائے عمل کی طرف دلائی جاتی تو وہ منہ موڑ لیتے اور باطل خیالات اور عقائد میں ہی مگن رہتے۔ فرمایا اُس شخص کو دیکھو جس نے منہ پھیر لیا۔ وَاَعْطٰی قَلِیْلًا وَّاَکْدٰی اور بہت تھوڑا دیا اور بڑا سخت نکلا۔ شاہ عبدالقادرؒ اس کا معنی یہ کرتے ہیں کہ وہ شخص تھوڑا سا ایمان کی طرف مائل ہوا مگر اس کا دل پھر سخت ہو گیا۔

مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ اس شخص سے مراد ولید ابن مغیرہ اور اسی قسم کے دوسرے مشرک ہیں۔ ولید ابن مغیرہ کے متعلق آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کی باتیں سنتا تھا تو بعض اوقات اس کے دل میں اسلام کی طرف میلان پیدا ہو جاتا تھا، کفر اور شرک کی سزا سن کر کبھی کبھی وہ ڈر جاتا تھا، لیکن دوسرے مشرکوں کے کہنے سے دین کی طرف سے منہ موڑ لیتا تھا۔ کدیہ اس چٹان کو کہتے ہیں جو کنواں وغیرہ کھودتے وقت

درمیان میں آجاتی ہے اور وہ اتنی سخت ہوتی ہے کہ اس کا توڑنا مشکل ہوتا ہے۔ تو یہاں پر اکدٰی کا معنی یہی کیا گیا ہے، وہ سخت نکلا یعنی ایمان لانے میں بڑا سخت ثابت ہوا۔ فرمایا اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى کیا اس کے پاس غیب کی کوئی خبر ہے جسے وہ دیکھ رہا ہے؟ یعنی وہ اس غیب کی بنا پر سمجھتا ہے کہ اُسے کفر اور شرک کی سزا نہیں ملے گی، لہٰذا وہ اس پر اڑا ہوا ہے۔ مشرکوں کی اس ہٹ دھرمی کو اللہ نے اُن کی سنگدلی سے تعبیر کیا ہے۔

صحائف موسیٰ اور ابراہیم علیہما السلام

فرمایا اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى کیا اُس کو نہیں پہنچی وہ خبر جو موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں ہے وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى اور ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں بھی ہے جنہوں نے اپنے قول کو پورا کیا۔ موسیٰ علیہ السلام کو تو اللہ نے تورات جیسی عظیم کتاب عطا فرمائی، ہو سکتا ہے کہ تورات کے علاوہ آپ کو بعض صحائف بھی ملے ہوں جن کا ذکر اللہ نے سورۃ الاعلیٰ میں بھی کیا ہے اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى یہ بات پہلے صحیفوں میں بھی موجود ہے یعنی ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تورات کے مختلف ابواب کو ہی مختلف صحائف سے تعبیر کیا گیا ہو جیسے قرآن کریم کی ہر صورت ایک مکمل صحیفہ ہے اور ابراہیم علیہ السلام کے اپنے قول و اقرار کو پورا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ہر عہد و پیمان کو پورا کیا اور اللہ کی طرف سے آنے والی بڑی سے بڑی آزمائش میں بھی پورا اترے، اور انہوں نے اللہ کی رضا کی خاطر ہر مطلوبہ قربانی پیش کی۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے قلب کو ہمیشہ رحمان کے لیے صاف رکھا، اور اُن کا قلب سلیم ہر وقت خدا تعالیٰ کی یاد سے لبریز رہتا تھا۔ اُن کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ اُن کا مال ہمیشہ مہمانوں کی خدمت کے لیے وقف رہتا، شاید ہی کوئی ایسا وقت ہو گا جب وہ کسی مہمان کے ہمراہ کھانا نہ کھاتے ہوں۔ پھر جب امتحان کا وقت آیا تو آپ نے اپنے کو آگ کے سپرد کرنے میں بھی ذرا تامل نہ کیا، بلکہ جب جبرائیلؑ اور میکائیلؑ نے امداد کی پیشکش

کی تو آپ نے اُسے بھی قبول نہ کیا اور فرمایا کہ مجھے تمھاری مدد کی ضرورت نہیں میری ضرورت جس کی طرف ہے وہ مجھ کو جانتا ہے۔ یہی ابراہیم علیہ السلام کا اخلاص اور وفاداری تھی جس کے متعلق بیان فرمایا ہے کہ انھوں نے اپنے قول یا عہد کو پورا کیا

بوجھ اپنا اپنا

فرمایا کیا تجھے وہ بات پہنچی ہے جو موسیٰ اور ابراہیم علیہما السلام کے صحیفوں میں لکھی ہوئی ہے؟ اور وہ یہ بات ہے: اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ ہر ایک کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑے گا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص اسلام کی طرف رغبت کرتا اور وہ ایمان لانے کے قریب ہوتا تو بڑے بڑے کافر اور مشرک اس کو باز رہنے کی تلقین کرتے اور کہتے کہ تم اپنے دین پر قائم رہو اور اہلِ ایمان کے بقول اگر تم پر کوئی گناہ لازم آیا تو اس کا بوجھ ہم اٹھالیں گے۔ بعض اوقات وہ اس خدمت کے لیے کچھ مال بھی وصول کر لیتے تھے مگر اللہ نے اس باطل نظریے کا رد فرمایا ہے اور واضح کیا ہے کہ سابقہ صحائف میں یہ بات درج ہے کہ کوئی ایک دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا حتیٰ کہ قریبی عزیز، رشتہ دار، باپ، بیٹا، ماں یا بیوی بھی ایک دوسرے کے کام نہ آسکیں گے۔ اس سے نصاریٰ کے باطل عقیدہ کا بھی رد ہو جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام نے سولی پر چڑھ کر ہمارا بوجھ اٹھالیا ہے اور اب ہم آزاد ہیں۔ جو چاہیں کرتے پھریں، ہمیں کچھ فکر نہیں۔ جبری سفارش والا عقیدہ بھی ایسا ہی ہے کہ فلاں نبی، ولی، پیر یا فرشتہ اڑ جائے گا ہمیں چھڑا لے گا۔ خواہ اللہ تعالیٰ راضی ہو یا ناراض۔ سورۃ العنکبوت میں اللہ نے کفار کا یہ واضح بیان نقل کیا۔ یہ تو مومنوں سے کہتے تھے اِتَّبِعُوْا سَبِیْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰیٰکُمْ (آیت-۱۲) کہ ہمارے طریقے کی پیروی کرو ہم تمھارے گناہوں کا بوجھ اٹھالیں گے۔ مگر اللہ نے فرمایا کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں، کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ یہ بات اصولاً غلط ہے

فرمایا یہ بھی یاد رکھو وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی اور نہیں ہے انسان کے لیے مگر وہی کچھ جو اس نے کوشش کی یعنی کمایا۔ ہر انسان کو اس کی محنت

ہی کا ثمرہ ملے گا کسی ایک کی کمائی دوسرے کے لیے مفید نہیں ہوگی، مطلب یہ کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی نیکیاں نہیں لے سکیگا۔ اس کے برخلاف احادیث سے ثابت ہے کہ صدقہ خیرات اور دعاؤں کا فائدہ مرنے والے کو پہنچتا ہے۔ اسی طرح استغفار کا فائدہ نص قرآنی سے ثابت ہے۔ سورۃ المؤمن میں ہے کہ عرش عظیم کو اٹھانے والے اور اس کے گرد حلقہ باندھے ہوئے فرشتے اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کرتے ہیں، وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا (آیت ۔ ۷) اور اہل ایمان کے لیے بخشش کی دعائیں کرتے ہیں۔ اسی طرح پچھلی سورۃ الطور میں گزر چکا ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور اُن کی اولاد نے بھی ایمان میں اُن کا اتباع کیا أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ (آیت ۔ ۲۱) ہم اُن کی اولادوں کو بھی مومنوں کے ساتھ ملا دیں گے مطلب یہ کہ اگر اولاد کے اعمال کم بھی ہوں گے تو ان کے والدین کی نیکی اور ایمان کی وجہ سے اُن کو بھی اعلیٰ درجہ مل جائے گا۔ اس سے بھی دوسرے کی نیکی سے مستفید ہونے کا عندیہ ملتا ہے۔

حضرت سعدؓ نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور! میری والدہ فوت ہوگئی ہے، کیا میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو اس کو فائدہ ہوگا؟ آپ نے فرمایا، ہاں۔ چنانچہ حضرت سعدؓ نے ایک باغ اور ایک کنواں والدہ کے ایصالِ ثواب کے لیے وقف کر دیا۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایک کی نیکی دوسرے کے کام آسکے گی۔

ایصالِ ثواب کا مسئلہ

دراصل ایصالِ ثواب کے مسئلہ میں ائمہ کرام کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام مالکؒ، اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مالی عبادت تو دوسروں کے لیے مفید ہو سکتی ہے اور اس میں دوسرے کی نیابت بھی ہو سکتی ہے جیسے حج بدل ادا کیا جا سکتا ہے یا صدقہ خیرات کا ثواب دوسرے کو ہبہ کیا جا سکتا ہے مگر نماز، روزہ یا تلاوت قرآن کا ثواب دوسرے کو نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ بدنی عبادات میں نیابت نہیں ہو سکتی۔

اس کے برخلاف امام ابوحنیفہؒ، اور امام احمدؒ اور جمہور علما وفقہا رکھتے ہیں کہ بدنی عبادت کا فائدہ بھی دوسرے کو پہنچتا ہے اور اس میں تلاوتِ قرآن پاک بھی شامل ہے۔ اسی طرح صدقہ خیرات، استغفار اور حج وعمرہ کا ثواب بھی پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ شفاعت کا عقیدہ بھی مسلّم ہے۔ حضور علیہ السلام اور دوسرے انبیاء، شہداء اور صالحین بھی شفاعت کریں گے جو اللہ کے اِذن سے ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی مفید ہوگی۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس آیت میں دو چیزوں کی طرف اشارہ ہے یعنی عدل اور فضل فرماتے ہیں کہ اس آیت کا ظاہر تو عدل پر مبنی ہے اور عدل کا تقاضا یہی ہے کہ ہر شخص کو اس کی اپنی کمائی کا بدلہ ملے نہ کہ دوسروں کی کمائی کا۔ البتہ فضل کا تقاضا یہ ہے کہ کسی کو کسی دوسرے کی نیکی کا فائدہ بھی پہنچے جیساکہ پہلے عرض کیا کہ اولاد کو اُس کے والدین کی نیکی کی وجہ سے اعلیٰ درجے میں جگہ دے دی جائیگی۔

بعض فرماتے ہیں کہ اس آیت میں چونکہ کافروں کا ذکر ہو رہا ہے، اس لیے اس سے مراد یہ ہے کہ کافروں کو کسی دوسرے کی نیکی کا فائدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ سورۃ الشعراء میں موجود ہے یَوۡمَ لَا یَنۡفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوۡنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنۡ اَتَی اللّٰہَ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ ﴿۸۹﴾ اس دن نہ مال فائدہ دے گا اور نہ بیٹے۔ ہاں! جو شخص اللہ کے پاس قلبِ سلیم لے کر پہنچ گیا وہ بچ جائیگا۔ مطلب یہ کہ اگر ایمان درست ہے تو اس سے فائدے کی اُمید ہو سکتی ہے، مگر کفار کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اور ایک بات یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ اگر کوئی شخص نیک کام کرتے وقت نیت کر لے کہ اللہ تعالیٰ اس نیکی کا ثواب فلاں کو عطا کر دے، تو پھر نیکی کا یہ عمل کرنے والا دوسرے شخص کا نائب بن گیا، اور اس طرح اُس کی نیکی کا ثواب دوسرے کو پہنچ جائیگا ہاں! اگر نیکی کرتے وقت نیت نہیں کی، تو پھر اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔

صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اُس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے مگر تین چیزوں کا فائدہ اُسے مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے۔ فرمایا۔ ایک تو

صدقۂ جاریہ ہے جو خود مرنے والا جاری کر گیا ہے، اس کا ثواب اُس کو مرنے کے بعد بھی حاصل ہوتا رہے گا۔ دوسری چیز علمِ نافع ہے کہ جب تک اُس کے جاری کردہ علم سے لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں گے، اس جاری کرنے والے کو بھی برابر ثواب ملتا رہے گا۔ تیسری چیز فرمایا وَلَدٌ صَالِحٌ یَدْعُوْ لَهٗ نیک اولاد ہے جو میت کے لیے دعائیں کرتی ہے، اُن دُعاؤں کا فائدہ بھی مرنے والے کو حاصل ہوتا ہے۔

امام ابونعیمؒ نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی عبدِ مومن کی روح کو قبض کر لیتا ہے تو دو فرشتے بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتے ہیں کہ مولا کریم! تو نے ہمیں اس مومن بندے کے ساتھ مقرر کیا تھا، ہم اس کی نیکیاں لکھتے تھے، اب تو نے اُس کو قبض کر لیا تو ہمیں اجازت دے کہ ہم زمین پر ہی رہ جائیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میری زمین تو مخلوق سے بھری ہوئی ہے اور وہ لوگ میری تسبیح بھی بیان کرتے ہیں، مگر تم ایسا کرو کہ میرے اس بندۂ مومن کی قبر پہ چلے جاؤ، میری تسبیح، تحمید، تہلیل اور تکبیر بیان کرتے رہو جس کا ثواب قیامت تک میرے بندے کے نامۂ اعمال میں درج ہوتا رہے گا۔ یہ صرف عبدِ مومن کے لیے ہے، نہ کہ ہر ایک کے لیے کیونکہ دوسرے کے عمل سے مستفید ہونے کے لیے ایمان کا ہونا ضروری ہے۔

اس بحث کا حاصل یہ ہوا کہ ایصالِ ثواب کا انکار درست نہیں مگر فرائض واجبات اور سنن میں کوئی شخص دوسرے کی نیابت نہیں کر سکتا۔ یہ عبادات تو ہر مکلف آدمی کو خود ہی ادا کرنا ہوں گی، البتہ روزے کے متعلق کہا گیا ہے کہ اگر کسی کا روزہ رہ جائے تو اس کے کسی عزیز کی طرف سے روزہ رکھنے سے اُس کا روزہ ادا ہو جائیگا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ اس سے مراد فدیہ ادا کرنا ہے۔ بزرگ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس طرح ادا کرنے سے فرض روزہ تو ادا نہیں ہوگا، ہاں اگر متوفی کے مال میں سے فدیہ دے دیا جائے گا تو اس کے ذمے سے فرض ادا ہو جائے گا۔ باقی رہا نفلی روزے کا ثواب دوسرے شخص کو پہنچتا ہے۔ مولانا علامہ انور شاہ کشمیریؒ شرح بخاری میں لکھتے ہیں

کہ نفلی روزے کا ثواب یقیناً پہنچتا ہے، البتہ فرائض، واجبات اور سنن کے لیے ہر شخص بذاتِ خود ذمہ دار ہے۔ چنانچہ احناف کا مسلک یہ ہے کہ اپنی نفلی عبادت مثلاً نفلی حج، عمرہ، نماز، روزہ، صدقہ خیرات وغیرہ کا ثواب اگر دوسرے مسلمان کو دینا چاہے تو ایسا کر سکتا ہے البتہ دعا کے ثواب کے تو سارے ہی قائل ہیں۔ اور اس کا کوئی بھی انکار نہیں کرتا۔ نفلی عبادت میں تلاوتِ قرآن بھی شامل ہے۔ مگر امام شافعیؒ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ نفلی عبادت کا فائدہ دوسرے شخص کو نہیں پہنچتا لیکن امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ تلاوت بہترین نفلی عبادت ہے اور اگر کوئی شخص اس کا ثواب دوسرے کو بخش دے تو امید ہے کہ اس کا فائدہ ہوگا۔

یہ ایصالِ ثواب کا مسئلہ بھی بیان ہو گیا۔

کوشش کا بدلہ

فرمایا وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى اور بیشک انسان کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی۔ دنیا میں رہ کر کسی شخص نے جو کچھ بھی نیک کام کیا ہے یا کسی برائی کا ارتکاب کیا ہے وہ سب کچھ قیامت والے دن ظاہر ہو جائے گا۔ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى پھر اس شخص کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ فرمایا، یاد رکھو! وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ہر ایک کی انتہا تیرے پروردگار کی طرف ہی ہے۔ اس دنیا کی زندگی کو پورا کرنے کے بعد ہر انسان کو اللہ کے دربار میں پہنچ کر حساب کتاب کی منزل طے کرنا ہے اور پھر اس کے مطابق ہر اچھے یا برے عمل کا بدلہ پانا ہے۔ آخری فیصلہ وہیں ہوگا۔

درس ہفتم ۷ — آیت ۴۳ تا ۶۲

وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ﴿۴۳﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ﴿۴۴﴾ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۴۵﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ﴿۴۶﴾ وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ﴿۴۷﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى ﴿۴۸﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ﴿۴۹﴾ وَاَنَّهٗ اَهْلَكَ عَادَا الْاُوْلٰى ﴿۵۰﴾ وَثَمُوْدَا فَمَاۤ اَبْقٰى ﴿۵۱﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى ﴿۵۲﴾ وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ﴿۵۳﴾ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴿۵۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴿۵۵﴾ هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ﴿۵۶﴾ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ﴿۵۷﴾ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴿۵۸﴾ اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ﴿۶۱﴾ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴿۶۲﴾ ۩

ترجمہ:۔ اور بیشک وہی ہے جو ہنساتا اور رلاتا ہے (۴۳) اور بیشک وہی ہے جو موت طاری کرتا اور جو زندگی بخشتا ہے (۴۴) اور بیشک وہی ہے جس نے پیدا کیا جوڑا جوڑا، نر اور مادہ (۴۵) ایک قطرہ آب سے جب کہ وہ ٹپکایا جاتا ہے (۴۶) اور بیشک

اُسی کے ذمے ہے دوسری دفعہ اٹھانا (۴۷) اور بیشک وہی ہے جس نے مغنی بنایا اور محتاج بنایا (۴۸) اور بیشک وہی ہے شعریٰ کا پروردگار (۴۹) اور بیشک وہی ہے جس نے ہلاک کیا عاد اولیٰ کو (۵۰) اور ثمود کو، پھر کسی کو باقی نہ چھوڑا (۵۱) اور قوم نوح کو اس سے پہلے، بیشک تھے وہ بڑے ظالم اور بڑے سرکش (۵۲) اور الٹی بستی والوں کو پٹخ دیا (۵۳) پس ڈھانپ لیا اُس کو اُس چیز نے جس نے ڈھانپ لیا (۵۴) پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت میں شک کرو گے (۵۵) یہ ڈر سنانے والا ہے پہلے ڈرسنانے والوں میں سے (۵۶) قریب آگئی ہے قریب آنے والی (۵۷) نہیں ہے اُس کو اللہ کے سوا کوئی کھول کر دکھانے والا (۵۸) کیا اس بات سے تم تعجب کرتے ہو (۵۹) اور ہنستے ہو اور روتے نہیں (۶۰) اور تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو (۶۱) پس سجدہ کرو اللہ کے سامنے اور عبادت کرو اسکی (۶۲)

ربط آیات

اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی توحید، رسالت اور معاد کو اکٹھا ہی بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ نے اشارۃً ان لوگوں کا ذکر بھی کیا ہے جن کو اُن کی سرکشی کی بناء پر ہلاک کیا گیا۔ ایمان سے گریز کرنیوالوں کو تنبیہ کی گئی ہے اور واضح کر دیا گیا ہے کہ جزائے عمل لازماً واقع ہونے والی ہے اور ہر شخص کو اپنا بوجھ خود اٹھانا ہوگا۔ ہر نیکی اور بدی کی جوابدہی کرنا ہوگی۔ کسی کی برائی کسی دوسرے کے ذمے نہیں لگائی جائے گی۔ اگر کسی شخص نے خود ایمان قبول نہیں کیا اور نیکی نہیں کمائی تو آگے دوسرے کی نیکی مفید نہیں ہوگی۔ انسان کی سعی کو عنقریب دیکھا جائے گا۔ ہر ایک کو پروردگار کے سامنے حاضر ہونا ہے اور پھر ہر ایک

کو اُس کی کارگزاری کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔ اب آخر میں اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا ذکر ہو رہا ہے جن سے توحید اور وقوعِ قیامت کی بات سمجھ میں آتی ہے۔

متضاد چیزوں کا خالق

ارشاد ہوتا ہے وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰی اور بیشک اللہ تعالیٰ کی وہی ذات ہے جو ہنساتا اور رلاتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ مبارک ہے کہ اگر تم بھی اُن چیزوں کو دیکھتے جن کو میں دیکھتا ہوں تو یقیناً تم روتے زیادہ اور ہنستے کم۔ لیکن چونکہ وہ چیزیں تم سے پردۂ غیب میں ہیں اس لیے تم ہنسی میں ہی مگن رہتے ہو۔ ہنسنا اور رونا امورِ طبعیہ میں سے ہے، یہ حالت اللہ کے پیغمبر پر بھی طاری ہوتی تھی البتہ قہقہہ لگا کر ہنسنا غفلت کی نشانی ہے۔ اگر کوئی شخص نماز کے دوران قہقہہ لگا کر ہنس پڑتا ہے تو اُس کی نماز فاسد ہو جائے گی اور وضو بھی ٹوٹ جائے گا۔ البتہ تبسم یعنی مسکرانا جائز ہے۔ کسی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے پوچھا کہ کیا حضور علیہ السلام کے صحابہؓ کبھی ہنستے بھی تھے، تو آپ نے فرمایا ہاں، مگر اُن کے دلوں میں ایمان پہاڑوں سے بھی زیادہ مضبوط تھا اور اُن میں غفلت نہیں پیدا ہوتی تھی۔

پھر فرمایا وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا اور بیشک وہ وہی ذات ہے جو موت طاری کرتا اور زندگی بخشتا ہے۔ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰی اور بیشک وہ وہی ذات ہے جس نے جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے یعنی نر اور مادہ اللہ نے جہاں پھر کی چیزوں کو متضاد اور متقابل شکل میں پیدا کیا ہے، جیسے خیر و شر کا خالق بھی وہی ہے، اور خوشی اور غمی بھی اللہ ہی کی پیدا کردہ ہے۔ یہاں انسان کے متعلق فرمایا کہ اُسے نر اور مادہ کی شکل میں پیدا کیا، تاہم جانداروں کی بھی یہی صورتِ حال ہے، وہ بھی نر اور مادہ پیدا ہوتے ہیں حتیٰ کہ اشجار اور نباتات میں بھی اللہ نے کسی حد تک جنسی تفریق قائم کی ہے۔ غرضیکہ ان تمام متضاد چیزوں کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

پھر فرمایا کہ انسان کو جوڑا جوڑا پیدا کیا مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰی ایک قطرۂ آب سے جب کہ وہ ٹپکایا جاتا ہے۔ یہ قطرۂ آب مختلف مراحل میں سے گزر کر

انسانی صورت میں اس دنیا میں آتا ہے۔ اِن نو ماہ کے مراحل کی تفصیل قرآن پاک میں موجود ہے۔ قطرۂ آب، خون میں تبدیل ہوتا ہے جس میں ایک چلّے کا عرصہ لگتا ہے پھر دوسرے چلّے میں خون سے گوشت بنتا ہے۔ پھر انسان کا ڈھانچہ تیار ہونے میں مزید ایک چلّہ لگتا ہے۔ پھر اس میں ہڈیاں پیدا ہوتی ہیں، اُن پر گوشت چڑھتا ہے اور اس طرح ایک مکمل انسان بن جاتا ہے۔ پھر وہ ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے۔ دنیا میں آکر بچپن کے دور سے گذر کر جوانی میں قدم رکھتا ہے اور پھر کچھ عرصہ بعد اس پر بڑھاپا آنے لگتا ہے حتیٰ کہ ایک دن ایسا بھی آتا ہے جب اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ تو یہ سارے کام اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے، اُسی کے منشاء کے مطابق انسان یہ سارے ادوار گذارتا ہے۔

فرمایا جس اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں ایک قطرۂ آب سے انسان کی تخلیق کی۔ وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى دوبارہ اٹھانا بھی اسی کے ذمہ ہے۔ جب قیامت کا دن آئے گا تو وہ سب کو زندہ کر کے دوبارہ اٹھائے گا اور جس طرح انسان کی پہلی پیدائش اللہ تعالیٰ نے کی تھی، اسی طرح اسکو دوبارہ اٹھانا بھی اُس کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔ وہ اپنا وعدہ پورا کرے گا، حساب کتاب کی منزل آئے گی اور پھر ہر شخص کے لیے جزا یا سزا کے فیصلے ہوں گے۔ اس سے معاد کا مسئلہ بھی سمجھ میں آگیا۔

پھر فرمایا وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى اور خدا تعالیٰ کی ذات وہی ہے جس نے جس کو چاہا غنی بنا دیا اور جس کو چاہا محتاج بنا دیا۔ مطلب یہ ہے کہ جب خالق وہی ہے تو روزی رساں بھی وہی ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے وافر عطا کر کے غنی بنا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کم دے کر محتاج بنا دیتا ہے۔ اللہ نے تمام انسانوں کو یکساں نہیں بنایا۔ نہ تو شکل و صورت بالکل ایک جیسی ہے اور نہ دماغی، عقلی اور جسمانی قوتیں یکساں ہیں۔ ہر انسان کے اعمال میں بھی تفاوت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمان ہے اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى (الّیل۔ ۴) بے شک تمہاری کوشش طرح طرح کی ہے۔

اسی طرح اللہ نے معیشت کو بھی متفاوت بنایا ہے۔ بعض لوگوں کو زیادہ دے کر آزمایا اور بعض کو کم دے کر امتحان میں مبتلا کیا ہے۔ کسی کو صبر کے ذریعے اور کسی کو شکر کے ذریعے۔ کسی کو صحت دی ہے تو کسی کو بیماری لاحق کر دی ہے۔ اسی طرح کسی کو غنی بنایا ہے تو کسی کو محتاج کر دیا ہے۔ یہ سب اسی مالک الملک کے کام ہیں۔

شعریٰ ستارے کا پروردگار

آگے اللہ تعالیٰ کی ایک یہ صفت بھی بیان کی گئی ہے وَاَنَّہٗ ھُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی اور بیشک شعریٰ ستارے کا پروردگار بھی وہی ہے۔ شعریٰ بہت بڑا روشن ستارہ ہے۔ اس کا ایک نام جوزا بھی ہے۔ اس کو شعریٰ عبور اور شعریٰ غمیصا بھی کہتے ہیں۔ ان دو اقسام میں سے عبور زیادہ روشن اور غمیصا نسبتاً کم روشن ہے۔ اس ستارے کو شعریٰ یمانیہ اور شعریٰ شامیہ کے ناموں سے بھی پکارا جاتا ہے۔ یہ زیادہ تر موسم بہار میں یمن کے علاقہ میں دکھائی دیتا ہے۔ رومی، یونانی، عرب اور دوسری قدیم اقوام کے لوگ اس ستارے کے پجاری تھے۔ اللہ نے اسی بات کی تردید کے لیے بیان فرمایا کہ جس ستارے کو تم الوہیت کا درجہ دیتے ہو، اس کا پروردگار بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ یہ ستارہ نہ کسی کا حاجت روا اور نہ مشکل کشا ہے۔ یہ تو اللہ کی مخلوق ہے جو اپنے خالق کی مقررہ ڈیوٹی انجام دے رہا ہے، اس میں الوہیت والی کوئی چیز نہیں ہے۔ حضور علیہ السلام کے ننھیال کے ایک شخص ابو کبشہ نے سب سے پہلے لوگوں کو اس ستارے کی طرف آمادہ کیا۔ لہٰذا یہ ستارہ ابو کبشہ کی طرف بھی منسوب ہوتا تھا۔ بخاری شریف میں ہے کہ قیصر روم کے دربار میں جب ابو سفیان حضور علیہ السلام کے متعلق بیان دے کر باہر نکلا تو کہنے لگا لَقَدْ اَمِرَ اَمْرُ ابْنِ اَبِیْ کَبْشَۃَ یعنی ابو کبشہ کے فرزند کا معاملہ تو بہت بڑھ گیا ہے اس سے تو رومی بادشاہ بھی خائف ہونے لگا ہے۔ ابو سفیان کا بیان ہے کہ اس وقت سے برابر میرے دل میں یہ بات آ رہی تھی کہ مسلمان ضرور غالب آئیں گے حتیٰ کہ اللہ نے میرے دل میں ایمان کی دولت ڈال دی۔ آپ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے۔ اس سے پہلے بیس سال تک اسلام کی سخت مخالفت کی۔ ان کی بیٹی اور حضور علیہ السلام کی زوجہ ام حبیبہؓ اس سے پہلے اسلام قبول کر چکی تھیں۔ ابو سفیان اس پر

بھی ناراض تھے مگر بالآخر اللہ نے کایا پلٹ دی اور وہ بھی ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے۔
شعریٰ ستارے کے متعلق ماہرین فلکیات کی تحقیق ہے کہ یہ ستارہ سورج سے
بیس ہزار گنا بڑا ہے۔ مصر کے مفسر طنطاوی نے بھی اپنی تفسیر میں یہی لکھا ہے یہ ستارہ
نظام شمسی سے باہر ہے اس لیے دور ہونے کی وجہ سے سورج سے چھوٹا نظر آتا
ہے۔ بہر حال اللہ نے شعریٰ کی الوہیت کی تردید کی ہے۔

نافرمان قوموں کی ہلاکت

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بعض نافرمان قوموں کی سزا کا ذکر کیا ہے۔ وَاَنَّهٗٓ
اَهْلَكَ عَادَاِۨ الْاُوْلٰى اور بیشک اسی اللہ تعالیٰ نے عاد اولیٰ کو ہلاک کیا وَثَمُوْدَا۟
اور قوم ثمود یعنی عاد ثانیہ کو بھی اسی نے اس طور تباہ کیا فَمَآ اَبْقٰى کہ ان میں کوئی بھی
زندہ نہ بچا۔ یہ دونوں قومیں سامی نسل میں سے تھیں۔ عاد یمن کے اطراف میں آباد تھے
جبکہ ثمود وادی تبوک سے لے کر وادی قریٰ تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ لوگ بڑے
متمدن، طاقتور اور کاریگر تھے۔

پھر فرمایا وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ اور ان سے پہلے قوم نوح کو بھی اللہ نے
ہلاک کیا۔ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى یہ لوگ بڑے ہی ظالم اور سرکش
تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام سینکڑوں سال تک قوم کو اللہ کا پیغام سناتے رہے۔
جس کی تفصیل سورۃ نوح میں موجود ہے۔ انہوں نے دن رات، خلوت، جلوت،
اکیلے اکیلے، مجموعی طور پہ نرمی اور سختی سے، مردوں اور عورتوں کو غرضیکہ ہر مقام اور ہر
طریقے سے سمجھایا مگر نتیجہ کیا نکلا؟ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ (ھود ۴۰)
بہت کم لوگ ایمان لائے۔ یعنی وہی ستر یا اسی افراد جو آپ کے ساتھ کشتی میں سوار
ہو گئے!

ان کے علاوہ فرمایا وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى الٹی بستی والے بھی ہلاک ہوئے
جن کو نیچے پٹخ دیا گیا۔ یہ قوم لوط کے لوگ تھے جو بحر میت کے کنارے شرق اردن
میں آباد تھے۔ ان میں لواطت کی بیماری پائی جاتی تھی۔ اللہ نے ان کی بستی کو الٹ
دیا اسی واقعے کے متعلق فرمایا فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى پس ڈھانپ لیا اس کو اس چیز

نے جس نے ڈھانپ لیا۔ اور اوپر سے پتھروں کی بارش کی جس سے سارے ہلاک ہوگئے۔ امام ابن کثیرؒ لکھتے ہیں۔ کہ اس قوم کی چار لاکھ کی آبادی کو اللہ تعالیٰ نے آناً فاناً تباہ کر دیا۔

فرمایا فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکَ تَتَمَارٰی تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت میں شک کرو گے۔ خدا نے باغیوں اور مفسدوں کو ہلاک کیا یہ بھی اسی کا انعام ہے۔ جب اللہ کی زمین ظلم و فساد سے بھر گئی فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الانعام۔ ۴۵) ظالم قوم کی جڑ کاٹ دی گئی اور سب تعریفیں خدا رب العالمین کو ہی سزاوار ہیں۔ یہ واقعات بجائے خود انعام الٰہی ہیں جن کے ذریعے ظلم کا قلع قمع ہوا، اور ان واقعات کا تذکرہ بھی خدا کا انعام ہے کہ ان سے باقی لوگوں کو عبرت حاصل ہوتی ہے۔

رسالت کا بیان

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے رسالت کا بیان فرمایا ہے هٰذَا نَذِیْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی ڈر سنانے والے ہیں پہلے ڈر سنانے والوں میں سے اللہ نے آپ سے پہلے بھی مختلف اقوام میں اپنے نبی بھیج کر لوگوں کو اُن کے انجام سے آگاہ کیا، اور اب آخر میں حضور علیہ السلام بھی یہی فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ یہ در اصل آپ کی رسالت کی تصدیق ہے۔ مشرک اور کافر آپ کو اللہ کا نبی ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کبھی کاہن کہتے کبھی ساحر، کبھی مجنون اور کبھی شاعر اللہ نے فرمایا ایسی بات نہیں ہے بلکہ یہ بھی اللہ کے رسول ہیں۔ جس طرح پہلے اللہ کے رسول آکر لوگوں کو ڈراتے رہے، اسی طرح یہ بھی تمہیں تمہارے انجام بد سے آگاہ کرنے کے لیے آئے ہیں اگر ان کی بات مان لو گے تو بچ جاؤ گے! ورنہ دائمی سزا کے مستحق بن جاؤ گے۔

قیامت کی آمد

اس کے بعد اللہ نے وقوع قیامت کا ذکر کیا ہے۔ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ قریب آنے والی قریب آگئی، یعنی قیامت۔ اب اللہ کا آخری نبی آچکا ہے اور اس کے بعد قیامت ہی آنے والی ہے اور یہ ایسی چیز ہے لَیْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ

اللہ کا شف ۃ اللہ کے سوا اس کو کوئی کھول کر دکھانے والا نہیں ہے۔ یعنی قیامت اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کے مقررہ وقت پر آئے گی۔ ہر آدمی کی موت قیامت صغریٰ ہے جس کا کسی کو علم نہیں اور پھر مجموعی موت قیامت کبریٰ ہے جس کے وقت وقوع کا علم اللہ نے اپنے ہی پاس رکھا ہوا ہے لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ (الاعراف ۱۸۷) وہی اس کو وقت مقررہ پر ظاہر کریگا۔ پھر فرمایا أَفَمِنْ هَٰذَا الْحَدِيثِ تَعْجَبُونَ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہے کہ قیامت اچانک آجائیگی؟ بلاشبہ ایسا ہی ہوگا چونکہ اس کا یقین نہیں ہے لہٰذا وَتَضْحَكُونَ وَلَا تَبْكُونَ تم ہنستے ہو اور روتے نہیں۔ اگر تمہیں اسکی ہولناکی کا ادراک ہو تو تم یقیناً رونے لگو کہ پتہ نہیں کیا معاملہ پیش آئے گا۔ وَأَنتُمْ سَامِدُونَ مگر تم تو کھیل رہے ہو۔ دنیا کی زندگی اور اس کے عیش و آرام میں مگن ہو اور قیامت کا احساس تک نہیں ہے۔ حقیقت میں تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔

عبادت کا حکم

فرمایا تمہارے لیے ضروری ہے کہ وقوع قیامت اور جزائے عمل کا احساس کرتے ہوئے فَاسْجُدُوا لِلَّهِ اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ وَاعْبُدُوا اور اس کی عبادت کرو۔ نماز کے سجدہ کے علاوہ اس آیت کی تلاوت اور سماعت پر سجدہ تلاوت بھی واجب ہو جاتا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے یہ سب سے پہلی سورۃ ہے جس میں سجدہ تلاوت کا حکم ہے۔ آپ نے یہ سورۃ اہل ایمان اور کافروں کی مشترکہ مجلس میں تلاوت فرمائی اور پھر آخر میں سجدہ کیا۔ یہ دیکھ کر مسلمانوں نے بھی سجدہ کیا اور کافر بھی سجدہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اور سب نے سجدہ ادا کیا ایک بوڑھے کافر امیہ ابن خلف نے سجدہ نہ کیا بلکہ زمین سے مٹی لے کر اپنی پیشانی پر لگائی اور کہنے لگا میرے لیے یہی کافی ہے۔ یہ شخص جنگ بدر میں کفر کی حالت میں مارا گیا۔

سورة القمر
(مكية)

سُوْرَةُ الْقَمَرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ خَمْسٌ وَّخَمْسُوْنَ اٰيَةً وَّثَلٰثُ رُكُوْعَاتٍ

سورۃ القمر مکی ہے۔ یہ پچپن آیتیں ہیں اور اس کے تین رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ① وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ② وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ③ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ④ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ⑤ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ⑥ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ⑦ مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ⑧

ترجمہ:- قریب آگئی ہے قیامت اور پھٹ گیا ہے چاند ① اور اگر دیکھیں یہ لوگ کوئی نشانی تو اعراض کرتے

ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جادو ہے جو مسلسل چلا آرہا ہے ② اور جھٹلایا انہوں نے، اور پیروی کی اپنی خواہشات کی۔ اور ہر کام ٹھہرا ہوا ہے (اپنے وقت پر) ③ اور البتہ تحقیق آئی، ان کے پاس خبروں میں سے وہ جس میں ڈانٹ ہے ④ یہ حکمت ہے کامل، پس نہیں فائدہ دیتے ڈر سنانے والے ⑤ پس آپ روگردانی کریں ان سے، جس دن بلائے گا بلانے والا ایک ناگوار چیز کی طرف ⑥ پست ہوں گی ان کی آنکھیں، نکلیں گے یہ قبروں سے گویا کہ یہ ٹڈیاں ہیں پھیلی ہوئی ⑦ دوڑنے والے ہوں گے پکارنے والے کی طرف۔ کہیں گے کافر کہ یہ دن بہت سخت ہے ⑧

نام اور کوائف

اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ القمر ہے جو کہ اس کی پہلی آیت میں آمدہ لفظ سے ماخوذ ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی، اس کی پچپن آیتیں اور تین رکوع ہیں اور یہ سورۃ ۳۴۲ الفاظ اور ۱۴۰۳ حروف پر مشتمل ہے۔

مضامین سورۃ

دیگر مکی سورتوں کی طرح اس سورۃ مبارکہ میں بھی زیادہ تر اسلام کے بنیادی عقائد توحید، رسالت، معاد اور قرآن حکیم کی حقانیت ہی کا تذکرہ ہے۔ تاہم یہاں پر رسالت اور قیامت کا اکٹھا ذکر کیا گیا ہے۔ وقوع قیامت کے متعلق گذشتہ سورۃ کے آخر میں فرمایا تھا اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ﴿۵۷﴾ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴿۵۸﴾ قریب آنے والی (یعنی قیامت) قریب آگئی ہے، جس کو اللہ کے سوا کوئی کھول کر ظاہر کرنے والا نہیں ہے۔ اب اس سورۃ کی ابتدا میں فرمایا ہے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ قیامت قریب آگئی ہے اور چاند پھٹ گیا ہے .... اس طرح یہ دونوں سورتیں آپس میں مربوط ہیں۔

اس سورۃ میں انذار کا پہلو بھی غالب ہے منکرین کے حالات بیان کئے جاتے ہیں

کا ذکر کر کے انہیں بڑی سختی کے ساتھ تنبیہ کی گئی ہے۔ لوگوں کی عبرت کے لیے اللہ نے بعض سزا یافتہ اقوام کا ذکر بھی کر دیا ہے۔

قیامت کی گھڑی

ارشاد ہوتا ہے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ قیامت قریب آگئی ہے، جدید عربی میں ساعت وقت ظاہر کرنے والی گھڑی کو کہتے ہیں، اس سے مطلق وقت بھی مراد ہوتا ہے، تاہم یہاں یہ قیامت کی گھڑی مراد ہے کہ وہ قریب آچکی ہے بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ساعت سے وہ وقت مراد ہے جب دنیا میں منکرین کو سزا ملی ہے جیسا کہ کفار مکہ کو بدر کے مقام پر سزا ملی۔ قیامت کے قریب ہونے اور اچانک برپا ہونے کا ذکر قرآن پاک میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ بلکہ سورۃ المعارج میں ہے قیامت تو قریب ہی ہے اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا (آیت ۶) اگرچہ لوگ اسے بعید خیال کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے خلافت ارضی کے لیے انسان کو پیدا کیا اور پھر اُن کی راہنمائی کے لیے بعثت انبیاء کا سلسلہ بھی ساتھ ہی شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا۔ چونکہ نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے، اس لیے آگے نہ کوئی نبی آنے والا ہے اور نہ کوئی دوسری امت۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب قیامت ہی کا انتظار ہے۔ حضور علیہ السلام سے قیامت کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے اپنی انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کو جوڑ کر فرمایا اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ یعنی میں اور قیامت اس طرح آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ جس طرح یہ دو انگلیاں تھوڑا آگے پیچھے ہیں۔ اسی طرح میں اور قیامت آگے پیچھے ہیں۔ اب میرے بعد قیامت ہی آئے گی تو اس لحاظ سے قیامت کو قریب کہا گیا ہے۔ اگرچہ اس پر چودہ صدیاں گزر چکی ہیں، اور یہ اللہ کے علم میں ہے کہ وہ گھڑی کب واقع ہو گی۔

چاند کا پھٹ جانا

فرمایا قیامت قریب آگئی ہے وَانْشَقَّ الْقَمَرُ اور چاند پھٹ گیا ہے۔ چاند کا پھٹ جانا دراصل علامات قیامت میں سے ہے۔ قرآن و حدیث میں قیامت کی بہت سی نشانیوں کا ذکر موجود ہے منجملہ ان کے شق القمر بھی ایک نشانی ہے۔ بخاری اور مسلم کی صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شق القمر کا واقعہ حضور علیہ السلام

کا ایک معجزہ یہ بھی ہے جو ہجرت سے پانچ سال پہلے پیش آیا۔ ایام حج دسویں یا تیرھویں ذی الحج (میں) حضور علیہ السلام منیٰ میں تشریف فرما تھے۔ اس موقع پر مشرکین نے آپ سے آپ کی صداقت کی نشانی طلب کی جسے دیکھ کر وہ آپ پر ایمان لا سکیں اس پر آپ نے چاند کی طرف انگلی سے اشارہ کیا تو وہ دو ٹکڑے ہو کر ایک حصہ مشرق کی طرف ہو گیا اور دوسرا مغرب کی طرف۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت کے مطابق چاند کا ایک ٹکڑا جبل حرا کی ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف چلا گیا۔ جب مشرکین نے یہ معجزہ اچھے طریقے سے بار بار دیکھ لیا تو دونوں ٹکڑے پھر سے مل گئے اور چاند اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔

یہ واضح نشانی دیکھنے کے باوجود متعصب مشرکین نے ایمان قبول نہ کیا بلکہ اسے جادو کہہ کر رد کر دیا۔ ابوجہل جیسے ہٹ دھرم لوگوں نے کہا کہ محمد نے ہم پر جادو کر دیا ہے۔ اسی بات کے متعلق اللہ نے یہاں فرمایا ہے وَإِنْ يَرَوْا آيَةً يُعْرِضُوا اور اگر یہ لوگ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں۔ وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُسْتَمِرٌّ اور کہتے ہیں کہ یہ چلتا ہوا جادو ہے جو قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ یہ پہلے زمانے میں بھی چلتا تھا اور آج بھی چل رہا ہے۔ غرضیکہ مشرکین نے نہ تو اسے معجزہ تسلیم کیا، نہ خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور قدرت تامہ پر ایمان لائے اور نہ ہی رسالت کو تسلیم کیا۔

شق القمر پر اعتراضات

واقعہ شق القمر پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے۔ بعض یونانیوں اور قدیم فلسفیوں کا خیال تھا کہ آسمانی کروں میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا، لہٰذا وہ اس معجزہ کو وہم قرار دیتے تھے اور سطحی لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر یہ اتنا بڑا واقعہ پیش آیا تھا تو پھر اس کا ذکر تاریخ میں کیوں نہیں ملتا؟ علمائے کرام خاص طور پر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنی کتابوں میں اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ واقعہ رات کے وقت پیش آیا تھا اور ضروری نہیں کہ اس وقت سب لوگ جاگ رہے ہوں۔ اور ان کی نظریں بھی چاند پر لگی ہوئی ہوں کہ جونہی اس میں تغیر واقع ہوا تھا وہ اس کو

دیکھ لیتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس وقت پوری دُنیا میں تو رات نہیں تھی بلکہ زمین کے ایک حصہ پر ہی تھی لہٰذا ساری دُنیا کے لیے اس واقعہ کا مشاہدہ ممکن نہ تھا۔ ہاں اگر پہلے سے کوئی اعلان ہوتا کہ فلاں تاریخ کو فلاں وقت یہ واقعہ پیش آنے والا ہے تو لوگ اس کی طرف متوجہ بھی ہوتے۔ مگر یہ واقعہ تو اچانک پیش آگیا اور تھوڑی دیر کے بعد چاند پھر اصلی حالت میں آگیا۔ لہٰذا یہ کوئی معقول اعتراض نہیں ہے۔

ان تمام حالات کے باوجود اس واقعہ کا ذکر تاریخ میں بھی ملتا ہے۔ برصغیر میں تغلقوں کے دور میں احمد نگر کے رہنے والے ایک مؤرخ محمد قاسم فرشتہ ہیں جنہوں نے اپنی کتاب "تاریخ فرشتہ" میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شق القمر کا یہ واقعہ مالابار کے راجہ نے دیکھا تھا۔ اس رات ان کے محل میں کوئی تقریب تھی جس میں خود اور اس کی رانیاں بھی موجود تھیں۔ انہوں نے یہ واقعہ دیکھا تھا اور راجہ نے اسے اپنی ڈائری میں نوٹ کیا تھا۔

پھر کچھ عرصہ بعد حضور علیہ السلام کے ایک صحابی حبیب ابن مالک تجارتی سفر پر مالابار گئے تو راجہ نے آپ سے دریافت کیا کہ فلاں تاریخ کو اُس نے یہ واقعہ دیکھا ہے بھلا یہ کیسے ممکن ہوا؟ تو حبیبؓ نے جواب دیا کہ یہ تو بڑا مشہور واقعہ ہے جو کہ حضور علیہ السلام کے دس صحابہؓ سے منقول ہے۔ پھر آپ نے وضاحت کی کہ عرب کی سرزمین میں اللہ نے اپنا آخری رسول مبعوث فرمایا ہے انہوں نے انگلی کا اشارہ کیا تو چاند دو ٹکڑے ہو گیا تھا اور تھوڑی دیر بعد پھر اپنی اصلی حالت پر آگیا تھا۔ اس تصدیق پر وہ راجہ اپنی رانیوں سمیت مسلمان ہو گیا تھا۔

بہر حال شق القمر کا معجزہ حضور علیہ السلام کے ہاتھ مبارک پر ظاہر ہوا تھا جس کی تفصیلات صحیح احادیث میں موجود ہیں۔ بخاری شریف میں چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا ذکر ہے۔ ایک پہاڑ کی مشرقی جانب چلا گیا اور دوسرا مغربی جانب۔ اور لوگوں نے یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے اچھی طرح دیکھا۔ مشرکین مکہ اس کو بھی جادو سے تعبیر کرتے تھے۔ پھر انہوں نے آنے جانے والے قافلوں کے لوگوں سے اس واقعہ

کے متعلق پوچھا تو ان میں سے بعض نے تصدیق کی کہ انہوں نے بھی چاند کو دو لخت
ہوتے دیکھا ہے۔ بہرحال اس معجزہ سے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

قیامت کی نشانی

یہ واقعہ ایک طرف تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا معجزہ ہے تو دوسری طرف
یہ علاماتِ قیامت میں بھی شامل ہے۔ خود حضور علیہ السلام کا دنیا میں تشریف لانا
بھی قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔ اس کے علاوہ بعض علامات ابھی ظاہر ہونے
والی ہیں جیسے سورج کا مغرب سے طلوع، دجال، یاجوج ماجوج کا خروج، مسیح علیہ السلام
کا نزول وغیرہ۔ احادیث میں بہت سی چھوٹی بڑی نشانیوں کا ذکر موجود ہے جن میں
یہ شق القمر کا واقعہ بھی ہے۔ اسی طرح یہ واقعہ وقوعِ قیامت پر بھی دلیل بنتا ہے۔
جس طرح یہ واقعہ اچانک پیش آیا اسی طرح قیامت بھی اچانک ہی آجائے گی
نیز جس طرح اللہ نے چاند کو دو ٹکڑے کرکے پھر جوڑ دیا، اسی طرح وہ انسان کو زندگی
دے کر موت طاری کرتا ہے اور قیامت والے دن اس کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ یہ
اللہ تعالیٰ کی قدرتِ تامہ اور حکمتِ بالغہ کے عین مطابق ہے۔

فرمایا ان لوگوں نے واقعہ شق القمر کو جادو کہہ کر رد کر دیا وَكَذَّبُوا وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ
اور انہوں نے جھٹلایا۔ اور اپنی خواہشات کی پیروی کی۔ اور خواہشات کی پیروی شیطان کے نقشِ قدم
پر چلنے کے مترادف ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا حکم ہے وَلَا تَتَّبِعُوا
خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ (البقرہ ۔ ۱۶۸) شیطان
کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو بلاشبہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ مطلب یہ ہے
کہ جو شخص صحیح تحقیق سے اور قانون کو چھوڑ دیتا ہے وہ شیطان کا اتباع کرنے لگتا ہے
[illegible] اپنی خواہشات اور شیطان کی پیروی کرتے ہیں جو حقیقت کا [illegible]
[illegible] کرتے ہیں [illegible] بات کہ اگر قیامت برحق ہے تو پھر یہ کیوں
نہیں آجاتی؟ تو اللہ نے فرمایا وَكُلُّ أَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ اور ہر کام کے لیے وقت مقرر ہے
[illegible] کوئی بات [illegible] وقت [illegible] انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے
[illegible] ایک وقت مقرر [illegible] جب وہ وقت آجاتا ہے۔ لا
[illegible]

تَسْتَاخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ (سبا ۳۰) تو گھڑی بھر بھی آگے پیچھے نہیں ہوتا۔ جب قیامت کا وقت مقرر آجائے گا۔ تو قیامت بھی بپا ہو جائے گی۔

سخت تنبیہ

ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ اور البتہ تحقیق ان کے پاس ایسی خبر آئی ہے جس میں تنبیہ ہے۔ اگر یہ غور کریں تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت ڈانٹ ہے یعنی شق القمر جیسا عجیب وغریب واقعہ انسان کے لیے زجر ہے کہ وہ کیسے قیامت کا انکار کرتا ہے۔ بلکہ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ یہ تو اللہ تعالیٰ کی کامل حکمت کے عین مطابق ہے جس سے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے باوجود بات یہ ہے فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ڈرانے والے کام نہیں دیتے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نبی اور مبلغ ان ناہنجار لوگوں کو کتنا بھی ڈرائیں ان پر کچھ اثر نہیں ہوتا اور یہ اپنی ڈگر پر ہی چلتے رہتے ہیں۔ ان کے دل سیاہ ہو جاتے ہیں، فہم الٹ جاتے ہیں اور وہ سیدھی بات کو بھی ٹیڑھا ہی سمجھنے لگتے ہیں معترض لوگ ہمیشہ کج روی کی تلاش میں ہی رہتے ہیں اور نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں ان پر وعظ ونصیحت کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔

میدان حشر میں اجتماع

آگے اللہ نے اپنے پیغمبر کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا فَتَوَلَّ عَنْهُمْ آپ ان لوگوں کی طرف زیادہ توجہ نہ دیں، ان کے انکار اور ہٹ دھرمی کو خاطر میں نہ لائیں۔ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ جس دن بلائے گا بلانے والا ایک ناگوار چیز کی طرف۔ اس دن سے مراد قیامت کا دن اور پکارنے والا اسرافیل ہوگا۔ جو صور پھونکے گا اور لوگ قبروں سے نکل کر دوڑتے ہوئے اس آواز کی طرف جائیں گے۔ اس وقت ان کی حالت یہ ہوگی خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی، ندامت کے مارے وہ صیان اوپر نہیں کر سکیں گے۔ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ اپنی قبروں سے اس طرح نکلیں گے گویا کہ ٹڈی دل پھیلا ہوا ہے۔ سخت افراتفری کا عالم ہوگا۔ ان کے چہروں سے خوف وہراس

اور ذلت اور ندامت کے آثار ظاہر ہوں گے۔ مُّهْطِعِينَ إِلَى الدَّاعِ وہ دوڑنے والے ہوں گے پکارنے والے کی طرف۔ یعنی جدھر سے آواز آرہی ہوگی اُدھر دوڑتے جائیں گے۔ دوسری جگہ ہے يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَأَنَّهُمْ إِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِضُونَ (المعارج-۴۳) اس دن قبروں سے اس حالت میں نکلیں گے گویا کہ وہ نشانوں کی طرف دوڑے جاتے ہیں۔ فرمایا آج تو یہ انکار کرتے ہیں مگر اس دن يَقُولُ الْكَافِرُونَ هَٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ کافر کہیں گے کہ افسوس آج تو بڑا سخت دن ہے نامعلوم آج ہمارے ساتھ کیا معاملہ پیش آئیگا مگر ہوگا وہی کچھ جو سابقہ قوموں کا حال ہوا اور جن کو اللہ نے اس دنیا میں بھی سزا دی اور پھر دائمی سزا تو آگے آرہی ہے۔

درس نمبر ۲ — آیت ۹ تا ۲۲

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَّازْدُجِرَ ۞۹ فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ ۞۱۰ فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُّنْهَمِرٍ ۞۱۱ وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَى أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۞۱۲ وَحَمَلْنَاهُ عَلَى ذَاتِ أَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ۞۱۳ تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا جَزَاءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ۞۱۴ وَلَقَدْ تَّرَكْنَاهَا آيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۞۱۵ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ۞۱۶ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۞۱۷ كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ۞۱۸ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ۞۱۹ تَنْزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ۞۲۰ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ۞۲۱ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۞۲۲ ع ۸/۲

ترجمہ:۔ جھٹلایا ان سے پہلے قوم نوح نے۔ پس جھٹلایا
انھوں نے ہمارے بندے کو اور کہا کہ یہ دیوانہ ہے، اور
اس کو جھڑک دیا گیا ۹ پس اس نے دعا کی اپنے پروردگار

کے سامنے کہ میں عاجز ہوں ، پس میرا بدلہ لے ⑩ پھر کھول دیا ہم نے آسمان کے دروازوں کو زور سے بہنے والے پانی کے ساتھ ⑪ اور بہا دیے ہم نے زمین میں چشمے ، پھر مل گیا پانی ایک کام پر جو مقدر کیا جا چکا تھا ⑫ اور ہم نے سوار کیا اُس (بندے) کو تختوں اور کیل والی کشتی پر ⑬ جو چلتی تھی ہمارے سامنے ، یہ بدلہ تھا اُس کا جس کی ناقدری کی گئی تھی ⑭ اور البتہ تحقیق ہم نے اس کشتی کو نشانی بنا دیا ، پس کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ⑮ پس کیسے ہوا میرا عذاب اور میرا ڈرانا ⑯ اور البتہ تحقیق ہم نے آسان کر دیا ہے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے ، پس ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ⑰ جھٹلایا قوم عاد نے پس کیسے ہوا میرا عذاب اور میرا ڈرانا ⑱ بے شک ہم نے بھیجی ان پر ایک تند ہوا ایسے وقت میں جو مسلسل نحوست والا تھا ⑲ اکھاڑتی تھی ہوا لوگوں کو جیسا کہ وہ تنے ہیں اکھڑی ہوئی کھجوروں کے ⑳ پس کیسے ہوا میرا عذاب اور میرا ڈرانا ㉑ اور البتہ تحقیق ہم نے آسان کر دیا ہے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے ، پس ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ㉒

ربطِ آیات

گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے رسالت کا انکار کرنے والے کافروں اور مشرکوں کا رد کیا اور ساتھ ساتھ قیامت کی بعض نشانیوں کا بھی ذکر کیا جن میں شق القمر کا واقعہ بھی شامل ہے۔ پھر محاسبہ اعمال کے بارے میں شدید درجے کا انذار کیا ، چنانچہ مشرکین عرب کو سخت تنبیہ کی ، اور محاسبہ اعمال کی منزل کا کچھ حال بیان کیا اور اس دن کی سختی

کا ذکر کیا۔ اب اللہ نے سابقہ اقوام میں سے بعض کے واقعات بطور نصیحت اور انذار ذکر کیے ہیں۔ فرمایا کہ جس طرح مشرکین عرب توحید، رسالت اور معاد کا انکار کرتے ہیں اسی طرح ان سے پہلے کئی قوموں نے بھی کیا۔ وہ بھی بڑے سرکش اور مغرور تھے۔ مگر اللہ نے اُن کو دنیا میں ہی گرفت کر کے سزا دی۔ اس سورۃ مبارکہ میں سابقہ اقوام کے جستہ جستہ حالات بیان کیے گئے ہیں۔ پوری تفصیل دوسری سورتوں میں موجود ہے یہاں پر صرف عبرت کے لیے بعض قوموں کی سزا کا سرسری ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ آج کے درس میں قوم نوح اور قوم عاد کا تذکرہ ہو رہا ہے۔

نوح علیہ السلام اور آپکی قوم

ارشاد ہوتا ہے کَذَّبَتۡ قَبۡلَهُمۡ قَوۡمُ نُوۡحٍ ان مشرکین عرب سے پہلے قوم نوح نے بھی جھٹلایا فَكَذَّبُوۡا عَبۡدَنَا انہوں نے ہمارے بندے نوح علیہ السلام کو جھٹلا دیا یعنی اُن کی رسالت کو تسلیم نہ کیا۔ وہ ہمارا بے حد شکر گزار بندہ اور رسول تھا۔ اور رسالت سے بڑھ کر فضل و کمال والی کوئی چیز نہیں جو اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے کسی کو عطا کرتا ہے۔ اور پھر رسالت کے درجات بھی مختلف ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے تِلۡكَ الرُّسُلُ فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ (البقرہ ۔ ۲۵۳) یہ رسولوں کا گروہ ہے جن میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے۔ یہ فضیلت اُن پر آنے والی ابتلاء و آزمائش کی وجہ سے ہوتی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام بھی اُن رسولوں میں سے ہیں جن کو اللہ نے فوقیت بخشی ہے۔ قیامت والے دن لوگ اللہ کے ہاں سفارش کے لیے نوح علیہ السلام کے پاس بھی جائیں گے۔ اور کہیں گے۔ يَا نُوۡحُ اِنَّكَ اَوَّلُ الرُّسُلِ اِلٰى اَهۡلِ الۡاَرۡضِ اے نوح علیہ السلام! آپ اہل زمین کی طرف سب سے پہلے عظیم رسول ہیں اِشۡفَعۡ لَنَا پس آپ ہمارے لیے بارگاہِ الٰہی میں سفارش کریں تاکہ حساب کتاب شروع ہو۔ اگرچہ نوح علیہ السلام سے پہلے آدم علیہ السلام اور ادریس علیہ السلام بھی اللہ کے نبی ہوئے ہیں۔ لیکن مستقل شریعت سب سے پہلے نوح علیہ السلام کو ہی عطا کی گئی اور پھر قوم کے انکار پر سب سے پہلے سزا بھی آپ ہی کی قوم کو ملی۔ بہر حال جب نوح علیہ السلام نے قوم کے سامنے

دعویٰ نبوت پیش کیا تو انہوں نے آپ کو جھٹلا دیا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ اور کہنے لگے کہ تم اللہ کے رسول نہیں بلکہ دیوانے ہو (العیاذ باللہ) اور سطح وَازْدُجِرَ آپ کو جھڑک دیا گیا۔ قوم نے یہ بھی کہا کہ اے نوح علیہ السلام! اگر تم اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے۔ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ (الشعراء ۱۱۶) تو ہم تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دیں گے۔ تم ہمارے معبودوں کو غلط کہتے ہو اور ہم سے ہمارا طریقہ چھڑانا چاہتے ہو، ہم سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ نوح علیہ السلام بڑے لمبے عرصے تک قوم کی طرف سے مصائب برداشت کرتے رہے، ان کو وعظ و نصیحت بھی کرتے رہے مگر انہوں نے کسی طرح نہ مانا۔ پھر جب آپ قوم سے بالکل مایوس ہو گئے تو اللہ کی بارگاہ میں دعا کی۔ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ پروردگار! میں عاجز آچکا ہوں، یہ قوم کسی طرح نہیں مانتی بلکہ الٹا مجھے تکلیفیں پہنچائی ہے، لہٰذا اب تو ہی ان سے میرا انتقام لے۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کا بدلہ لیتا ہے۔ لہٰذا اس سے بے فکر نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی شخص اللہ کے نیک بندوں کو ستائے گا تو اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ مہلت بھی دے دیتا ہے مگر کبھی کبھی وہ انتقام بھی لے لیتا ہے۔

قوم نوح کے لیے سزا

جب قوم نوح کی سرکشی حد سے بڑھ گئی تو نوح علیہ السلام نے ان کے لیے بددعا کی۔ اللہ نے آپ کی دعا قبول کی اور فرمایا فَفَتَحْنَاۤ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ پھر ہم نے آسمان کے دروازے کھول دیئے زور سے برسنے والے پانی کے ساتھ۔ یعنی آسمان سے شدید موسلا دھار بارش شروع کر دی۔ اس کے علاوہ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُیُوْنًا زمین کے چشموں سے بھی پانی جاری کر دیا۔ اُدھر آسمان سے پانی برسنے لگا اور اُدھر زمین نے پانی اگلنا شروع کر دیا۔ فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰۤی اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ پس آسمان اور زمین کا پانی آپس میں مل گیا ایک کام پر جو مقدر کیا جا چکا تھا۔ تقدیر کا یہی فیصلہ تھا کہ اس پوری قوم کو اس پانی میں غرق کر دیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے مقررہ فیصلے کے مطابق یہ پانی جمع ہو گیا۔

اس طوفان کی آمد سے پہلے اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو حکم دیا تھا وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا (ہود۔۳۷) ہمارے حکم سے کشتی تیار کرو۔ پھر جب تنور سے پانی ابلنا شروع ہو تو خود بھی اپنے پیروکاروں سمیت اس میں سوار ہو جانا اور مختلف جانوروں کا ایک ایک جوڑا بھی ساتھ رکھ لینا۔ کیونکہ اس طوفان میں کوئی جاندار باقی نہیں بچے گا۔ سوائے کشتی والوں کے۔ اُدھر قوم کا حال یہ تھا کہ جب وہ نوح علیہ السلام کو کشتی تیار کرتے ہوئے دیکھتے سَخِرُوا مِنْهُ تو ٹھٹھا کرتے۔ یہ کشتی بہت لمبی چوڑی تھی جس میں بہتر یا اسی افراد، اُن کا سامان اور جانوروں کا جوڑا جوڑا بھی سوار ہو گئے۔ یوں سمجھ لو جیسے ہمارے ہاں سفینہ حجاج بہت بڑا بحری جہاز ہوا کرتا تھا۔ یہ جہاز تو گیارہ منزلہ تھا، تاہم نوح علیہ السلام کی کشتی صرف تین منزلہ تھی۔

بائیبل کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بارش چالیس دن تک جاری رہی ہمارے ہاں تو چوبیس گھنٹے کی بارش بھی تباہی مچا دیتی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے جہاں مسلسل چالیس دن بارش ہوئی اور نیچے سے بھی پانی اُبلتا رہا، وہاں کیا حشر ہوا ہوگا۔ تفسیری روایات میں آتا ہے کہ بلند پہاڑیوں سے بھی اُوپر تیس تیس فٹ تک پانی چڑھ گیا۔ کیا یہ طوفان پوری روئے زمین پر آیا تھا یا کسی محدود علاقے میں؟ اس بات میں مفسرین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جس جس خطہ ارضی میں انسانی آبادی تھی سیلاب اس خطے تک محدود رہا اور بعض کہتے ہیں کہ یہ طوفان پوری سطح ارضی پر آیا۔ اس زمانے میں آبادی بہت کم تھی اور یہ زیادہ تر دریائے دجلہ اور فرات کے دوابہ میں تھی، لہٰذا قرین قیاس یہی ہے کہ یہ طوفان اسی علاقے میں آیا تھا۔

نوح علیہ السلام کی کشتی

آگے اللہ نے نوح علیہ السلام کی کشتی کا ذکر بھی کیا ہے وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ اور ہم نے نوح علیہ السلام کو تختوں اور کیلوں والی کشتی پر سوار کرایا۔ ظاہر ہے کہ لکڑی کے تختے کیلوں کے ساتھ جوڑ کر ہی کشتی تیار کی گئی تھی۔ فرمایا تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا یہ کشتی ہمارے سامنے پانی کی سطح پر چلتی تھی یعنی

ہماری نگرانی اور حفاظت میں چھ سات ماہ تک پانی پہ تیرتی رہی۔ اور اس کے بعد وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ (ھود۔ ۴۴) جودی پہاڑ پہ جا کر ٹھہر گئی۔ یہ پہاڑ آرمینیا کے پہاڑوں میں سے ہے جسے پرانے جغرافیے میں ارارت کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ پھر جب آہستہ آہستہ پانی اترا تو نوح علیہ السلام اپنے ہمراہیوں سمیت کشتی سے نیچے اترے۔ یہ کشتی صدیوں تک اسی پہاڑ پہ پڑی رہی جسے لوگ عبرت کے لیے جا کر دیکھتے تھے۔ اب تو بڑے بڑے جہاز پانی کی سطح پہ رواں دواں ہیں۔ مگر اس جہاز رانی کی بنیاد نوح علیہ السلام کی کشتی ہی تھی۔ اللہ نے فرمایا ہم اس کشتی کو رہتی دنیا تک نمونہ بنائیں گے اور یہ بات ہمیشہ یاد رکھی جائیگی۔ کہ اللہ نے اس کشتی پہ سوار ہونے والوں کو بچا لیا جب کہ باقی سارے غرق کر دیے گئے فرمایا جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ یہ بدلہ تھا اس چیز کا جس کی ناقدری کی گئی لوگوں نے خدا کی وحدانیت اور جزائے عمل کا انکار کیا، وقوع قیامت پہ یقین نہ کیا، نبی کی نبوت کو تسلیم نہ کیا۔ اور اللہ کے مخلص بندے نوح علیہ السلام کی کوئی بات نہ مانی، یہ اسی چیز کا بدلہ تھا کہ ساری کی ساری قوم تباہ و برباد ہو گئی۔

فرمایا وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً اور البتہ تحقیق ہم نے اس کشتی کو نشانی بنا دیا تاکہ لوگ اس کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ پس کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟ کون ہے جو خدا تعالی کی قدرت تامہ میں غور کرے اور اس واقعہ سے عبرت حاصل کرے؟ فرمایا دیکھ لیا، فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَنُذُرِ کہ کیا ہوا میرا عذاب اور میرا ڈرانا تم کو اللہ کے نبیوں نے آخرت کے انجام سے بروقت ڈرایا تھا مگر تم نے اس وقت کچھ پرواہ نہ کی جس کا نتیجہ سزا کی صورت میں برآمد ہوا۔

قرآن بطور نصیحت

اللہ تعالی نے انذار کرنے کے بعد نصیحت کی بات کی ہے وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا ہے پس ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟ اللہ تعالی نے قرآن کریم کو

ترغیب و ترہیب کے ساتھ اس انداز سے بیان کیا ہے کہ اگر کوئی شخص ذرا سا غور بھی کرے تو وہ اس سے نصیحت حاصل کر سکتا ہے اور معاملہ اس کی سمجھ میں آ سکتا ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اجتہاد اور استنباط کے لحاظ سے تو قرآن حکیم بڑی گہری کتاب ہے مگر عمل اور نصیحت کے اعتبار سے بہت آسان ہے ایک عام عقل و فہم والا آدمی بھی اس کی تعلیمات سے مستفید ہو سکتا ہے، اور اس پر عمل کر سکتا ہے۔ مگر ہر لحاظ سے قرآن ایک آسان کتاب نہیں۔ اس لیے قرآن کی تفسیر کرنے کے ضمن میں سلف نے بڑی کڑی شرائط لگائی ہیں۔ جب تک تفسیر سے متعلقہ جملہ علوم پر عبور حاصل نہ ہو قرآن کی تفسیر کرنا درست نہیں کیونکہ اس سے گمراہی میں پڑجانے کا خطرہ ہے سلف میں تو علم کا بہت زور تھا لیکن بعد میں کمزوری آگئی، مجتہد حضرات بھی کمزور ہو گئے، لہذا اب مسائل کے استنباط کے لیے بڑی گہرائی کی ضرورت ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ تمام انسان اور دیگر مخلوق مل کر بھی ان مصلحتوں کو نہیں پا سکتے جو اللہ نے قرآن کی ایک ایک آیت میں رکھی ہیں اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے عام چیلنج کر رکھا ہے فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ (البقرہ۔۲۳) کہ اس جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لاؤ، مگر فرمایا کہ سارے انسان اور جن مل کر بھی قرآن کی نظیر پیش نہیں کر سکتے اگرچہ بعض بعض کے مددگار بھی بن جائیں۔ اس چیلنج کو قبول کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوئی۔ وجہ یہی ہے کہ قرآن پاک کی حکمتوں اور مصلحتوں کو کوئی نہیں پا سکتا۔ شاہ صاحبؒ اپنی کتاب فیوض الحرمین میں لکھتے ہیں کہ جب میں قرآن پاک کی کسی ایک آیت میں غور کرتا ہوں تو اس کے نیچے علوم و معارف کا اتنا وسیع سمندر نظر آتا ہے جسے عبور کرنا انسان کے بس کی بات نہیں، چہ جائیکہ سارے قرآن پر عبور حاصل ہو۔ تو اس لحاظ سے قرآن بہت گہری کتاب ہے لیکن عمل، اخلاق اور نصیحت کے اعتبار سے بہت آسان ہے، ہر پڑھا لکھا اور ان پڑھ آدمی اس کے احکام پر عمل پیرا ہو سکتا ہے۔

قوم عاد کی ہلاکت

قوم نوح کے بعد اللہ نے قوم عاد کا حال اجمالاً بیان کیا ہے۔ كَذَّبَتْ عَادٌ قوم عاد نے اللہ کے نبی ہود علیہ السلام کو جھٹلایا۔ امام جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں۔ کہ قوم نوح کے دو ہزار چھ سو سال بعد اللہ نے قوم عاد کو بام عروج تک پہنچایا۔ اللہ کے نبی ہود علیہ السلام نے چار سو سال تک اپنی قوم کو وعظ و نصیحت کی، خدا کا پیغام سنایا مگر وہ لوگ کفر و شرک پر اڑے رہے۔ ان میں غرور و تکبر اور اسراف جیسی بیماریاں تھیں جب یہ لوگ کسی طرح بھی راہِ راست پر آنے کے لیے تیار نہ ہوئے تو اللہ نے ان پر تند ہوا بھیجی جو سات راتیں اور آٹھ دن تک مسلسل چلتی رہی اور اس نے تمام نافرمانوں کو ہلاک کر دیا۔ اسی لیے اس مقام پر اللہ نے فرمایا کہ قوم عاد نے جھٹلایا فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ تو کیسا ہوا میرا عذاب اور ڈرانا إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا ہم نے ان پر تند ہوا بھیجی فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ایک نحوست والے دن، یہاں یوم سے مراد مطلق وقت ہے کیونکہ یہ ہوا صرف ایک دن نہیں بلکہ سات راتیں اور آٹھ دن تک چلتی رہی تھی۔ اور نحوست سے مراد یہ ہے کہ یہ اُن نافرمانوں کے حق میں تھی، ورنہ دن کوئی بھی منحوس نہیں ہوتا سارے ایام اللہ کے ہیں۔ ہاں! اگر اللہ تعالیٰ کسی خاص وقت کو کسی قوم یا فرد کے لیے منحوس بنا دے تو یہ الگ چیز ہے۔ کوئی بھی دن، سال یا وقت سارے لوگوں کے لیے منحوس نہیں ہوتا۔ قوم عاد کی یہی نحوست تھی کہ انہوں نے اللہ کے نبی کی بات کو ٹھکرایا تو اللہ نے انہیں صفحہ ہستی سے نابود کر دیا۔

فرمایا قوم عاد پر مسلط کی جانے والی تند ہوا ایسی تھی تَنزِعُ النَّاسَ جو لوگوں کو اکھاڑ کر پھینک دیتی تھی كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنقَعِرٍ گویا کہ وہ کھجور کے اکھاڑے ہوئے تنے ہوں۔ قوم عاد کے لوگ بڑے طاقتور اور قد آور تھے جب اللہ نے اُن پر موت طاری کی تو اُن کی لاشیں ایسے پڑی تھیں جیسے کھجور کے بڑے بڑے تنے اکھاڑ کر پھینک دیے گئے ہوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ یہی ہوا جب نرم اور خوشگوار ہوتی ہے تو مردہ دلوں کو زندگی بخشتی ہے اور کھیتی باڑی

کے لیے مفید ہوتی ہے اگر جب یہی ہوا تند و تیز ہو جائے تو آگ برسانے لگتی ہے اور جب آندھی کی صورت میں آتی ہے تو پہاڑوں جتنے بڑے ریت کے ٹیلوں کو ایک جگہ سے اڑا کر دوسری جگہ لے جاتی ہے بسا اوقات ریگستانوں میں سفر کرنے والے قافلے ان طوفانوں کے دوران ریت میں دب کر ختم ہو جاتے ہیں۔ فرمایا دیکھیو فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ پس کیسا ہوا میرا عذاب اور میرا ڈرانا۔ آگے پھر اسی جملے کو دہرایا ہے وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ اور البتہ تحقیق ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان بنا دیا ہے، پس ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟ آج وقت ہے کہ تم قرآن سے نصیحت حاصل کر کے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ سکتے ہو ورنہ اللہ کی گرفت یقینی ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِالنُّذُرِ ﴿۲۳﴾ فَقَالُوا أَبَشَرًا مِنَّا وَاحِدًا نَتَّبِعُهُ
إِنَّا إِذًا لَفِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ﴿۲۴﴾ أَؤُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْ
بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ أَشِرٌ ﴿۲۵﴾ سَيَعْلَمُونَ غَدًا مَنِ
الْكَذَّابُ الْأَشِرُ ﴿۲۶﴾ إِنَّا مُرْسِلُو النَّاقَةِ فِتْنَةً لَهُمْ
فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴿۲۷﴾ وَنَبِّئْهُمْ أَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ
بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُحْتَضَرٌ ﴿۲۸﴾ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ
فَتَعَاطَى فَعَقَرَ ﴿۲۹﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿۳۰﴾
إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا كَهَشِيمِ
الْمُحْتَظِرِ ﴿۳۱﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ
مُدَّكِرٍ ﴿۳۲﴾ كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ بِالنُّذُرِ ﴿۳۳﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَا
عَلَيْهِمْ حَاصِبًا إِلَّا آلَ لُوطٍ نَجَّيْنَاهُمْ بِسَحَرٍ ﴿۳۴﴾
نِعْمَةً مِنْ عِنْدِنَا كَذَٰلِكَ نَجْزِي مَنْ شَكَرَ ﴿۳۵﴾
وَلَقَدْ أَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ﴿۳۶﴾ وَلَقَدْ
رَاوَدُوهُ عَنْ ضَيْفِهِ فَطَمَسْنَا أَعْيُنَهُمْ فَذُوقُوا
عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿۳۷﴾ وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ

مُّسْتَقِرٌّ ﴿٣٨﴾ فَذُوقُوا عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿٣٩﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا
الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ﴿٤٠﴾ ع وَلَقَدْ جَاءَ آلَ
فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿٤١﴾ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كُلِّهَا فَأَخَذْنَاهُمْ
أَخْذَ عَزِيزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿٤٢﴾

ترجمہ:- جھٹلایا قوم ثمود نے ڈر سنانے والوں کو ﴿۲۳﴾
پس کہا انہوں نے کیا ہم اپنے میں سے ایک اکیلے انسان
کا اتباع کریں۔ تحقیق اس وقت ہم
البتہ گمراہی اور پاگل پن میں ہوں گے ﴿۲۴﴾ کیا ڈال گئی
ہے نصیحت اس کے اوپر ہمارے درمیان سے۔ نہیں بلکہ
یہ جھوٹا ہے اور اترانے والا ہے ﴿۲۵﴾ (فرمایا) عنقریب
جان لیں گے یہ لوگ کل کہ کون ہے جھوٹا اور
اترانے والا ﴿۲۶﴾ بیشک ہم بھیجنے والے ہیں اونٹنی
کو آزمائش ان کے لیے۔ پس آپ انتظار کریں ان
کا اور صبر کریں ﴿۲۷﴾ اور بتلا دیں ان کو کہ بے شک
پانی تقسیم کیا ہوا ہے ان کے درمیان۔ ہر ایک کو
اسکی باری پر پہنچنا ہے ﴿۲۸﴾ پس پکارا انہوں نے اپنے
ساتھی کو، پس اس نے ہاتھ اٹھایا، اور اونٹنی کے
پاؤں کاٹ دیے ﴿۲۹﴾ پس کیسے ہوا میرا عذاب اور میرا
ڈرانا ﴿۳۰﴾ بے شک بھیجی ہم نے ان پہ ایک آواز، اور
تھے وہ مثل روندھی ہوئی باڑ کے ﴿۳۱﴾ اور البتہ تحقیق
ہم نے آسان کیا ہے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے
کے لیے پس ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ﴿۳۲﴾

جھٹلایا قومِ لوط نے ڈر سنانے والوں کو (۳۳) بیشک ہم نے بھیجی اُن پر پتھر برسانے والی آندھی، مگر لوط کے گھرانے والے۔ ہم نے ان کو بچا لیا سحری کے وقت (۳۴) یہ ہماری نعمت تھی۔ اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں اس کو جو شکر ادا کرتا ہے (۳۵) اور البتہ تحقیق ڈرایا اُن کو اُس نے ہماری گرفت سے۔ پس وہ جھگڑنے لگے ڈر سنانے والوں کے ساتھ (۳۶) اور البتہ تحقیق انہوں نے پھسلایا اُس (لوط) کو اُس کے مہمانوں سے۔ پس ہم نے مٹا دیں اُن کی آنکھیں۔ پس چکھو میری سزا اور میرا ڈرانا (۳۷) اور البتہ تحقیق صبح سویرے آیا ان کے پاس مستقل ٹھہرنے والا عذاب (۳۸) پس چکھو میرا عذاب اور میرا ڈرانا (۳۹) اور البتہ تحقیق آسان کیا ہے ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے۔ پس ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا (۴۰) اور البتہ تحقیق آئے آلِ فرعون کے پاس ڈر سنانے والے (۴۱) جھٹلایا انہوں نے ہماری سب نشانیوں کو۔ پس پکڑا ہم نے ان کو پکڑنا ایک زبردست اور قدرت رکھنے والی ہستی کا (۴۲)

ربطِ آیات

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے پانچ نافرمان قوموں کا ذکر کر کے اُن کی تباہی کا حال بیان کیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح سابقہ اقوام نافرمانی کی وجہ سے تباہ و برباد ہوئیں اسی طرح اگر اہلِ مکہ بھی اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے تو ان کا انجام بھی سابقہ اقوام سے مختلف نہیں ہوگا۔ گذشتہ درس میں قومِ نوح اور قومِ عاد کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب آج کے درس میں مزید تین اقوام یعنی قومِ ثمود، قومِ لوط اور قومِ فرعون کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان اقوام کو دنیا میں پورا پورا موقع دیا مگر

وہ ایمان نہ لائے بلکہ اللہ کے نبیوں کو جھٹلایا اُن کو تکالیف پہنچائیں۔ توحید خداوندی اور معاد کا انکار کیا جس کی وجہ سے اللہ نے انہیں اسی دُنیا میں سزا دی اور انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا کر رکھ دیا۔

قوم ثمود کی ہٹ دھرمی

ارشاد ہوتا ہے كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ قوم ثمود نے ڈرسنانے والوں یعنی اللہ کے نبی حضرت صالح علیہ السلام کی تکذیب کی۔ اللہ نے اس قوم کی طرف حضرت صالح علیہ السلام کو ہی مبعوث فرمایا تھا مگر یہاں پر نُذُر جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کے کسی ایک نبی کو جھٹلانا تمام انبیاء کے جھٹلانے کے مترادف ہے۔ سارے نبیوں کا منشور تو ایک ہی رہا ہے یعنی اللہ کی توحید کا پیغام، ایمان، نیکی، امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ البتہ شریعتوں میں تھوڑا بہت اختلاف ہے تو یہ فروعی چیز ہے وگرنہ دین سب کا ایک ہی ہے۔ اس لیے ایک نبی کی تکذیب گویا سارے نبیوں کی تکذیب کے برابر ہے۔ تو یہاں پر سارے نبیوں کے جھٹلانے سے یہی مراد ہے۔

بہرحال قوم ثمود کے لوگ بڑے متکبر تھے فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ کہنے لگے کیا ہم اپنے میں سے ہی ایک آدمی کا اتباع کرنے لگیں۔ یہ بھی تو آخر ہماری برادری کا ہی آدمی ہے، اس میں کون سی خوبی ہے جو ہم اس کی سیادت قبول کر لیں؟ کہنے لگے، اگر ہم نے اس کی بات مان لی اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ تو بیشک ہم گمراہی اور دیوانگی میں ہوں گے، لہٰذا ہم اس کی چال میں آنے کی حماقت نہیں کر سکتے۔ بغرضیکہ قوم نے اپنے نبی کو دیوانہ اور اس کے پیروکاروں کو گمراہی کا لقب دیا۔

پھر انہوں نے اپنی ہٹ دھرمی کے حق میں یہ دلیل بھی دی ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا کیا ہمارے درمیان میں سے اس پر نصیحت ڈال دی گئی ہے؟ کیا اس کے علاوہ کوئی اور آدمی نہیں تھا جو نصیحت کا مورد بنتا؟ اس کے پاس نہ مال ہے نہ دولت، نہ باغات ہیں اور نہ یہ جھتے کا

مالک ہے تو یہ وحی کے نزول کا کیسے مستحق بن گیا ہے جو کہتا ہے کہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے اور اللہ نے مجھے نبی بنا کر بھیجا ہے، اس قسم کی باتیں ہر نبی کے دور میں ہوتی رہی ہیں۔ خود حضور علیہ السلام کی قوم قریش بھی اسی قسم کی بات کرتی تھی وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (الزخرف-۳۱) کہتے تھے کہ یہ قرآن مکے اور طائف کی دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل ہوا۔ یہاں بڑے بڑے سردار اور چوہدری ہیں جن کے پاس مال و دولت، جتھہ اور جانور ہیں۔ مگر ان میں سے تو کسی پر قرآن نازل نہیں ہوا، کیا اس کام کے لیے ابوطالب کا یتیم بھتیجا ہی رہ گیا تھا؟
غرضیکہ قوم ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت و رسالت کو تسلیم کرنے کی بجائے کہنے لگے بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ۔ بلکہ یہ شخص تو جھوٹا اور اترانے والا ہے۔ یہ نبوت کا دعویٰ کر کے اپنی بڑائی بیان کرنا چاہتا ہے۔ ہم اسے اللہ کا نبی ماننے کے لیے تیار نہیں۔

اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ یہ لوگ عنقریب کل ہی جان لیں گے کہ کون جھوٹا اور اترانے والا ہے۔ غد سے مراد بالکل اگلا دن نہیں بلکہ اس کا مطلب مستقبل قریب ہے۔ جیسے سورۃ الحشر میں اللہ کا فرمان ہے۔ اے لوگو! اللہ سے ڈر جاؤ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (آیت-۱۸) اور دیکھو کہ تم نے کل یعنی قیامت کیلئے کیا سامان تیار کیا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی فرمایا کہ عنقریب کل ہی ان کو پتہ چل جائے گا کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون۔ یہ لفظ عربی ادب میں بھی اسی معانی میں استعمال ہوتا ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے۔

تَرْجُوْا غَدًا وَّغَدًا كَحَامِلَةٍ فِي
الْحَيِّ لَا يَدْرُوْنَ مَا تَلِدُ

تم کل کی امید لگائے بیٹھے ہو مگر کل کا معاملہ تو خاندان میں حاملہ عورت کی مانند

ہے جس کے متعلق کچھ پتہ نہیں کہ وہ کل کیا جنے گی ۔

اونٹنی بطور معجزہ

اللہ نے فرمایا اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ ہم ان کے پاس آزمائش کے لیے ایک اونٹنی کو بھیجنے والے ہیں ۔ اللہ نے اپنے نبی صالح علیہ السلام کو تسلی دی کہ آپ ان نابکاروں کی تکلیف دہ باتوں سے دل برداشتہ نہ ہوں ۔ ہم ان کو ایک آخری موقع دے رہے ہیں فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ پس آپ تھوڑی دیر انتظار کریں اور صبر و تحمل سے کام لیں ، ہم عنقریب انہیں کیفر کردار تک پہنچا دیں گے ۔ اونٹنی کا واقعہ بہت سی سورتوں میں بیان ہو چکا ہے قوم نے خود صالح علیہ السلام سے مطالبہ کیا تھا کہ اس چٹان میں سے ہمارے سامنے ایک اونٹنی نکالو جو ہمارے سامنے بچہ بھی جنے ، پھر ہم آپ کی صداقت پر ایمان لائیں گے ۔ اللہ نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم کیا اور ان کے سامنے چٹان سے ایک غیر معمولی اونٹنی برآمد ہوئی ۔ یہ بڑی قد آور اونٹنی تھی جسے سورۃ الشمس میں نَاقَةَ اللّٰهِ کہا گیا ہے حضور علیہ السلام کے ایک جلیل القدر صحابی ابوموسیٰ اشعریؓ نے اس اونٹنی کے بیٹھنے کی جگہ کی پیمائش کی تھی تو یہ نوے فٹ مربع نکلی ، اتنی بڑی کلانی والی اونٹنی تھی ۔ یہ اونٹنی دودھ بھی بہت دیتی تھی ۔ جس شخص کا جب جی چاہتا اس سے دودھ دوہ لیتا اور وہ کوئی تعرض نہ کرتی ۔

پانی کی تقسیم

یہ اونٹنی جس قدر قد آور تھی اسی قدر وہ پانی بھی زیادہ پیتی تھی ۔ جب یہ پانی کے گھاٹ پر جاتی تو باقی جانور اسے دیکھ کر بھاگ جاتے اور سارا پانی یہ اکیلی ہی پی جاتی ۔ اس بناء پر باقی جانوروں کی سیرابی کا مسئلہ پیدا ہو گیا ۔ اس مسئلہ کا حل بھی اللہ نے خود ہی فرما دیا اور اپنے نبی کو وحی کی وَنَبِّئْهُمْ أَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ آپ ان کو بتا دیں کہ ان کے درمیان پانی تقسیم شدہ ہے اس تقسیم کے مطابق كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ہر ایک کو اپنی باری پر پہنچنا چاہیئے پانی کی تقسیم اس طرح کی گئی کہ ایک دن اکیلی اونٹنی پانی پیئے اور دوسرے دن باقی سارے جانور سیراب ہوں ۔ اس طرح گویا باری مقرر کر دی گئی جس سے پانی کا مسئلہ حل ہو گیا ۔

امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ یہ پانی کی تقسیم نہیں تھی بلکہ پانی کے منافع کو تقسیم کر کے باری مقرر کر دی گئی تھی۔ کسی حوض یا کنوئیں پر اس قسم کی تقسیم درست ہے اور فقہاء کی اصطلاح میں اسے مہایات کہا جاتا ہے۔ امام صاحبؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ حکم تو صالح علیہ السلام کی شریعت میں تھا تو کیا یہ ہماری شریعت میں بھی نافذ العمل ہے اس کا جواب خود ہی دیتے ہیں کہ اگر قرآن پاک میں کسی پہلی شریعت کا کوئی مسئلہ بیان کیا گیا ہو جس کی تردید بھی قرآن میں موجود نہ ہو تو ایسا مسئلہ ہماری شریعت میں بھی نافذ سمجھا جائے گا۔ بعض چیزوں کو پہلی شریعتوں میں جائز قرار دیا گیا ہے مگر قرآن یا سنت میں واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ ہماری شریعت میں روا نہیں تو ایسا حکم ہمارے لیے جائز نہیں ہوگا۔ البتہ پہلی شریعتوں کے جس حکم کو اللہ یا اس کے نبی نے منسوخ قرار نہیں دیا، وہ ہمارے لیے بھی نافذ ہوگا۔ یہ تو پانی کی تقسیم کا قانون تھا بجا طور پر صالح علیہ السلام کی شریعت میں تھا۔ مگر عدم تنسیخ کی وجہ سے ہمارے لیے بھی جائز ہے۔ جس چیز میں بہت سے لوگوں کے حقوق مشترک ہوں، اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے باری ٹھہرائی جا سکتی ہے۔

قتل ناقہ پر عذاب الٰہی

شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں کہ اس قوم میں ایک بدکار عورت تھی جس کے بہت سے مویشی تھے جنہیں اس اونٹنی کی وجہ سے پانی پینے میں دقت کا سامنا تھا چنانچہ اس عورت نے اس اونٹنی کے خاتمے کے لیے ایک شخص قدار ابن سالف کی خدمات حاصل کیں۔ یہ بدبخت آدمی اس عورت کے جھانسے میں آ گیا، اس نے کچھ دوسرے آدمی ساتھ ملائے اور اونٹنی کے قتل کا منصوبہ بنا لیا۔ اسی واقعہ کے متعلق اللہ نے یہاں ارشاد فرمایا فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ پس انہوں نے اپنے ساتھی کو پکارا فَتَعَاطٰى پس اس نے ہاتھ اٹھایا فَعَقَرَ اور اونٹنی کے پاؤں کاٹ دیے تفسیری روایات میں آتا ہے کہ جب وہ اونٹنی گر پڑی تو ان لوگوں نے تلواریں چلا کر اس کے ٹکڑے کر دیے۔ اونٹنی کا بچہ بھی ساتھ تھا۔ وہ یہ واقعہ دیکھ کر بھاگ گیا۔ اسی چٹان پر جا کر زور زور سے چیخیں ماریں جہاں سے اونٹنی برآمد ہوئی تھی۔

اور پھر اسی چٹان میں غائب ہو گیا۔ اللہ نے قوم کو تین دن کی مہلت دی اور اس کے بعد پوری قوم کو ملیا میٹ کر دیا۔ اللہ نے فرمایا فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ پھر کیسا ہوا میرا عذاب اور میرا ڈرانا۔

قوم کی ہلاکت کے متعلق اللہ نے فرمایا إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً ہم نے ان پہ ایک چیخ بھیجی۔ فرشتے نے ایسی چیخ ماری کہ لوگوں کے جگر پھٹ گئے اور نیچے سے زلزلہ بھی آیا جس سے پوری کی پوری قوم ہلاک ہو گئی۔ اللہ نے فرمایا فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ وہ روندی ہوئی باڑ کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر رہ گئے۔ اللہ نے عبرت کے لیے یہ واقعہ بیان کیا اور ساتھ نصیحت کی بات بھی کی۔ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ اور البتہ تحقیق ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان بنا دیا ہے۔ پس ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟ اگر کوئی نصیحت کا طالب ہے تو وہ قرآن حکیم سے بخوبی استفادہ حاصل کر سکتا ہے۔

قوم لوط پر عذاب

آگے چوتھے واقعہ میں اللہ نے قوم لوط کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ بِالنُّذُرِ قوم لوط نے بھی ڈر سنانے والوں کو جھٹلایا۔ اللہ کا نبی بڑے عرصہ تک قوم کو سمجھاتا رہا۔ مگر وہ لوگ ایک طرف تو کفر اور شرک کا ارتکاب کرتے تھے تو دوسری طرف اغلام بازی جیسی قبیح اخلاقی بیماری میں مبتلا تھے۔ انہوں نے لوط علیہ السلام کی کوئی بات نہ مانی اس کے نتیجے میں اللہ نے فرمایا۔ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا ہم نے ان پہ تند آندھی بھیجی جس میں پتھر شامل تھے۔ اس قوم پر آسمان سے پتھر برسے ہر پتھر پہ نام لکھا ہوا تھا کہ یہ فلاں سردار کے سر پہ پڑے گا اور یہ فلاں چوہدری کو لگے گا۔ اس طرح اللہ نے ساری نافرمان قوم کو سنگسار کر دیا۔ إِلَّا آلَ لُوطٍ سوائے لوط علیہ السلام کے گھرانے کے کہ وہ اس ہلاکت سے بچ گئے۔ لوط علیہ السلام کے ساتھ ان کی بیٹیاں تھیں، وہ بھی بچ گئیں مگر آپ کی نافرمان بیوی نہ بچ سکی۔ جیسا کہ سورۃ الاعراف میں فرمایا۔ إِلَّا امْرَأَتَهُ

كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ (آیت ۸۳۰) کیونکہ وہ پیچھے رہنے والوں میں تھی یعنی اللہ کے حکم کے مطابق راتوں رات لوط علیہ السلام کے ساتھ بستی سے نکلی لہذا باقی قوم کے ساتھ ہی تباہ ہو گئی۔

فرمایا سوائے لوط علیہ السلام کے گھر والوں کے نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ہم نے ان کو سحری کے وقت بچا لیا۔ جب سحری کے وقت اللہ کا عذاب آیا تو یہ لوگ بستی چھوڑ کر جا چکے تھے لہذا بچ گئے۔ فرمایا یہ بچاؤ نِعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ہماری طرف سے خاص مہربانی تھی كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ہم شکر گزاروں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ حضرت لوط علیہ السلام اور آپ کے گھر والے چونکہ شکر گزار بندے تھے، لہذا ہم نے ان کو محفوظ رکھا۔ آگے اللہ نے واقعہ کی تھوڑی سی تفصیل بھی بیان کی ہے وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا البتہ تحقیق ہم نے اس قوم کو اپنی گرفت سے ڈرایا کہ کفر، شرک اور قبیح حرکات سے باز آجاؤ مگر انہوں نے کچھ پرواہ نہ کی بلکہ فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ وہ ڈرانے والوں کے ساتھ جھگڑا کرنے لگے کہنے لگے تم بڑے پاکباز آئے ہو ہمیں نصیحت کرنے کے لیے ہم تمہیں اپنی بستی سے نکال باہر کریں گے۔ خبردار ہمیں ایسا کوئی وعظ نہ کیا کرو۔ وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ اور البتہ تحقیق انہوں نے لوط علیہ السلام کو ان کے مہمانوں سے پھسلانے کی کوشش کی یعنی ان کو اپنے اور مہمانوں کے درمیان حائل ہونے سے روکنا چاہا تاکہ وہ اپنی قبیح خواہش کی تکمیل کر سکیں۔ مگر لوط علیہ السلام نے گھر کے دروازے بند کر دیئے تاکہ قوم ان کے مہمانوں کی بے حرمتی نہ کر سکے۔ مگر وہ بڑی ناہنجار قوم تھی۔ وہ گھر کی دیواریں پھلانگ کر اندر آگئے۔ اس پر لوط علیہ السلام سخت پریشان ہو گئے۔

سورۃ ہود میں ہے کہ انہوں نے فرمایا هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ (آیت ۷۷) آج تو بڑا مشکل کا دن ہے آپ نے قوم کو بڑا سمجھایا کہ خدا کے بندو! مجھے رسوا نہ کرو کیونکہ مہمانوں کی رسوائی میری رسوائی ہے۔ اپنی جنسی خواہش کے لیے میری اور قوم کی بچیاں ہیں ان سے نکاح کر لو۔ مگر وہ لوگ نصیحت کی کوئی بات

مانگنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔

جب مہمانوں نے لوط علیہ السلام کو اس پریشانی میں دیکھا تو اپنے آپ کو ظاہر کر دیا۔ لوط علیہ السلام سے کہنے لگے کہ ہم انسان نہیں بلکہ فرشتے ہیں اور اس قوم پر عذاب نازل کرنے کیلئے آئے ہیں، آپ پیچھے ہٹ جائیں، ہم خود ان سے نپٹ لیں گے۔ چنانچہ جونہی جبرائیل علیہ السلام نے اپنا پر ہلایا تو اللہ نے فرمایا فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ ہم نے انکی آنکھیں ہی مٹا دیں وہ سب کے سب اندھے ہو گئے مگر پھر بھی اپنی قبیح حرکت سے باز آنے کی بجائے وہ ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر مہمانوں کو تلاش کرتے رہے۔ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ پس چکھو میرا عذاب اور میرا ڈرانا۔ پھر اللہ نے لوط علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے اہل خانہ کو لے کر رات کے پچھلے حصے میں بستی سے نکل جائیں اور پیچھے پلٹ کر نہ دیکھیں۔ آپ نے ایسا ہی کیا، بچیوں کو آگے آگے چلایا اور خود پیچھے پیچھے چلنے لگے اور اس طرح آپ بستی سے دور نکل گئے۔ پھر اللہ نے اس قوم پر صبح کے وقت عذاب بھیجا جس کے متعلق یہاں فرمایا ہے وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ اور البتہ تحقیق صبح سویرے اُن پر ایسا مستقل عذاب آیا جس سے ابد الآباد تک نہ نکل سکیں گے۔ یہ تو اللہ نے دنیا میں سزا دی، پھر آگے برزخ کی سزا اور پھر آخرت کی سزا ہو گی۔ اسی لیے فرمایا کہ ان پر ہمیشہ کے لیے ٹھہر جانے والا عذاب نازل ہوا فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ پس چکھو میرا عذاب اور میرا ڈرانا تم جیسے نابکاروں کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیئے۔ آگے اللہ نے پھر قرآن پاک کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ اور البتہ تحقیق ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا ہے پس کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟

قوم فرعون کی گرفت

اس سورۃ میں اللہ نے پانچویں نمبر پر قوم فرعون کی ہلاکت کا ذکر کیا ہے۔ وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ اور البتہ تحقیق آل فرعون کے پاس بھی ڈر سنانے والے آئے۔ اللہ کے یہ عظیم رسول حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام تھے

جنہوں نے فرعون کو توحید کی دعوت دی اور ساتھ بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کیا مگر انہوں نے تسلیم کرنے کی بجائے كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا ہماری تمام نشانیوں کو جھٹلا دیا۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے پیش کردہ معجزات کو جادو کہہ کر رد کر دیا۔ اللہ نے فرمایا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ہم نے پکڑا اُن کو ایک غالب اور قادر ہستی کا پکڑنا۔ تمام قوتوں کا سرچشمہ تو اللہ تعالیٰ ہے لہذا اس سے بڑھ کر گرفت کس کی ہو سکتی ہے؟ اللہ نے ایسے عذاب میں پکڑا کہ جس سے کبھی باہر نہیں نکل سکیں گے۔ دنیا میں بحرِ قلزم کی موجوں کی نذر ہوئے اور آخرت میں دائمی عذاب میں مبتلا ہوں گے، لہذا فرمایا کہ ہم نے انہیں بڑی سخت گرفت میں جکڑ لیا۔ یہ پانچ واقعات اللہ نے نہایت ہی اختصار کے ساتھ بیان کر دیے ہیں تاکہ مشرکین عرب اور بعد میں آنے والے لوگ ان واقعات سے عبرت پکڑیں اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کریں۔

درس چہارم ۴ — آیت ۴۳ تا ۵۵

أَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ أُولَٰئِكُمْ أَمْ لَكُم بَرَاءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿٤٣﴾ أَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ جَمِيعٌ مُّنتَصِرٌ ﴿٤٤﴾ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ﴿٤٥﴾ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ ﴿٤٦﴾ إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ﴿٤٧﴾ يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ ﴿٤٨﴾ إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ﴿٤٩﴾ وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ﴿٥٠﴾ وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا أَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ﴿٥١﴾ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ ﴿٥٢﴾ وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُّسْتَطَرٌ ﴿٥٣﴾ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهَرٍ ﴿٥٤﴾ فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِندَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿٥٥﴾

ع ۱۵ / ۱۰

ترجمہ :- کیا تمہارے کافر بہتر ہیں ان سے ، یا تمہارے لیے برأت لکھی ہوئی ہے صحیفوں میں ﴿۴۳﴾ کیا کہتے ہیں یہ لوگ کہ ہم سب بدلہ لینے والے ہیں ﴿۴۴﴾ عنقریب شکست دی جائیگی اس مجمع کو اور

بہ پشت پھیر جائیں گے (۴۵) بلکہ قیامت ان کے وعدے کا وقت ہے ، اور قیامت بہت بڑی آفت اور کڑوی چیز ہے (۴۶) بیشک مجرم لوگ گمراہی اور جنون میں ہیں (۴۷) جس دن گھسیٹے جائیں گے ان کو دوزخ کی آگ میں چہروں کے بل (اور کہا جائیگا) چکھو آگ کا جلانا (۴۸) بیشک ہم نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے ایک اندازے کے ساتھ (۴۹) اور نہیں ہے ہمارا معاملہ مگر یکبارگی آنکھ جھپکنے کی مانند (۵۰) اور البتہ تحقیق ہم نے ہلاک کیے ہیں تمہارے ساتھ والے ، پس ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا (۵۱) اور ہر وہ چیز جو انہوں نے انجام دی ہے ، صحیفوں میں درج ہے (۵۲) اور ہر چھوٹی اور بڑی چیز لکھی ہوئی ہے (۵۳) بیشک متقی لوگ جنتوں اور نہروں میں ہوں گے (۵۴) سچی بیٹھک میں ایک بڑی قدرت رکھنے والے بادشاہ کے پاس (۵۵)

ربط آیات

اس سورۃ میں جملہ بنیادی عقائد میں سے وقوع قیامت اور جزائے عمل پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ گذشتہ درس میں پانچ سابقہ اقوام کا ذکر کیا گیا ہے جن کو اللہ نے اُن کی نافرمانی اور سرکشی کی بنا پر دنیا میں ہی سزا دی اور ان کو صفحہ ہستی سے نابود کر دیا۔ یہ قومیں قوم نوح ، قوم عاد ، قوم ثمود ، قوم لوط اور قوم فرعون ہیں ان اقوام کا حال ذکر کر کے اللہ نے نزول قرآن کے زمانے اور بعد میں آنے والوں کو تنبیہ کی ہے کہ وہ بھی مذکورہ اقوام کے نقش قدم پر چل کر اپنی ہلاکت کو دعوت نہ دیں ۔

کفار مکہ کی شکست

اب آج کے درس میں کفار مکہ کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے اَکُفَّارُکُمْ خَیْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِکُمْ کیا تمہارے یہ کافر مذکورہ سابقہ اقوام کے کافروں

سے بہتر ہیں؟ وہ تو تم سے مال و دولت اور جسمانی طاقت میں بڑھے ہوئے تھے
پھر تم کس بنا پر اپنے آپ کو ان سے بہتر سمجھتے ہو؟ قانونِ مکافات تو یکساں
ہے۔ جب وہ لوگ کفر، شرک، تعدی، تجاوز اور انکارِ رسالت اور معاد کی وجہ
سے گرفت میں آئے تو تم میں کیا خوبی ہے کہ تم بھی انہی کے نقشِ قدم پہ چل کر
عذابِ الہٰی سے بچ جاؤ گے۔ اسی طرح اللہ نے سورۃ الدخان میں فرمایا۔
اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ (آیت۔ ۳۷) کیا یہ لوگ بہتر ہیں یا قومِ تبع یا ان
سے پہلے لوگ۔ فرمایا جب قومِ تبع کو ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا تو یہ ان
سے کوئی بہتر تو نہیں ہیں جو یہ بچ جائیں گے۔ سورۃ سبا میں ارشاد ہوتا ہے وَمَا
بَلَغُوا مِعْشَارَ مَا اٰتَيْنٰهُمْ (آیت۔ ۴۵) پہلے لوگوں کی نسبت ہم نے نزول
قرآن کے زمانے کے کافروں کو تو عشرِ عشیر بھی نہیں دیا، پھر یہ کس بات پہ غرور کرتے
ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان پہ گرفت نہیں آئے گی۔

فرمایا کیا تمہارے یہ کافر پہلے کافروں سے بہتر ہیں اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ
یا پھر صحیفوں میں تمہیں بری قرار دے دیا گیا کہ تم جو چاہو کرتے پھرو، تم سے کوئی بازپرس
نہیں ہوگی۔ اسی قسم کا زعم باطل یہودیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ وہ بھی سمجھتے ہیں کہ ہم
سے کبھی کہیں ہماری گرفت نہیں ہوگی۔ کہتے ہیں کہ اگر ہمیں سزا ملی بھی تو صرف
چالیس روز کی ہوگی جس عرصہ میں ہم نے بچھڑے کی پوجا کی تھی، اس کے علاوہ ہمیں
کوئی سزا نہیں ملے گی۔ فرمایا اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ یا یہ لوگ یوں کہتے
ہیں کہ ہم سب بدلہ لینے والے ہیں۔ یعنی ہم اتنے طاقتور ہیں کہ کوئی ہم سے بدلہ نہیں
لے سکتا، بلکہ ہم ہی بدلہ لینے کے قابل ہیں۔ کیا ان کے تکبر و غرور کا یہ عالم ہے کہ
یہ کسی دوسرے کو اپنا مدِ مقابل نہیں سمجھتے؟ فرمایا ان کا یہ خیال بھی غلط ہے۔ ان
سے پہلے قومِ عاد نے بھی کہا تھا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (حٰمٓ السجدۃ۔ ۱۵) ہم
سے زیادہ طاقتور کون ہے دنیا میں۔ مگر اللہ نے فرمایا کہ ان سے طاقتور وہ ذات
ہے جس نے انہیں پیدا کیا ہے، لہٰذا وہ ان کی گرفت کرنے پر بھی قادر ہے۔

وہ چاہے تو کسی کمزور ترین چیز کے ذریعے تمہیں سزا میں مبتلا کر دے۔ اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ بھی سابقہ نافرمان اقوام کی طرح مبتلائے عذاب ہوں گے، اور اس کی صورت یہ ہوگی سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ ان کی جماعت کو شکست دی جائے گی وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ اور یہ پشت پھیر کر بھاگ نکلیں گے۔ چنانچہ اللہ نے اپنا یہ وعدہ پورا کیا اور کفارِ مکہ کو بدر کے میدان میں شکست فاش ہوئی اور یہ پیٹھ پھیر کر بھاگے، کچھ مارے گئے اور کچھ قیدی بنا لیے گئے۔ جب حضور علیہ السلام جنگ کے لیے خیمے سے باہر آئے تو آپ کی زبان پر یہی آیت مبارکہ تھی جسے اللہ نے حرف بحرف پورا کر دیا۔

آخرت کی سزا

فرمایا دنیا کی سزا تو اصل سزا کا ایک ادنیٰ نمونہ تھا، اصلی سزا تو اللہ کے ان دشمنوں کو آخرت میں ملنے والی ہے۔ فرمایا بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ بلکہ قیامت تو ان کے وعدے کا وقت ہے۔ اللہ نے خبردار کر رکھا ہے کہ آخرت کی واقعی سزا تو تمہیں قیامت کو ملنے والی ہے۔ اور یاد رکھو وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ کہ قیامت کی گھڑی بہت بڑی آفت اور کڑوی چیز ہے۔ جب وہ وقت آجائے گا تو پھر تمہارے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہوگی اور تمہیں سزا کا کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑے گا۔ ان کی غفلت کے متعلق فرمایا اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ بے شک مجرم لوگ گمراہی اور جنون میں پڑے ہوئے ہیں جو معاملہ ان کے ساتھ قیامت کو پیش آئے گا، اس کا اندازہ یہ لوگ آج نہیں کر سکتے۔ ان کی یہ خام خیالی ہے کہ ان سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ فرمایا اس دن ان کا کیا حال ہوگا يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِى النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ جس دن یہ لوگ دوزخ کی آگ پر چہروں کے بل گھسیٹے جائیں گے۔ پھر ان سے کہا جائے گا ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ آگ کا مزا چکھو۔ سقر دوزخ کے ناموں میں سے ایک نام ہے جیسے جحیم، لظیٰ، سعیر وغیرہ۔ فرمایا جس دن تم دوزخ میں اوندھے منہ گھسیٹے جاؤ گے اس دن تمہاری گمراہی اور دیوانگی کا نشہ اتر جائے گا اور تم کو معلوم ہو جائے گا کہ کفر اور شرک کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

مسئلہ تقدیر

فرمایا اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ بے شک ہم نے ہر چیز کو ایک خاص ٹھہرائے ہوئے اندازے کے مطابق پیدا کیا ہے۔ کافر کہتے تھے کہ جس قیامت کا رعب دیتے ہو وہ آ کیوں نہیں جاتی اور جس دوزخ کے عذاب سے ڈراتے ہو وہ آ کیوں نہیں جاتا۔ اللہ نے فرمایا کہ ہر چیز اللہ کی مقرر کردہ تقدیر کے مطابق واقع ہوتی ہے۔ کوئی چیز قبل از وقت نہیں آتی۔ جس طرح ہر شخص کی انفرادی موت اپنے وقت پر آتی ہے اور آگے پیچھے نہیں ہوتی، اسی طرح قیامت بھی اپنے مقررہ وقت پر ہی برپا ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے جس وقت کسی چیز کو پیدا کیا تو اُس کی تقدیر بھی ٹھہرا دی کہ فلاں فلاں وقت میں اس میں یہ یہ تغیر و تبدل ہوگا اور فلاں وقت پر جا کر ختم ہو جائے گی۔ دنیا میں جتنے تغیرات آ رہے ہیں یہ سب اللہ تعالیٰ کے علم، ارادے اور مشیت کے مطابق واقع ہو رہے ہیں۔ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ہمارا معاملہ تو یکبارگی ایسا ہوتا ہے جیسے آنکھ جھپکنے کی دیر ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ہم جو چاہتے ہیں چشم زدن میں ہو جاتا ہے، اس میں کسی لمبے چوڑے پلان اور پھر اُس پر بتدریج عمل کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ہم جس چیز کو کہتے ہیں ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ اس اصول کے مطابق جب ہم چاہیں گے تو قیامت بھی اچانک ہی آ جائے گی۔ اور پھر ہر ایک کو اپنی کارکردگی کا حساب چکانا پڑیگا وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ اور البتہ تحقیق ہم نے تمہارے ہمسایہ ڈالے یعنی تمہارے جیسے بہت سے گروہ پہلے ہی ہلاک کر دیئے ہیں اگر تم بھی انہی کے نقش قدم پر چلو گے تو عذاب الٰہی سے بچ نہیں سکو گے۔ یہ واقعات تمہاری عبرت کے لیے بیان کیے جاتے ہیں فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ پس کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا جو سابقہ قوموں کی ہلاکت کے واقعات سے عبرت حاصل کر کے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو مان لے اُس کے رسولوں پر ایمان لے آئے، تقدیر اور قیامت پر یقین کر لے۔

حفاظت اعمال کا انتظام

فرمایا، یاد رکھو! ہم ہر شخص کے لیے اُس کے اعمال کے مطابق ہی جزا یا سزا کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ہم نے ہر نفس کے اعمال کی حفاظت کا مستقل انتظام کر رکھا ہے

اور اس میں کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی ۔ فرمایا وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ
ہر انسان کا انجام دیا ہوا عمل صحیفوں میں درج ہے وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ
مُّسْتَطَرٌ اس کا ہر چھوٹا بڑا عمل اللہ کے حکم کے مطابق لکھا ہوا ہے ۔ یہ انسانوں
کے اعمال کی حفاظت کا قانون ہے کہ اس کا ہر قول و فعل ، حرکت اور سکون اللہ
کے فرشتے لکھتے رہتے ہیں وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ
(بنی اسرائیل ۔ ۱۳) ہر شخص کا اعمال نامہ اس کی گردن میں لٹکا دیا گیا ہے جس کو قیامت
والے دن نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا ، اور حکم ہوگا ۔ اقْرَأْ كِتَابَكَ
كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا (بنی اسرائیل ۔ ۱۴) اس کو پڑھ لو کہ تمہارے
نفس کے محاسبے کے لیے یہی کافی ہے آج تم اپنا محاسبہ خود کرو ۔ سورۃ الکہف
میں فرمایا کہ جب انسان کا اعمال نامہ اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا تو وہ دیکھ کر
ڈر جائے گا ۔ اور حیران ہو کر کہے گا يَا وَيْلَتَنَا مَالِ هَٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ
صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا (آیت ۔ ۴۹) ہائے افسوس یہ کیسی کتاب
ہے جس نے نہ کوئی چھوٹی چیز چھوڑی ہے اور نہ بڑی ، مگر اس کو محفوظ کر رکھا ہے

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ انسان کے ہر اچھے یا برے عمل کا
نتیجہ اس کی روح میں بھی محفوظ ہوتا ہے کیونکہ ہر عمل انسان کی روح سے پھوٹتا ہے
نیکی یا بدی کا بیج تو روح میں ہوتا ہے ۔ تو جب انسان کوئی عمل انجام دیتا ہے تو
وہ پھیل جاتا ہے اور اس کا نتیجہ پلٹ کر روح کے ساتھ آکر چمٹ جاتا ہے ، اور
اس کے اثرات وہاں محفوظ ہو جاتے ہیں ۔ اس کے علاوہ ہر چیز اللہ تعالیٰ
کے علم میں بھی محفوظ ہے کیونکہ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ (حٰم السجدۃ ۵۴)
اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے اور کوئی چیز بھی اس کے علم سے باہر نہیں ۔ اسی لیے
تقدیر کا مسئلہ ایمانیات میں داخل ہے کہ اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا ۔

تقدیر کی تین قسمیں

محدثین کرام تقدیر کی تین قسمیں بیان کرتے ہیں ، پہلی تقدیر کتابی ہے ۔ جو کہ
لوح محفوظ پر لکھی ہوئی ہے ۔ گویا لوح محفوظ علم الٰہی کا ایک مظہر ہے امام غزالیؒ

فرماتے ہیں کہ لوح سے مراد ایسی تختی نہیں جو ہمارے تصور میں ہے بلکہ یہ ایک ایسی لوح ہے جس کی حقیقت کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا مگر ہے ضرور اور اس میں ہر چیز محفوظ ہے۔ آپ مثال کے ذریعے سمجھاتے ہیں کہ ایک حافظ قرآن آدمی کے دماغ میں قرآن پاک اوّل تا آخر محفوظ ہوتا ہے لیکن اگر اس کے دماغ کا آپریشن کیا جائے تو وہاں گوشت، خون اور رگوں کے سوا قرآن کا ایک حرف بھی نظر نہیں آئے گا۔ اسی طرح لوح محفوظ میں ہر چیز درج ہے جو اللہ کے علم تفصیلی کا ایک نمونہ ہے اللہ نے کائنات کی تخلیق سے پہلے ہی ہر چیز لوح محفوظ میں درج کر دی تھی۔

تقدیر کی دوسری قسم تقدیر ارادی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں اوّل سے آخر تک جو بھی چیز ظاہر ہو رہی ہے یا جو آئندہ ہو گی وہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کے ارادے سے واقع ہوتی ہے۔

اور تیسری قسم تقدیر علمی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز کو ازل میں جانتا تھا آج بھی جانتا ہے اور آئندہ بھی جانتا رہے گا۔ اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو فلاں چیز کا علم نہیں تو وہ کافر سمجھا جائیگا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب کوئی چیز ظاہر ہوتی ہے تو اس وقت اللہ کو علم ہوتا ہے۔ اس سے پہلے نہیں۔ ایسے لوگ خدا تعالیٰ کے علم تفصیلی کے منکر ہیں اور قطعی کافر ہیں۔ اور جو لوگ اللہ تعالےٰ کی تقدیر کتابی اور تقدیر ارادی کے منکر ہیں، اگر ان کا انکار کسی تاویل کی بنا پر ہے تو گمراہ ہیں اور اگر وہ سرے سے ہی انکار کرتے ہیں تو پھر کافر ہیں۔ کیونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ کوئی آدمی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ توحید رسالت، بعث بعد الموت اور تقدیر پر ایمان نہیں لاتا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی ہے وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی (الاعلیٰ-۲) خدا تعالیٰ کی ذات وہ ہے جس نے کائنات کی ہر چیز کا اندازہ ٹھہرایا۔ اور پھر اس کے لیے ہدایت کا انتظام بھی فرمایا۔ خدا تعالےٰ کی صفات کاملہ میں سے ایک صفت تقدیر بھی ہے۔ تقدیر کے جو منکرین یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ ہم تمام اعمال اپنی مرضی سے انجام دیتے ہیں، وہ قدریہ فرقہ کہلاتا ہے۔

یہ فرقہ دوسری صدی میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے برخلاف جو لوگ انسان کو پتھر کی طرح مجبور محض سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان کو کچھ اختیار نہیں، وہ جبریہ فرقہ کہلاتا ہے، یعنی انسان ہر کام مجبوراً کرتا ہے، اس کو نہ کوئی اختیار ہے اور نہ یہ اپنے ارادے سے کرتا ہے۔ یہ بھی گمراہ فرقہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک حد تک اختیار دے کر اُسے مکلف بنا دیا ہے جس کی بنا پر اُسے قانون کا پابند کر دیا گیا ہے۔ اگر یہ اختیار نہ ہوتا تو انسان پتھر کی طرح جامد ہوتا اور اس سے کوئی باز پرس بھی نہ ہوتی۔ لیکن انسان مختار مطلق بھی نہیں ہے کہ جو چاہے کرتا پھرے اور اس سے کوئی باز پرس نہ ہو۔ نہیں بلکہ انسان کا اختیار محدود ہے جس سے آگے وہ نہیں جا سکتا۔ جہاں قانون کی پابندی کی ضرورت ہے وہاں تو اللہ نے اختیار دے دیا ہے تاکہ انسان اپنی مرضی اور ارادے سے قانون کی پابندی کرے یا اس کا انکار کر دے۔ اسی بنا پر انسان مکلف ہے اور قانون کی پابندی یا عدم پابندی کر کے ہی وہ جزا یا سزا کا مستحق بنتا ہے۔ البتہ اگر کسی جگہ اضطرار کی حالت پیدا ہو جائے تو وہاں مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ مثلاً کوئی شخص رعشہ کا مریض ہے اور اُسے اپنے ہاتھوں پر کنٹرول حاصل نہیں۔ اگر ایسی حالت میں اگر اُس کے ہاتھ سے کوئی برتن وغیرہ گر کر ٹوٹ جاتا ہے تو اس کا مؤاخذہ نہیں ہوگا یا اسکا ہاتھ کسی دوسرے کو لگ جاتا ہے تو اُس کی مجبوری کی بنا پر اُس سے انتقام نہیں لیا جائیگا۔ اور اگر کوئی شخص ارادۃً برتن توڑتا ہے یا کسی دوسرے شخص پر ہاتھ اٹھاتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ قابل مؤاخذہ سمجھا جائے گا۔ بہر حال انسان نہ تو مختار مطلق ہے اور نہ ہی مجبور محض۔ اللہ نے اُسے ایک خاص حد تک اختیار دیا ہے جسے وہ اپنی مرضی اور ارادے سے استعمال کرتا ہے اور اسی پر اس کی جزا یا سزا کا دارومدار ہے۔ اللہ نے سورۃ کے آخر میں تقدیر کا مسئلہ بھی سمجھا دیا ہے۔

متقین کی کامیابی

آگے فرمایا إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهَرٍ بیشک متقی لوگ باغات اور نہروں میں ہوں گے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق متقی وہ ہے جو کفر، شرک، نفاق، بد عقیدگی اور معاصی سے بچتا ہے۔ سورۃ قتال میں

گزر چکا ہے کہ جنت میں چار قسم کی نہریں ہوں گی۔ جن میں صاف پانی، شہد، دودھ اور شراب طہور رواں دواں ہوگا۔ امام بغویؒ فرماتے ہیں کہ یہ نہریں زمینی نہروں کی طرح زمین دوز نہیں ہوں گی۔ بلکہ یہ زمین کے اوپر چل رہی ہوں گی اور اہل جنت جدھر چاہیں گے موڑ کر لے جا سکیں گے۔ یہ کیفیت آج تو سمجھ میں نہیں آتی مگر اگلے جہان میں یہ سب کچھ ممکن ہوگا۔

فرمایا جنتی لوگ باغوں اور نہروں میں ہوں گے فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ سچی بیٹھک میں سچائی کی پر شاندار، باعزت اور باراحت بیٹھک کہاں ہوگی؟ فرمایا عِنْدَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ قدرت تامہ رکھنے والے بادشاہ کے ہاں اور وہ وہی ذات خداوندی ہے جو قادر مطلق اور علیم کل ہے۔ پہلے انذار کا بیان تھا اب آخر میں دوسرا پہلو بھی بیان کر دیا۔ ترہیب کے ساتھ ترغیب بھی ہوگئی۔ گویا اہل ایمان کا اچھا انجام بھی بیان فرما دیا۔

سُورَةُ الرَّحْمٰن
(مکّیّة)

درس اول ۱ — آیت ۱ تا ۱۳

سُورَةُ الرَّحْمٰنِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانٍ وَّسَبْعُوْنَ اٰيَةً وَّثَلٰثُ رُكُوْعَاتٍ

سورۃ الرحمٰن مدنی ہے ، اور یہ اٹھہتر آیتیں اور اس میں تین رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

اَلرَّحْمٰنُ ① عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ② خَلَقَ الْاِنْسَانَ ③ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ④ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ⑤ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ⑥ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ⑦ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ⑧ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ⑨ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ⑩ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ⑪ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ⑫ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ⑬

ترجمہ :- رحمان نے ① سکھلایا ہے قرآن ② پیدا کیا ہے اس نے انسان کو ③ سکھلایا ہے اس کو بولنا ④ سورج اور چاند ایک حساب سے چل رہے ہیں ⑤ اور پودے اور درخت سجدہ کرتے ہیں ⑥

اور آسمان کو اونچا کیا ہے اُس نے، اور رکھی ہے اُس نے ترازو (۷) کہ نہ زیادتی کرو تم ترازو میں (۸) اور قائم کرو ترازو کو انصاف کے ساتھ، اور نہ گھٹاؤ تول میں (۹) اور زمین کو رکھا ہے اُس نے مخلوق کے لیے (۱۰) اُس میں پھل ہیں اور کھجوریں ہیں جن پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں (۱۱) اور دانے بھوسے والے ہیں، اور خوشبودار پودے ہیں (۱۲) پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے (۱۳)

نام اور کوائف

اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ الرحمٰن ہے جو اس کے پہلے لفظ سے ماخوذ ہے صرف ایک آیت کے سوا یہ ساری سورۃ مکی دور میں نازل ہوئی اس سورۃ کی اٹھہتر آیات اور تین رکوع ہیں اور یہ سورۃ ۳۵۱ الفاظ اور ۱۶۳۶ حروف پر مشتمل ہے

مضامین سورۃ

مکی سورتوں میں عام طور پر بنیادی عقائد ہی کا ذکر ہے۔ ان سورتوں میں احکام کا سلسلہ خال ہی ہے۔ مکی دور میں چونکہ اسلامی معاشرہ کی بنیادیں نہیں رکھی جا سکی تھی، لہٰذا اس دوران زیادہ تر اخلاق اور عقائد کی اصلاح پر توجہ دی گئی ہے چنانچہ اس سورۃ مبارکہ میں بھی یہی پہلو غالب ہے۔ اُس زمانے میں عرب میں شرک کی مختلف قسمیں رائج تھیں یا بالکل کفر تھا۔ اللہ نے مکی سورتوں میں کفر اور شرک کی قباحت کو مختلف طریقوں سے سمجھا کر اُس کی تردید فرمائی ہے، اور توحید کی دعوت دی ہے۔ دوسرا اہم مسئلہ نبوت و رسالت کا تھا۔ وہ لوگ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ کا نبی ماننے کے لیے تیار نہیں تھے اللہ نے اس مسئلہ کی بھی وضاحت کی ہے۔ پھر وقوع قیامت، بعث بعد الموت اور جزائے عمل کے مسئلہ کو سمجھایا ہے کیونکہ عرب کے لوگ اس کا بھی انکار کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں اُن کے شکوک و شبہات کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے

ہدایت کا آخری پروگرام ہے جس میں پوری انسانیت کی فلاح مضمر ہے۔ اللہ نے اس کے وحی الٰہی ہونے کا ذکر کیا ہے اور اس کی حقانیت کو بیان کیا ہے۔ غرضیکہ اس سورۃ مبارکہ میں زیادہ تر تمام انبیاء کے مشترکہ بنیادی اصولوں کا ہی تذکرہ ہے۔

سابقہ سورۃ کے ساتھ ربط

گذشتہ سورۃ القمر میں انذار کا پہلو غالب تھا۔ اللہ نے سابقہ پانچ نافرمان اقوام کا ذکر کر کے اُن کی ہلاکت کے واقعات بیان فرمائے، اور ساتھ ساتھ عبرت دلانے کے لیے اس جملے کو بار بار دہرایا وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ البتہ تحقیق ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے پس کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟ مطلب یہ تھا کہ قیامت آنے والی ہے، پھر حساب کتاب کی منزل بھی آئے گی اور پھر جزا اور سزا کے فیصلے ہوں گے لہٰذا آج موقع ہے کہ قرآن جیسی عظیم نعمت سے نصیحت حاصل کر لو، اور آخرت کی سزا سے بچ کر اللہ کی رحمت کے مقام میں داخل ہونے کا بندوبست کر لو۔ نیز یہ بھی باور کرانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو نافرمانوں کو اس دنیا میں بھی سزا دینے پر قادر ہے اور پھر آخرت کا عذاب تو دائمی ہے۔ گذشتہ سورۃ کے آخر میں اللہ نے متقین کے انعامات کے ضمن میں فرمایا فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيكٍ مُقْتَدِرٍ یعنی کہ ایسے لوگ سچی بیٹھک میں بڑی قدرت رکھنے والے بادشاہ کے پاس ہوں گے۔ اب یہاں اس سورۃ کا آغاز لفظ اَلرَّحْمٰنُ سے ہو رہا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو خدا تعالیٰ کمال قدرت کا مالک اور مجرموں کو سزا دینے پر قادر ہے، وہی خداوند کریم نہایت مہربان بھی ہے۔ چنانچہ اس سورۃ مبارکہ میں خدا تعالیٰ کی بہت سی نعمتوں کا ذکر کر کے انسانوں اور جنوں کو ترغیب دلائی گئی ہے اور ساتھ ساتھ انذار بھی کیا گیا ہے کہ تم ان نعمتوں کو کیسے جھٹلا سکتے ہو۔ غرضیکہ پچھلی سورۃ کے لفظ مقتدر سے سزا کی طرف اشارہ ملتا ہے جب کہ اَلرَّحْمٰنُ سے شفقت و مہربانی کا اظہار ہوتا ہے۔ دونوں سورتوں کا آپس میں اس طرح سے ربط ہے۔

خواص سورۃ

قرآن پاک کا یہ اسلوب ہے کہ بعض سورتوں میں بعض جملوں کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ جس سے سورۃ میں بیان کردہ مضمون کو اجاگر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ چنانچہ گذشتہ سورۃ القمر میں یہ آیت بتکرار آئی ہے وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ اور البتہ تحقیق ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا ہے، پس کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا، و سورۃ الشعراء میں یہ آیت بار بار آتی ہے اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ بے شک تیرا پروردگار غالب اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سورۃ المرسلٰت میں وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ والی آیت بار بار آئی ہے، یعنی اس دن ہلاکت ہے جھٹلانے والوں کے لیے۔ اسی اسلوب بیان کے مطابق اللہ نے اس سورۃ مبارکہ میں اپنی مختلف نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ آیت بار بار دہرائی ہے فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ پس اے جنو! اور انسانو! تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ بعض روایات میں آتا ہے لِكُلِّ شَيْءٍ عُرُوْسٌ وَّعُرُوْسُ الْقُرْاٰنِ سُوْرَةُ الرَّحْمٰنِ ہر چیز کی کوئی عروس ہوتی ہے اور قرآن کی عروس سورۃ الرحمٰن ہے۔ اللہ نے اس سورۃ کے ذریعے قرآن کو زینت بخشی ہے

انعامات الٰہیہ

سورۃ کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے اَلرَّحْمٰنُ خدائے رحمان جو بے حد مہربان ہے۔ اسی لفظ سے اللہ تعالیٰ کے بے حد و بے شمار انعامات کی طرف اشارہ ملتا ہے جو اس نے اپنی مخلوق اور خاص طور پر انسانوں پر کیے ہیں۔ آگے مکرر آنے والی آیات میں اٰلَآءِ کا لفظ آرہا ہے جو اَلْيٌ یا اِلْيٌ کی جمع ہے اور اس کا معنی نعمت ہے۔ ان انعامات میں مادی انعامات بھی ہیں جن کو ہر شخص استعمال میں لا رہا ہے اور حسی بھی جنہیں بآسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح بعض انعامات ظاہری ہیں جن سے ہر نیک و بد آدمی مستفید ہوتا ہے اور بعض انعامات باطنی یا معنوی ہیں جن میں سے بلند ترین انعام اللہ تعالیٰ کا قرآن کریم ہے جو اللہ نے انسانوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے نازل فرمایا ہے۔ انسان اپنے جسم پر غور کرے کہ

یہ کس قدر حقیر اور ناتواں چیز ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ (المؤمن - ۵۷) ارض وسما کی تخلیق لوگوں کی تخلیق سے بہت بڑی چیز ہے انسان تو ایک کیڑے مکوڑے کی طرح ایک چھوٹی سی چیز ہے مگر اللہ نے اسے ایک ایسی نعمت عطا فرمائی ہے جس کو ارض وسما اور پہاڑ بھی اٹھانے سے عاجز ہیں۔ کہاں یہ کمزور انسان اور کہاں یہ اللہ کی عظیم نعمت۔ قرآن حکیم ایسا بحر ناپیدا کنار ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات میں سب سے پہلے اسی نعمت کا ذکر کیا ہے۔

قرآن بطور معجزہ

فرمایا خدائے رحمان، بے حد مہربان وہ ذات ہے عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ جس نے انسان کو قرآن سکھایا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان مبارک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سارے نبیوں کو کوئی نہ کوئی معجزہ عطا کیا ہے لیکن مجھے جو خاص معجزہ عطا فرمایا گیا ہے وہ وَحْيًا اَوْحَى اللّٰهُ اِلَيَّ اللہ نے میری طرف وحی کے ذریعے نازل فرمایا ہے اور وہ قرآن حکیم ہے جو روحانی اور علمی معجزہ ہے اور ہمیشہ قائم رہے گا۔ دیگر انبیاء کے معجزات ان کے ساتھ ہی ختم ہو گئے مگر میرا معجزہ تا قیام قیامت قائم رہے گا۔ دوسرے الفاظ میں میرے دعویٰ نبوت کی یہ دلیل ہے جو ہر وقت قائم و دائم ہے لہٰذا اہل ایمان کو چاہیئے کہ وہ اس عظیم نعمت کے حصول پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہیں جس نے انہیں قرآن جیسی عظیم نعمت عطا فرمائی۔

قوت گویائی کی نعمت

فرمایا خدائے رحمان، بے حد مہربان وہ ذات ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ جس نے انسان کو پیدا کیا عَلَّمَهُ الْبَيَانَ اور اسے بولنا سکھایا۔ انسان کو اللہ نے قوت گویائی عطا فرمائی جو اس کی مابہ الامتیاز چیزوں میں سے ہے۔ قوت گویائی جیسی عظیم نعمت کے ذریعے انسان اپنا مافی الضمیر بیان کر سکتا ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہوتی تو انسان جانوروں کی طرح گونگا ہوتا، نہ اپنی خوشی اور غمی کا اظہار کر سکتا، نہ اپنی تکلیف بیان کر سکتا اور نہ اپنی ضروریات طلب کر سکتا۔ تمام علوم و فنون کا اظہار زبان کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح لطیف احساسات کو باریک چیزوں کا اظہار

بھی زبان ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ یہی قوت گویائی کبھی شعر و ادب کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ کبھی فلسفہ و حکمت کی باتیں بتاتی ہے اور کبھی مثال اور کہانی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے انسانوں اور دیگر جانوروں میں یہ بہت بڑا امتیاز ہے اور انسان کے لیے باعث تفوق ہے۔

آفاقی نعمتیں

اس کے بعد اللہ نے بعض آفاقی نعمتوں کا ذکر کیا ہے اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ سورج اور چاند ایک حساب سے چل رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں نظام شمسی قائم کر کے مخلوق پر بہت بڑا احسان فرمایا ہے۔ دن رات کے تغیر و تبدل تیز روشنی اور مدھم روشنی، سردی اور گرمی، بہار اور خزاں سب سورج اور چاند کے ایک مربوط نظام کے ساتھ منسلک ہونے کا مرہون منت ہے۔ اللہ نے شمس و قمر کو ایک خاص نظام کے تحت اپنی ڈیوٹی پر لگا دیا ہے جسے وہ انجام دے رہے ہیں اجرام فلکی کی گردش میں اگر ذرا بھی فرق پڑ جائے تو کائنات کا پورا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے بہرحال اللہ نے سورج اور چاند کو مخلوق کی مصلحت کی خاطر پیدا کیا ہے جو کہ بہت بڑی نعمت ہے۔

پھر فرمایا وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ اور پودے اور درخت سجدہ کرتے ہیں شجر نباتات کی وہ قسم ہے جس کا مضبوط تنا ہوتا ہے اور پھر آگے اس کی شاخیں اور پتے وغیرہ ہوتے ہیں۔ البتہ نجم سے مراد وہ پودے یا جڑی بوٹیاں ہیں جن کا تنا نہیں ہوتا بلکہ وہ زمین پر پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ فرمایا یہ سب چیزیں اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ ارض و سما اور اس میں پائی جانے والی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتی ہیں وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (آیت۔ ۴۴) مگر تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ یہ چیزیں جس طریقے سے سجدہ کرتی ہیں یا اللہ کی حمد و ثنا بیان کرتی ہیں اس کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے یا خود یہ چیزیں جانتی ہیں۔ اللہ نے ارض و سما کی تمام چیزیں انسانوں کی مصلحت کے لیے پیدا فرمائی ہیں، اور یہ اسی کی فرمانبردار ہیں اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔

میزان
علامت عدل

فرمایا وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا اور آسمان کو بلند کیا ہے۔ اتنی بڑی چیز کو بغیر ستونوں کے کھڑا کر دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی علامت ہے۔ نیز فرمایا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ اور اس میں ترازو کو رکھ دیا۔ بعض لوگ اس مقام پر میزان سے عقل مراد لیتے ہیں جس سے نیکی اور بدی کو، یا صحیح اور غلط کو معلوم کیا جاتا ہے۔ تاہم صحیح بات یہ ہے کہ اس مقام پر میزان سے مراد ترازو ہی ہے۔ گویا اللہ نے آسمان کو بلند کیا، اس میں ترازو مقرر کیا، اور فرمایا اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ترازو میں سرکشی اختیار نہ کرو یعنی حد سے نہ بڑھو۔ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ اور وزن کو انصاف کے ساتھ قائم رکھو وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ اور تول میں کمی نہ کرو۔ بظاہر آسمان کی بلندی اور ترازو کے درمیان کوئی مناسبت معلوم نہیں ہوتی۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کا ذکر ہو رہا ہے۔ تو اہنی انعامات میں ترازو بھی ایک اہم انعام ہے جو کہ عدل کی علامت کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ترازو سے صرف تولنے والا ترازو مراد نہیں بلکہ اس میں ماپ تول کے تمام پیمانے گز، میٹر، لیٹر، کلوگرام وغیرہ شامل ہیں تو جس طرح ماپ تول میں کمی بیشی نہیں کرنی چاہیئے۔ اسی طرح زندگی کے ہر معاملہ میں عدل کو قائم رکھنا چاہیئے۔

امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ دنیا کا اجتماعی نظام عدل پر ہی قائم ہوتا ہے اور اس کے بغیر معاشرتی نظام بگڑ جاتا ہے جس کی وجہ سے ہر طرف لعنت برسنے لگتی ہے۔ لہٰذا عدل بہت بڑی صفت اور بڑی ضروری چیز ہے۔ تو عدل کے قیام کے لیے اللہ نے ترازو کو قائم کیا ہے اور ترازو میں سرکشی یہ ہے کہ ماپ و تول میں کمی بیشی کی جائے۔ اور خرابی یہ ہے کہ دیتے وقت کم دو جیسے سورۃ المطففین میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ o الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ o وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ماپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے خرابی ہے۔ جو لوگوں سے ماپ کر تو پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ماپ کر یا تول کر دیں تو کم دیں۔ دنیا میں یہ

بیماری اکثر پائی جاتی ہے جو عدل و انصاف کے منافی ہے۔ بعض اوقات باٹوں میں کمی کردی جاتی ہے اور کبھی پیمانے چھوٹے بنائے جاتے ہیں۔ بعض اوقات تولتے وقت ڈنڈی ماری جاتی ہے دوسرے کو نقصان پہنچانے کا جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے وہ قابل مذمت ہے۔ ہر حقدار کو اس کا حق لازماً ملنا چاہئے۔ اسی لیے اللہ نے ترازو کو مدارِ عدل بنایا ہے۔

زمین کے فوائد

آگے اللہ نے ایک اور انعام کا ذکر فرمایا ہے وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ اللہ نے زمین کو مخلوق کے لیے بچھایا ہے۔ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اُس نے لوگوں کے چلنے پھرنے اور کام کاج کرنے کے لیے اس کو ہموار بنایا ہے۔ یہ نہ تو اتنی نرم ہے کہ انسان اس میں دھنس جائیں اور نہ اتنی سخت ہے کہ کھیتی باڑی اور دوسری ضروریات کے لیے کام نہ آسکے۔ لوگ اپنی ضرورت کے لیے اسے آسانی سے کھود سکتے ہیں۔ اس کی مٹی کو عمارات کی تعمیر میں استعمال کرتے ہیں۔ اور اس سے لوہا، کوئلہ، تیل، پانی اور دیگر معدنیات نکالتے ہیں۔ جو معاشرتی زندگی کے لیے نہایت ہی کارآمد ہیں۔ اب مخلوق میں صرف انسان ہی نہیں بلکہ جنات، جانور، کیڑے مکوڑے، درندے، پرندے اور لاکھوں اقسام کے آبی جانور بھی آتے ہیں۔ ان تمام جانداروں کی زندگی زمین کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ زمین نہ صرف زندہ مخلوق کی ضروریات پوری کرتی ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی انسان کو یہی اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى (طٰہٰ۔ ۵۵) ہم نے اسی زمین سے تمہیں پیدا کیا، اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور پھر اسی سے دوسری دفعہ قیامت کو نکالیں گے۔

فرمایا فِيْهَا فَاكِهَةٌ اسی زمین میں ہم نے پھل رکھے ہیں جنہیں انسان کھاتے ہیں وَالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ اور کھجوریں بھی اسی زمین سے پیدا ہوتی ہیں جن کے پھل پر غلاف چڑھا ہوتا ہے۔ مگر دراصل اُس ڈوڈی کو

کہتے ہیں جس کے اندر پھل ہوتا ہے اس سے وہ غلاف بھی مراد ہو سکتے ہیں جو کھجور یا دیگر پھلوں پر چڑھائے جاتے ہیں تاکہ پرندے نقصان نہ پہنچا سکیں۔ بہر حال فرمایا کہ انسان کی خوراک بننے والے تمام پھل زمین سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ اور بھوسے والے دانے بھی اسی زمین کی پیداوار ہیں اناج کی مختلف قسموں کے دانے بھوسے کے اندر بند ہوتے ہیں جنہیں اتار کر غلہ حاصل کیا جاتا ہے اور پھر یہی بھوسہ یا چھلکا جانوروں کی خوراک بن جاتا ہے۔ نیز فرمایا وَالرَّيْحَانُ اور خوشبودار پودے بھی زمین ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ ریحان کا عام معنیٰ تو خوشبودار پودا ہی ہوتا ہے جیسے نیاز بو وغیرہ، تاہم اس سے رزق بھی مراد لیا جاتا ہے جس میں ہر قسم کا اناج اور پھل بھی آجاتے ہیں۔

ان تمام علوی اور سفلی انعامات کا ذکر کرنے کے بعد اللہ نے جنوں اور انسانوں کی انواع سے خطاب کر کے فرمایا فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ مذکورہ نعمتوں سے مستفید ہو کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے اور ان میں قرآن کریم جیسی روحانی نعمت تو بے مثال نعمت ہے۔ اللہ نے انسانوں اور دیگر مخلوق پر اس قدر انعامات فرمائے ہیں کہ مخلوق میں سے کوئی بھی اس کا کما حقہٗ شکر ادا ہی نہیں کر سکتا۔

درس دوم ۲ — آیت ۱۴ تا ۲۵

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴿۱۵﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۶﴾ رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿۱۷﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۸﴾ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿۱۹﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿۲۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۱﴾ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۲۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۳﴾ وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۲۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۵﴾ ع ۴

ترجمہ:۔ پیدا کیا اُس نے انسان کو بجنے والی مٹی سے جیسا کہ ٹھیکرہ ہوتا ہے ﴿۱۴﴾ اور پیدا کیا اُس نے جنوں کو شعلہ مارنے والی آگ سے ﴿۱۵﴾ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ﴿۱۶﴾

دو مشرقوں اور دو مغربوں کا مالک ہے ﴿۱۷﴾ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ﴿۱۸﴾ چلایا ہے اس نے دو دریا جو آپس میں مل کر چلتے ہیں ﴿۱۹﴾ اور اُن کے درمیان میں پردہ ہے کہ وہ ایک دوسرے پر زیادتی نہیں کرتے ﴿۲۰﴾ پس تم اپنے پروردگار کی کس

کس نعمت کو جھٹلاؤ گے (۲۱) نکلتے ہیں دونوں دریاؤں سے موتی اور مونگے (۲۲) پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے (۲۳) اور اسی کے لیے ہیں کشتیاں جو چلتی ہیں دریا میں جس میں پہاڑوں جیسی موجیں اٹھتی ہیں (۲۴) پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے (۲۵)

ربط آیات

اس سورۃ مبارکہ میں کائنات اور بالخصوص انسانوں پر ہونے والے انعامات الٰہیہ کا ذکر ہو رہا ہے۔ چنانچہ گزشتہ درس میں روحانی انعامات میں سے سب سے بڑی نعمت قرآن حکیم کا تذکرہ ہوا۔ اس کے بعد اللہ نے خود انسانی جسم کی تخلیق کا ذکر کیا کہ اس نے انسان کو پیدا کیا اور کمال درجے کی قوت گویائی بھی عطا فرمائی۔ پھر اللہ نے شمس و قمر، پودوں اور درختوں کا ذکر کیا ہے کہ یہ بھی انعامات الٰہیہ میں شامل ہیں جو اللہ نے انسانوں کی مصلحت کی خاطر پیدا فرمائے ہیں پھر اللہ نے ترازو کا ذکر کیا جو کہ عدل کی علامت ہے لہٰذا اللہ نے عدل قائم کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ناپ تول میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ کرو کیونکہ اس سے معاشرہ میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ پھر اللہ نے زمین کی تخلیق کا ذکر کیا کہ یہ بھی انسانوں کی مصلحت کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اللہ نے اس میں پھل اور غلہ اگایا ہے۔ جو انسانوں اور جانوروں کی خوراک ہے۔ ان انعامات کا ذکر کرنے کے بعد اللہ نے فرمایا کہ اے انسانو! اور جنو! اللہ نے تمہیں بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے تم اس کی کس کس نعمت کی ناقدری کرو گے۔

تخلیق انسانی

گزشتہ درس میں مطلق انسانی تخلیق کا ذکر ہوا خَلَقَ الْإِنسَانَ (آیت ۳) یعنی اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اسے قوت گویائی عطا فرمائی اب آج کے درس میں انسان کے مادۂ تخلیق کا ذکر ہو رہا ہے خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ اللہ نے انسان کو ٹھیکرے جیسی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا ہے۔ فخار اس ٹھیکرے کو کہتے ہیں جو مٹی سے بنایا جاتا ہے اور آگ

میں پکنے کے بعد بجنے لگتا ہے سورۃ الصّٰفّٰت میں فرمایا ہے اِنَّا خَلَقْنٰھُمْ مِّنْ طِیْنٍ لَّازِبٍ (آیت ۱۱) یعنی ہم نے نسلِ انسانی کو چپکنے والی مٹی سے پیدا کیا۔ دراصل اللہ نے بنی نوعِ انسان کے جدِ امجد حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا، اور پھر اس نسل کو سلسلہ تناسل کے ذریعے چلا دیا۔ جب اللہ نے آدم علیہ السلام کی تخلیق کا ارادہ فرمایا تو صحیح حدیث کے مطابق فرشتے کو حکم دیا کہ تمام روئے زمین سے تھوڑی تھوڑی مٹی لے کر اس سے آدم علیہ السلام کا ڈھانچہ تیار کیا جائے جس کی تعمیل کی گئی۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ نسلِ انسانی کی مختلف رنگتیں، اُن کی نرم اور سخت مزاجی وغیرہ مٹی کے اثرات کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ اس مٹی سے آدم علیہ السلام کا مجسمہ تیار کر کے رکھ دیا گیا۔ وہ خشک ہو گیا تو اس میں کھنکھناہٹ کی کیفیت پیدا ہو گئی، جس کا اللہ نے یہاں ذکر کیا ہے۔

جنات کی تخلیق

انسان کی تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد اللہ نے جنات کی تخلیق کا بھی تذکرہ فرمایا وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ اور جنات کو اللہ نے شعلہ مارنے والی آگ سے پیدا کیا جس میں دھواں نہیں ہوتا۔ جن اللہ تعالیٰ کی لطیف مخلوق ہے جو انسانوں کو نظر نہیں آتی، البتہ وہ انسانوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ ہاں! اگر کوئی جن شکل تبدیل کر لے تو پھر انسانوں کو بھی نظر آ جاتا ہے۔ مسلم اور مسند احمد وغیرہ میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا خُلِقَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ نُّوْرٍ۔ اللہ نے فرشتوں کو نورانی مادہ سے پیدا کیا۔ اللہ نے درجہ اوّل کے فرشتوں یعنی ملاءِ اعلیٰ کی جماعت اور عالمِ بالا کے فرشتوں کو اس نہایت ہی لطیف نورانی مادہ سے پیدا فرمایا۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر نظر آنے والی آگ کو بطورِ مثال پیش کیا ہے۔ جب آپ اس آگ کے قریب پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ آگ درخت پر ظاہر ہو رہی ہے اور درخت کو جلانے کی بجائے اس میں مزید شادابی کا باعث بن رہی تھی۔ جب موسیٰ علیہ السلام اس آگ کے قریب جاتے تو وہ پیچھے ہٹ جاتی، اور جب آپ پیچھے ہٹتے تو وہ

پھر اپنی جگہ پر آجاتی یہ ہماری آگ جیسی تو نہیں تھی جو ایندھن کو جلانے سے پیدا ہوتی ہے بلکہ یہ حجابِ نوری یا حجابِ ناری تھا جو کہ بہت ہی لطیف چیز ہے۔ تو شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اللہ نے ملاءِ اعلیٰ کے فرشتوں کو اسی قسم کے کسی لطیف نورانی مادے سے پیدا فرمایا ہے۔ اس کے بعد دوسرے درجے کے فرشتے ہیں جن کو اللہ نے عالمِ مثال کے لطیف مادے سے پیدا کیا۔ اور پھر اس سے نچلے درجے کے فرشتے ذرا کم لطیف مادے سے پیدا کیے گئے حتیٰ کہ اللہ نے جنات کو شعلہ مارنے والی آگ سے پیدا کیا۔ بہرحال اللہ نے فرشتوں کو نورانی مادے، جنوں کو آگ سے اور انسان کو کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا۔

شاہ ولی اللہؒ کی حکمت

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی حکمت اور فلسفے کے مطابق بیان کرتے ہیں کہ اجسام کے مختلف درجات ہیں، اور سب سے موٹی چیز معدنی اجسام ہیں۔ جن میں سونا، چاندی، لوہا، کوئلہ، نمک وغیرہ شامل ہیں، اور ان میں بھی روح ہوتی ہے اگرچہ وہ بہت کمزور ہوتی ہے۔ اس روح کا فائدہ یہ ہے کہ معدنی اشیاء اپنی صورت اور اپنے خواص کو محفوظ رکھتی ہیں۔ اسی طرح نباتات میں بھی روح ہوتی ہے جس کی بدولت پودے، درخت اور سبزیاں نشوونما پاتے ہیں، اور اپنی صورت اور خواص کو برقرار رکھتے ہیں۔ پھر حیوانات میں ایسی روح ہوتی ہے کہ ان میں شعور بھی پایا جاتا ہے۔ ان کو احساس بھی ہوتا ہے۔ ان میں تخیل، وہم اور ادراک بھی پایا جاتا ہے۔ حیوانات بھی اپنے ارادے سے حس و حرکت کرتے ہیں اور اپنے خواص کو بھی محفوظ رکھتے ہیں۔ اس کے بعد ناطق مخلوق آتی ہے۔ ناطق مخلوق میں انسانوں کے علاوہ بعض دوسری انواع بھی شامل ہیں۔ انسانی اجسام میں مٹی، آگ، ہوا اور پانی وغیرہ بہت سے عناصر ہیں مگر ان میں باقی عناصر کی نسبت مٹی کی مقدار زیادہ ہے اور باقی عناصر معتدل ہیں، تاہم انسانی جسم میں اعتدال پایا جاتا ہے مخلوق ناطق کی ایک قسم سفلی ملائکہ ہیں جن کے اجسام میں ہوا کی مقدار دوسرے عناصر کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ اسی طرح بعض ناطق مخلوق میں پانی کی مقدار زیادہ

ہوتی ہے۔ یہ مائی انسان ہیں جو پانی کے اندر رہتے ہیں۔ اسی طرح ایک مخلوق ناطق وہ ہے جس میں آگ کی مقدار زیادہ ہے اور باقی عناصر معتدل ہیں۔ یہ جنات ہیں۔ پھر ایک ناطق مخلوق ملک علوی ہے جو افلاک کے مادہ سے پیدا ہوتی ہے یہ بھی لطیف مخلوق ہے

بہرحال اللہ نے انسانوں کو اپنی تخلیق کی یاد دلائی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے۔ آگے پھر وہی جملہ دہرایا ہے فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ اے جنو! اور انسانو! تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا کفران کرو گے؟ اٰلَآءِ کا معنیٰ نعمت، احسان، مہربانی، قدرت اور کرشمہ بھی ہوتا ہے۔ اللہ نے مذکورہ تمام نعمتیں انسانوں کو عطا فرمائی ہیں اور انسانی ضمیر کو جھنجھوڑ کر پوچھا ہے کہ بتلاؤ تم میری کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ مطلب یہ ہے کہ بالآخر تمہیں میری عطا کردہ نعمتوں کا اقرار کرنا ہی پڑے گا۔

حضرت جابرؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سورۃ الرحمٰن تلاوت فرمائی اور پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا، لوگو! تم خاموش بیٹھے ہو، تم سے تو جنات نے مجھے اچھا جواب دیا۔ فرمایا کہ جنات کی خواہش پر میری ان سے ملاقات ہو گئی، پھر میں نے ان کو یہ سورۃ مبارکہ سنائی۔ جب بھی میں آیت فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ کی تلاوت کرتا تو جنات جواب دیتے بِنِعَمِکَ رَبَّنَا لَا نُکَذِّبُ فَلَکَ الْحَمْدُ یعنی اے پروردگار! ہم تیری کسی نعمت کی ناشکر گزاری نہیں کرتے، اور ساری تعریف تیرے ہی لیے ہے۔

عربی ادب میں تکرار کا اسلوب

کسی جملے کا بار بار دہرایا جانا عربی زبان کے عین مطابق ہے۔ عرب لوگ کسی اہم یا فکر انگیز بات کو اپنے کلام میں بار بار دہرایا کرتے تھے۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں بلکہ اسلوب کلام ہے۔ اس تکرار سے ذہنوں میں کمال درجے کی خوشی پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض عرب شاعروں نے بھی اپنے کلام کو اس قسم کی تکرار سے مزین کیا ہے۔ مثلاً ایک مشہور عرب شاعر مہلہل ہوا ہے۔ اس کا بھائی اپنی قوم کا سردار تھا۔ جب وہ مر گیا تو شاعر نے اس کے مرثیے میں ایسے جملے کہے جن میں

ایک بات کو بار بار دہرایا گیا ہے۔

أَلَا إِنْ لَيْسَ عَدْلاً مِنْ كُلَيْبٍ
إِذَا طُرِدَ الْيَتِيمُ عَنِ الْجَزُورِ

بڑے افسوس کا مقام ہے کہ کلیب موجود نہیں ہے جس وقت کہ کسی یتیم کو اونٹ کے گوشت کے قریب نہیں آنے دیا جاتا۔

أَلَا إِنْ لَيْسَ عَدْلاً مِنْ كُلَيْبٍ
إِذَا مَا ضِيمَ جِيرَانُ الْمُجِيرِ

افسوس کہ آج کلیب موجود نہیں ہے جبکہ آج پڑوسی پر ظلم کیا جا رہا ہے۔

أَلَا إِنْ لَيْسَ عَدْلاً مِنْ كُلَيْبٍ
إِذَا رَجَفَ الْعِضَاهُ مِنَ الدَّبُورِ

افسوس کہ آج کلیب موجود نہیں ہے جبکہ گرم ہواؤں کی وجہ سے عضاہ کے درخت ہل گئے ہیں (یعنی خشک سالی کی وجہ سے محتاجوں کو کوئی کھلاتا پلاتا نہیں یہ کام کلیب کرتا تھا)۔

أَلَا إِنْ لَيْسَ عَدْلاً مِنْ كُلَيْبٍ
إِذَا خَرَجَتْ مُخَبَّأَةُ الْخُدُورِ

افسوس کہ آج کلیب موجود نہیں ہے جبکہ پردہ نشین عورتیں باہر نکلتی ہیں (کسی سخت خطرے کے وقت ہی عورتوں کو باہر نکلنا پڑتا تھا مگر شاعر کہتا ہے کہ ایسی مصیبت میں کلیب موجود نہیں ہے)

أَلَا إِنْ لَيْسَ عَدْلاً مِنْ كُلَيْبٍ
إِذَا مَا أُعْلِنَتْ نَجْوَى الْأُمُورِ

افسوس کہ آج کلیب موجود نہیں ہے جب کہ سینوں کے راز کھولے جاتے ہیں یعنی جب صلح و جنگ کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اس وقت کلیب کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

اسی طرح ایک مشہور خاتون شاعرہ لیلیٰ اخیلیہ نے بھی ایک سردار کے مرثیے میں اس قسم کی تکرار کی ہے۔

لَنِعْمَ الْفَتٰى كُنْتَ تَوْبَ
لَمْ تَكُ تَسْبِقُ يَوْمًا كُنْتَ فِيْهِ

اے توبہ تم کتنے اچھے جوان تھے کہ جس چیز کا قصد کرتے تھے اس سے آگے کوئی نہیں بڑھ سکتا تھا۔

لَنِعْمَ الْفَتٰى تَوْبَ كُنْتَ
اَتَاكَ لِكَيْ تَحْمِيْ وَنِعْمَ الْمُجَامِلُ

تم کتنے اچھے جوان تھے اے توبہ! کہ خوفزدہ آدمی کی حمایت کے لیے آتا تھا

لَنِعْمَ الْفَتٰى تَوْبَ كُنْتَ
صُدُوْرُ الْعَوَالِيْ وَاسْتَشَالَ الْاَسَافِلُ

تو کتنا اچھا جوان تھا اے توبہ! جب کہ نیزوں کے سینے آپس میں ملتے تھے۔

وَنِعْمَ الْفَتٰى يَا تَوْبُ جَارًا وَّصَاحِبًا
وَنِعْمَ الْفَتٰى يَا تَوْبُ حِيْنَ تُنَاضِلُ

تم کتنے اچھے نوجوان تھے ساتھی اور پڑوسی اور تم کتنے اچھے نوجوان تھے جب ہمارے درمیان دشمن سے مقابلہ کرتے تھے۔

لَعَمْرِيْ لَاَنْتَ الْمَرْءُ اَبْكِيْ لِفَقْدِهٖ
وَلَوْ لَامَ فِيْهِ نَاقِصُ الرَّاْيِ جَاهِلُ

مجھے میری جان کی قسم تم ایسے آدمی ہو جس کے گم ہونے پہ میں رو رہا ہوں اگرچہ کم عقل بے وقوف آدمی ملامت ہی کرے۔

الغرض! قرآن پاک میں کسی جملے کا تکرار کوئی نئی چیز نہیں۔ بلکہ یہ عربی زبان کے اسلوب کے مطابق ہے اور اس تکرار سے کلام میں جوش پیدا ہوتا ہے اور یہ زیادہ اثر انگیز ثابت ہوتا ہے۔

مشرق و مغرب کا پروردگار

آگے ارشادِ خداوندی ہے رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ اللہ تعالیٰ وہ ہے جو دو مشرقوں اور دو مغربوں کا پروردگار ہے۔ مشرق اور مغرب تو ایک ہی ہے لیکن یہ قرآن پاک کا اسلوبِ بیان ہے کہ اس نے مشرق و مغرب کے لیے واحد تثنیہ اور جمع تینوں صیغے استعمال کیے ہیں۔ یہاں تثنیہ کا صیغہ ہے تو سورۃ المزمل میں واحد کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (آیت۔ ۹) یعنی وہ مشرق و مغرب کا پروردگار ہے۔ اسی طرح سورۃ الصّٰفّٰت میں جمع کا صیغہ بھی آیا ہے رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا

وَرَبُّ الْمَشَارِقِ (آیت - ۵) وہ ارض وسما اور ان کے درمیان والی چیزوں کا بھی پروردگار اور تمام مشرقوں کا بھی پروردگار ہے۔ سورۃ المعارج میں بھی ہے فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ (آیت - ۴۰) ایک مشرقی سمت اور دوسری مغربی سمت تو واضح ہیں۔ البتہ جب دو مشرقوں اور دو مغربوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ موسم سرما اور گرما میں طلوع و غروب آفتاب کے مقامات مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب جمع کا صیغہ استعمال کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سورج ہر روز نئی جگہ سے طلوع ہوتا ہے اور نئی جگہ میں غروب ہوتا ہے۔ نظام شمسی کے مطابق سورج کی بارہ منزلیں یا بارہ بروج ہیں۔ اور سورج سال بھر میں ان بارہ منزلوں میں چلتا ہے اس لحاظ سے ہم کئی مشرق اور کئی مغرب بھی کہہ سکتے ہیں۔ بعض یہ بھی فرماتے ہیں کہ صیغہ کوئی بھی استعمال ہو مطلب مفرد ہی ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ مشرق و مغرب کا پروردگار ہے اور آگے پھر وہی جملہ فرمایا فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ اے جنو! اور انسانو! تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کی ناقدری کرو گے؟

دو متوازی دریا

آگے اللہ نے اپنی ایک اور قدرت کاملہ کا ذکر کیا ہے مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ اس نے دو دریا اکٹھے اور متوازی چلا دیے ہیں جو آپس میں ملے ہوئے ہیں بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ ان کے درمیان ایک ایسا قدرتی پردہ ہے کہ ان کا پانی آپس میں خلط ملط نہیں ہوتا۔ ایک دریا کا پانی میٹھا ہے اور دوسرے کا کھارا مگر ایک کے پانی کا اثر دوسرے پر نہیں ہوتا بلکہ یہ دونوں اپنی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں یہ بھی اللہ نے انسانوں کی مصلحت ہی کیلئے پیدا کیے ہیں۔ انسان کے مفاد دونوں قسم کے پانی سے وابستہ ہیں اور یہ دونوں سے مستفید ہوتے ہیں۔ پھر فرمایا فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

موتی اور مونگے

آگے اللہ تعالیٰ نے ان دو دریاؤں کے فوائد کے ضمن میں فرمایا

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ اِن دونوں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں
مونگا سمندر میں پیدا ہونے والا ایک درخت ہے جس میں جانوروں کی طرح زندہ
مادہ ہوتا ہے۔ اس درخت کو کاٹ کر حیوانی مادہ الگ کر لیا جاتا ہے۔ پھر اس
میں سرخ پتھر کی طرح کا مادہ نکلتا ہے۔ جس کو مختلف دوائیوں میں کیمیائی جزو کے
طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ نیز یہ مادہ زینت کے کام بھی آتا ہے۔ لغت کے ماہرین،
صاحب مختار الصحاح اور قاموس والے کہتے ہیں کہ لؤلؤ کا معنی بڑا موتی اور مرجان کا معنی
چھوٹا موتی ہے۔ بعض نے اس کے برعکس بھی کہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ
اور حضرت علیؓ بھی پہلے معنی کو ترجیح دیتے ہیں۔ بہرحال اللہ نے ہی یہ موتی اور مونگے
سمندروں اور دریاؤں میں پیدا کیے ہیں جن کو انسان کام میں لاتے ہیں۔ تاہم موتی عام
طور پر کھارے پانی میں ہوتے ہیں۔ موتیوں کی پیدائش کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ
سے یہ بھی منقول ہے کہ سمندروں میں بڑے سیپیوں کا منہ کھلا ہوا ہوتا ہے، اور اگر
بارش کا کوئی قطرہ براہ راست سیپ کے اندر چلا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنی قدرتِ تامہ
سے موتی بنا دیتا ہے جسے لوگ نکال کر زینت کے لیے یا دوائی کے جزو کے طور پر
استعمال کرتے ہیں۔ امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات حضرت عبداللہ بن عباسؓ
سے صحیح طور پر ثابت ہے۔ نیز آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جس طرح رحم مادر میں
قطرۂ آب سے بچہ پیدا ہوتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ بارش کے قطرۂ آب کو موتی
کی صورت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس نعمت کے تذکرے کے بعد اللہ نے پھر
وہی جملہ دہرایا ہے فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ اے جنات اور انسانوں کے گروہ
تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

کشتیوں کی نعمت

آگے ایک اور انعام کا ذکر فرمایا وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ
اور سمندروں اور دریاؤں میں چلنے والی کشتیاں بھی اسی کی ہیں جن میں پہاڑوں جیسی بڑی
بڑی موجیں اٹھتی ہیں۔ بظاہر تو کشتیاں اور جہاز انسان ہی بناتے اور چلاتے ہیں۔ مگر
حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ ہی کا فیضان ہے۔ جس نے کشتیوں کے لیے سامان اور

تو بھی جتلا فرماتے ہیں حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ سے کہ کشتی سازی اور
کشتی رانی کا سلسلہ اللہ نے قائم کر رکھا ہے پہلے بادبانی کشتیاں ہوتی تھیں، پھر
سٹیمر جاری ہوئے اور اب لاکھوں ٹن وزنی جہاز معرض وجود میں آچکے ہیں - جن کے
ذریعے بین البراعظمی نقل وحمل ہو رہی ہے، اور یہ سارا اللہ تعالیٰ کی مہربانی کا ہی نتیجہ
ہے - فرمایا فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت
کو جھٹلاؤ گے -

امام ابن کثیرؒ نے اس مقام پہ ایک روایت بیان کی ہے جسے ابن ابی حاتمؒ
نے عمیرہ ابن سویدؒ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ كُنْتُ مَعَ عَلِيٍّ عَلٰى شَاطِئِ
الْفُرَاتِ یعنی میں حضرت علیؓ کے ساتھ دریائے فرات کے کنارے پہ تھا، اچانک
کشتی نمودار ہوئی جس کے بادبان اٹھے ہوئے تھے - حضرت علیؓ نے اپنے دونوں
ہاتھ اٹھا کر کشتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسی آیت کی تلاوت کی وَلَهُ الْجَوَارِ
الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ سمندروں اور دریاؤں میں چلنے والی کشتیاں
بھی اللہ تعالیٰ ہی کی ہیں، وہ سمندر جن میں پہاڑوں جیسی موجیں اٹھتی ہیں - نیز فرمایا
وَالَّذِي اَنْشَاَهَا تَجْرِي فِي بُحُوْرِهٖ اس ذات پاک کی قسم جس نے ان
کشتیوں کو پیدا کیا ہے، یہ اسی کے حکم، توفیق اور مدد سے رواں دواں ہیں، وگرنہ
خدا تعالیٰ کی مدد شامل حال نہ ہو تو کشتی یا جہاز کسی وقت بھی حادثے کا شکار ہو سکتا ہے۔

اور پھر حضرت علیؓ نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے حضرت عثمانؓ کو قتل نہیں
کیا اور نہ ہی میں نے ان کے قتل میں کسی کی مدد کی ہے لوگ ہمیں اس قتل میں
ملوث کرتے ہیں حالانکہ نَحْنُ بُرَآءٌ ہم اس سے بری ہیں - لوگ ہم سے
عثمانؓ کا قصاص طلب کرتے ہیں جبکہ ہم اس معاملہ میں بے گناہ ہیں، دراصل
عثمانؓ کو سرکش لوگوں نے قتل کیا جن میں کوئی صحابی شامل نہیں تھا - حضرت
عثمانؓ کے پاس فوج اور طاقت تھی مگر اس کو استعمال کر کے اپنی جان بچانے کی
کوشش نہیں کی - وہ امت کے خیرخواہ تھے اور مسلمانوں کی خونریزی نہیں

چاہتے تھے۔ آپ کی صداقت کی یہی دلیل ہے۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ خمینی جیسے آدمی بھی حضرت عثمانؓ اور حضرت معاویہؓ کو چاپلوس (نعوذ باللہ) کا خطاب دیتے ہیں۔ بہرحال حضرت علیؓ نے خدا کی قسم اٹھا کر کہا کہ وہ نہ خود حضرت عثمانؓ کے قاتل ہیں اور نہ انہوں نے کسی قاتل کی مدد کی ہے۔

درس سوم ۳ — آیت ۲۶ تا ۳۶

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٢٦﴾ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ﴿٢٧﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٢٨﴾ يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ﴿٢٩﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٣٠﴾ سَنَفْرُغُ لَكُمْ أَيُّهَ الثَّقَلَانِ ﴿٣١﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٣٢﴾ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا ۚ لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ ﴿٣٣﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٣٤﴾ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِنْ نَارٍ وَنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرَانِ ﴿٣٥﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٣٦﴾

ترجمہ :- جو کوئی بھی ہے زمین پر فنا ہونے والا ہے (۲۶) اور باقی رہے گی تیرے پروردگار کی ذات جو بزرگی اور عظمت والا ہے (۲۷) پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے (۲۸) اسی سے مانگتا ہے جو بھی ہے آسمانوں میں اور زمین میں ہر دن میں وہ ایک شان میں ہوتا ہے (۲۹) پس تم

دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ﴿۳۰﴾ عنقریب ہم فارغ ہوں گے تمہارے لیے اے دو بھاری قافلو! ﴿۳۱﴾ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ﴿۳۲﴾ اے جنوں اور انسانوں کے گروہ، اگر تم طاقت رکھتے ہو کہ نکل جاؤ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے تو نکل جاؤ، تم نہیں نکل سکتے مگر غلبے کے ساتھ ﴿۳۳﴾ پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ﴿۳۴﴾ وہ چھوڑے گا تم پر شعلے آگ کے اور دھواں، پس تم بدلہ نہیں لے سکو گے ﴿۳۵﴾ پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ﴿۳۶﴾

ربط آیات

گذشتہ دروس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ان انعامات اور احسانات کا ذکر فرمایا جو اس نے اپنی مخلوق خاص طور پر انسانوں اور اہل ایمان پر کیے ہیں۔ پھر اپنی قدرت کی بعض نشانیوں کا ذکر کیا جو اس کی وحدانیت اور وقوع قیامت پر دلیل بنتی ہیں اب آج کے درس میں اللہ نے جزائے عمل کا مسئلہ بیان فرمایا ہے۔

فانی اور باقی

ارشاد ہوتا ہے کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ جو کچھ بھی زمین پر ہے، وہ فنا ہونے والا ہے۔ گذشتہ درس میں فرمایا وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ہم نے زمین کو اپنی مخلوق کے لیے بچھا دیا۔ اللہ کی بے شمار مخلوق انسان، جانور، درندے پرندے، کیڑے مکوڑے اس زمین پر آباد ہیں اور اسی سے پیدا ہونے والی روزی استعمال کرتے ہیں۔ اب اللہ نے فرمایا کہ اس نے جو چیزیں اس زمین پر پیدا کی ہیں، وہ سب فنا ہونے والی ہے۔ ایک وقت آئے گا جب ان میں سے کوئی چیز بھی باقی نہیں رہے گی البتہ وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ باقی رہنے والی صرف تیرے پروردگار کی ذات ہے جو بزرگی اور عظمت والی ذات ہے۔

عربی زبان میں وجہ چہرے کو کہتے ہیں۔ مگر اس سے مراد ذات ہوتی ہے مطلب یہ کہ قیام و دوام صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہے۔ باقی ہر چیز فانی ہے اور ظاہر ہے کہ فانی چیز میں الوہیت کی صفت نہیں پائی جا سکتی۔ لہٰذا کسی فانی چیز کی پرستش کرنا شرک اور کفر ہے۔ اس سے قیامت والی بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ انسان کو لازماً اس دُنیا سے جانا ہے اور حساب کتاب کی منزل سے گذر کر جزا یا سزا پانی ہے۔ بہر حال فرمایا کہ ہر چیز فانی ہے۔ سوائے اللہ کی ذات کے کہ وہی باقی رہنے والا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے۔

؎ قَضَى عَلَى خَلْقِهِ مَنَايَا
وَكُلُّ شَيْءٍ سِوَاهُ فَانِ

اس نے اپنے سوا ہر چیز پر موت کا فیصلہ کر رکھا ہے خواہ وہ ملائکہ مقربین ہوں، عالم بالا کی کوئی مخلوق ہو، فضاؤں اور ہواؤں کی مخلوق یا زمین پر بسنے والے جن، انسان، چرند، پرند یا کیڑے مکوڑے ہوں۔ ہر چیز فانی ہے۔

؎ تَعَالَى اللّٰهُ لَا يَبْقَى سِوَاهُ
إِذَا وَرَدَتْ بَرِيَّتُهُ الْفَنَاءَ

اللہ تعالیٰ کی ذات ہی بلند و برتر اور باقی ہے۔ اور اس کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔

؎ أَنْتَ نِعْمَ الْمَتَاعُ لَوْ كُنْتَ تَبْقَى
غَيْرَ أَنْ لَا بَقَاءَ لِلْإِنْسَانِ

اگر باقی رہتے تو تم بہترین چیز ہوتے مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان کیلئے بقا نہیں

؎ أَنْتَ خِلْوٌ مِنَ الْعُيُوبِ وَمِمَّا
يَكْرَهُ النَّاسُ غَيْرَ أَنَّكَ فَانِ

تم میں نہ کوئی عیب ہے اور نہ کوئی ایسی چیز جس کو لوگ ناپسند کریں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم فانی ہو۔

جانداروں کے متعلق تو اللہ نے خاص طور پر فرمایا ہے کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (آل عمران - ۱۸۵) ہر جان نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے ۔ جانداروں کے علاوہ دوسری کوئی چیز بھی "قائم و دائم" نہیں ہے بلکہ سب کو ایک دن ختم ہو جانا ہے ۔ حتیٰ کہ ایک وقت آئے گا جب آسمان بھی پھٹ جائے گا اور یہ زمین بھی تبدیل کر دی جائے گی ۔ غرضیکہ اللہ کی ذات کے سوا کائنات کی کسی چیز کو دوام حاصل نہیں ۔ لہٰذا عبادت کے لائق بھی وہی ذات ہے جو ہمیشہ سے قائم و دائم ہے اور ہمیشہ رہے گی ۔ یہ حقیقت بیان کرنے کے بعد اللہ نے وہی بات دہرائی فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ اے جنو اور انسانو! تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ۔

سائل اور مسئول الیہ

ارشاد ہوتا ہے يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ اسی سے مانگتا ہے جو کوئی ہے آسمانوں اور زمین میں ۔ اللہ کی مخلوق خواہ ارضی ہو یا سماوی سب کے سب اسی کے آگے دستِ سوال دراز کرتے ہیں اور اُسی کے سامنے اپنی حاجات پیش کرتے ہیں ۔ البتہ یہ سوال دو طرح سے ہوتا ہے : زبانِ قال سے یا زبانِ حال سے ۔ اللہ نے انسان کو قوتِ گویائی عطا فرمائی ہے لہٰذا یہ اپنی ضروریات زبان سے بول کر طلب کرتا ہے ۔ اور باقی چیزیں یعنی جانور ، درندے ، چرند ، پرندے ، کیڑے مکوڑے ، شجر و حجر زبانِ حال سے مانگتے ہیں ۔ ان کی حالت ہی بتاتی ہے کہ انہیں کس چیز کی ضرورت ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کی حاجات پوری کرتا ہے ۔ مخلوق میں سے کوئی چیز ایک لمحہ کے لیے بھی اللہ تعالیٰ سے مستغنی نہیں ہو سکتی ۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے دُعا میں اس طرح سکھایا ہے ۔
اَللّٰهُمَّ لَا تَكِلْنِي إِلَىٰ نَفْسِي طَرْفَةَ عَيْنٍ اے اللہ! مجھے آنکھ جھپکنے کے برابر بھی میرے نفس کی طرف نہ سونپ بلکہ مجھ پر شفقت فرما اور ہر حالت میں میری مدد فرما ۔ اگر تو نے مجھے میرے نفس کی طرف سونپ دیا تو میں شر کے قریب ہو جاؤں گا ۔ غرضیکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے اور غنی صرف وہی ذات ہے جو قادرِ مطلق

نیت الکل، علیم کل اور مختار مطلق ہے۔ سارے محتاج ہیں جبھی تو مانگتے ہیں فرشتوں جیسی
مقرب مخلوق بھی اپنے عروج اور ترقی کے لیے اسی سے سوال کرتی ہے ساری مخلوق
کی حاجت روائی کرنا اسی مالک الملک کا کام ہے اور وہ اپنی حکمت اور مصلحت
کے مطابق ہر مانگنے والے کو دیتا ہے۔ اگر اس کی مشیت نہ ہو تو روک بھی لیتا ہے۔
یہ سارا اختیار اُسی کے پاس ہے۔ چاہے تو تکلیف کو دور کرے اور چاہے تو
اسے لمبا کر دے۔

شانِ خداوندی

فرمایا آسمان و زمین کی ہر چیز اُسی سے مانگتی ہے۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ
شَاْنٍ وہ ہر دن ایک شان اور حالت میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی حکمت کے مطابق ہر
وقت اور ہر لمحہ ایک نئی شان کو ظاہر کرتا ہے کسی کو زندگی بخشتا ہے تو کسی کو
موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے کسی کو صحت بخشتا ہے تو کسی کو بیماری میں مبتلا کر
دیتا ہے کسی کو ترقی عطا کرتا ہے اور کسی کو تنزل میں گرا دیتا ہے کسی کو بڑھا دیتا ہے
اور کسی کو گھٹا دیتا ہے کسی کے گناہ بخش دیتا ہے کسی کی مصیبت دور کر دیتا ہے۔
اور کسی کے درجات بلند کر دیتا ہے کہیں خوشحالی عطا کرتا ہے اور کہیں قحط پیدا کر دیتا ہے
تمام اختیارات اُسی کے پاس ہیں جنہیں وہ اپنی مشیت اور مصلحت کے مطابق
استعمال کرتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے بِيَدِهِ الْمِيْزَانُ اسی کے ہاتھ میں اختیار
کا ترازو ہے جس کو چاہے کم کرے اور جس کو چاہے زیادہ کر دے بعض فرماتے
ہیں کہ خدا تعالیٰ کی ایک شان دنیا کے دن کی ہے اور ایک قیامت کے دن کی
اس کی دنیا کی شان یہ ہے کہ وہ زندگی بخشتا ہے موت طاری کرتا ہے۔ عطا کرتا ہے
اور روک لیتا ہے۔ حکم دیتا ہے اور منع کرتا ہے۔ اور اس کی قیامت کی شان یہ ہے
کہ کسی کو ثواب ہوگا اور کسی کو عذاب ہوگا۔ غرضیکہ دنیا کی شان ہو یا آخرت کی وہ ہر
دن ایک شان میں ہوتا ہے جس میں اس کی صفات کمال کا ظہور ہوتا ہے فرمایا
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ اے جنو! اور انسانو! تم خدا تعالیٰ کی کس کس

نعمت کا انکار کرو گے۔

حساب کتاب کی منزل

پھر فرمایا سَنَفْرُغُ لَكُمْ أَيُّهَ الثَّقَلَانِ عنقریب ہم تمہارے لیے فارغ ہو جائیں گے۔ اے دو بھاری قافلو! ان دو قافلوں سے مراد ایک جنوں کا گروہ ہے۔ اور دوسرا انسانوں کا۔ یہ آدمیت کا دور ہے جس کو اللہ نے آدم علیہ السلام سے شروع کیا۔ اور یہ قیامت تک چلتا رہے گا۔ اس دور میں انسان ہی سب سے اعلیٰ مخلوق ہے اور باقی تمام چیزوں کو اللہ نے انسان کی مصلحت کے لیے پیدا فرمایا ہے دوسرا گروہ جنات کا ہے جو کہ آدم علیہ السلام سے بھی پہلے کے دور سے چلے آ رہے ہیں انسانوں کی طرح جنات بھی مکلف ہیں۔ انسانوں کی طرح ان کے بھی مختلف گروہ اور پارٹیاں ہیں۔ ان میں منصف مزاج بھی ہیں اور ظالم بھی، مومن بھی ہیں اور کافر بھی، ناری بھی ہیں اور ناری بھی۔ بہرحال انسان اور جن دونوں قسم کی مخلوق مکلف ہے یہ دونوں بھاری قافلے قیامت تک چلتے رہیں گے۔ پھر سارا جہان تبدیل ہو جائے گا۔ حساب کتاب کی منزل آئے گی اور پھر جزا اور سزا کے فیصلے ہوں گے اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ ہم عنقریب تمہارے حساب کتاب کے لیے فارغ ہونگے۔

اس سَنَفْرُغُ کے لفظ سے اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات تو ایسی ہے کہ اس کو کوئی شان دوسری شان سے مصروف نہیں رکھتی مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی ایک کام میں مصروف ہو تو کیا وہ کسی دوسرے کام کی طرف توجہ نہیں دے سکتا؟ حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ ہر چیز اور ہر کام ہمہ وقت اس کی نگاہ میں ہے اور کوئی چیز اسے دوسری چیز سے غافل نہیں کر سکتی۔ اگر یہ بات ہے تو پھر اس جملے کا کیا مطلب ہے کہ ہم عنقریب تمہارے حساب کتاب کے لیے فارغ ہوں گے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ پہلے فارغ نہیں تھے عنقریب جب فارغ ہوں گے تو اس طرف متوجہ ہوں گے۔

اس سلسلہ میں صرف، نحو اور تفسیر کے مشہور امام زجاج فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں فراغت دو معنی میں آتا ہے ایک فراغت تو عام ہے کہ کوئی شخص کسی کام میں مصروف ہے اور جب اس کو ختم کر لیتا ہے تو فارغ ہو جاتا ہے۔ فراغت کا

دوسرا معنی کسی کام کا قصد کرنا ہوتا ہے۔ اور اس مقام پر یہی معنی مراد ہے۔ اور جملے کا معنی یہ بنتا ہے کہ عنقریب ہم قصد کریں گے تمہارے لیے اے دو بوجھل قافلو! یہ انسانوں اور جنوں دونوں گروہوں سے خطاب ہے کیونکہ یہ دونوں انواع مکلف ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم عنقریب تمہارا حساب کتاب لینے کا قصد کریں گے جس کے بعد جزا اور سزا کے فیصلے ہوں گے۔ البتہ بعض یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہاں پر سَنَفْرُغُ کا حقیقی نہیں بلکہ مجازی معنی مراد ہے کہ عنقریب ہم بدلہ دیں گے۔ یہ بدلہ دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں حساب کتاب کی منزل کے بعد دیا جائے گا۔ دنیا میں تو پورا بدلہ نہیں ملتا کسی کو تھوڑا بہت مل گیا مگر مکمل بدلہ آخرت میں ہی ملے گا۔ ساتھ پھر وہی جملہ دہرایا فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ تم دونوں گروہ اللہ تعالیٰ کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

مخلوق کی بے بسی

آگے پھر دونوں گروہوں کو مخاطب کر کے فرمایا یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ۔ اے جنوں اور انسانوں کے گروہ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا اگر تم اس بات کی طاقت رکھتے ہو کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ تو بھاگ نکلو۔ اللہ نے چیلنج کیا ہے کہ تم میری نافرمانی کر کے میری گرفت سے بچ نہیں سکتے۔ میری بادشاہت تو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اگر تم میں ہمت ہے تو میری سلطنت سے بھاگ کر دکھاؤ، تاکہ تم گرفت سے بچ سکو۔ پھر اللہ نے خود ہی فرمایا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ یاد رکھو! تم نہیں بھاگ سکتے مگر غلبے کے ساتھ۔ سلطان کا معنی سند، دلیل یا غلبہ۔ اور یہ غلبہ تمہارے پاس موجود نہیں، لہٰذا تم خدا تعالیٰ کے قبضے اور تصرف سے نکل نہیں سکتے۔ پوری کائنات تو اسی کی قلمرو ہے، پھر تم بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟ عام دنیا کی حکومتوں کا بھی دستور ہے کہ وہ حتی الامکان مجرم کو بھاگنے نہیں دیتیں۔ مگر اس کے باوجود بعض لوگ روپوش ہو جاتے ہیں یا ایک ملک چھوڑ کر دوسرے ملک میں چلے جاتے ہیں جس کی وجہ سے گرفت سے باہر ہو جاتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی سلطنت

تو ہر جگہ ہے۔ آخر کوئی بھاگ کر کہاں جائے گا؟ لہذا مجرم لازماً پکڑے جائیں گے اور پھر اللہ تعالیٰ کی عدالت سے سزا بھی پائیں گے۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

فرمایا یُرْسَلُ عَلَیْکُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّ نُحَاسٌ تم دونوں پر آگ اور دھوئیں کے شعلے پھینکے جائیں گے، یعنی اگر کوئی جن یا انسان خدا تعالیٰ کی گرفت سے بھاگ کر بچنا چاہے گا، تو اس پر آگ اور دھواں پھینکا جائے گا۔ جس کی وجہ سے کوئی مجرم بھاگ نہیں سکے گا۔ سُوْرَۃُ الصّٰفّٰت میں اللہ نے شیاطین کے متعلق فرمایا ہے کہ ہم نے آسمانِ دنیا کو ستاروں سے مزین کیا اور ہر سرکش شیطان سے اس کی حفاظت کی ہے تاکہ ملاءِ اعلیٰ کی بات نہ سن سکیں۔ وَ یُقْذَفُوْنَ مِنْ کُلِّ جَانِبٍ (آیت۔ ۸) اور ہر طرف سے ان پر انگارے پھینکے جاتے ہیں۔ یہاں بھی فرمایا کہ جنوں اور انسانوں میں سے اگر کوئی بھاگنا چاہے گا تو ان پر آگ اور دھواں چھوڑا جائے گا فَلَا تَنْتَصِرٰنِ پس تم دونوں بدلہ نہیں لے سکو گے۔ مطلب یہی ہے کہ تم خدا تعالیٰ کی سلطنت سے بھاگ کر نہیں جا سکو گے اور تمہیں اپنے عقائد و اعمال کا حساب دینا ہی پڑے گا۔ فرمایا فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ بھلا تو تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کا انکار کرو گے۔

اعتراض اور جواب

دیانند سرسوتی، آریہ سماج ہندوؤں کا لیڈر تھا۔ اس نے اپنی کتاب "ستیارتھ پرکاش" میں تورات، انجیل اور قرآن پر بہت سے اعتراض کیے ہیں۔ کتاب کے چودھویں باب میں قرآن پاک کی اسی آیت فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ مسلمانوں کا خدا بھی عجیب ہے کہ ایک طرف تو جنوں اور انسانوں پر آگ کے شعلے اور دھواں پھینکنے کا حکم دے رہا ہے اور ساتھ ہی کہتا ہے کہ تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ بھلا آگ اور دھواں پھینکنے میں کونسی نعمت رکھی ہے جس کا انکار ممکن نہیں؟ اس کے جواب میں شاہ عبدالقادرؒ

نے حاشیہ قرآن پر جواب لکھا ہے کہ کسی کو عذاب کی خبر دینا بھی خدا تعالیٰ کی ایک نعمت ہے کہ اس طرح کوئی شخص اپنا بچاؤ کر سکتا ہے اور اگر یہ اطلاع نہ دی جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ شخص اس مصیبت میں مبتلا ہو جائے۔ تو اللہ نے آگ اور دھوئیں کا ذکر کر کے جنوں اور انسانوں کو خبردار کر دیا ہے کہ قیامت والے دن تم بھاگ نہیں سکو گے لہٰذا آج موقع ہے کہ ایمان اور توحید کو اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کی سزا سے بچ جاؤ۔ دنیا کا بھی یہ دستور ہے کہ جس خطۂ ملک میں طوفان یا سیلاب وغیرہ آنے کا خطرہ ہو، وہاں کے لوگوں کو پیشگی خبردار کر دیا جاتا ہے کہ اپنا بچاؤ کر لو ورنہ طوفان کی نذر ہو جاؤ گے۔ تو اطلاع کرنا بھی نعمت ہے ورنہ لوگ طوفان یا سیلاب کی زد میں آ کر ہلاک ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات مالی نقصان بھی ہوتا ہے۔ تو اسی طرح اللہ تعالیٰ کا خبردار کرنا بھی ایک نعمت سے کم نہیں۔ امام محمد بن ابوبکر عبدالقادر رازیؒ فرماتے ہیں کہ کسی سزا کو مؤخر کر دینا یا مصیبت کو ٹال دینا بھی تو نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا میں بسا اوقات مصیبت کو ٹال دیتا ہے اور فوری سزا نہیں دیتا بلکہ اسے مؤخر کر دیتا ہے، تو یہ بھی تو اُس کا احسان ہی ہے۔ اسی طرح پیشگی اطلاع دے دینا اور آنے والی آفت سے خبردار کر دینا بھی خدا کا انعام ہے۔ جو شخص اس بات کو نہیں سمجھتا وہ احمق ہے اور فضول اعتراض کرتا ہے۔

فَإِذَا انشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿٣٧﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٣٨﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْأَلُ عَن ذَنبِهِ إِنسٌ وَلَا جَانٌّ ﴿٣٩﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٤٠﴾ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِي وَالْأَقْدَامِ ﴿٤١﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٤٢﴾ هَٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُونَ ﴿٤٣﴾ يَطُوفُونَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيمٍ آنٍ ﴿٤٤﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٤٥﴾

رکوع ۲ — ۱۲

ترجمہ :- پھر جب پھٹ جائے گا آسمان ، پس ہو جائے گا سرخ کھال کی طرح (۳۷) پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے (۳۸) پس اس دن نہیں پوچھا جائے گا اس کے گناہ کے بارے میں کسی انسان اور نہ کسی جن سے (۳۹) پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے (۴۰) پہچانے جائیں گے مجرم اپنی نشانیوں سے ، پس پکڑا جائے گا اُن کو پیشانیوں اور پاؤں سے (۴۱) پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے (۴۲) یہ ہے جہنم جس کو جھٹلاتے تھے مجرم (۴۳) پھر چکر لگائیں گے اس کے

درمیان اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان (۴۴) پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے (۴۵)

رابطہ آیات

سورۃ کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اُن خصوصی انعامات کا ذکر کیا جو اس نے اپنی مخلوق اور خاص طور پر نسلِ انسانی پر کیے ہیں۔ پھر جزائے عمل کے بارے میں فرمایا کہ زمین وآسمان کی ہر چیز فانی ہے اور باقی رہنے والی صرف پروردگار کی ذات ہے اس کے ساتھ انعامات کے سلسلے کو دہرا کر لوگوں کو یہ بات باور کرائی گئی کہ وہ محتاج ہیں اور ہر چیز خدا تعالیٰ سے ہی اپنی حاجات طلب کرتی ہے۔ پھر وقوعِ قیامت اور محاسبہ اعمال کا ذکر کیا۔ مجرمین کے متعلق فرمایا کہ اُن پر آگ کے شعلے اور دھواں پھینکا جائے گا مگر انہیں کسی طرف سے مدد نہیں مل سکے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ نے یہ جملہ بھی دہرایا کہ اے جنو اور انسانو! تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

آسمان پھٹ جائے گا

آج کے درس میں بھی وقوعِ قیامت اور جزائے عمل ہی کا بیان ہے۔ ارشاد ہوتا ہے فَإِذَا انْشَقَّتِ السَّمَاءُ جس وقت آسمان پھٹ جائے گا یہ وقوعِ قیامت کی علامات میں سے ایک علامت ہے کہ آسمان پھٹ جائے گا فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ پس وہ ہو جائے گا سُرخ کھال کی طرح۔ وَرْدَةً گلاب کو کہتے ہیں اور دھان دباغت شدہ کھال کو کہتے ہیں جو سُرخی مائل ہوتی ہے مطلب یہ ہے کہ آسمان پھٹ کر گلابی یا سُرخ رنگ کا ہو جائے گا۔ دھان تیل کی تلچھٹ کو بھی کہتے ہیں جو سُرخی مائل ہوتی ہے۔ اس وقت تو آسمان نیلگوں نظر آتا ہے۔ مگر قیامت والے دن سُرخی مائل ہو جائے گا۔ دوسری جگہ ہے کہ آسمان پھٹ کر دریچے دریچے ہو جائے گا۔ اور اس سے اُوپر کی چیزیں نظر آنے لگیں گی۔ پھر وہی جملہ دہرایا فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ تم دونوں (جن اور انسان) اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کی تکذیب کرو گے؟

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ مجرموں کی سزا یابی اہل ایمان کے حق میں نعمت ہے اسی لیے سورۃ الانعام میں ارشاد فرمایا ہے فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ

ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾ پس ظالموں کی جڑ کاٹ دی گئی اور سب تعریفیں تمام جہانوں کے پروردگار کے لیے ہی سزاوار ہیں۔ وفاداروں کے حق میں تو یہ نعمت ہے لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ سزا کا حال سن کر مجرم لوگ جرائم سے باز ہی آجائیں۔ شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ اللہ نے ہر آیت میں اپنی نعمت جتائی ہے کوئی تو فی الواقع نعمت ہے جس سے مخلوق مستفید ہو رہی ہے اور کسی بُرے انجام کی خبر دینا بھی نعمت ہے کہ لوگ ڈر کر اس برائی سے باز آجائیں اور سزا سے بچ جائیں۔

مجرمین کی پہچان

آگے ارشاد ہوتا ہے فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ اُس قیامت والے دن کسی انسان یا جن سے اُس کے گناہوں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ تو مجرم لوگ اپنی نشانیوں سے پہچان لیے جائیں گے۔ اس عدم بازپرس کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں بغیر سزا کے کھلا چھوڑ دیا جائے گا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی کیونکہ اُن کے گناہوں کی آلودگی اُن کے چہروں سے ظاہر ہوگی جیسا کہ سورۃ عبس میں فرمایا وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾ اور کتنے منہ ہوں گے جن پر اس دن گرد پڑ رہی ہوگی اور سیاہی چڑھ رہی ہوگی۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ خود بھی ہر شخص کے حالات کو جانتا ہے اور ہر شخص کا ہر عمل لوح محفوظ میں بھی محفوظ ہے۔ فرشتوں کی کتابوں میں بھی درج ہے اور ہر انسان کے اعمال نامہ میں بھی محفوظ ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کی حکمت کے مطابق انسان کی نیکی اور بدی اُس کی روح اور نسمے میں بھی محفوظ ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ اس دن مجرموں سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ البتہ ڈانٹ ڈپٹ اور سرزنش کے لیے ضرور بازپرس ہوگی جیسے سورۃ الحجر میں فرمایا فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾ تیرے پروردگار کی قسم ہم اُن سب سے ضرور پوچھ گچھ کریں گے

اور یہ باز پرس سزا کے لیے ہوگی۔ مفسرین یہ بھی فرماتے ہیں کہ قیامت کو کئی مواقع پیش آئیں گے۔ بعض مواقع پر باز پرس ہوگی اور بعض پر نہیں ہوگی۔ تو اس لحاظ سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ مجرموں سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ جرم کی نوعیت کے اعتبار سے فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِي وَالْأَقْدَامِ وہ پیشانی کے بالوں سے پکڑے جائیں گے اور پاؤں سے پکڑ کر گھسیٹے جائیں گے فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

نمازی اور مؤذن کی پہچان

جسطرح مجرم لوگ اپنی نشانیوں سے پہچانے جائیں گے اسی طرح اہل ایمان بھی بعض نشانیوں سے پہچانے جائیں گے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ میری امت کے لوگ وضوء کے اعضاء سے پہچانے جائیں گے۔ صحابہؓ نے عرض کیا، حضور! حشر کے ہجوم میں آپ اپنی امت کے لوگوں کو کیسے پہچانیں گے تو فرمایا، اگر کسی شخص کے بہت سے گھوڑے ہوں جن میں پنج کلیان بھی ہوں تو اُن کو کیسے پہچانا جاتا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ایسے گھوڑے اپنے چہرے اور چاروں پاؤں کی سفیدی سے پہچانے جاتے ہیں۔ اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میری امت کے لوگوں کے چہرے، ہاتھ اور پاؤں وضو کرنے کی وجہ سے روشن ہوں گے لہٰذا میں انہیں آسانی کے ساتھ پہچان لوں گا۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اللہ کی رضا کی خاطر اذان دینے والوں کی گردنیں قیامت کے دن بلند ہوں گی اور اس طرح مؤذن لوگ پہچانے جا سکیں گے۔ گردنیں لمبی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اونٹ کی طرح لمبی ہوں گی۔ بلکہ اُن پر خاص قسم کی نورانیت چھائی ہوگی جس سے یہ پتہ چل جائے گا کہ یہ مؤذن ہیں جو دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند کرتے رہے اور لوگوں کو نماز کی طرف دعوت دیتے رہے۔

متکبر اور بدکار کی پہچان

حدیث شریف میں اللہ کے نبی نے بعض دوسرے لوگوں کی پہچان کا بھی تذکرہ فرمایا ہے۔ مثلاً متکبر اور مغرور لوگ قیامت والے دن چیونٹیوں کے

برابر چھوٹے چھوٹے ہوں گے۔ دُنیا میں تو بڑے بنتے رہے، حسب نسب اور مال و دولت پر غرور کرتے رہے مگر اس دن اُن کے جسم چیونٹیوں جتنے ہوں گے اور وہ پہچانے جائیں گے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں۔

؎ حشر پُر حرص، سگ مردار خوار
صورتِ خوک بود روزِ شمار

حرص کا مریض دنیا میں مردار کھانے والے کُتے کی مانند ہو گا۔ اور وہ قیامت والے دن خنزیر کی شکل و صورت میں ہو گا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا۔

؎ زانی را گندہ اندام نہاں
خمر خوردہ بود وگندہ دہاں

زناکاروں کے اعضائے تناسل سے اس قدر بدبو آئیگی کہ کوئی پاس نہیں کھڑا ہو سکے گا۔ اور شراب خور کے منہ سے بھی ایسی بدبو آئے گی جیسا کہ گندہ دہنی کی بیماری ہوتی ہے۔ یہ بیماری بعض کو بغل میں ہوتی ہے، بعض کو پاؤں میں اور بعض کو منہ میں۔ غرضیکہ مختلف قسم کے لوگ اپنی اپنی نشانیوں سے پہچانیں جائیں گے

مجرمین کے لیے سزا

فرمایا مجرم لوگوں کو پیشانی کے بالوں اور پاؤں سے گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا، اور کہا جائے گا هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ یہ ہے وہ جہنم جس کو مجرم لوگ جھٹلاتے رہے۔ جب انہیں دنیا کی زندگی میں برے اعمال اور جہنم کے عذاب سے ڈرایا جاتا تھا۔ تو وہ تکذیب کر دیتے تھے اور کہتے تھے کہ کوئی قیامت نہیں، نہ کوئی حساب کتاب ہے اور نہ اُس کے نتیجے میں جنت دوزخ ہے۔ یہ سب کہانیاں ہیں جو لوگوں نے بنا رکھی ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کو جہنم رسید کر کے کہا جائے گا کہ اس جہنم کا تم انکار کرتے تھے، اب اس کا مزا چکھ لو۔ سورۃ الحاقہ میں جہنم رسیدگی کا حال اس طرح بیان کیا گیا ہے حکم ہو گا خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ ﴿۳۱﴾ ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ﴿۳۲﴾ اسے پکڑ لو

اور طوق پہنا دو۔ پھر دوزخ کی آگ میں جھونک دو۔ پھر ستر ستر گز لمبی زنجیر وں میں جکڑ دو۔

فرمایا پھر اُس وقت حالت یہ ہوگی یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَبَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ پھر وہ چکر لگائیں دوزخ اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان۔ جب آگ کی شدت سے پیاس محسوس ہوگی تو پانی کی طرف دوڑیں گے۔ مگر وہ کھولتا ہوا گرم پانی ہوگا۔ سورۃ محمد میں ہے کہ جب وہ پانی کا ایک گھونٹ پئیں گے تو وہ اس قدر گرم ہوگا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ (آیت ۱۵) کہ ان کی آنتوں کو کاٹ کر نیچے پھینک دے گا۔ وہ پھر اپنی اصلی جگہ پر آئیں گی۔ پھر پانی پئے گا۔ اور پھر وہی حالت ہوگی۔ اُن کی ایک اور حالت سورۃ النساء میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ جہنم میں كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا جب اُن کی کھال جل جائے گی تو ہم دوسری کھال پہنا دیں گے۔ پھر وہ بھی جل جائے گی تو اور کھال چڑھا دی جائے گی اور اس طرح اُن کو مسلسل سزا ملتی رہے گی۔

سورۃ الواقعہ میں دوزخیوں کے کھانے پینے کا ذکر بھی آتا ہے لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ﴿۵۲﴾ کھانے کے لیے تھوہر کا کڑوا درخت ہوگا جس سے وہ پیٹ بھرنے کی کوشش کریں گے۔ فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ اور پینے کے لیے کھولتا ہوا پانی ہوگا۔ سورۃ الحاقہ میں فرمایا وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ﴿۳۶﴾ اُن کے کھانے کے لیے ایسی بدبودار پیپ ہوگی کہ جس کا ایک ڈول بھر کر اگر دنیا میں پھینک دیا جائے تو دنیا کی کوئی چیز استعمال کے قابل نہ رہے۔ ایسا ہی ایک نقشہ سورۃ الغاشیہ میں کھینچا ہے۔ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ﴿۵﴾ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ﴿۶﴾ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ﴿۷﴾ اُن کو کھولتے ہوئے چشمے کا پانی پلایا جائے گا۔ اور کھانے کے لیے خار دار جھاڑ ہوگا۔ جو کہ جسم کو نہ فربہ کرے گا۔ اور نہ اُس سے

بھوک دُور ہو گی۔

اور پھر آخر میں وہی جملہ دہرایا گیا فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ یعنی جنّو!
اور انسانو! تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمت کا انکار کرو گے۔ یہ مذکورہ سزائیں
بھی اس لحاظ سے نعمت ہیں کہ اُن کی ہولناکی کو سُن کر لوگ بدائی سے باز آجائیں اور
نیکی کو اختیار کر لیں۔ اگر یہ بات کسی کی سمجھ میں آجائے تو سزا کا بیان فی الواقع اس کے
لیے نعمت ثابت ہو گا۔

درس پنجم ۵ — آیت ۴۶ تا ۶۱

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۷﴾ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴿۴۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۹﴾ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ ﴿۵۰﴾ فَبِاَیِّ
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۱﴾ فِیْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ
زَوْجٰنِ ﴿۵۲﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۳﴾ مُتَّكِـِٕیْنَ
عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآىٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍؕ وَجَنَا الْجَنَّتَیْنِ
دَانٍ ﴿۵۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۵﴾ فِیْهِنَّ قٰصِرٰتُ
الطَّرْفِۙ لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّۚ ﴿۵۶﴾
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۷﴾ كَاَنَّهُنَّ الْیَاقُوْتُ
وَالْمَرْجَانُ ﴿۵۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۹﴾
هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿۶۰﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ
رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۱﴾

ترجمہ :- اور اس شخص کے لیے جو ڈرا کھڑا ہونے
سے اپنے پروردگار کے سامنے ، دو باغ ہوں گے ﴿۴۶﴾
پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمت کو
جھٹلاؤ گے ﴿۴۷﴾ (وہ باغ) گھنی شاخوں والے ہونگے ﴿۴۸﴾
پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس **نعمت** کو جھٹلاؤ گے

گے ﴿۴۹﴾ ان دو باغوں میں دو چشمے بہتے ہوں گے ﴿۵۰﴾
پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ
گے ﴿۵۱﴾ اُن دو باغوں میں قسم قسم کے پھل ہوں
گے ﴿۵۲﴾ پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت
کو جھٹلاؤ گے ﴿۵۳﴾ ان باغوں میں تکیے لگا کر بیٹھنے والے
ہوں گے ایسے بچھونوں پہ جن کے استر موٹے ریشم
کے ہوں گے اور اُن باغوں کے پھل قریب ہونگے ﴿۵۴﴾
پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ
گے ﴿۵۵﴾ اُن باغوں میں عورتیں ہوں گی نیچی نگاہ والی کہ
نہیں چھوا اُن کو کسی انسان نے اس سے پہلے اور نہ
کسی جن نے ﴿۵۶﴾ پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس
کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ﴿۵۷﴾ (وہ عورتیں) گویا کہ وہ
یاقوت اور مرجان ہیں ﴿۵۸﴾ پس تم دونوں اپنے پروردگار
کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ﴿۵۹﴾ نہیں ہے بدلہ احسان
کا مگر احسان ﴿۶۰﴾ پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس
کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ﴿۶۱﴾

ربط آیات

پہلے اللہ کے مطلق مادی، حسی اور روحانی انعامات کا ذکر ہوا۔ پھر اس کے بعد نافرمانوں کے انجام کا تذکرہ ہوا۔ برائی کی چیزوں سے خبردار کرنا بھی نعمت خداوندی ہے تاکہ لوگ اللہ کے عذاب سے بچ جائیں۔ اب اگلی آیات میں اللہ کے اطاعت گزار بندوں کا ذکر آرہا ہے۔ ان کے آگے پھر دو گروہ بن جاتے ہیں جن کی جزائے عمل بھی اللہ نے الگ الگ بیان کی ہے۔

متقین کے لیے انعامات

ارشاد ہوتا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ اور جو شخص ڈر گیا اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے جس کو وقوع قیامت اور جزائے عمل

پر یقین آگیا، اور اُسے علم ہو گیا کہ اُس نے ایک دن اللہ رب العزت کی عدالت میں کھڑے ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، وہ لازماً ایمان اور نیکی کو اختیار کریگا، اور بدعقیدگی اور بداعمالی سے بچ جائے گا۔ سورۃ النّٰزعٰت میں ہے۔ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى (آیت ۔ ۴۰) جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکا فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (آیت ۔ ۴۱) بلاشبہ اُس کا ٹھکانا جنت ہوگا۔ البتہ اس مقام پر فرمایا کہ جو شخص اپنے پروردگار کے روبرو کھڑا ہونے سے ڈر گیا۔ اس کے لیے جنّتٰن دو جنتیں، یا دو باغ ہوں گے۔ اگلی آیات میں اللہ تعالےٰ نے ان باغات کے اوصاف بیان فرمائے ہیں۔ مفسرین دو باغوں کی مختلف توجیہات بیان فرماتے ہیں۔ اگلی سورۃ الواقعہ میں نیکی کرنے والوں کے دو گروہوں کا ذکر آرہا ہے۔ ایک گروہ سابقین کا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو نیکی میں سبقت کرنے والے ہیں اور دوسرا گروہ اصحاب یمین کا ہے جن کو اعمال نامہ اُن کے دائیں ہاتھ میں ملے گا۔ یہ لوگ اگرچہ سابقین سے کم درجہ میں ہونگے، مگر یہ بھی کامیاب ہونگے تو یہاں پر جن دو جنتوں کا ذکر فرمایا ہے، مفسرین فرماتے ہیں کہ اُن میں سے ایک باغ سابقین کے لیے ہے اور دوسرا اصحاب یمین کے لیے ہے۔ بعض مفسرین دو باغات یا دو جنتوں کی تقسیم اس طرح کرتے ہیں کہ ایک باغ جنوں کے لیے ہوگا اور دوسرا انسانوں کے لیے کیونکہ اس سورۃ میں اللہ نے ان دونوں انواع سے بار بار خطاب کیا ہے، چنانچہ اس سورۃ مبارکہ سے مفسرین یہ بھی اخذ کرتے ہیں کہ جس طرح انسان جنت میں جائیں گے، اسی طرح جنات بھی جنت میں جائیں گے۔ اُن کو بھی ایسی ہی جزا ملیگی جس کی تشریح اگلی آیات میں آرہی ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جنات کی تخلیق انسانوں کی تخلیق سے بہت پہلے ہوئی اور اُن کی آبادی بھی انسانوں سے کہیں زیادہ ہے۔ انسانوں کی طرح اُن کی بھی پارٹیاں اور گروہ ہیں۔ اُن میں بھی مومن اور کافر ہیں اور پھر وہ بھی مختلف

مذاہب اور فرقے نکلتے ہیں تو جنوں میں سے جو کوئی ایمان لائے گا اور نیکی اور تقویٰ کا رستہ اختیار کرے گا۔ وہ بھی جنت میں جائے گا اور وہاں کے انعام واکرام کا حقدار ہوگا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مذکورہ دو جنت ایک ہی شخص کے لیے ہیں۔ ایک جنت اُسے اس کی نیکیوں کی وجہ سے ملے گا اور دوسرا ترکِ معاصی کی بنا پر ملے گا۔ امام بیضاویؒ اور بعض دوسرے مفسرین یہ بھی فرماتے ہیں کہ انسان کو ایک جنت اُس کی جسمانی راحتوں کے لیے ملے گا جب کہ دوسرے جنت میں اس کے لیے روحانی راحتوں کا سامان ہوگا۔ جسمانی راحت میں کھانا، پینا، بیویاں، باغات، پھل، نہریں وغیرہ ہیں جب کہ روحانی راحت میں انسان کو روحانی سکون اور اطمینان حاصل ہوگا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ دو جنتوں میں ایک جنت انسان کو اس کے حسنِ عقیدہ کی بنا پر ملے گا اور دوسرا جنت اعمالِ حسنہ کی وجہ سے حاصل ہوگا۔ تاہم یہ دونوں جنت ایک ہی شخص کے لیے ہیں۔ بعض یہ بھی فرماتے ہیں کہ ہر مومن کو ایک جنت اُس کے نیک اعمال کے بدلے میں ملے گا اور دوسرا جنت اللہ تعالیٰ کے فضل وانعام کی وجہ سے حاصل ہوگا، کیونکہ خود اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ (یونس - ۲۶) جن لوگوں نے دُنیا میں نیکی کے کام انجام دیے اُن کا بدلہ نیکی ہے اور کچھ زیادہ بھی۔ یہ زیادتی اللہ تعالیٰ کے فضل وانعام کی وجہ سے ہوگی اور اس میں دیدارِ الٰہی کا ذکر بھی آتا ہے۔

حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ مذکورہ دو جنتوں میں سے ایک کا سازوسامان یعنی فرنیچر، برتن، سامانِ آرائش وغیرہ چاندی کا ہوگا۔ اور دوسرے کا سونے کا ہوگا۔ گویا دو جنتوں میں اس قدر تفاوت ہوگا۔ ظاہر ہے چاندی کے سازوسامان کی اپنی کیفیت ہوگی جو سفید ہوگی اور سونے کی دوسری شان ہوگی۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فضل وانعام ہی ہوگا۔ اس قسم کی مثالیں دنیا میں بھی مل جاتی ہیں حیدرآباد دکن کے نواب افضل الدولہ کے کسی عزیز نے ایک پہاڑی پر قلعہ نما مکان

بنایا اور پھر اُسے عطیے کے طور پر نواب کو دے دیا۔ کہتے ہیں کہ اس محل میں چالیس کمرے تھے اور ہر کمرے کا ماحول الگ الگ تھا۔ کسی کمرے کی دیواریں، چھت، فرنیچر اور تمام ساز و سامان ایک رنگ کا تھا تو دوسرے کمرے کا دوسرے رنگ کا۔ ایک کمرے کے پردے ایک قسم کے کپڑے کے تھے تو دوسرے کمرے کے دوسری قسم کے کپڑے کے تھے۔ علیٰ ہٰذا القیاس ہر کمرے کا ماحول مختلف تھا۔ اُس کے رنگ و روغن ساز و سامان اور روشنی کی بناء پر کوئی کمرہ صبح کا منظر پیش کر رہا تھا تو کوئی دوپہر کا کوئی دن ڈھلے کا، اور کوئی چاندنی رات کا۔ بہر حال جب انسان اس قسم کی چیزیں پیش کر سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ تو قادرِ مطلق ہے، اس کے ہاں کیا کچھ ممکن نہیں ؟
اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام بہت اعلیٰ و ارفع ہوں گے جن کا تصور آج ہم نہیں کر سکتے بہر حال فرمایا کہ جو شخص اللہ کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اس کے لیے دو باغ ہوں گے۔ اور پھر یاد دلایا فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

آگے ان باغوں کی کچھ کیفیت بیان کی جا رہی ہے ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ وہ دونوں باغ گھنی شاخوں والے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ باغ کا حسن درختوں سے ہوتا ہے اور درختوں کا حسن اُن کی شاخوں، پتوں، پھولوں اور پھلوں سے ہوتا ہے۔ اور پھر یہ ہے کہ گھنے باغات زیادہ خوش کن ہوتے ہیں۔ اگر درخت موجود بھی ہوں مگر پت جھڑ کا موسم ہو تو باغ بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ مگر اللہ کی جنت میں سدا بہار درخت، پھل، پھول اور پودے ہوں گے، جن کی دلکشی میں کبھی فرق نہیں آئے گا۔ فرمایا اللہ نے اس قدر انعام و فضل فرمایا ہے فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے ؟

ان باغات کی ایک اور خصوصیت یہ بیان فرمائی فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ ان میں دو چشمے بہتے ہوں گے وہ ایسا نفیس پانی ہوگا جو نہ کبھی باسی ہوگا اور نہ اس میں بدبو پیدا ہوگی۔ اُن چشموں کا پانی ہمیشہ میٹھا، خوشگوار، اور

تروتازہ رہیگا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ دو چشمے سلسبیل اور کوثر ہیں۔ جن کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے۔ فرمایا فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ پس تم دونوں گروہ اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ اس کے علاوہ فِیْهِمَا مِنْ کُلِّ فَاکِهَةٍ زَوْجٰنِ ان باغات میں ہر قسم کے جوڑا جوڑا پھل ہوں گے۔ وہاں پر انواع واقسام کے پھل بافراط موجود ہوں گے جنتی جس قسم کا پھل چاہے گا، اسے دیا کیا جائے گا۔ جنت میں مختلف قسم کے پھلوں کا ذکر قرآن پاک کی متعدد سورتوں میں بیان ہوا ہے۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

اگلی آیت میں جنتیوں کے عیش وآرام کی حالت بیان کی گئی ہے مُتَّکِئِیْنَ عَلٰی فُرُشٍ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ وہ اپنے بچھونوں پر تکیہ لگا کر بیٹھنے والے ہوں گے جن کا استر موٹے ریشم کا بنا ہوا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے بستر نہایت اعلیٰ اور نفیس قسم کے ہوں گے۔ یہ ریشم وغیرہ کی مثال تو اس دنیا میں پائی جانے والی اشیاء کی نسبت سے ہے ورنہ جنت کی ہر چیز بے مثال ہوگی اور آج ہم اس کی عمدگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پھر فرمایا وَجَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ اور ان باغوں کے پھل بالکل قریب ہی ہوں گے۔ جنتی بستر پر آرام کر رہا ہے اور اس کا جی چاہتا ہے کہ کوئی پھل کھائے تو اسے اٹھ کر کہیں جانا نہیں پڑے گا کہ جا کر پھل توڑ لائے یا کسی خادم کو حکم دے کہ اس کے لیے پھل مہیا کرے۔ بلکہ ان باغات کے پھل اتنے قریب ہوں گے کہ ہر جنتی آرام کرتا ہوا بھی ہیں ٹ‍ھانا پڑے گا۔ بلکہ پھل خود بخود اس کے منہ کے قریب آجائے گا۔ فرمایا فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ پس تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمت کی تکذیب کرو گے؟

پاکیزہ عورتیں

خوراک، پانی، لباس، مکان، صحت اور تعلیم انسان کی بنیادی ضروریات میں شامل ہیں۔ ان کی وضاحت قرآن وسنت میں کردی گئی ہے کہ یہ چیزیں

ہر شخص کو ملنی چاہییں۔ ان چیزوں کے علاوہ انسان کو اپنے جوڑے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مرد کو عورت کی ضرورت ہوتی ہے اور عورت کو مرد کی۔ ان دونوں ضروریات کی تکمیل اور نسلِ انسانی کی بقا کے لیے اللہ نے نکاح کا سلسلہ قائم کیا ہے یہ سلسلہ تو دنیا تک محدود ہے آگے جنت میں پہنچ کر حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ ہر شخص کو کم از کم دو بیویاں میسر ہوں گی۔ وَمَا فِی الْجَنَّۃِ اَعْزَبُ یعنی کوئی جنتی مجرد نہیں ہوگا۔ سارے صاحب اہل ہوں گے۔ سورۃ الطور میں جہاں اہلِ جنت کے دیگر انعامات کا ذکر ہے وہاں فرمایا وَزَوَّجْنٰھُمْ بِحُوْرٍ عِیْنٍ (آیت۔ ۲۰) ہم ان کا موٹی آنکھوں والی خوبصورت عورتوں سے نکاح کر دیں گے۔ اسی نعمت کو اللہ نے اس مقام پر بھی بیان کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ فِیْھِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ان جنتوں میں نیچی نگاہ رکھنے والی پاکیزہ عورتیں ہوں گی۔ سورۃ بقرہ میں ہے وَلَھُمْ فِیْھَآ اَزْوَاجٌ مُّطَھَّرَۃٌ (آیت۔ ۲۵) جنت میں اہلِ جنت کے لیے پاک بیویاں ہوں گی۔ یہ حوریں جنت کی مخلوق میں سے ہوں گی۔ یعنی ان کی تخلیق ہی جنت میں ہوئی ہوگی۔ اللہ نے اُن کی ایک صفت یہ بیان کی ہے کہ وہ اپنے خاوندوں اور محرموں کے علاوہ کسی پر نگاہ نہیں اٹھا سکیں گی، اور دوسری صفت یہ کہ لَمْ یَطْمِثْھُنَّ اِنْسٌ قَبْلَھُمْ وَلَا جَآنٌّ اہلِ جنت سے پہلے نہ انہیں کسی انسان نے چھوا ہوگا اور نہ کسی جن نے۔ وہ بڑی ہی باحیا اور باعصمت عورتیں ہوں گی اور یہی دو چیزیں عورت کا زیور ہیں۔ عصمت بڑی نازک چیز ہے اگر عصمت نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ سورۃ القصص میں اللہ نے حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی کا تذکرہ کیا ہے کہ جب وہ موسیٰ علیہ السلام کو بلانے کے لیے آئی تو تَمْشِیْ عَلَی اسْتِحْیَآءٍ (آیت۔ ۲۵) حیاداری کے ساتھ چلتی ہوئی آئی۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ جس میں حیا نہیں اس میں ایمان نہیں

حیا صرف عورتوں کے لیے ہی ضروری نہیں بلکہ یہ مردوں کے لیے بھی ویسی ہی ضروری ہے جیسی عورتوں کے لیے۔ پہلے نبیوں کی تعلیم میں بھی تھا اور حضور علیہ السلام کا فرمان بھی ہے اِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ اگر تجھ میں حیا نہیں ہے تو جو بھی چاہے کرتے رہو، کون پوچھنے والا ہے ؟ حیا کمال درجے کی صفت ہے تو جنت کی عورتیں باحیا اور باعصمت ہونگی اور جنتیوں سے پہلے انہیں کسی انسان یا جن نے ہاتھ نہیں لگایا ہوگا۔

ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ آج انہی دو چیزوں کا فقدان ہے۔ خاص طور پر مغربی ممالک میں تو بے حیائی فیشن کے طور پر ہو رہی ہے جس کے اثرات مشرقی ممالک پر بھی ظاہر ہو رہے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ جب انسان فطری عادت سے باہر نکل جائے تو وہ انسانی باپ بے غیرت ہو جاتا ہے اس میں جوہر کمال باقی نہیں رہتا۔ ان چیزوں کا پتہ اس وقت چلے گا، جب جزائے عمل کا وقت آئے گا۔ دنیا میں حکومتی سطح پر بے حیائی پھیلائی جا رہی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن کا بیشتر وقت عیاشی، فحاشی، عریانی اور بے حیائی پر صرف ہو رہا ہے جن کی وجہ سے اخلاق خراب ہو رہے ہیں، دین، برباد ہو رہا ہے، نسلیں خراب ہو رہی ہیں اعمال بالکل ضائع ہو رہے ہیں اور اس طرح پوری انسانی سوسائٹی تنزل کی طرف جا رہی ہے۔

دیکھو جنتی عورتوں کی اللہ نے تعریف بیان کی ہے کہ ان کی نگاہیں نیچی ہوں گی، موجودہ نام نہاد ترقی پسند معاشرے کی طرح مرد و زن کا کھلے عام میل جول مصافحے اور جنسی مذاق نہیں ہوگا۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن ڈرامے نہیں ہوں گے، فلمیں نہیں بنیں گی بلکہ ہر جنتی مرد اور جنت کی ہر عورت باحیا اور باعصمت ہوگی، وہ کسی دوسری طرف آنکھیں اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے، بہر حال اللہ نے جنت کی عورتوں کی صفات بیان فرمائی ہیں، اور ساتھ وہی جملہ پھر دہرایا ہے فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے

كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ وہ عورتیں گویا کہ وہ یاقوت اور مرجان ہیں
فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمت
کو جھٹلاؤ گے۔

نیکی کا بدلہ نیکی

فرمایا یاد رکھو! هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ نہیں ہے
بدلہ احسان کا مگر احسان ہی۔ یعنی نیکی کا بدلہ نیکی کی صورت میں ہی ملے گا۔ اگر
دنیا میں نیک نیتی کے ساتھ اچھے اعمال انجام دیئے ہیں تو ان کی جزا بھی اچھی ہو
گی۔ سورۃ الٓمٓ سجدہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ
مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ
(آیت۔ ۱۷) کوئی نفس نہیں جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں کی کیسی
ٹھنڈک چھپا رکھی ہے۔ یہ ان کے اعمال ہی کا بدلہ ہوگا۔ جو وہ دنیا میں انجام دیتے
رہے۔ اللہ نے ان کی خوشی اور راحت کے لیے بیشمار نعمتیں تیار کر رکھی ہیں۔ جن
کا علم وہیں جا کر ہوگا، اس دنیا میں ان کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ فرمایا فَبِأَيِّ
آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمت کو
جھٹلاؤ گے۔

وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴿۶۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۳﴾
مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۵﴾
فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿۶۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۷﴾ فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴿۶۸﴾
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۹﴾ فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ
حِسَانٌ ﴿۷۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۱﴾ حُوْرٌ
مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ﴿۷۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۳﴾ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿۷۴﴾
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۵﴾ مُتَّكِـِٔيْنَ عَلٰى
رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴿۷۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ
رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۷﴾ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ
وَالْاِكْرَامِ ﴿۷۸﴾

ع ۳ / ۲۲ / ۱۲

ترجمہ:۔ اور ان دو باغوں کے علاوہ دو باغ اور
ہیں ﴿۶۲﴾ پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت
کو جھٹلاؤ گے ﴿۶۳﴾ وہ دونوں باغ گہرے سرسبز ہیں ﴿۶۴﴾
پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو
جھٹلاؤ گے ﴿۶۵﴾ اُن میں دو چشمے ہیں اُبلتے ہوئے ﴿۶۶﴾

پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے (۶۷) ان دونوں میں پھل ہیں اور کھجوریں اور انار (۶۸) پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے (۶۹) اُن میں عورتیں ہیں اچھی اور خوبصورت (۷۰) پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے (۷۱) وہ گورے رنگ کی ہیں روکی ہوئی خیموں کے اندر (۷۲) پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے (۷۳) نہیں چھوا اُن کو کسی انسان نے اس سے پہلے اور نہ کسی جن نے (۷۴) پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے (۷۵) وہ لوگ تکیے لگا کر بیٹھنے والے ہوں گے سبز رنگ کے مسندوں پر اور نہایت نفیس قالینوں پر (۷۶) پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے (۷۷) بڑی برکت والا ہے نام تیرے پروردگار کا جو بزرگی اور عظمت والا ہے (۷۸)

ربطِ آیات

سورۃ کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے مادی اور روحانی نعمتوں کا ذکر کیا، پھر تکذیب کرنے والوں کی مذمت بیان فرمائی اور توحید کے دلائل بیان کیے۔ پھر قیامت کے محاسبے اور جزائے عمل کا ذکر فرمایا اور اسی سلسلے میں مجرموں اور نافرمانوں کا انجام بھی بیان کیا۔ اس کے بعد اللہ نے انسانوں اور جنوں دونوں گروہوں کے اہلِ ایمان کا دو حصوں میں ذکر فرمایا۔ پہلے حصے میں فرمایا وَلِمَنۡ خَافَ ... الآیۃ جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے دنیا میں ڈر گیا اور ایمان اور تقویٰ کے راستہ پر چل نکلا، فرمایا اس کے لیے دو بہشت ہیں۔ میں نے کل عرض

کیا تھا کہ ایک تفسیر یہ ہے کہ ایک بہشت انسانوں کے لیے ہے اور دوسرا جنوں کے لیے۔ تاہم مشہور تفسیر یہ ہے۔ جو کہ سورۃ الواقعہ میں مذکور ہے، ایک بہشت سابقین کے لیے ہے اور دوسرا اصحاب یمین کے لیے۔ اس سورۃ میں ایک تیسرے گروہ اصحاب شمال کا ذکر بھی ہے۔ ان تینوں گروہوں کے درجات میں بھی مذکورہ ترتیب کے ساتھ تفاوت ہوگا۔ جس طرح دنیا میں مختلف لوگوں میں عقل، فہم، اخلاق اور نیکی بدی کا تفاوت ہوتا ہے اسی طرح اُن کے درجات میں بھی تفاوت ہوگا۔ خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا (بنی اسرائیل ۲۱) دیکھو ہم نے کس طرح بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے اور آخرت تو درجات اور فضیلت کے لحاظ سے بہت بڑھ کر ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ جنت کے سو درجے ہیں، اور ہر درجہ نچلے درجے سے زمین و آسمان کی بلندی جتنا بلند ہے۔ سب سے بلند درجہ جنت الفردوس کہلاتا ہے۔ جس کے اوپر عرش الٰہی کا سایہ پڑتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا یہ بھی فرمان ہے کہ جب خدا تعالیٰ سے مانگو تو جنت الفردوس ہی کا سوال کرو۔ کیونکہ یہ بلند ترین درجہ ہے۔

دو مزید باغات

پہلے دو باغوں کا ذکر گذشتہ درس میں ہو چکا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے سابقین کے لیے تیار کر رکھے ہیں۔ اب مزید دو باغوں کا تذکرہ ہے۔ جو اللہ نے اصحاب یمین کے لیے مخصوص کیے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ان دو کے علاوہ دو مزید باغ ہوں گے جو پہلے مذکورہ باغوں سے کم تر درجے کے ہوں گے۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ پھر ان باغوں کی تعریف میں فرمایا مُدْهَآمَّتٰنِ — یہ دونوں گہرے سبز رنگ کے ہوں گے۔ اور جب سبز رنگ گہرا ہو جائے تو قدرے سیاہی مائل ہو جاتا ہے۔ یہ نہایت ہی سرسبز اور خوشنما باغ ہوں گے جن میں ہر چیز قرینے کے ساتھ رکھی ہوگی جو انسانی طبائع کے عین

مطابق ہوگی۔ جنتی ان باغات کو پا کر بڑے مسرور ہوں گے۔ فرمایا فَبِاَیِّ اٰلَآءِ
رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ آگے
ان باغات کے لوازمات سے متعلق فرمایا فِیْهِمَا عَیْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ۝
ان باغات میں دو ابلتے ہوئے چشمے ہوں گے۔ وہاں پانی کی کوئی کمی نہیں ہوگی۔
بلکہ پانی ہر وقت جاری و ساری ہوگا۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ پس تم
اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کی تکذیب کرو گے۔ اس کے علاوہ فِیْهِمَا
فَاکِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ان باغوں میں پھل، کھجوریں اور انار ہوں گے جنت
کے پھلوں کو دنیا کے پھلوں کے ساتھ محض تشبیہ دی گئی ہے ورنہ جنت کے
میوہ جات بے مثال ہیں اور ہم ان کا تصور اس دنیا میں نہیں کر سکتے۔ ان کی
رنگت، خوشبو اور ذائقہ بہترین قسم کا ہوگا۔

کھجور اور انار کی خصوصیت

اگرچہ کھجور اور انار بھی پھلوں میں شمار ہوتے ہیں مگر ان کو پھلوں کے
ذکر کے بعد بطور خاص ذکر کیا گیا ہے۔ تاہم اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ دونوں
پھل خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ کھجور کا درخت بڑی لمبی عمر پاتا ہے اور ہر سال
پھل دیتا ہے۔ بعض ممالک میں یہ غذا کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے درخت
سے برداشت کرنے کے بعد کھجور کا پھل تین تین سال تک خراب نہیں ہوتا۔
بلکہ قابل استعمال رہتا ہے۔ اس پھل میں شکر، حرارت اور توانائی بیک وقت
پائے جاتے ہیں اس لیے یہ پھل نہ صرف تفریح کے کام آتا ہے بلکہ انسانی جسم
کی نشوونما کے لیے بہترین غذا بھی ہے۔ اسی طرح انار بھی عجیب و غریب پھل
ہے۔ اللہ نے اس کے دانوں کو مضبوط خول میں بند کرکے محفوظ بنا دیا ہے۔ عام طور
پر ذائقے کے لحاظ سے انار کی تین قسمیں ہیں یعنی ترش، میخوش اور شیریں۔ ترش انار سے
چٹنی اور اچار تیار کیا جاتا ہے۔ میخوش انار صفراوی مریضوں کے لیے نہایت مفید ہے
جبکہ شیریں انار تفریح طبع کے لیے عام استعمال ہوتا ہے۔ اس کے استعمال سے
جسم میں صالح خون کافی مقدار میں پیدا ہوتا ہے جو کہ جسمانی ساخت میں بڑا مفید ثابت
ہوتا ہے۔ ان دونوں پھلوں کی ان خصوصیات کی بنا پر کھجور اور انار کو عرف عام

اور محاورے میں پھل شمار نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ پھلوں کا اطلاق ان دو کے علاوہ باقی پھلوں پر ہوتا ہے۔

اسی بنا پر امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص قسم اٹھائے کہ وہ پھل نہیں کھائے گا اور پھر کھجور یا انار کھائے تو وہ شخص حانث نہیں ہوگا۔ اس کی مزید مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص سری نہ کھانے کی قسم اٹھاتا ہے اور پھر وہ چڑیا کا سر کھا لیتا ہے تو بھی اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ کیونکہ عرفِ عام میں سر کا اطلاق بھیڑ بکری یا گائے بھینس کے سر پر ہوتا ہے۔ چڑیا کے سر پر نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص فرش پر نہ سونے کی قسم اٹھاتا ہے اور پھر وہ زمین پر سو جاتا ہے تو بھی قسم نہیں ٹوٹے گی کیونکہ عرفِ عام میں فرش سے مراد بستر ہوتا ہے۔ حالانکہ اللہ نے زمین کو بھی فرش کہا ہے۔

بعض مفسرین کھجور اور انار کے پھلوں کے بطورِ خصوصی تذکرہ کی ایک اور توجیہہ بھی بیان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ ذکر تخصیص بعد التعمیم ہے۔ یعنی عام پھلوں کا ذکر کرنے کے بعد ان کی خاص کیفیت اور فوائد کی وجہ سے علیحدہ بھی ذکر کر دیا ہے اس کی مثال ترمذی شریف کی روایت میں ملتی ہے۔ صحابہؓ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم علیہ السلام یُحِبُّ الْحَلْوَاءَ وَالْعَسَلَ یعنی حضور علیہ السلام حلوہ اور شہد پسند فرماتے تھے۔ حلوہ تو ہر میٹھی چیز کو کہا جاتا ہے اور عربی زبان میں تمام مٹھائیاں حلوہ ہی کہلاتی ہیں۔ تو شہد بھی اگرچہ حلوہ میں داخل ہے مگر تخصیص کے لیے اس کا علیحدہ ذکر بھی کر دیا گیا ہے۔ وجہ یہی ہے کہ اللہ نے شہد میں دوسری میٹھی چیزوں کی نسبت خصوصیت رکھی ہے۔ جیسے فرمایا فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ (النحل-۶۹) اس میں لوگوں کے لیے اللہ نے شفا بھی رکھی ہے۔ اسی طرح پھلوں کے ذکر کے ساتھ کھجور اور انار کا ذکر اس کی خصوصیت کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ ان تمام مادی چیزوں کا ذکر کرنے کے بعد اللہ نے پھر وہی بات دہرائی ہے فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ اے جنوں اور انسانو! تم دونوں گروہ اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

عورتوں اور مردوں کی رفاقت

اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے لیے آخرت میں باغات جیسی بہترین رہائش اور وہاں پر حاصل ہونے والی خورد و نوش کی بہترین اور باافراط چیزوں کا ذکر کرنے کے بعد ایک اور نعمت کا ذکر فرمایا ہے۔ انسان بالطبع مدنی ہے یعنی وہ مل جل کر رہنے کو پسند کرتا ہے اور اس اجتماعیت کی سب سے اہم صورت میاں بیوی کا اجتماع ہے۔ فطری طور پر مرد عورت کی اور عورت مرد کی ضرورت محسوس کرتی ہے کہ زندگی میں خوشگواری کی یہ بہترین صورت ہے۔ مستدرک حاکم کی روایت میں حضور علیہ السلام کا فرمان مبارک ہے کہ دنیاوی لحاظ سے انسان کی سعادت یہ ہے کہ اُسے اچھا مکان، اچھی سواری اور اچھی بیوی میسر آجائے۔ ان اشیاء کی خواہش انسان کے لیے اگلے جہان میں بھی بدستور قائم رہے گی۔ اسی خواہش کی تکمیل کیلئے اللہ نے فرمایا ہے فِيهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ جن باغات کا ذکر کیا جا رہا ہے اُن میں اچھی اور خوبصورت عورتیں بھی ہوں گی۔ اس نعمت پر بھی اللہ نے یاد دلایا ہے فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے پھر آگے اُن عورتوں کی تعریف بیان کی ہے حُورٌ مَّقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ وہ ایسی گوری چٹی خوبصورت عورتیں ہوں گی جو خیموں میں روکی ہوئی ہوں گی۔ اُن کی خوبصورتی کے علاوہ اُن میں یہ خصوصیت بھی ہے کہ اپنے اپنے خیموں کے اندر رہائش پذیر ہیں۔ نہ وہ باہر آتی ہیں اور نہ کسی غیر مرد پر اُن کی نظر پڑتی ہے فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ آگے مزید وضاحت فرما دی کہ وہ ایسی باعصمت اور باحیا عورتیں ہیں کہ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ اس سے پہلے اُن کو کسی انسان یا جن نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ایسی پاکیزہ بیویاں اہل جنت کو ملیں گی۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ پس اے جنو اور انسانو! تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کی تکذیب کرو گے؟ عصمت اور حیا ہی عورت کے حق میں کمال ہے۔ اور یہی چیزیں مرد کے لیے بھی ضروری ہیں۔ سورۃ نور میں اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت دونوں کو حیاداری کی تلقین کی اور فرمایا ہے کہ دونوں اپنی نگاہوں کو نیچا رکھیں اور اپنی عصمت کی حفاظت کریں۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جنت میں دو قسم کی عورتیں ہوں گی ایک تو یہ حوریں ہوں گی جن کا ذکر ان آیات میں ہوا ہے۔ یہ نہایت ہی پاکیزہ اور باعصمت ہوں گی۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو جنتی مردوں کے لیے جنت ہی میں پیدا فرمائے گا۔ ان کے علاوہ اس دنیا کی اہلِ ایمان اور نیکوکار عورتیں بھی جنت میں ہوں گی جو حوروں سے بھی زیادہ حسین و جمیل ہوں گی۔ طبرانی شریف کی روایت میں حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حورِ عین کو زعفران جیسے پاکیزہ اور خوشبودار مادے سے پیدا کیا ہے۔ اور مفسرِ قرآن حضرت زید بن اسلمؒ تابعی فرماتے ہیں کہ خَلَقَهُنَّ مِنْ مِّسْكٍ وَّكَافُوْرٍ وَّزَعْفَرَانٍ اللہ نے جنتی حوروں کو کستوری، کافور اور زعفران کے مادے سے پیدا کیا ہے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان حوروں کو جنت ہی میں پیدا کرے گا۔ یعنی یہ وہیں کی مخلوق ہوگی اور نہایت پاکیزہ، خوبصورت اور با اخلاق مخلوق ہوگی۔

راحت کے دیگر سامان

اس کے بعد اللہ نے جنت والوں کے آرام و آسائش کا ذکر فرمایا ہے۔ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وہ سبز رنگ کے مسندوں پر تکیہ لگا کر بیٹھنے والے ہوں گے۔ رفرف کا معنیٰ فرش بھی ہوتا ہے اور تکیہ بھی۔ اور ساتھ فرمایا وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ اور نہایت نفیس قالینوں پر۔ عبقر کمال درجے کی چیز کو کہتے ہیں جس کی مثال موجود نہ ہو۔ تاہم عبقر کا اطلاق خود انسان پر بھی ہوتا ہے۔ عربی میں ہر اچھی اور نفیس چیز کو عبقر کہا جاتا ہے۔ کوئی خوبصورت، نقش و نگار والا قالین یا فرش ہو تو اس کو عبقری کہتے ہیں۔ دراصل عربوں میں مشہور تھا کہ عبقر جنات کا بنایا ہوا نہایت خوبصورت شہر ہے اس لیے وہ ہر اچھی چیز کو عبقر کہہ دیتے تھے۔ بہرحال فرمایا کہ اہلِ جنت نہایت عمدہ قسم کے قالینوں پر گاؤ تکیے لگا کر آرام کریں گے۔ پھر آگے وہی جملہ انتیسویں بار دہرایا ہے۔ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ اے جنو اور انسانو! اللہ نے تمہیں اتنی بے مثال نعمتیں عطا فرمائی ہیں تو بتلاؤ اب تم اس کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں تو شمار سے باہر ہیں، تم ان میں سے کس کس کا انکار کرو گے؟ مطلب

یہ ہے کہ تم خواہش کے باوجود انکار کر ہی نہیں سکتے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ مذکورہ نعمتوں میں سے کچھ تو فی الواقعہ نعمتیں ہیں اور بعض سزا کی چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے اور ان چیزوں کا تذکرہ بھی اللہ تعالیٰ کا احسان ہے تاکہ لوگ خرافات سے بچ جائیں اور آخرت کے عذاب سے خلاصی حاصل کر لیں۔

عظمت جلال کبریائی

سورۃ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت جلال کا ذکر کیا ہے جس نے انسانوں کو ان بیش قیمت نعمتوں سے نوازا ہے ارشاد ہوتا ہے تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ بڑا ہی بابرکت ہے تیرے پروردگار کا نام۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہاں پر اسم سے مراد صفت ہے، یعنی تیرے رب کی صفات بڑی بابرکت ہیں۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ یہاں پر لفظ اسم زائد ہے اور مطلب یہ ہے کہ تیرا پروردگار بڑا ہی بابرکت ہے جس نے انسانوں کے لیے مذکورہ نعمتیں پیدا کی ہیں۔ تاہم اسم بھی درست ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے اسمائے پاک ہیں اور ان میں سے جس اسم کے ساتھ بھی اُسے یاد کیا جاوے وہ راضی ہوتا ہے۔

فرمایا بڑی برکت والا ہے تیرے رب کا نام ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ جو بڑی بزرگی اور عظمت والا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے الفاظ ہیں۔ لہٰذا اُس کو ان الفاظ کے ساتھ یاد کرنا چاہیئے اسی لیے حضور علیہ السلام نے نماز کے بعد یہ دعا پڑھنے کی ترغیب دلائی ہے اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَاذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ اے اللہ! تو سلام ہے یعنی تیرا اسم پاک اور تیری صفت سلام ہے، اور تجھ ہی سے سلامتی ہے۔ تو بڑی ہی برکت والا ہے اے بزرگی اور عظمت والے پروردگار۔ حضور علیہ السلام نماز سے فارغ ہو کر قعدے کی حالت میں بیٹھے بیٹھے یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اور تین دفعہ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ بھی کہتے تھے۔ اور باقی دعائیں رُخ پھیر کر پڑھتے تھے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ ـــــ

معالم العرفان فی دروس القرآن

افادات

مفسر قرآن
حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی صاحب

ریکارڈنگ

بلال احمد ناگی صاحب

مرتب

الحاج لعل دین صاحب (ایم۔اے علوم اسلامیہ)

زیر انتظام

انجمن محبان اشاعت قرآن

صدر انجمن

شیخ محمد یعقوب عاجز

جنرل سیکرٹری

بابو غلام حیدر صاحب

خزانچی

محمود انور بٹ ایڈووکیٹ

ناظم مکتبہ

محمد منیر صاحب Ph: 4221943

مکتبہ دروس القرآن گوجرانوالہ